معلم سے خطاب

زادِ نو کو مُعلّم سکندری نہ سکھا! | بُتوں کے توڑنے والوں کو بُت
پڑی ہے گھُٹّی میں جن کی مئے ہُوالقادر | بٹھا کے زانو پہ اُن کو "ہری" "ہر

بسلسلۂ گذشتہ۔

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی اَنچھر

لکھت پڑھت کا دن۔ کچھ دن ہوئے جو اَن پڑھ دیسیوں کو پڑھنے لکھنے کی جونپ دلانے اور اس کا رسیا بنانے کے لئے دیس کے ایک ٹکڑے میں پڑھنے لکھنے کا دن منایا گیا۔ اس دن منانے پر جگہ جگہ سے بہت سے لوگوں نے اپنے سندیسے (پیامات) بھیجے۔ ان میں پنڈت مدن موہن مالوی کا سندیسا (پیام) یہ تھا۔

"مجھے اتائیت کھد ہے کہ سواستھ کی در بتا تھا اور کاموں کے کارن میں نراکشرتا نوارک دن کے سمبندھ میں ابھی تک کوئی سندیش نہ بھیج سکا۔ سکشرتا سب اونتی کی مول ہے۔ دیش میں سے نراکشرتا کو دُور کرنا دیش کی اتانیت اُونچی اور ہتکاری سیوا کرنا ہے۔ بھارت ورش کی جنتا میں کسی سمے، سکشار، ویاکتیوں سا نکھیا بہت اُونچی تھی اور یہ اتانیت دُکھ کا وشے ہے کہ آج وہ بہت کم ہوگئی ہے میں مانیاشری شمپورتا نند تتھا سنیوکت پرانت کی ورتمان گورنمنٹ کو ہردے سے بدھائی دیتا ہوں کہ انہوں نے نراکشرتا کو دُور کرنے کا پوتر سنکلپ کیا ہے۔ اسے میں ایشور کی کرپا مانتا ہوں اور ہردے سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ اس پونیا مایا یوگ میں ان کا تتھا اور سب کاریا کرتاؤں کو سپھلتا پراپت ہو۔

پرنت کے ہر ایک پڑھے لکھے پروش استری اور ودیارتھی سے میرا انورودھ ہے کہ وہ پراپتک بالغ پروش اور استری کو شکشا بنانے کے کاریا میں اتشا پروک سہیوگ دیں اور اس طرح دیش کی اتم سیوا کا پونگ پراپت کریں۔ اس سے دیش کی شکتی اور سمپتی بڑھے گی اور سب طرح کی دیش کی اونتی بھی ہوگی۔"

یہ لکھت ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیسے مسیحؑ سے پانسو برس پہلے کسی بڑی پُرانی راجدھانی میں راج پنڈت کی کتھا۔ یہ بولی ان پنڈت جی کی ہے جو کبھی "راشٹرپتی" رہ چکے ہیں اور جن کی باتوں کو جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ یہی جب ستھری اور سلجھی ہوئی اُردو بولنے پر آتے ہیں تو اچھے اچھے اُردو جاننے والوں کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ پنڈت جی نے بڑی روک تھام کی۔ اس پر بھی بدیسی بولیوں کے کچھ بول ان کی لکھت میں گھس ہی پڑے۔ پڑھنے لکھنے کے اسی دن منانے پر مسز وجے لکشمی پنڈت، جواہرلال جی کی چھوٹی بہن کا سندیسا (پیام) بھی پڑھئے۔

"ہندوستان میں سوتنترتا کی لڑائی چل رہی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہر پرکار سے ہم اپنے کو اس دن کے لئے تیار کرلیں۔ یہ اوشک ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک پرش اور استری اگیان ہوں۔ آج اس پرانت میں ساکشرتا کا کام شروع ہوا ہے۔ ہر ایک پڑھے لکھے استری اور پرش سے میرا یہ نویدن ہے کہ وہ آج کے دن سے یہ پرن کرے کہ وہ کم سے کم ایک آدمی ساکشر کردے یدی ہم سب لوگ مل کر اس کام کو اُٹھائیں تو بہت تھوڑے سمے میں ہندوستان میں ساکشرتا پھیل جائے گی اور ہماری اونتی کی بُنیاد پڑ جائے گی۔"

یہ سندیسا (پیغام) بھیجنے والی دیس کے اس گھرانے سے ہیں، جس کی بول چال، بات چیت مانی ہوئی ہے۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت جواہر لال نہرو اُردو کو اپنی اور اپنے کنبے کی بولی مان چکے ہیں۔ مسز پنڈت کا جان بوجھ کر پُرانی ڈگر کو چھوڑ کے نئی پگڈنڈی پر چلنا اسی ہلڑ میں ملنے کے لئے ہے جو دیس میں جگہ جگہ مچایا جا رہا ہے۔ یہ ابھی پنڈت نہیں ہوئی ہیں اور مسز پنڈت ہی ہیں۔ اس لئے مالوی جی کے سندیسے (پیام) سے ان کے سندیسے کے کچھ بول سمجھ میں آتے تو ہیں۔ پر پتا نہیں چلتا یہ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ اس دھاجوکڑی اور اودھم سے پہلے جو لوگ ان کی منجھی ہوئی بولی سن چکے ہیں وہ جانتے

ہیں مسز پنڈت کیسی اچھی اُردو بول سکتی ہیں۔ پر بھیڑ کا ساتھ دینے کیلئے اُنہوں نے اسے بگاڑ کے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اسے الٹی سمجھ نہیں تو پھر اور کیا کہا جائے جو بیٹھو بٹھائے سیدھی سادی اچھی بولی چھوڑ چھاڑ کے ایک کٹھن اور کڈھب بھاشا کے پرچار پر لوگ اڑ جائیں۔

بولی جو آپس میں میل ملاپ کا سہارا اور ایکے کا بندھن ہے اسے توڑنے کی بھاگ دوڑ کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاتھ سے اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مارنا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے پُرکھا مل ملا کے جو "ایکا گھر" بنا گئے تھے۔ ہندوؤں کے سپوت اپنے بڑے بوڑھوں کے بناتے ہوئے اسی گھر کو ڈھا دینے کے جتن کر رہے ہیں۔ یہ وہ گھر تھا اور ہے جس میں ہندو اور مسلمان اپنے الگ الگ دھرم ہونے پر بھی بے جھجک ایک دوسرے سے ملتے اور مل ملا کے ایک جگہ بیٹھکر اپنے من کی کہتے اور دوسرے کی سُنتے تھے۔ آج بھی یہ دونوں جتھے آپس میں ملتے جُلتے ہیں۔ پر اس میل جول میں وہ پہلی سی بات کہاں۔ ہندوستان کے سپوتوں کو تو یہ چاہیئے جو وہ اپنے بڑے بوڑھوں کے کئے دھرے کی لاج رکھ لیں اور اس ایکے کے بندھن کی توڑ تاڑ چھوڑ کے سپوت سے کپوت نہ بنیں۔

اُردو دِن۔ ۸ ردسمبر ۱۹۳۸ء کو بڑی دھوم دھام سے "اُردو دن" منایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی جگہوں کو چھوڑ کے دلّی، لکھنؤ، آگرہ، علی گڈھ، الہ آباد، پٹنہ، کلکتہ، بمبئی، لاہور، سری نگر، پشاور، راولپنڈی میں بڑی چہل پہل رہی۔ بڑی بڑی سبھائیں جمیں۔ دھواں دھار اسپیچیں ہوئیں۔ بڑی بات یہ ہے ان سبھاؤں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ہندو بھائی بھی مل جُل کر ایک جگہ بیٹھے اور کہیں کہیں یہی پنچ بھی بنے۔ جیسے۔ دلّی سبھا کے منشی بشیشور پرشاد منوّر، لکھنؤ کے پنڈت کشن پرشاد کول، علی گڈھ کے آنند سروپ کپل، آگرے کے پنڈت راج ناتھ کنزرو، لاہور کے ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر، الہ آباد کے سرتیج بہادر سپرو اور اسی جگہ کی ایک دوسری سبھا کے پنچ رائے بہادر آر۔ بی جینی بنائے گئے۔

سرتیج بہادر سپرو نے اپنی اسپیچ میں یہ کہا۔

"اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبے میں کم وبیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کرلیں جو فطری طور پر ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔۔۔۔
۔۔۔ اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے مٹائی نہیں جاسکتی۔ اگرچہ مٹھی بھر آدمی فرقہ وارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہے۔۔۔۔۔۔۔ اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہو تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی۔۔۔۔۔۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو دیہاتوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جبکہ ہر گاؤں اور قصبے کی مقامی بولی اور لب ولہجہ میں فرق ہے اور اس طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہانتک انکی تقلید کرینگے"

لکھنؤ میں پنڈت کشن پرشاد کول نے کہا۔

"میری مادری زبان اُردو ہے اور میری تمام جماعت کی پیدائشی زبان بھی یہی ہے۔ ہمارے گھروں میں مستورات بھی یہی زبان بولتی ہیں جو اس وقت میں بول رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ ہندو ایسے بھی ہوں جن کے ہاں یہ زبان نہ بولی جاتی ہو۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں کی عورتیں جب دوسری برادری کی ہندو خواتین سے ملتی جلتی ہیں تو اپنے مفہوم و مطلب کو اسی زبان میں ادا کرتی ہیں اور تمام ہندو عورتیں اسے بخوبی سمجھ لیتی ہیں"

لاہور میں ڈاکٹر بھٹناگر نے یہ کہا۔

"اُردو مُلک کے تمام قوموں کی مشترکہ زبان ہے اور جو لوگ تعصب کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ قوم اور مُلک کے دُشمن ہیں"

ہندو مہاسبھا کے ممبر راجا نریندر ناتھ نے بھی اسی سبھا میں سب کے سامنے کہا۔

"اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور اسے مٹانے کی کوشش کرنا پرلے درجے کی ہٹ دھرمی ہے۔۔۔ میری مادری

زبان اُردو ہے اور ہمارے تمام خاندان میں اُردو بولی جاتی ہے"۔

پنڈت راج ناتھ کنزرو جو کچھ باتوں میں ہندو مہاسبھا کے ساتھ ہیں۔ آگرے کی اسی سبھا میں اُنہوں نے یہ کہا۔

"کوئی زبان کسی کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتی۔ موجودہ مخالفت سے اُردو کو بجائے نقصان کے فائدہ ہوگا"۔

دیکھئے یہ سب کے سب ہندو ہی ہیں جو اپنی اُردو کو اپنے بڑے بوڑھوں کی دیا سمجھکر اپنی چھاتی سے الگ کرنا نہیں چاہتے اور ان لوگوں کو اچھا نہیں جانتے جو اُردو کی جڑ کھوکھلی کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ تو جن لوگوں کی سوجھ بوجھ کا دیا جل رہا ہے وہ اسکے اُجالے میں نیچ اونچ دیکھتے ہوئے بے جھجک چلے جارہے ہیں۔ اور جن کی سمجھ کا دیا بجھ چکا وہ اندھیرے میں ٹٹولتے اور ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

پبلک سے ریڈیو پروگرام کیلئے بمبئی لاسلکی کی پُوچھ گچھ

ابھی کچھ دن اُدھر آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مسٹر فیلڈن نے بمبئی والوں سے اُن کی بولیوں اور ریڈیو پروگرام کو وہ کس بولی میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی ہی کئی باتیں پوچھی تھیں۔ ان کے اس پوچھنے پر بمبئی والوں نے الگ الگ جو کچھ کہا ان سب کو ایک جگہ دیکھ لیجے۔

"اگر ریل تار اور موٹر نے ہندوستان کے مختلف حصّوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے تو ان کو قریب تر کرنے کا سہرا ریڈیو کے سر ہے۔ ریڈیو کے ذریعے سے خبریں، کہانیاں، گانے، تقریریں اور اسی قسم کی دوسری دلچسپ چیزیں جو مشتہر ہوتی ہیں۔ ان کو ملک کے مختلف حصوں کے لوگ سنتے اور لُطف اُٹھاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تقریروں، کہانیوں اور گانوں کی کون سی زبان ہو جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور لُطف اُٹھا سکیں۔ ہندوستان بلحاظ اپنی آبادی اور اپنی وسعت کے مختلف قسم کی تہذیبوں کا ایک زندہ عجائب گھر رہا ہے اور جوں جوں وسائل آمد و رفت بڑھتے گئے یہ تہذیبی دیواریں ٹوٹتی رہیں۔ لیکن آج اس زمانے میں بھی جب مادّی ترقیاں اپنے عروج کی طرف جارہی ہیں اور وسائل آمد و رفت بڑی تیزی سے دُنیا کے چپّے چپّے پر اپنا جال بچھا رہے ہیں۔ ہندوستان کی اندرونی یکجہتی کے راستے میں اب بھی بہت سے سنگ گراں باقی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا پتھر زبان کا ہے۔

آج ہندوستان میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ ٹامل، تلنگی، ملیالم، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پشتو، پنجابی، اُردو، ہندی، بنگالی وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت ہندوستان میں ریڈیو کے سات اسٹیشن ہیں۔ جہاں سے مقامی ضروریات کے مطابق ان زبانوں میں تقریریں، خبریں اور گانے مشتہر ہوتے ہیں۔ جس اسٹیشن کے قریب کئی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں سے بعض وقت کئی زبانوں میں گانے اور تقریروں کا پروگرام نشر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ریڈیو کے اخراجات میں بجائے کمی کے اضافے کا زیادہ امکان ہے۔ کچھ شاید بڑھتے ہوئے اخراجات سے متاثر ہوکر اور کچھ شاید دریافت کرنے کے لئے کہ ہندوستان میں کون سی زبان سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مسٹر فیلڈن کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو نے حال میں صوبۂ بمبئی کے سترہ ہزار سُننے والوں سے کچھ سوالات کئے تھے۔ ان سُننے والوں میں صرف سات ہزار حضرات نے جوابات دئے۔ مسٹر فیلڈن نے بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن سے ان جوابات پر ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اپنے تبصرے کے شروع میں اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں کوئی بھی ریڈیو اسٹیشن جبکہ اُسے دو سے زیادہ زبانوں کا پروگرام مرتب کرنا ہو اچھی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اور یہ دقّت بمبئی میں بہت ہی۔ جہاں دو سے زائد زبانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

مسٹر فیلڈن کا پہلا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ کس زبان کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ اسکے حسب ذیل جوابات ملے۔ ۲۵۰۰ حضرات نے گجراتی کو، ۱۵۰۰ حضرات نے مرہٹی کو، ۱۲۰۰ حضرات نے ہندوستانی کو، ۸۵۰ حضرات نے انگریزی کو، ۹۳ حضرات نے کوکنی کو، اور ۷۰ حضرات نے کنڑی کو اپنی مادری زبان قرار دیا۔ اس سے بمبئی میں گجراتی کی فوقیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مسٹر فیلڈن نے اس سوال کا رُخ پھیر کر جو جواب حاصل کیا ہے وہ صوبۂ بمبئی کے لئے خاصکر اس صورت میں عجیب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ جب اُردو کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ بمبئی تو گجراتی اور مرہٹی کا مرکز ہے اور وہاں اُردو کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

مسٹر فیلڈن کا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ کس زبان میں تقریریں سننا پسند کرینگے۔ مسٹر فیلڈن نے جوابات کی تشریح یوں

کی ہے۔ ۲۵۰۰ حضرات ہندوستانی، ۷۰۰ حضرات انگریزی، ۲۵۰ حضرات گجراتی اور صرف ۱۵۰ حضرات مرہٹی کے حق میں تھے۔ کوئی زبان کو پسند کرنے والے صرف ۱۲ آدمی تھے۔ مسٹر فیلڈن نے ان اعداد و شمار کو عجیب بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ بہت سے سننے والے جن کی مادری زبان گجراتی یا مرہٹی ہے انگریزی یا ہندوستانی میں تقریریں پسند کرتے ہیں اور آگے چل کر انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ابھی تک ہم نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ بمبئی میں بھی ہندوستانی زبان میں تقریروں اور ڈراموں کی اس قدر مانگ ہے۔

مسٹر فیلڈن کا تیسرا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ ڈرامے اور گانے کس زبان میں پسند کرینگے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ تین ہزار حضرات نے ہندوستانی زبان کے اور ۱۲۵۰ حضرات نے مرہٹی زبان کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد گجراتی اور انگریزی کا نمبر تھا۔ یہ اعداد و شمار اس بات کی کھلی شہادت ہیں کہ صوبۂ بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی کے مقابلے میں ہندوستانی زبان کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ تقریروں کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ صوبۂ بمبئی کے لوگ ہندوستانی تقریریں اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ہندوستانی، بازاروں میں سڑکوں پر ہوٹلوں میں رائج ہے اور اس قسم کی ہندوستانی تقریریں وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی گانوں اور ڈراموں کا شوق تو صاف اس بات کی پردہ دری کر رہا ہے کہ ہندوستانی زبان صرف بازاروں ہی میں نہیں مقبول ہے بلکہ یہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور شعر و موسیقی سے انکی روحوں کو تازگی پہونچاتی ہے۔

ہم مسٹر فیلڈن سے درخواست کریں گے کہ وہ اس قسم کے سوالات کلکتہ اسٹیشن کے ان سننے والوں سے بھی کریں جو بنگال، بہار، آسام میں آباد ہیں۔ ان جوابات سے کم سے کم یہ تو اندازہ ہوجائے گا جیسا کہ بمبئی میں ہوا ہے کہ کون سی زبان مشرقی ہندوستان میں زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ ہندوستانی کون سی زبان ہے۔ کیا یہ گاندھی جی کی ہندی اتھوا ہندوستانی ہے۔ یا شری سمپورنانندجی وزیر تعلیم صوبۂ متحدہ کی ہندی اتھوا دیوبانی ہے۔ جس میں کچھ بنارس کے مہا پنڈتوں کی روح حلول کر گئی ہے۔

اگر آپ بمبئی کا پروگرام سنتے رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ تو سیدھی سادی بے تکلف اردو ہے جو ہندوستان کے بیشتر حصوں میں بولی اور تمام حصوں میں سمجھی جاتی ہے اور جو ہندو، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ البتہ پروگرام میں کہیں کہیں نامانوس الفاظ ضرور آجاتے ہیں۔ ان کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی جگہ آسان عام فہم الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

اردو پھیلنے کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سب سے آسان ہے۔ ہر قسم کے مطالب کو ادا کر سکتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اثر ہے۔

سر تیج بہادر سپرو نے رسالۂ اردو کے اقبال نمبر کے سلسلہ میں مولوی عبدالحق صاحب کو حال ہی میں ایک خط لکھا تھا اس میں انہوں نے اقبال کے حسب ذیل تین شعر نقل کئے تھے۔

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں خاموش اذانیں ہیں تری باد سحر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں
دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

اور فرمایا "شاعری اور تخیل ایک طرف ان اشعار کی زبان دوسری طرف آج کل جو مسئلہ زبان پر بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس پر اکثر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جس زبان میں یہ درد، یہ قدرت اور یہ وسعت ہو جو ان اشعار سے پائی جاتی ہے اس کو ہم کیوں چھوڑیں۔"

("ہماری زبان" اپریل ۱۹۳۹ء)

مسٹر جمناداس مہتا کی نئی اپج۔ بہت سے بمبئی والے ریڈیو پروگرام جس بولی میں سننا چاہتے ہیں۔ مسٹر فیلڈن نے گنتی گنا کے اسے بتا دیا۔ پر، بمبئی اسمبلی کے ممبر مسٹر جمناداس مہتا کو مرہٹی اور گجراتی ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے اور دوسرے لوگ

چاہیں نہ چاہیں پر یہ ریڈیو پروگرام انہی دو بولیوں میں انہیں سُنوانا چاہتے ہیں ان کی اکھاڑ پچھاڑ کچھ نہ کچھ چلی ہی جاتی ہے۔ ابتک نئے نئے بھیس میں انہیں آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ ایک ڈگر اور ایک ڈھچر کا ہو رہنا اُن کے دھیان میں ایسا ہی سیٹھا پھیکا ہے جیسے دن رات ایک ہی سا کھانا کھاتے چلے جانا۔ نہ وہ کسی سے کھایا جاسکتا ہے اور نہ یہ کسی جگہ نچلے بیٹھ سکتے ہیں۔ کبھی یہ مہاتما جی کے بڑے ماننے والوں میں تھے۔ پھر جو کچھ دھیان میں گھٹ بڑھ ہوئی تو سوراجی ہوگئے اور سوراجیوں سے بھی جب نہ بنی تو انڈی پنڈنٹ، پھر انڈیپنڈنٹ ڈیماکریٹ ہوگئے اور ہندو مہاسبھا سے ڈانڈے ملادیے۔

یہ سب کھیل کھیل چکنے پر اب بمبئی میں ریڈیو سننے والوں کی ایک سبھا بنا کر آپ ہی اس کے پنچ بن بیٹھے۔ اپنی اس سبھا میں لوگوں سے کہہ سُن کے ایک یہ بات منوالی۔ بمبئی کے ریڈیو رکھنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی بولی مرہٹی اور گجراتی ہے۔ اس لئے بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے اُردو میں کوئی بات چیت نہ ہونا چاہیئے۔ مسٹر فیلڈن جس ڈھنگ سے اس گتھی کو سُلجھا چکے ہیں وہ ابھی آپ دیکھ چکے۔ بمبئی میں تو مرہٹی اور گجراتی بولنے والے اُردو میں گانے اور اسپیچیں سُننا چاہتے ہیں اور مسٹر مہتا اپنی ایک چھوٹی سی سبھا کے بل پر گجراتی اور مرہٹی ہی کا راگ الاپ رہے ہیں۔ اسے سوچ بچار کی آنکھ سے دیکھیے تو دکھائی دیگا۔ گجراتی اور مرہٹی کی آڑ پکڑ کے مہاسبھائی جتھا اُردو کو نیچا دکھانے کی گھات میں لگا ہوا ہے۔

اُردو کے سامنے مرہٹی اور گجراتی ہے کس گنتی میں۔ اُردو کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بولی میں نہیں۔ یہ تو پورے بمبئی کی بولی ہے۔ اسے یوں دیکھئے۔ جب کوئی گجراتی کسی مرہٹے سے ملتا ہے تو انگریزی بول چکنے پر اسی اُردو ہی میں تو بات چیت کرتا ہے۔ ایسے ہی وہاں کے اور اور جتھے ملنے جلنے میں پہلے انگریزی اور پھر یہی اُردو بولتے ہیں۔ بمبئی کے باہر گجرات، احمد آباد، بڑودہ، سورت، خاندیش، شولاپور اور ایسی اور چھوٹی بڑی جگہوں میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

دلّی لاسلکی اور ہندوستانی کی گتھی،

یہ تو بمبئی لاسلکی کی بات چیت تھی۔ دلّی لاسلکی بھی اسی بولی ٹھولی کے لئے اپنے پروگرام میں جگہ نکال چکی ہے۔ شبد ساگر میں ڈبکی لگانے والے کانگریسی ہندی پرچار کی دُھن میں جب گنگا جمنی بولی بولنے پر آتے ہیں تو یہ دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی پوجا پاٹ میں منتر پڑھ رہا ہے۔ سُننے والے ہکّا بکّا ہو کر پوچھنے لگتے ہیں یہ کس دیس کی بولی ہے اس گُم کنز پرسٹ پٹا کے "ہندوستانی" کی آڑ پکڑی جاتی ہے تو ہندوستانی کیا ہوئی گورکھ دھندا ہوگئی۔

"ہندوستانی" کیا ہے؟ اس گتھی کو سُلجھانے کے لئے مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مسٹر آصف علی یہ تین مسلمان اور ڈاکٹر تاراچند، بابو راجندر پرشاد، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی یہ تین ہندو، دلّی لاسلکی نے ان سب کو بُلوا بھیج کے اپنے یہاں اکٹھا کیا۔ لاسلکی کے پروگرام میں ان میں سے ایک ایک نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اسپیچ پڑھی۔ جب یہ سب پڑھ پڑھا چکے تو یہ چھے اسپیچیں ایک جگہ کر کے "جامعہ ملّیہ" نے دیکھنے والوں کے جی بہلانے کیلئے چھوٹے سے سائز پر چھاپ دیں۔ اس میں اسپیچ دینے والے کا پہلے فوٹو دیا گیا ہے اور پھر اسکی پوری اسپیچ۔ ایک کو چھوڑ کر پانچ اسپیچوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے یہ پانچوں بہت سوچ سوچ کے اور بڑی کاٹ چھانٹ کر کے لکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند اور بابو راجندر پرشاد کے یہاں ہندی بُھولے بسرے بول بہت ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے تو عربی، فارسی کے ان گھلے ملے بولوں کو بھی نکال پھینکا جنہیں تاراچند اور بابو راجندر پرشاد نے جگہ جگہ لکھا ہے۔ مسٹر آصف علی کو بھی انہیں کے لگ بھگ سمجھنا چاہیئے۔ پنڈت برجموہن کیفی بھی اپنی پُرانی ڈگر سے کچھ ہٹے ہوتے سے دکھائی دیتے ہیں۔ اب ایک مولوی عبدالحق صاحب ہی رہ گئے۔ جن کی اسپیچ سمویا ہوا پانی ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ہندی کا ایک آدھ بول بھی کوئی ایسا نہیں جسے بُھولا بسرا کہا جاسکے۔ ان کے لکھنے کا وہی ڈھنگ ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر اسی چھوٹی سی سبھا میں دیکھیے گا تو کئی لوگ آپکو ایسے ملیں گے جو اپنے لکھنے کے پُرانے ڈھرے سے الگ ہو چکے ہیں۔ تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب ہی کی اسپیچ ان سب میں "ہندوستانی" کی کسوٹی پر ٹھیک لے کھائی دیتی ہے۔ نہ جانے ان چھیوں اسپیچوں میں نئی ہندی والوں نے کسے "ہندوستانی" ٹھہرایا۔

آج ہندوستان اس اندھیرے گھپ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا اور اس ڈراؤنی گھاٹی پر دَوڑ لگا رہا ہے، جس کی بھیانک گہرائی سب کچھ نگلنے پر بھی اُگلنے کا نام نہیں لیتی۔ یونہی سی چُوک ہونے اور پیر پھسلنے پر یہ اس میں دھڑام سے گر پڑے تو پھر اس کا نکالنے والا کوئی نہیں۔ آئے دن ایک جگہ کے رہنے والوں کے الگ الگ جتھے دھرم اور ایسی ہی اور اور آڑیں پکڑ کے آپس ہی میں ایسے لڑے مرتے ہیں جیسے بھارت میں "مہابھارت" کا سا سماں آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ بھلا اس اندھیاؤ میں اُردو کیسے بچ سکتی تھی۔ یہ بھی ہٹ دھرمی کی دھول میں اٹتی اور چوٹ پہ چوٹ کھاتی چلی جارہی ہے۔ کہیں اسے ایک ہی جتھے کی بولی ٹھہرا کے اسے مٹانے اور وہ ایکا جو اسی کے سہارے یہاں والوں میں برسوں سے چلا آرہا ہے

اس بندھن کو توڑ تاڑ کے پھینک دینے کے جتن کرنے میں لوگ اپنے آپے سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی اندھیرے میں کہیں نہ کہیں سے سوجھ بوجھ کا کچھ اجالا بھی دکھائی دیجاتا ہو جسے دیکھکر ڈھارس بندھتی ہو اور آگے بڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "عثمانیہ یونیورسٹی" کے اگلے برس کے کانووکیشن میں سر تیج بہادر سپرو نے جو اسپیچ پڑھی وہ بھلائی نہیں جاسکتی۔ کوئی دیکھنے والا ہو تو اس میں بہت سی چھپی ہوئی انمول باتیں دیکھ سکتا ہے۔

"اُردو زبان کو میں جو اہمیت دیتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ گذشتہ زمانہ میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی تعلق اور میل جول کا ایک زبردست رشتۂ اتحاد رہ چکی ہے اور یہ کام وہ آج بھی کر سکتی ہے اور ہندوستان کے اکثر حصّوں میں کر رہی ہے۔"

کچھ پرانی باتیں۔ پہلے پہل جب مسلمان یہاں آئے تو ایک ہی دیس کی الگ الگ جگھوں اور الگ الگ دھرموں کی چھاؤں میں ان گنت بولیاں دیکھیں۔ یہ ادھر آنے والے گونگے تو نہ تھے، اپنی بولیاں رکھتے تھے اور انہی کو ساتھ لئے ہندوستان آئے تھے۔ عربوں کی عربی، ایرانیوں کی فارسی، ترکوں اور مغلوں کی ترکی بولی تھی۔ پر ان سب بولیوں پر فارسی چھائی رہی۔ سندھ کے راج والے عرب ہی پر ایران کے پاس ہونے اور وہاں کے بیوپاریوں کے لگاتار آنے جانے سے عربی ملی ہوئی فارسی ہی جگہ جگہ بولی جاتی تھی۔

خیبر کی گھاٹی میں سے جو جتھے آئے اُن کی بولی کچھ ہی کیوں نہ ہو پر ان کے راج پاٹ اور کچہریوں کی بولی فارسی ہی تھی۔ اس لئے ہندوستان کی کچہریوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں ہوتی رہی۔ پر یہ تو نہیں ہو سکتا تھا جو پورے دیس کی بول چال اور بات چیت کے لئے دیس کی بولی فارسی ہی کو ٹھہرا دیا جائے اور نہ یہ ہو سکتا تھا جو یہیں کی بولیوں میں سے کسی بولی کو چھانٹ کے دیس بھاشا بنا دیا جائے۔ جب یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتی تھیں تو تیسری بات ہی ہو سکتی تھی اور رہو ہی جو مسلمان اس دیس میں جس جگہ بھی پہونچے وہیں کی بولی بولنے کا انہوں نے لگا لگا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بڑھتے ہوتے راج کی نت نئی باتوں کیلئے سیکڑوں، ہزاروں اپنی بولی کے بول اُس جگہ کی بولی میں بڑھانا پڑے۔

کھوج لگانے پر جگہ جگہ اس کا پتا ملتا ہے۔ دیکھئے:۔ مرہٹی بولنے والے مرہٹے اپنے راج منتریوں (وزیروں) کو "پیشوا" اور ہندو راجدھانیاں انہیں آج بھی "دیوان" ہی کہہ کے پکارتی ہیں۔ پیشوا اور دیوان یہ دونوں کے دونوں ٹھیٹ فارسی بول ہیں جنہیں یہاں کی کسی بولی سے یونہی سا بھی کوئی لگاؤ نہیں۔ مہاراشٹر میں گاؤں کے چودھری کو "مقدّم" اور کلرک کو "کارکن" کہا جاتا ہے۔ ان بولوں میں سے پہلا عربی ہے اور دوسرا فارسی۔ گاؤوں کی چوکسی اور اُنکی دیکھ بھال، جانچ پڑتال کرنیوالوں کی جگھوں کے نام عربی، فارسی ملے ہوتے ہی آپ دیکھیں گے۔ جیسے:۔

"ضلعدار، کارندہ، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، گماشتہ، سیاہہ نویس، واصل باقی نویس، خزانچی، تحویلدار، پیشکار، محرّر۔"

ڈھونڈنے پر ایسے اور بہت سے بول مل سکتے ہیں۔

کھیتی باڑی ہندوستان کا بڑا پرانا دھندا ہے۔ مسلمانوں نے آکر اسے اتنا بڑھایا اور اس میں وہ وہ باتیں نکالیں جن کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا۔ انہیں کے راج میں کابل، ترکستان، ایران کے وہ وہ اچھے میوے اور رسیلے، میٹھے پھل دیس میں آگئے جنہیں سونگھنا، چکھنا تو بڑی بات ہے۔ یہاں کبھی کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔ جیسے:۔

"انجیر، ناشپاتی، خربوزہ، تربوز، سردہ، انگور، انار، سیب، بہی، شفتالو، پستہ، چلغوزہ، کشمش، بادام"

دیسیوں کو یہ سب ایسے بھاتے اور اچھے لگے جن کے بدیسی نام بے رٹے آپ ہی آپ دھیانوں پر چڑھ گئے اور اب انہیں بھلانا چاہنے پر بھی نہیں بھلا سکتے۔ تغلقوں کے راج میں دلّی اور اس کے آس پاس بارہ سو بڑی بڑی پھلواریاں تھیں جن میں ایک چھوڑ کئی کئی ڈھنگ کے انگور رہتے۔ فیروز شاہی کا یہ لکھنا مانیں نہ مانیں آپ جانیں۔ مسلمانوں سے پہلے اندھیرے گھپ سے بچنے کیلئے یہاں کیا تھا؟ ایک ٹمٹماتا ہوا دیا جس کا اجالا سمٹ سمٹا کے اسی کے نیچے رہ جاتا تھا۔ رات آئی اور یہی دیئے گھر گھر ٹمٹمانے لگے۔

"چراغ، مشعل، شمع کافوری، فانوس، مردنگ، دیوارگیر، فتیل سوز، قندیل۔"

یہ سب ٹھاٹ مسلمانوں کا راج ساتھ لایا اور یہاں کے اندھیرے میں ایسا اجالا پھیلا یا جس سے پورا دیس جگمگا اٹھا۔ انہیں کے راج میں باہر کے نئے نئے رنگ کے مہکتے ہوتے پھولوں سے دیس پٹ گیا اور کونا کونا مہکنے لگا۔

گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نسرین، نسترن، گل شبو۔

اور ایسے بہت سے نئے نئے ڈھنگ کے پھول جنہیں ہندوستان نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا ایک ایک کر کے یہاں سب کھنچ آئے۔

کھانا پکانا اور کھانا کھانا کس دیس میں نہیں۔ سانس کے لسر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے۔ مسلمانوں سے پہلے کھانا پکانے کیلئے یہاں مٹی کی ہانڈیاں تھیں اور کھانا کھانے کیلئے کیلے کے چوڑے چوڑے پتے۔

دیگ، دیگچہ، دیگچی، کفگیر، چمچے، رکابیاں، پیالے، قاب، دسترخوان، آفتابہ، سیلابچی، باورچی، بکاول، رکابدار۔

یہ سب مسلمان ہی اپنے ساتھ لائے۔ جب میووں، پھولوں، پھلوں کی یہاں بہت بہتات تھی تو نئے نئے کھانوں کے کیا کچھ ٹھاٹ نہ ہونگے۔

"پلاؤ، مزعفر، مطنجن، بریانی، کباب، قیمہ، کوفتہ، قلیہ، قورمہ، شب دیگ، شیرمال، باقرخانی"

اور ایسے بہت سے اچھے اچھے کھانے انہیں کے راج نے ہندوستان کو کھلائے اور یہ کھانے کھلا کر۔

"شکر پارے، برفی، گلاب جامن، بالوشاہی، لوزبادام، حلوا مغزی"

اور نئے نئے حلووں سے دیس کا منہ میٹھا کیا۔ پیٹ بھر چکا تو اس کے پہننے کے لئے اچھے سے اچھے کپڑوں کا ڈھیر سامنے لگا دیا۔ جیسے۔

"گلبدن، اطلس، مشجر، زربفت، کمخواب، جامہ وار، تن زیب، جامدانی، کامدانی، شال، دوشالہ"

ٹیپ ٹاپ کے لئے۔

"سرپیچ، طرہ، گوشوارے، بازوبند، نونگے، جوشن، ہیکل، طوق، گلوبند، زنجیرہ، کمرزیب، پازیب"

یہ سب باتیں انہی کی نکالی ہوئی ہیں۔

"یاقوت رمانی، لعل بدخشانی، عقیق یمنی، یشب، فیروزہ، زمرد، زبرجد"

یہاں کون لایا؟ یہی مسلمانی راج تھا۔

پتھروں میں۔ "سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ سماق، سنگ موسیٰ، سنگ لرزاں، سنگ خارا"

یہ سب اسی راج نے نکالے۔

گھوڑوں کیلئے۔ "زین، تنگ، لگام، رکاب، نعل، جل، سئیس، سوار، شہسوار، تازیانہ"

یہ ٹھاٹ انہی کے ساتھ یہاں آیا۔ بسانے اور نبھا دینے والے وہ کنٹرا ان کے راج میں بنے۔ جن کے نئے نئے نام رکھے اور دیس کی بولیوں میں وہی پھیل گئے۔

ان پرانی باتوں کے دہرانے سے سوجھ بوجھ والوں کو یہی دکھانا ہے۔ مسلمان اپنے راج پاٹ اور اس کی ایک ایک بات ساتھ لئے ادھر آئے اور جو پھیلاؤ یہ اپنے ساتھ لائے وہ پورے کا پورا یہاں کے لئے نیا۔ جب باہر سے آیا ہوا پھیلاؤ ہندوستان میں تھا ہی نہیں تو دیس کی بولیوں میں اس کے لئے بول کہاں سے آتے۔ اسی لئے ان کے ساتھ لائے ہوئے بہت سے بدیسی بول یہاں کی بولیوں میں جوں کے توں سما گئے۔

سندھ میں اردو کا ڈھانچا۔ پورے دیس میں سندھ ہی وہ جگہ ہے جہاں پہلے پہل مسلمان پہونچے اور یہیں کی وہ مٹی ہے جس سے اردو کے پتلا بننے کا اٹکا لگا۔ مسلمان جب یہاں آنے جانے لگے تو ہوتے ہوتے وہ گھڑی بھی آ گئی جس میں دھاوا کر کے انہوں نے اسے چھین چھان کر اپنی راجدھانی بنا لیا۔ یہ دھاوا کرنے والے عراق اور شیراز کے جیوٹ، سورما اور منچلے عربی، فارسی بولتے ہوئے سندھ آئے۔ پھر وہ بیوپار والے مسلمان جو آ کے یہیں رہ پڑے ان کی بولی بھی یہی عربی، فارسی تھی۔ سندھ والے بھی عراق آتے جاتے تھے۔ یہاں والوں کا وہاں اور وہاں کے لوگوں کا یہاں آنا چپ رہنے اور ایک ایک کا منہ تکنے کے لئے تو نہ تھا۔ یہ آنا جانا اور ملنا جلنا تھا ہی اسی لئے جو اپنے جی کی باتیں جس ڈھنگ سے بھی ہو سکے دوسرے تک پہونچا دی جائیں اور دوسرے کی باتیں جیسے بھی بن پڑے آپ سن کر سمجھ سکیں۔ تو آئے دن کی اس مڈبھیڑ سے ایک بھاشا کے بگڑے بگڑائے، آدھ کٹے آدھ کٹے بول دوسری بولی بولنے والے کی بات چیت میں آنے لگے ہونگے۔

۱۳۳ھ میں شام کو چھوڑ کر خلافت نے جب عراق میں اپنا اجالا پھیلایا تو سندھ کے بہت سے پنڈت عراق میں ڈھل آئے اور اپنی بھاشا کی لکھتوں کو عربی میں لانے والوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ساتھ ہی انہیں اچھی اچھی جگہیں مل گئیں۔ عربی سے ہندی کے ملنے کی یہی پہلی گھڑی تھی جس میں بہت سے ہندی بول پہلے پہل عربی سے ملے اور ان نئے آنے والے بدیسی بولوں کو عربی نے اپنے پاس جگہ دی۔ سندھ اور ملتان یہ دونوں جگہیں تین سے

برس تک مسلمانوں کا راج گڑھ بنی رہیں جن کا ناتا بغداد اور مصر سے جڑا ہوا تھا۔ خراسان، عراق، یمن، ایران اور مصر سے آنے والے بیوپاریوں اور دوسرے لوگوں کا یہاں تانتا لگا رہتا تھا۔ الگ الگ بولیوں والوں کے ایک جگہ اکٹھے ہونے سے، سندھ اور ملتان میں، دیسی بولیوں سے عربی، فارسی کا میل جول بڑھنے اور ایک نئی بولی کا ڈھانچا دھڑتے سے بننے لگا۔

بزرگ بن شہریار ملاح ۳۰۰ھ میں ادھر کا چکر لگا چکا ہے۔ اس کی ڈائری "عجائب الہند" میں کئی ہندی بولوں کا پایا جانا یہ بتاتا ہے، ہندی بول دھیانوں پر ایسے چڑھ چکے تھے جو بات چیت تو بات چیت لکھنے میں بھی آنے لگے۔ اس سے چالیس برس پیچھے اصطخری سندھ اور ملتان آیا، وہ منصورہ (بھکر) ملتان اور ان کے آس پاس کی بولی کو عربی اور سندھی بتاتا ہے اور مکران والوں کی بولی کو فارسی اور مکرانی۔ ابن حوقل جو اصطخری سے اٹھارہ برس پیچھے پھرتا پھراتا ادھر آیا وہ بھی یہی کہتا ہے "منصورہ (بھکر) ملتان اور اس کے آس پاس عربی اور سندھی بولی جاتی ہے"۔ بشاری مقدسی ابن حوقل سے بھی سترہ برس پیچھے ملتان آیا اور یہ دیکھا "یہاں فارسی بولی سمجھی جاتی ہے"۔

ان سب کڑیوں کو ملا کر دیکھنے سے یہی پتا چلتا ہے۔ سب سے پہلے دیس کے جس ٹکڑے میں عربی، فارسی میل ملاپ کا لگا لگا وہ سندھ ہی ہے اور مسلمانوں کی بولیاں پہلے پہل جن دیسی بولیوں سے ملیں وہ یہی سندھی اور ملتانی ہیں۔ پھر پنجابی اور اس کے پیچھے دہلوی کا نمبر ہے۔ بدیسی بولوں کی جیسی "اُردو" میں ریل پیل دکھائی دے رہی ہے، عربی، فارسی بولوں سے سندھی بھی ایسی ہی ندی پھندی ہوئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر اچنبے کی بات سندھی لکھنے کا ڈھب ہے جو آج تک عربی ہی چلا جاتا ہے۔

سندھی، پنجابی، ملتانی کے یونہی سے اَل بل اور گھٹ بڑھ چھوڑ کے دیکھئے تو یہ تینوں ایک ہی سی دکھائی دینگی۔ عربی، فارسی بولوں کی بہتات جیسی ایک میں ویسی ہی دوسری اور تیسری میں۔ آپ کی اُردو انہی کا نچوڑ، انہی کی اچھی مورت اور نکھرا ہوا رنگ ہے۔ انہی بولیوں میں عربی، فارسی بولوں کی ملاوٹ سے اُردو بننے کا ڈول پڑا۔ آگے بڑھکر دہلوی بولی سے اس کی مڈبھیر ہوئی اور اسی سے مل ملا کے یہ کسوٹی کی بولی بن بنا گئی۔ پھر راجدھانی کی یہی بولی پھیل پھیلا کے دیس کے کونے کونے میں پہونچ گئی۔

سلطان محمود غزنوی کا دھاوا ہوا تو گجرات تک۔ پر اس کی راجدھانی پنجاب اور سندھ ہی میں سمٹ سمٹا کے رہ گئی۔ دوسو برس کے لگ بھگ یہ گھرانا راج پاٹ سنبھال سکا۔ غزنویوں کی چھاؤنیوں میں مسلمان اوپچیوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہتیار لگائے اپنی اپنی جگھوں پر ڈٹے رہتے اور بہت سے ہندو بڑی بڑی جگھوں پر انہی کی دیکھ بھال کے لئے رکھے گئے تھے۔ جیسے عرب اور عجم کے بڑے بھاری بھرکم لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کے راج کی سبھا میں اکٹھا کیا گیا تھا ایسے ہی دیس کے چوٹی کے ہندوؤں کو بھی انہی کے ساتھ جگہ دی گئی تھی۔ دیسیوں کا بدیسیوں کے ساتھ میل جول بڑھنے سے ترکستان، ایران، کابل کے سیکڑوں، ہزاروں ہندوستان آ کے یہیں رہ پڑے اور یہاں والے انکی جگھوں میں جا کے بس بسا گئے۔ اس سے دیسیوں کے دھیانوں پر بدیسی اور بدیسیوں کے دھیانوں پر دیسی بول چڑھ چڑھا گئے۔

غوریوں کا راج آیا تو انہوں نے لاہور اور ملتان سے اسے اتنا آگے بڑھایا جو دلّی کو اپنا راج گڑھ بنا کے چھوڑا۔ پشاور سے گجرات اور بنگال تک جگہ جگہ انہی کی دھاک تھی۔ اب اس ملی جلی نئی بولی کی دوڑ اور بڑھی۔ پورے دیس کی بول چال اور بات چیت کی جہاں کبھی کوئی ایک بولی تک نہ تھی، وہاں اب ملی جلی بولی کا ایک بڑا پورا پتلا بن بنا گیا۔ ۵۱۶ھ میں شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ سے چھین کر ملتان اور سندھ کو بھی جب دلّی سے ملا لیا تو اِدھر اُدھر سے سیکڑوں دھندے والے اور ہزاروں بیوپاری دلّی ڈھل آئے اور اب ملتان، لاہور، دلّی یہ تینوں جگھیں اس نئی بولی کے آگے بڑھانے اور اس کے سدھارنے میں لگ گئیں۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا اس میں بہت کچھ کرنے والا پرماتما کے پریم میں ڈوبا ہوا مسلمانوں کا وہ گیانی جتھا تھا جسے "صوفیہ" کہتے ہیں۔

ہندوستان میں کوئی ایک ملی جلی بولی جیسے راج چاہتا تھا اس سے بڑھکر دیس کا ایک ایک چھوٹا بڑا اور ان سب چھوٹے دیسی تک پہونچکر اس کے سنسان من کے مندر میں بھگوان کے پریم کا دیا جلانے اٹھا تھا اس نے اچھائی پھیلانے اور برائی کو مٹانے کے لئے دیس کی بہت سی بولیوں میں سے وہی ملی جلی ایک بولی چھانٹ لی جسے سب سمجھ سکتے تھے۔ اب تک اُردو کے پُرانے سے پرانے ٹکڑے اور اس کی پرانی سی پرانی جتنی لکھتیں ہاتھ آسکی ہیں یہ سب کی سب اسی بھاگوان گیانی جتھے کی ہیں۔ اس بولی کی پرانی باتوں کی جہاں سے جہاں تک چھان بین ہو سکی اس سے یہی پتا چلتا ہے۔ پہلے پہل خواجہ فرید گنج شکر کے منہ سے اس نئی پھلواری کے پھول جھڑے۔ یہاں جگہ نہیں، نہیں تو اُن کی ایک ایک بات پھیلا کے لکھی جاتی۔ سیر الاولیا، فوائد الفوا

تاریخ فرشتہ، لطائف اشرفی اور ایسی اور دوسری لکھتوں میں کڑیاں پھیلی ہوئی ملتی ہیں جنہیں ایک جگہ کیا جاسکتا ہے۔

فارسی کہنے والوں کے چھندوں میں ہندی بولوں کی کھپت اسی لکھت میں آپ کہیں پہلے دیکھ چکے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف خلجی اور تغلق راج کی ان دونوں لکھتوں میں بھی ہندی کی پوری جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے:-

کہار، ٹھگ، لونڈی، ٹیکہ ہندواں، منڈل، گھٹی، بہی پٹواریاں، ڈھولک، چبوترہ، مٹھ، بسوہ، چرائی، منڈی غلہ، ماش، ریوڑی، دھاوگاں، تھانہ، بھٹی، چودھری۔　　(فیروز شاہی ضیائے برنی)

سراج عفیف کے یہاں بھی ہندی کے ایسے ہی بول ملتے ہیں:- جیسے:-

راج، چونہ، چھتر، بھیڑ، چودھریاں، گھڑیال، گھڑیال خانہ، درخت سینبھل، بھرکر، کنگرہ، سوندھار۔

اب بیچ کی چھوٹی بڑی کڑیوں کو یونہی چھوڑتے ہوئے اتنا آگے بڑھتے جو دکھن کے وہ بہنی راج پاٹ والے دکھائی دینے لگیں جنہوں نے دلّی سے الگ ہوکر گلبرگہ کو اپنا راج گڑھ بنالیا اور اپنی کچہریوں سے فارسی کو نکال کے دیسی بولی کو اس کی جگہ دیدی۔ یہ گھرانا جب مٹ مٹا گیا تو عادل شاہی اور قطب شاہی راج آیا اور اس نے بھی اسی دیسی بولی کی پیٹھ ٹھونکی، اسی کا ساتھ دیا اور اسی کو اپنی بھاشا سمجھا۔ راج بھاشا بن چکنے پر یہ بڑی پھرتی سے آگے بڑھی اور پھیلنے لگی۔

جب دیس کے اُتر میں یہ بولی بہنی اور اس میں لکھت پڑھت بری بات سمجھی جارہی تھی، اسی گھڑی میں دکھن اور گجرات نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ یہ بات بھی بھولنے کی نہیں:- پیار اور پریم کی من گھڑت کہانیاں کہنے سے پہلے اُردو نے جو پہلے پہل باتیں کیں وہ سب کی سب دھرم پرچار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے گیانی جتھے نے اسی میں اپنے ڈھچر کی بہت سی لکھتوں پر لکھتیں لکھ ڈالیں۔

۹۱۸ھ میں قطب شاہی راج کی نیو پڑی۔ بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈے میں "شیعہ" ہی "شیعہ" تھے۔ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد قلی قطب شاہ اور دوسرے اور اور کوی (شاعر) جیسے شجاع الدین نوری، نصرتی اور ہاشم علی نے کربلا والوں کی دُکھ بھری بپتا پر رونے رُلانے کے لئے بہت کچھ لکھ لکھا کے ڈھیر لگا دیا۔ ہوتے ہوتے اس نئی بولی میں اور دوسرے دھیانوں کی کھپت کے لئے بھی جگہ نکلنے لگی۔ دکھن کی اس پھلواری کی مہک جب اُتر میں پھیلنے لگی تو وہاں والے چونکے اور جھٹ سے اس کا پودا اپنے یہاں لگاکے اسکی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ جب یہ جڑ پکڑ چکا اور بڑھ بڑھا کے بڑا اونچا پیڑ بن چکا تو اسکی اٹھان اور اسکے بڑھتے ہوئے رُوپ کو دیکھکر دکھنی بولی پر قائم نے یہ چوٹ کی:-

"قائم! میں غزل طور کیا ریختہ، ورنہ　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی"

نئی دیسی بولی کی ندی کہاں سے نکلی اور آگے بڑھتی، پھیلتی پھیلاتی، بل کھاتی ہوئی کہاں سے کہاں جا پہونچی۔ اس کا دُھندلا سا سماں ابھی آپ دیکھ چکے۔ اب یہ اندھیر دیکھئے وہ بدیسی بولیاں جیسے سنسکرت اور پُرانی ہندی جن کا ناتا کئی ہزار برس کی چوڑان چکلان دیس سے جوڑ چکی ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ یہ تو ٹھیٹ دیسی سمجھی جائیں اور جس بولی کا یہی جگہ جنم بھوم ہو، جسے اسی دیس نے پال پوس کے بڑا کیا ہو وہ ان سب باتوں پر بھی بدیسی ہی رہے اور دیسی نہ بن سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا کہتے ہیں۔

دڑاوڑی دیسی اور آریا پردیسی، بہت دنوں تک چھوٹے بڑے سب کے سب یہی مانتے اور اسی کو ٹھیک جانتے رہے۔ جب دوڑ دھوپ آگے بڑھی تو دڑاوڑی دیسی بھی پردیسی بن گئے اور دیس کے ٹھیٹ دیسی رہی بھیل، گونڈ اور لمباڑے ہی ٹھیرے جنہیں آج تک اپنے ہی دیس میں نہ کبھی پیٹ بھر کھانا ملا اور نہ پہننے کو پھٹا پُرانا کوئی کپڑا۔ کیسے اچنبے کی بات ہے:- بھاگوان پردیسی تو یہاں آکے راج کریں اور بھاگ پھوٹے دیسی پھل پھلاری کھاتے ہوتے ادھر اُدھر چھپتے چھپاتے پڑے پھریں۔ کہتے ہیں:- بارہ برس میں گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ یہ کہاوت ٹھیک ہے تو ان ابھاگی دیسیوں کے کب دن پھریں گے۔ کیا ان کے لئے بارہ برس کی گنتی کروڑوں برس ہو چکنے پر پوری ہوگی؟

ہندوستان میں کب سے بدیسیوں کا تانتا بندھا؟ اسے ہزاروں برس ہو چکے۔ پھر ایک ہو تو کہا جائے۔ دڑاوڑی، آریا، یونانی، تاتاری، سیتھین، عرب، ترک، مغل، پٹھان، ایک کے پیچھے ایک آتے ہی رہے۔ آریا جو بولی بولتے ہوئے دیس میں گھسے نہ جانے وہ کب تک اُسے ویسی ہی بولتے رہے جیسے بولتے یہاں آتے تھے۔ آگے بڑھکر اس میں گھال میل ہوا اور گھٹ بڑھ ہوتے ہوتے یہاں تک پہونچی جس سے ایک دوسری

بولی کا ڈھانچا بن بن گیا۔ ایسے ہی عرب، ترک، مغل اور پٹھان اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے ہندوستان آئے اور یہیں رہ پڑنے سے اپنی اپنی بولیوں کے بول ملا جلا کے ٹھیٹ دیسی بولی بولنے لگے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس کے میل جول کے لئے یہی ایک سہارا نکالا اور سچ پوچھئے تو یہ آپ ہی آپ ایسے ہی نکل آیا جیسے ہنسنے میں دانت نکل آتے ہیں۔ دیس دیس کے لوگ جب ایک جگہ اکھٹے ہونگے تو کب تک گونگے بنے ایک دوسرے کے منہ کو تکتے رہیں گے۔ کیسی ہی الگ الگ بولیاں کیوں نہ ہوں کئے دن کی مڈبھیڑ ان رکاوٹوں کو الگ کرتی ہوئی اس ڈگر تک پہونچا دیتی ہے جہاں آمنے سامنے والے اپنی اپنی بولیوں میں توڑ مڑوڑ کر کے اپنی بات دوسرے کو سمجھانے لگتے ہیں۔ پہلے تو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے۔ بات چیت کرنیوالے اپنی اپنی ہانکتے رہتے ہیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہی ہانک کانوں میں جگہ کرتی چلی جاتی ہے اور اس ہانک کے ساتھ منہ کا اتار چڑھاؤ، ہاتھ نچانا، بھویں مٹکانا، یہ باتیں مل ملا کے بات پوری نہیں تو ادھوری ہی سمجھا دیتی ہیں۔ جب ادھوری باتیں سمجھی جانے لگیں تو آگے بڑھکر سمجھ کے سامنے یہی ادھوری پوری بن جاتی ہیں۔

تو ہندو، مسلمانوں نے اس سہارے کو آگے بڑھانے کے لئے نت نئے جتن کئے۔ عربوں نے عربی، ترکوں نے ترکی، ایرانیوں نے فارسی، پٹھانوں نے پشتو اور آریوں نے اپنی سنسکرت میں کتر بیونت اور گھٹ بڑھ کرکے ایک ایسی نئی بھاشا بنائی جس کی بناوٹ میں دیس دیس کی بولیوں اور لٹریچر کا کچھ نہ کچھ روپ ملا ہوا ہے اور یہی ایسی بولی ہے جس سے پورب کا سرا پچھم سے اور اتر کا دکھن سے مل ملا کر اپنے جی کی چھپی ہوئی بات ایک دوسرے سے کہہ سکتا ہے۔

جو لوگ اردو کو اکیلے مسلمانوں ہی کی بولی کہنے پر اڑے ہوتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے اردو تو انہی جگہوں کی بھاشا ہو سکتی ہے جہاں ہندوؤں کی بہتات اور ریل پیل ہے۔ مسلمانوں کی جہاں جہاں بہتات ہے وہ سندھ، سرحد، پنجاب، کشمیر، بنگال، یہی جگہیں ہیں جو الگ الگ اپنی بولیاں رکھتی ہیں جیسے بنگال کی بنگالی، کشمیر کی کشمیری، سندھ کی سندھی، پنجاب کی پنجابی اور سرحد کی پشتو۔ ان سب بولیوں کے ہوتے ساتے وہاں کے جو اردو بول رہے ہیں اور اُسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اردو کو وہ دیس کے ایکے کا بندھن سمجھ کے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ اپنی اپنی جگہوں کی بولیاں ہوتے ساتے اسے کبھی منہ بھی نہ لگاتے۔

کہنے والے دکھاوے کے لئے یوں چاہے کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ پر جی ہی جی میں وہ بھی یہی مانتے ہیں۔ اب یہ دیس کسی ایک کی گھتی نہیں۔ باہر والے جہاں جہاں کے جتھے بھی یہاں آ آ کے رہ پڑے اور ایسے بس بسا گئے جنہیں اب یہاں سے نکلنے اور کہیں اور جا کر رہنے بسنے کا بھولے سے بھی کبھی دھیان تک نہیں آتا۔ وہ اس سے پہلے چاہے کہیں کے بھی کیوں نہوں۔ اب سب کے سب یہیں کے ہیں اور ہندوستان ہی ان سب کا جنم بھوم ہے۔ جیسے سبھوں کا ایک ہی جنم بھوم ہے۔ ایسے ہی ان سب کی بولی بھی ایک ہی ہے جو پورے دیس میں پھیلی ہوئی ہے۔

مدراس اور بمبئی میں ہندی پرچار کیلئے سنسکرت بولوں کی بھرمار کرنے کا راگ الاپنے والوں نے کبھی ٹھنڈے جی سے یہ بھی سوچا۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ مدراس اور دکھن کی بولیوں کا سنسکرت سے بھلا کیا لگاؤ۔ جو سرگم بھری جا رہی ہے یہ کبھی اس راگنی کی نہیں ہو سکتی۔ مدراس کے وہ ہندو جو برہمن نہیں، ہندی کے پرچھاواں پڑنے سے ڈرے جاتے ہیں اور اسے سیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ کیوں؟ انہیں اس بولی کی آڑ میں اپنی بھاشا، اپنے کلچر اور اپنے لٹریچر کا ستیاناس ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور وہ اپنا بنا بنایا گھر اپنے سامنے گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا مہاراشٹر، گجرات، مدراس میں سمجھے جانے کے لئے ہندوستانی میں سنسکرت بولوں کی ریل پیل جتنی جی چاہے کیجئے، پر اسی کے ساتھ ساتھ سندھ، سرحد، کشمیر، پنجاب، میں بھی سمجھے جانے کے لئے سندھی، پشتو، کشمیری، فارسی، عربی بولوں کی بھرمار سے نہ چوکیئے۔ تول کے باٹ ادھر ادھر دونوں جگہ ایک ہی سے ہونے چاہئیں۔ کہیں کی تول جھکتی ہوئی اور کہیں ڈنڈی مارنا ایسی تول تو ٹھیک نہیں۔

نئی ہندی کے پرچاری اپنی بات کی پچ کرنے کی دھن میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نئی نئی باتیں تو نکالتے رہتے ہیں۔ پر وہ ہوتی ہیں ایسی انمل، بے تکی اور بے جوڑ جن میں کوئی تک ہی نہیں۔ کہا جا رہا ہے دیس کی بڑی جگہوں کی بھاشا اردو ہے اور گاؤں کی ہندی۔ گاؤں میں رہنے والوں کی بہتات نگروں میں بسنے والوں سے بہت آگے ہے۔ اس لئے دیس کے پورے نگروں میں بھی ہندی ہی کو بڑھانا اور پھیلانا چاہیئے۔ نہ سوچنا نہ سمجھنا جو منہ میں آیا کہہ دینا یہ کون سی سمجھ کی بات ہے۔ سنسار میں ایسا کونسا دیس ہے جس کے نگروں اور گاؤں کی بولیاں ایک سی ہوں۔ بڑی جگہوں میں رہنے والوں کی باتیں ان کے رہنے سہنے اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ، ان کے میل جول کا ڈھچر، ان کی بہت سی اور اور باتیں گاؤں والوں سے الگ ہوا کرتی ہیں اور ان ہی سے

ایک نگر ایک گاؤں سے بات بات میں کھلّم کھلّا الگ دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں جگہوں کی بولیوں میں جیسے پہلے بڑا پورا اَل بل رہا ایسے ہی اب بھی ہے اور آگے بھی یونہی رہے گا۔

اور جو کسی دباؤ و باؤ سے گاؤں کی بولی کو کسی نگر کے گلے منڈھ بھی دیا جاتے تو جب بھی یہ اُبال آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈھائی دن میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ دکھائی دینے لگے گا۔ پھر دیس کے پورے گاؤں کی کوئی ایک ہندی بولی نہیں۔ ایک جگہ کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ۔ جگہ جگہ تھوڑے تھوڑے اَل بل سے بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ یہ نہ کھل سکا ان سب میں سے کس جگہ بولی کو دیس بھاشا کی کسوٹی بنانا ٹھیک ہوگا۔ بھاشا کو مٹی کا تھوا سمجھ لینا بھی ٹھیک نہیں جو ایک ہی جگہ پڑا رہے اور وہاں سے ہل نہ سکے۔ بڑھنے والی بولی کہیں ایک جگہ ٹک سکتی ہے۔ اس کے لئے رُکنا اور ٹھکنا مرنا، اور چلنا جینا ہے۔ دیکھ لیجے سنسکرت کا ٹکاؤ اور ٹھیراؤ اس کا گلا گھونٹ کے رہا۔ پھُولنے پھلنے والی بولی کی چلت پھرت آپ ہی آپ ہوا کرتی ہے۔ جو کسی بھاشا بھی ہو وہ سنسار کے ہاتھ کی اُلٹ پلٹ سے بچ نہیں سکتی اور جو کوئی بچ بچا گئی تو سمجھ لیجے وہ اپنے جینے کے دن پورے کر چکی، آج نہیں تو کل مٹ مٹا کے رہ جائے گی۔ سنسار ادھر سے تبھی ہاتھ کھینچتا ہے، جب دیکھتا ہے اب اس میں دوڑ کی سکت نہیں اور ستانے کیلئے ٹھیرنا چاہتی ہے۔ تو بھاشا اور بولی چلتی پھرتی چھاؤں اور بہتا ہوا پانی ہے۔ چھاؤں تو کسی کے روکے رُک ہی نہیں سکتی۔ پانی رُک سکتا ہے، پر ادھر رُکا اور باس آنے لگی۔

دودھ پیتے لڑکے بالوں کے فوٹو انہی کے پندرہ، پچیس، پینتیس برس کے فوٹوؤں سے ملا کے دیکھئے تو بڑا اَل بل پائیے گا۔ اس سے بڑھکر بولیوں میں آپ دیکھیں گے جب ان کے پہلے پہل کے ڈھچر کو انہی کے رسان رسان آگے بڑھنے اور بڑھ بڑھا کے پھیلتے چلے جانے کی لگاتار گھٹ بڑھ اور اَل بل سے ملایا جائے۔ رامائن کی ہندی، پدماوت والے ملک محمد جائسی کی ہندی، کبیر کی ہندی اور آج کل کی ہندی۔ ان سب کی ہندی کی چندی دیکھنا ہو تو سبھوں کو آمنے سامنے رکھکر دیکھئے۔ گھڑی بھر میں یہ پورا اُتار چڑھاؤ آگے آجائے گا۔ ایسے ہی بیجاپور اور گولکنڈے کی اُردو، وَلی اور ہاشم علی کی اُردو، میرؔ اور سوداؔ کی اُردو، آتشؔ اور ناسخؔ کی اُردو، امیرؔ اور داغؔ کی اُردو اور آج کل کی اُردو ان چھوں کڑیوں کا اَل بل جانچ پڑتال کرنے سے چھپ نہیں سکتا۔ پہلے پہل کا انگھڑپن، آگے بڑھکر بھدیسلے پن میں یونہی سا گھٹاؤ، ہوتے ہوتے اس گھٹاؤ کا بڑھاؤ اور پھر رسان رسان انگھڑپن گھٹ کر بولی کا کچھ کچھ اُبھار، سدھار اور نکھار ایک ایک کر کے یہ سب باتیں سامنے آجائیں گی۔

کسی بھاشا اور بولی کی جانچ "چلن" سے کی جاتی ہے۔ بولی اس کسوٹی پر پوری اُترے تو ٹھیک۔ نہیں تو اس کا کوئی ٹھیک ٹھور نہیں۔ چلن کیا ہے؟ جس ڈھنگ سے کوئی بھاشا بولی اور لکھی جا رہی ہو۔ جہاں کی وہ ہے وہاں کے چھوٹے بڑے اسے جیسے بولتے چالتے ہوں، یہی بول چال اور لکھنے کا ڈھچر "چلن"، کہلاتا ہے۔ اسے ڈکشنریوں میں نہ ڈھونڈئیے، یہ گھروں، گلیوں، سڑکوں پر ملتا ہے۔ اس کسوٹی پر اُردو کو کسئے اور دیکھئے اس کے جتنے بدیسی بول رات دن ہندو مسلمان بے جھجک بولتے اور سمجھتے ہیں وہ سب کے سب چلن کے بندھن سے بندھے ہوتے ہیں اور ان میں کا ایک بول بھی ٹکسال باہر کا نہیں۔ تو ان کی چھوٹی سی چھوٹی لکیر بھی مٹائی اور نکالی نہیں جا سکتی۔ اس سے ہٹ کر دوسری بولیوں کی لکھتیں جب اُردو کے سانچے میں ڈھالنی ہوں اور اس ڈھالنے میں نئے نئے بول ڈھونڈنا پڑیں تو اس کے لئے بولیوں کے پرکھنے والے اور بولوں کی ناپ تول کے رسیا سوچ بچار کر کے اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں۔ بنی بنائی بولی میں سے گھلے ملے بول نکال نکال کے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کی دُھن میں لگے رہنا سمجھ کا پھیر اور اسی پھیر کا یہ اندھیر ہے جو گنتی کے لوگوں کو چھوڑ کر اور جسے دیکھئے وہ ایسی ہی بے ٹھکانے کی بے سُری سرگم بھرنے کو بڑی بات سمجھ رہا ہے۔

جیسے پانی کے بہاؤ میں گھاس پھوس کے ساتھ بڑے بڑے پیڑ بھی اُکھڑ کے بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی دیس کی بھیڑ چال میں ملنے کے لئے اچھے اچھے سمجھ والے بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بھلا مسز سروجنی نائڈو جو بہت اچھی اُردو جانتی ہیں اور ہندی نہیں جانتیں اور ہندی کا نہ جاننا یہ آپ مانتی ہیں۔ ان کی لکھت کا یہ ٹکڑا کہیں دُہرایا جا چکا ہے۔

"اُن احسانات کو یاد کریں جو اسلام نے ہماری زبان اور لٹریچر کے ساتھ کیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی پیاری زبان (اُردو) بخشی ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک غیر فانی یادگار ہے۔ ہندوستان کے جس حصے میں چلے جاؤ تم قومی اتحاد کی یہ یادگار کسی نہ کسی حالت میں ضرور پاؤ گے"

(اخبار وکیل ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۱۸ء)

یہ پھر دیکھکر "دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا" کے آٹھویں کانووکیشن میں اُنہوں نے جو اسپیچ دی اسے پڑھئے تو آپ بھونچکا ہو کے رہ جائیں گے۔

آج دیس کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں بھی جس بولی کا پتا تک نہیں یہ اسی پر ریجھی ہوتی ہیں اور اسی کے پرچار کی دھن میں یہ کہتی ہیں:

"میں نے ٹھان لیا کہ آج میں اس زبان میں بولوں گی جس میں کبیر، تلسی، میرا نے گایا ہے۔"

ان کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بڑا بوڑھا دودھ پیتے بالکوں کی سی غوں غاں کرے اور انہی کے سے ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کبیر کو پیچھے چھوڑ کر سنسار کتنا آگے بڑھ چکا۔ اس کی بولی پر آج بھی رال ٹپکی پڑتی ہے تو اسے منہ لگانے کے لئے بڑھتے ہوئے سنسار کو اتنا پیچھے دھکیل دیجے جو کبیر کی سانس لینے کی گھڑیاں سامنے آجائیں۔ جو بات بھی ہو اس کے لئے کوئی نہ کوئی الگ جگہ ہوا کرتی ہے اور اسی جگہ میں اس کا اچھا پن بھلا لگتا ہے۔ پرانی بولی بولنے سے پہلے پرانا سماں بھی پلٹا کے لے آنا چاہئے۔ نہیں تو بات بے تکی اور بے جوڑ سی ہو کر رہ جائیگی۔ ہے یہ۔ بات کی پچ سمجھ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور پٹی بندھ چکنے پر پھر دیکھنا بھالنا کیسا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔

یہی دھارا بڑوں بڑوں کو بہائے لئے جا رہا ہے اور جو الگ تھلگ تھے وہ بھی انہی کی دیکھا دیکھی کود پھاند رہے ہیں۔ پر سب کے سب ایسے نہیں۔ انہی ہندوؤں میں سے جو سوجھ بوجھ کے پتلے اور بھاری بھر کم لوگ ہیں، وہ ادھم مچانے والوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور ان کی چیخم چاخ کو کان دھر کے بھی نہیں سنتے۔ وہ پہلے ہی جو سچی بات تھی اسے جانچ پرتال کے دیکھ بھال چکے اور سمجھ گئے یہ جو کچھ ہو رہا ہے سدھارنے کیلئے نہیں سب بگاڑنے کے لئے ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے بڑے بوڑھوں کی بنائی ہوئی بولی کا ستیاناس کرنا یہ نہیں چاہتے۔ یہ اپنی بنی بنائی بولی کو چھاتی سے لگا کے رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے چپ چاپ سب سے الگ تھلگ رہنے کو اچھا سمجھتے اور جب کوئی ایسی گھڑی ہاتھ آجاتی ہے جس میں جی کی بھڑاس نکل سکے تو پھر یہ نہیں چوکتے اور بے جھجک فرّاٹے بھرتے ہوئے سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

مسز سروجنی نائیڈو کا دیس کی بھیڑ چال میں مل کے الٹی گنگا بہانا ابھی آپ دیکھ چکے، اس کے ساتھ ہی سرتیج بہادر سپرو کا بھاری بھرکم پن اور انکی سوجھ بوجھ بھی دیکھ لیجے۔ ۲۵ راگست ۱۹۴۵ء کو سری نگر کے ایس۔ پی کالج میں "چھند سبھا" جمی۔ اس کے پنچ یہی بنائے گئے۔ اس سبھا میں سرسپرو نے جو کچھ کہا اور جس ڈھب سے کہا اس کا ایک ایک بول انمول ہے:-

"میں ایک ہندو کی حیثیت سے بے تامل کہتا ہوں کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور صرف اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے۔ آج زبانوں کے بارے میں سخت انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی زبان پشاور سے لیکر سی۔ پی تک اور حلقۂ بمبئی کے حصوں میں بھی بھی جا سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے۔ میں اس نظریے کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

اگر خود مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اردو ہماری زبان ہے تو میں اُن کے اس دعوے کی تردید کرتا ہوں۔ کیونکہ زبان اردو بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہندو اس زبان سے نفرت کریں۔ ہندوستانی کی اصطلاح نے اس مسئلے کو حل کرنے میں اور مشکل پیدا کر دی ہے۔ درحقیقت ہندوستانی ہندوستان کی کوئی زبان نہیں ہے۔ تامل اور تلگو بھی ہندوستانی زبانیں کہلا سکتی ہیں۔ اگر ہندوستانی سے مراد وہ زبان ہے جو آج سے پچاس سال پہلے دہلی میں بولی جاتی تھی یا آج کل دہلی میں مروج ہے تو میں اسے تسلیم کر سکتا ہوں۔

اردو زبان میں بے شمار ایسے الفاظ شامل ہیں جو فارسی، عربی یا سنسکرت سے لئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے الفاظ کو جو اردو کا جزو بن چکے ہیں محض اس لئے زبان سے خارج کر دینا معقولیت نہیں ہے کہ ان کا ماخذ عربی، فارسی یا سنسکرت ہے۔ اسی طرح اردو میں مزید عربی، فارسی الفاظ ٹھونس کر اسے مشکل بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس بات پر کامل یقین ہے کہ اردو ایک ایسا مشترکہ ورثہ ہے جو ہمیں اپنے آبا و اجداد سے ملا ہے اور جسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مسلمان یہ دعوےٰ کریں کہ یہ صرف ہماری زبان ہے تو ہندو یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ میں ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کرتا کہ ہماری مادری زبان اردو ہے۔ وہ رشتہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو جوڑ سکتا ہے صرف اردو زبان کا رشتہ ہو سکتا ہے اور اسے توڑنا گناہ کے مترادف ہے۔" (باقی۔ باقی)

سیّد ابوالقاسم سرور

باقیاتِ فانی

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غمگسار تھا نہ رہا

آ، کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا نہ رہا

اُنکی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی اُمّیدوار تھا نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کبتک
آہ کا اعتبار تھا نہ رہا

کچھ زمانہ کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغل فصلِ بہار تھا نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا

مہرباں یہ مزارِ فانیؔ ہے
آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

فانی بدایونی

حُسن کی قیمت

کہسار پر سکوت مسلط تھا۔ روح فرسا سکوت! بن کے سبزہ پوش بھی خاموش اور وادیوں کے نوافروش بھی خاموش۔ نالے میں برف آئینہ کی طرح چمک رہی تھی، اور میں اسی برف کے کنارے بیٹھا قدرت کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ برف پوش چوٹیوں پر شفق کی لالی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ساقی کہسار نے شام کی مینا میں مے گلرنگ بھر رکھی ہے۔ ڈھلوانوں اور گھاٹیوں پر رنگ رنگ کے پھول اور بن کے درختوں کی ہریاول دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ شعر آتا تھا کہ ؎

سُرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

میرا راہبر احمد جو، جو اسی دیار کا رہنے والا ایک بوڑھا زمیندار تھا، ایک طرف بیٹھا چائے کا پانی گرم کر رہا تھا۔ ٹفن باسکٹ میں کچھ آم تھے میں نے اپنے شکاری چاقو سے برف میں ایک گڑھا کھودا اور آم اس میں ڈال کر برف سے ڈھانپ دئے۔ مجھے آج پہلی بار برف قدرتی حالت میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بوڑھا احمد جو تو اپنے کام میں مشغول تھا، میں کوٹ اُتار کر برف پر چلنے لگا۔ دو قدم چلتا تھا کہ پاؤں پھسل جاتا، میں نے بوٹ اتار کر کنارے کی طرف پھینک دئے۔ اور برف پر چلنے لگا، لیکن دس پانچ قدم چلنے سے ہی پاؤں شل ہونے لگے۔ اب جرابیں بھی جو بھیگ چکی تھیں میں نے اتار پھینکیں۔ بوڑھے احمد جو نے وہیں سے آواز دی "پاؤں سوج جائیگا حضرت!"

بیشتر اس کے کہ میں کچھ جواب دوں میرا پاؤں ایسا پھسلا کہ چوپٹ گرا۔ ساتھ ہی ایک قہقہے کی آواز آئی۔ ایک نوجوان عورت کنارے پر کھڑی خوب زور زور سے ہنس رہی تھی۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ اور سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا کنارے پر آ بیٹھا۔

بوڑھے نے بیٹھے بیٹھے آواز دی "چوٹ تو نہیں آئی حضرت؟"

"نہیں!" میں نے کہا "چائے تیار ہو تو لے آؤ"

وہی عورت میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"یہ لو دو روپے! میرا بچہ مجھے دیدو"

لیکن ہاتھ خالی تھا۔ اب میں نے اس کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پیکر حُسن سامنے کھڑا ہے۔ لباس تو پھٹا پرانا تھا۔ اور جوبن اور حُسن کی بہار بھی لٹی لٹی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی نزاکت گل کی پتی کی لطافت کو شرماتی تھی۔ سیاہ اور خوبصورت بال جو شاخ سنبل کی طرح کمر تک لٹکتے تھے، کچھ اُلجھے اُلجھے سے تھے لیکن اب بھی کسی اُجڑی بہار کا پتہ دیتے تھے۔ اس کی سیاہ اور مست آنکھوں پر چشم آہو کا دھوکا ہوتا تھا۔ پاؤں اگرچہ خاک آلودہ تھے لیکن ساق نہیں کی نزاکت نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ صورتِ حال صاف کہہ رہی تھی کہ :- ع

حُسن کی صبح دل افروز کی اک شام ہوں میں

"لیتے نہیں!" اُس نے پھر ہاتھ بڑھا کر کہا "اللہ قسم! دو روپے ہیں"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نادرہ!" وہ بولی "بھول گئے کیا۔ یہ میرے حُسن کی قیمت ہے۔ اللہ قسم! دو روپے ہی ملے، تو نے ہی تو دئے تھے"

بوڑھے احمد جو نے آواز دی "دیوانی ہے حضرت!"

"جھوٹا ہے حضرت!" نادرہ نے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بس دو روپے ملے، اللہ قسم دو روپے"

پھر میری طرف دیکھ کر "میرا بچہ بیمار تھا۔ تم نے دو روپے حُسن کے دام دئے۔ میں نے بچے کی خاطر اپنا حُسن بیچ ڈالا۔ اللہ قسم! بس ایک بار"

"کون لے گیا تمہارا بچہ؟" میں نے پوچھا۔

"تم!" وہ ذرا گھور کر بولی "تم نے کہا چاندی کا سکہ دوں گا۔ یہ لو دو روپے، میرا بچہ مجھے دیدو"

میں خاموش بیٹھا اس پگلی کی طرف دیکھ رہا تھا اور قدرت کی نیرنگیوں پر حیران تھا۔ یہ حُسن اور یہ بے چارگی! تیرے بھید تو ہی جانے میرے مولا۔

احمد جو چائے بنا لایا۔

"نادرہ!" میں نے کہا "بیٹھ جاؤ چائے پی لو"

"تم میرا بچہ دو" وہ تیوری چڑھا کر بولی "اپنا ٹکا لو میرا بچہ دو"

"میرے پاس تمہارا بچہ نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہے کیوں نہیں" وہ بولی "ابھی تمہارے ساتھ برف پر کھیل رہا تھا"

بوڑھے احمد جو نے اب کشمیری زبان میں اس سے کچھ سختی کے لہجہ میں کہا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

"پگلی حضرت!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کب سے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑی بپتا پڑی اس پر۔" بوڑھا بولا۔ "دیوانی ہوگئی بے چاری۔"

"تم جانتے ہو اِسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں حضرت!" احمد جو نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "سب جانتے ہیں اسے۔"

"کوئی ولی وارث نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ حضرت!" احمد جو نے جواب دیا۔

مَیں چائے پی کر وہیں لیٹ گیا۔ اور اس بدنصیب نادرہ کی حالت پر غور کرنے لگا جو اپنی زبان سے وہ الفاظ کہہ رہی تھی جو اُسے ایک دُنیا میں ذلیل اور رُسوا کرنے والے تھے، گناہ کا اقبال اور بیباکی سے۔ لیکن وہ غریب تو اس وقت معذور تھی۔ بالکل معذور۔ اُسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہہ کیا رہی ہے۔ بچے کی خاطر عصمت بھینٹ چڑھا دی۔ استغفراللہ! ہائے ری ماما۔ کس قدر خوفناک الفاظ تھے۔ میرا خیال تھا کہ بوڑھا احمد جو خود ہی مجھ سے یہ قصہ کہے گا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ خاموشی پسند تھا۔ الگ بیٹھا پیالیاں صاف کر رہا تھا۔

"یہ کام کا کاغذ حضرت!" اُس نے کاغذ بیٹھے بیٹھے مجھے دکھا کر پوچھا۔

"دکھاؤ تو!" میں نے کہا۔

وہ کاغذ میرے پاس لے آیا۔ یہ نیلے رنگ کا ایک نوٹ پیپر تھا اور اس پر یہ شعر لکھا تھا ؎

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ بردآں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

اور لکھا ہوا بھی میرے قلم کا۔ اس وقت اور اس فضا میں جب اس بدنصیب نادرہ کی مظلوم صورت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ علامہ مرحوم کے اس شعر نے میرے دل کے سکون و قرار کو درہم برہم کر دیا۔ لیکن یہ حالت کچھ زیادہ دیر نہیں رہی۔ کیونکہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے خیالات کی دُنیا یکلخت بدل دی۔

احمد جو جب سب سامان ٹوکری میں ڈال چکا تو میرے پاس آکر بولا۔ "وہ اُگے گا حضرت!"

"کیا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہی۔" بوڑھا بولا۔ "جو آپ نے برف میں دبایا۔ جاڑے بعد کونپل پھوٹے گا۔"

"اوہو!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "آم؟"

"کیا مالم۔" (معلوم) اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ!" میں نے کہا۔ "نکال لاؤ۔"

احمد جو سب آم نکال لایا۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے کبھی آم کھایا؟"

"نہیں!" اُس نے سر ہلا کر کہا۔ "آپکے ملک کا پھل حضرت؟"

"ہاں!" میں نے ایک آم اُسے دیکر کہا۔ "کھاؤ۔"

آم تو اُس نے مجھ سے لے لیا لیکن کھانے کی بجائے جیب میں ڈال لیا۔

"کھالو!" میں نے کہا۔ "بہت میٹھا ہے۔"

"گھر چھوٹی بچی حضرت!" بوڑھے نے ذرا مسکرا کر کہا۔ "اسکو دیگا۔"

اولاد کی بھی کیا محبت ہوتی ہے۔ اس شخص نے عمر بھر آم کھایا نہیں اور جب اُسے ملا ہے تو بچی کی محبت کھانے نہیں دیتی۔

مَیں نے دو تین آم اور اُسے دئے اور کہا۔ "ایک تم بھی کھاؤ۔"

چونکہ میں نے ابھی تک اُس کے سامنے آم نہیں کھایا تھا اس لئے وہ آم کو بھی بالکل ایک سیب یا ناسپاتی کی طرح دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ یہ دیکھکر مجھے ہنسی آگئی۔ اور وادیٔ کشمیر کی اس سیاہ چشم حسینہ کی بیکسی کے خیال نے جو اثر دل پر پیدا کر رکھا تھا زائل ہوگیا۔

مغرب کی نماز میں نے وہیں برف کے کنارے ادا کی۔ بوڑھے احمد جو نے ٹفن باسکٹ پیٹھ پر باندھی اور میں نے بندوق سنبھالی اور منزل کی طرف چلدئے۔ میرا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا۔ ڈاک بنگلہ لب سڑک تھا۔ اب چونکہ اُترائی تھی اس لئے قدم جلدی اُٹھتا۔ فارسٹ روڈ یوں بھی ہموار تھی۔ کچھ خوف تھا تو کسی بگڑے دل ریچھ کا تھا۔ جو جنگل سے نکلکر ذرا تفریح کے لئے سڑک پر آبیٹھا ہو۔ اس لئے بوڑھا راہبر گاہے گاہے اپنے وطن کا کوئی گیت اُونچی آواز سے گانے لگتا۔

بہرکیف سفر خیریت سے ختم ہوا۔ میں نے آتے ہی گرم پانی سے غسل کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد برآمدے میں آبیٹھا۔ چاند قلۂ کوہ پر پوری آب و تاب سے جلوہ افروز تھا۔ گرد و کی ہر چیز چاندی کا لباس پہنے تھی ـــ

ڈاک بنگلے سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر بازار تھا سڑک کے دونوں کناروں پر چار پانچ دکانیں تھیں۔ اس وقت وہاں کوئی مطرب سارنگی کے ساتھ گا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز تھی اور بے سری تانیں لیکن آواز میں سوز تھا۔ اور مجھے گانا سننے کا شوق۔ میں نے چوکیدار کو بھیجکر اُسے بلوایا۔ بوڑھا آدمی تھا اور کہیں پنجاب کا رہنے والا تھا۔

"حضور کیا حکم ہے ؟" اُس نے مجھے سلام کر کے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گویا ہوں جناب !" بوڑھے نے جواب دیا۔

"گانا وانا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"روٹی مل جاتی ہے" بوڑھے مطرب نے جوابدیا۔

"وہی جو بازار میں کھڑے گا رہے تھے وہی سُنا دو" میں نے کہا۔

وہ گانے لگا ؎

مناظرِ غم گذر رہے ہیں حجابِ عالم اُٹھا رہا ہوں
سکوت ہے شامِ بیکسی کا کھڑا ہوا مُسکرا رہا ہوں

تلفظ نہایت غلط تھا۔ دُور سے آواز میں جو ایک دلکشی سی معلوم ہوتی تھی وہ بھی اب کرختگی میں بدل گئی تھی۔ لیکن شعر کا ایک ایک حرف سوز سے معمور تھا ؎

اُمیدِ غم سے بدل چکی ہے نصیب پر مُسکرا رہا ہوں
سُنا چکا ہوں انہیں فسانہ اب اپنے دل کو سُنا رہا ہوں

بس یہی دو شعر یاد تھے، دو چار بار جب وہ الاپ چکا تو میں نے پوچھا

"کہاں کے رہنے والے ہو تم ؟"

"پنجابی ہوں جناب !"

"ادھر کیسے آنکلے ؟"

"بھیک مانگتا آگیا !"

"کب سے آئے ہوئے ہو ؟"

"گھنے روز ہوگئے"

"کبھی بھلے دن بھی دیکھے ؟" میں نے پوچھا۔

"بھیک مانگتے عمر گذر گئی" بوڑھے مطرب نے جواب دیا۔

"بیوی بچے بھی تھے ؟"

"ہاں !" وہ بولا "بیاہ تو کیا تھا !"

"پھر بیوی کیا ہوئی ؟"

"مر گئی !"

"کتنا عرصہ ہوا ؟"

"کوئی پانچ سات سال !"

"یاد تو آتی ہوگی ؟"

"جناب !" وہ ذرا فلسفیانہ انداز سے بولا "مفلسی سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے بھیک مانگ رہا ہوں اور بھیک مانگتے مانگتے مر جاؤں گا"

کتنے دلخراش الفاظ تھے۔ توبہ ہے ! کیا زندگی ہے۔ ساری عمر بھیک گذر گئی میں نے کچھ دے کر اُسے رخصت کیا۔ دس بیس قدم جاکر اُس نے پھر وہی آواز نکالی :-

"مناظرِ غم گذر گئے ہیں... اور... کھڑا ہوا مسکرا رہا ہوں"

غالباً اس غریب کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہی دو شعر اُس کی زندگی کے ترجمان ہیں۔

کہسار کی ہوا نے جو غالباً برف سے دامن بھگو کر آتی تھی فضا میں خُنکی پیدا کر دی تھی۔ میں کمبل اوڑھکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد احمد جو آیا اور بولا "پاؤں داب دوں۔ آج تھک گیا آپ !"

"بیٹھ جاؤ" میں نے کہا۔

وہ پلنگ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ نادرہ کون ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"پگلی ہے بے چاری !" احمد جو نے جواب دیا۔ "بڑی بپتا پڑی اس پر"

"کیسی بپتا ؟" میں نے پوچھا۔

"سُنئے حضرت !" احمد جو نے اپنی لوئی (کمبل) زانو کے نیچے دبا کر کہا۔

"اس جنگل کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہاں صمد و بٹ ایک غریب زمیندار رہتا تھا۔ اپنی تو زمین تھی نہیں۔ گاؤں میں ایک شخص کے یہاں کھیتی باڑی کا کام کرتا۔ لیکن جاڑے پڑتے ہی محنت مزدوری کے لئے پنجاب کی طرف نکل جاتا۔ صمد و اور اُس کی بیوی دونوں بڑے نیک دل تھے شادی کے بہت سال بعد اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا کی۔ بیٹی کا نام انہوں نے نادرہ رکھا اور قدرت نے نادرہ کو وہ حُسن و نزاکت عطا کی کہ باید و شاید۔ کوئی اُسے حُسن کی تصویر کہتا، کوئی پربت کی دیوی سمجھتا، کوئی بن کی رانی اور کوئی چاند کی بیٹی۔ صمد و کے پڑوس میں ایک غریب لکڑہارا بھی رہتا تھا۔ جس روز صمد و کے گھر لڑکی ہوئی اُس کے گھر ایک لڑکا ہوا۔ لکڑہارے نے بیٹے کا نام جبار رکھا۔ قضائے الٰہی سے کچھ روز بعد لکڑہارا اور اُس کی بیوی مر گئے۔ جبار تن تنہا رہ گیا۔ صمد و بٹ ترس کھا کر اُسے اپنے پاس لے آیا۔ وقت گذرتا گیا اور بچے پروان چڑھتے گئے۔ جس طرح نادرہ کو قدرت نے

دولتِ حُسن مِلی تھی اسی طرح جبّار کو قوّت اور حوصلہ عطا ہوا تھا۔ جبّار بڑا منچلا اور نڈر تھا۔ دونوں ابھی سنِ شعور کو پہونچے ہی تھے کہ گاؤں میں ہیضہ پھوٹا۔ صمد اور اس کی بیوی دو ایک روز کے وقفے کے بعد آگے پیچھے عدم کو سدھارے۔ دونوں یتیم اکیلے رہ گئے۔ ذاتِ باری کے سوا اب کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ لیکن جبّار ایسا حوصلہ مند لڑکا ہمّت ہارنے والا نہ تھا۔ وہ ہر روز جنگل سے لکڑی کاٹ کر اور بازار میں جو لب سڑک تھا ایک نانبائی کے پاس روٹی کے عوض فروخت کر دیتا۔ نادرہ اور جبّار دونوں کی اسی پر گذران تھی۔

نادرہ کے پاس لے دے کر صرف ایک گائے تھی۔ جب گائے نے بچھڑا دیا اور دودھ دینے لگی تو نادرہ کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ اب وہ بھی جبّار کے ہمراہ بازار دودھ بیچنے آتی۔ بازار والے بڑی شوق بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا کرتے۔ جب لکڑیاں اور دودھ فروخت ہو جاتا تو دونوں مزے مزے کے گیت گاتے گاؤں کو واپس چلے جاتے۔

کشمیر کا حُسن تو خیر ضرب المثل ہے لیکن نادرہ جوان ہو کر تو قیامت کا فتنہ ہی نکلی۔ نانبائی کی اس پر نظر تھی، قصاب کا جوان بیٹا دل میں اس کی تمنا لئے بیٹھا تھا۔ سرائے کا چوکیدار گوپال بچے والا تھا لیکن نادرہ کو جورو بنانے کا وہ بھی ارمان رکھتا تھا۔ اور جو کسی راہگذر کی نگاہ پڑ جاتی تو وہ سو سو بہانے سے اس سے باتیں کرتا۔ یہ باتیں جبّار کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ ایک دو بار قصاب کے بیٹے سے ہاتھا پائی تک نوبت پہونچ چکی تھی اور سرائے والے کو بھی اُس نے سرِ بازار دو چار بار بُرا بھلا کہا۔ آخر کچھ روز بعد اُن کے پیرنے دونوں کا نکاح کر دیا۔ اور وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

کوئی ایک سال کے بعد نادرہ کے ہاں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ بچّہ بھی ماں کی طرح خوبصورت تھا۔ بچّہ دو سال کا تھا کہ مُلک میں قحط پڑا۔ قحط کیا تھا ایک عذاب تھا۔ ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ گاؤں کی بساط ہی کیا تھی، وہ تباہی آئی کہ بس توبہ ہی بھلی۔ لوگ درختوں کے پتّے اُبال اُبال کھا گئے، جبّار سے گاؤں والوں کی بیچارگی دیکھی نہ گئی۔ اس وقت اس کے پاس تین گائیں تھیں۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں ذبح کر کے گاؤں والوں کو کھلا دیں۔ آپ جانیئے! راج کے قانون کے مطابق گائے ذبح کرنا ایک سنگین جُرم ہے۔ کچھ روز تک تو یہ راز چُھپا رہا، لیکن کسی نہ کسی طرح قصاب کے بیٹے کو جو اب باپ کی جگہ دُکان پر کام کرتا تھا، پتہ لگ گیا۔ محبت کے میدان میں جو اُس نے زک اُٹھائی تھی، اب اس کا انتقام لینے کا اُسے موقع ملا۔ اس کور باطن نے ڈاک بنگلے کے چوکیدار سے جو برہمن تھا، غمازی کر دی۔ جرم ثابت تھا حاکم نے تین سنگین جُرموں کی پاداش میں جبّار کو سات سال کیلئے جیل بھیج دیا۔ اور نادرہ غریب پھر بے یار و مددگار رہ گئی۔

کسی زمانے میں احمد جو گاؤں کا چوکیدار تھا۔ صمد مرحوم سے اُس کی خُوب بنتی تھی۔ صمد کی زندگی میں ہی احمد جو سرکار کا ملازم ہو کر گلگت چلا گیا۔ ایک مدّت کے بعد وطن اُس وقت لوٹا جب اُس کے گاؤں والوں میں سے اکثر مر کھپ گئے تھے۔ کچھ قحط کی مُصیبت سے گاؤں چھوڑ کر دیارِ اغیار میں سرگرداں تھے۔

نادرہ اپنا بچّہ گود میں لئے سڑک پر بیٹھی آنے جانے والوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔ احمد جو نے اُسے پہچان لیا اور اس کا حال سُنکر اُسے بہت افسوس ہوا۔ آخر احمد اور نادرہ دونوں سرکاری علاقے میں چلے آئے۔ لیکن گرم مُلک کی آب و ہوا احمد جو کو راس نہ آئی اور وہ بیمار ہو گیا۔ اب ہی نادرہ تو پردیس میں کون تھا جو اُس کی دستگیری کرتا۔ فاقوں کی ماری نادرہ اگرچہ ایک شاخِ خزاں رسیدہ کی مانند مُرجھائی ہوئی تھی تاہم گذشتہ رعنائی و زیبائی کی ایک ہلکی سی جھلک اب تک باقی تھی۔ وہ دن بھر کوچہ و بازار میں، اپنے اور اپنے بچّے کے لئے بھیک مانگتی تھی۔ کوئی دھتکار دیتا۔ کہیں سوکھی روکھی مل جاتی۔ کوئی اللہ والا بچّے کے لئے کٹوری بھر دودھ بھی دیدیتا۔ بُری بھلی زندگی تو کٹ رہی تھی لیکن اب ایک نئی مُصیبت یہ آئی کہ بچّہ بھی بیمار ہو گیا۔ اور مامتا کی ماری اس ننھی سی جان کی خاطر اس خوفناک کام کیلئے بھی آمادہ ہو گئی جو ایک عورت کو جیتے جی جہنّم میں جھونکدیتا ہے۔

شہروں میں جس طرح کھلّم کھلّا بدچلنی اور بداخلاقی کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں دیہات تقریبًا اس سے پاک ہوتے ہیں۔ مان لیا کہ دیہات کے رہنے والے تعلیم اور تہذیب سے کورے ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اخلاق اور چلن کا تعلق ہے وہ شہر والوں سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ ایک دُنیا نادرہ کے حُسن کی گاہک تھی لیکن آج تک اُس کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہونے پائی تھی۔ جن دنوں وہ دودھ بیچنے بازار آیا کرتی تھی اکثر بداخلاق لوگ اُسے طرح طرح کے للچاوے دیتے تھے لیکن اُسے اِن سیاہ باطنوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ اور جو کہیں کسی سے آنکھیں چار ہو بھی جاتیں تو وہ نفرت سے تھوک دیا کرتی۔

جبّار قید ہو گیا، اور وہ فاقے کرتے کرتے تنگ آ گئی۔ لیکن طبیعت پھر بھی گناہ کی طرف راغب نہ ہوئی۔ تنگی، مفلسی، بے چارگی، سبھی کچھ اس نے برداشت کیا لیکن آن اور عزّت پر حرف نہ آنے دیا۔ اور ہمیشہ گناہ کو گناہ ہی سمجھکر اُس سے بچتی رہی۔ لیکن جب بچّے کی جان پر بنی تو دُنیا نادرہ کی آنکھوں میں اندھیر ہونے لگی۔ بہت روز اُس نے خیراتی ہسپتال

میں علاج معالجہ کروایا۔ لیکن بچے کی حالت روز بروز خراب ہی ہوتی گئی۔ شہر میں کوئی وید تھا جو بچے کے علاج کے لئے دو روپے مانگتا تھا۔ نادرہ جو صبح سے شام تک دو چار پیسے جمع کرتی وہ بچے کی خوراک پر اُٹھ جاتے۔

شہر سے باہر ایک ٹوٹی پھوٹی باؤلی تھی، نادرہ اور احمد اسی جگہ رہتے تھے۔ نادرہ جو ٹکڑے مانگ کر لاتی دونوں کی اسی پر گذران تھی۔ ایک اوباش عموماً ادھر سے گذرا کرتا تھا۔ ایک روز نادرہ اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی رو رہی تھی۔ احمد جو کہیں مانگنے تانگنے گیا ہوا تھا۔ وہ بدمعاش جو اُدھر سے گذرا تو پاس آکر پوچھا "روتی کیوں ہو؟ روٹی نہیں ملی کیا؟" پھر جیب سے دو پیسے نکال کر "یہ لو!"

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں!" نادرہ نے روتے ہوئے کہا "مجھے رب کے واسطے دو روپے دو۔ رب بھلا کریگا"

"دو روپے" اُس نے ہنسکر کہا "کیا کرو گی"

"میرا بچہ بیمار ہے۔ اس کی دوا دو روپے میں آئیگی" نادرہ نے بڑی منت سے کہا "رحم کرو"

اس کمبخت نے جیب سے دو چمکتے ہوئے روپے نکالے اور آنکھ سے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہائے ری ماستا! دونوں کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ لیکن جب نادرہ واپس آئی تو بچہ موت کی آغوش میں تھا۔

نادرہ بچے کو گود میں لئے اُسے پیارے پیارے ناموں سے بُلا رہی تھی۔ کبھی گدگدیاں کرتی، کبھی سینے سے لگاتی۔ کبھی دو روپے اُچھال اُچھالکر خود بخود ہنسنے لگتی۔ اتنے میں احمد جو بھی آگیا۔ اور پاس بیٹھ کر بولا "نادرہ! ہوش کرو۔ بچہ تو مرگیا"

نادرہ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا اور قہقہہ مار کر کہا "نہیں! میرا بچہ اب نہیں مرسکتا۔ یہ دیکھو! یہ دو روپے میرے پاس ہیں۔ اب کی دوا لاؤں گی"

"یہ روپے کہاں سے ملے؟" احمد جو نے پوچھا۔

"یہ میرے حُسن کے دام ہیں" نادرہ نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔

"نادرہ!" احمد جو خوفزدہ ہو کر بولا "کیا کہہ رہی ہو ہوش کرو"

نادرہ نے ذرا غصیلی نگاہوں سے احمد جو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پھر یہ روپے آئے کہاں سے۔ خدا قسم! میں نے اپنے لال کی خاطر حُسن بیچا۔ اب اس کی دوا لاؤنگی۔ سُن لیا"

"بچہ مرگیا!" احمد جو نے کہا "اب صبر کرو نادرہ! توبہ کرو"

"مر کیسے گیا" نادرہ بولی "کس نے کہا تم سے؟"

"دیکھو!" احمد بولا "بولتا تو ہے نہیں"

"بولے کیسے؟" نادرہ بولی "دوا ملے گی تو بولے گا ——— وہ شخص جس نے مجھے روپے دیتے تھے، کہتا تھا بچے کو دوا ملے گی تو اُٹھکر کھیلے گا"

"وہ جھوٹا تھا پاجی!" احمد جو نے جواب دیا "نادرہ! تم نے بہت ظُلم کیا۔ توبہ کرو توبہ!"

"تم جھوٹے ہو!" نادرہ نے غصے سے کہا "پھر اُس نے مجھے روپے کیوں دیتے"

"وہ پاجی تھا بدذات" احمد جو نے تھوکتے ہوئے کہا۔

"نہیں! نہیں!" نادرہ بولی "اُسے گالی مت دو۔ اُس نے مجھے روپے دیتے۔ تم نے تو نہیں دیتے"

احمد جو بار بار "توبہ کرو نادرہ توبہ کرو" کہتا تھا۔ لیکن نادرہ اب ہوش میں نہ تھی۔

احمد جو نے کسی زمیندار سے کسّی لیکر وہیں ایک گڑھا کھودا اور نادرہ کے لال کو جس کی خاطر اُس نے اپنی عصمت بھینٹ چڑھائی تھی دفن کر دیا۔ جب بچہ آنکھوں سے اوجھل ہوا تو نادرہ کی حالت بہت یاس انگیز ہوگئی۔ وہ سارا سارا دن گلی کوچوں میں گھومتی اور ہر کسی سے یہی کہتی "یہ لو! یہ دو روپے تم واپس لے لو۔ یہ میرے حُسن کے دام ہیں۔ میرا بچہ مجھے دیدو"

احمد جو خود بیمار اور بیکار تھا۔ جب مُلک کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور لوگ واپس جانے لگے تو وہ بھی نادرہ کو ساتھ لیکر اپنے گاؤں میں واپس آگیا۔

لیکن نادرہ تو اب پاگل ہوچکی تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں دن بھر گھومتی اور جو کوئی ملتا اس سے یہی دو لفظ کہتی۔

"یہ لو! اپنے روپے لے لو۔ میرا بچہ مجھے دیدو۔ یہ میرے حُسن کے دام ہیں!"

ایم۔ اسلم

ریزۂ مینا بچاس بے مثل افسانوں کا مجموعہ۔ ... صفحات۔ اعلیٰ درجے کی کتابت وطباعت۔ کپڑے کی مضبوط جلد سُنہری ٹھپہ۔ ساقی کے مستقل خریداروں کیلئے قیمت صرف دو روپے۔ محصولڈاک مع رجسٹری آٹھ آنے۔

گدھا

ایک تاجر دوست کا بیان ہے کہ ایک کاروبار میں مجھے پانچ ہزار روپے نقد وصول ہونے تھے یا جیت میں آئے تھے۔ میں خوش اور مطمئن اپنے برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ یک بیک ایک نوجوان جوتشی یوں نازل ہوگیا جیسے آسمان سے ٹپک پڑا یا زمین نے اگل دیا۔ دیکھتے ہی میں نے روکھے پن سے کہا۔ "جوتشی جی معاف فرمائیے مجھے اس وقت نہ اپنا ماضی و مستقبل سننے کی خواہش ہے نہ ایک پیسہ آپ کی نذر کرنا پسند ہے۔ آپ حضرات نے مجھ سے کافی رقمیں جھٹی ہیں۔ ریس اور لاٹری میں منحوس اور مبارک نمبروں اور گھڑیوں کی قیمتیں کافی ادا کی ہیں مگر ایک میں بھی مجھے کبھی کامیابی نہ ہوئی۔"

جوتشی:۔ بابا آپ تو یہ غلط فرما رہے ہیں۔ آج ہی غیبی ہاتھ نے آپ پر بھاری کرپا کی ہے۔

میں:۔ اچھا تو آپ نے میری تازہ کامیابی کا پتہ لگا لیا ہے تو واضح رہے کہ اس معاملے میں میں نے کسی جوتشی سے مدد نہیں لی تھی۔

اتنے میں ایک اور بوڑھے جوتشی مہاراج نازل ہوگئے اور پہلے جوتشی کی طرف تیکھی نگاہ کرکے بولے "صاحب اس فریبی کے جال میں نہ پھنس جائیے گا۔ آج کل کسی کو آتا جاتا تو خاک نہیں، جسے دیکھئے چندن لگائے گیروا روپ دھارے، کاشی کا رام رام کا چھاپا گمچھا اوڑھے اور کھڑاؤں پہنے جوتشی کا بچہ بنا پھرتا ہے۔ بابو جی بھلا ہوا کہ میں سمے پر آگیا۔"

پہلا جوتشی:۔ مہاراج ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ بدھیمانوں کا یہ سبھاؤ نہیں ہوتا۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ میں مورکھ ہوں، اور آپ کے بدیا کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

میں:۔ سچ تو ہی یہ جاہل سہی آپ اپنے علم کا ثبوت دیجئے۔

دوسرا جوتشی:۔ بابو جی میں اصل بھرگو سمہیتا کے قانون پر کام کرتا ہوں اور میرا حکم کبھی غلط نہیں ہوتا۔ جانچ کیلئے ایک کاغذ پر کوئی سا عدد لکھ رکھئے میں بتا دونگا۔

میں کاغذ پنسل ڈھونڈنے لگا۔ جھٹ پہلے جوتشی نے جو میری کرسی کے پیچھے کھڑا تھا اپنے تھیلے میں سے ایک سادہ نوٹ بک اور پنسل نکال کر سامنے رکھدی۔ میں نے ایک سات۔ عددوں کا نمبر لکھا جس میں دو صفر شامل تھے۔ وہ ورق پھاڑ لیا اور مٹھی میں دبالیا۔ نوٹ بک پہلے جوتشی کو واپس کردی۔ دوسرے جوتشی نے چند منٹ خاموشی سے کچھ منتر پڑھے ایک نقش نکال کر حساب کیا اور صحیح نمبر بتا دیا۔ میں دل میں حیران ہوا مگر زبان سے کہا "یہ اتفاق ہے۔ اچھا پھر سہی۔"

پہلے جوتشی نے پھر وہی نوٹ بک اور پنسل دی اور اب کے میں نے بجائے عددوں کے لکھدیا "گدھا"۔ ورق پھر پھاڑ کر رکھ لیا اور نوٹ بک اور پنسل پہلے جوتشی کو واپس دی۔ دوسرے جوتشی نے پھر منتر پڑھکر اور نقش بچار کر کہدیا "اب کے آپنے کوئی عدد نہیں لکھا۔"

"تو کیا لکھا؟"

"بتاتا ہوں"۔ ایک منٹ سوچکر کہا "گدھا"۔

پہلا جوتشی دوسرے کے پاؤں پر گر گیا "مہاراج میں مان گیا۔ میں پیٹ کا نربل داس ہوں آپ بدیاوان گرو ہیں۔" اور جھولی اٹھا چلتا بنا۔ میں ایسا مرعوب ہوا کہ دس روپے کا نوٹ جوتشی جی کی نذر کیا۔ کہنے لگا۔ "میں کسی سے اپنے لئے کچھ مانگتا نہیں۔ آپ دیتے ہیں تو لے لیتا ہوں۔ ایک مندر کی تعمیر کے لئے کچھ روپے اکٹھا کر رہا ہوں یہ اس میں کام آئیگا۔" میں نے کہا "تو پانچ اور قبول کر لیجئے۔" وہ ایک ہفتے کے اندر ایک بڑی مالی منفعت کی بشارت دیکر رخصت ہوگیا۔

دوسرے روز میرے کارپرداز کا کلکتہ سے تار آیا کہ "چمڑے کا نرخ بالکل گر گیا ہے۔ دیوالہ کی خبر ہے۔"

جوتشی کی پیشینگوئی میرے دماغ پر مسلط تھی۔ مجھے اچنبھے کے ساتھ غصہ آیا۔ سیدھا دھرمشالہ گیا۔ وہاں جوتشی کا پتہ نہ تھا۔ میں ہر طرف متجسس نظر دوڑا رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک پرزہ پڑا تھا اس پر کچھ عدد کے نشان میری تحریر سے معلوم ہوتے۔ اٹھا کر دیکھا تو وہی نمبر تھا۔ کاربن سے منقش؛ اور کاغذ بھی اسی نوٹ بک کا تھا۔ اب سب کچھ صاف تھا۔ دونوں جوتشی ملے ہوتے تھے۔ پہلے نے میرے نمبر کو کاربن کے مٹنے سے پڑھکر کسی اشارے سے یا میری بیٹھ کے پیچھے سے دکھا کر دوسرے جوتشی کو آگاہ کر دیا تھا۔ میں سچ مچ گدھا بن گیا تھا۔

محمد مسلم؛

انکارِ غم و تہیۂ نشاط

دل خوش رکھیں گے غم کو نہ اَب مُنہ لگائیں گے
جو غم پڑے گا اُس کو خوشی سے اُٹھائیں گے

پیدا ہوئے تھے روتے ہوئے روتے ہی کٹی
باقی جو اَب رہی ہے ہنسی میں اُڑائیں گے

طغیانیوں میں گریہ کی ایک سَیل آب ہے
بہجائیں گے جو آپ یہ آنسو بہائیں گے

مارے غموں کے سُوکھ کے اچور ہو گئے
مارے خوشی کے دیکھنا پھر پھُول جائیں گے

غم سے زیادہ دُشمنِ جاں اور کون ہے
غم سے لڑیں گے دوست خوشی کو بنائیں گے

دیوارِ غم کی حسرتِ فانی پہ نیو ہے
ہم مار قہقہے اسے نیچا دکھائیں گے

کوہِ الم پہ برق زنِ خندہ ہے نشاط
ہنس ہنس کے اِس پہاڑ پہ بجلی گرائیں گے

تارے زیادہ کِھلتے ہیں شب ہائے تار میں
شبہائے تارِ غم میں سوا کِھل کِھلائیں گے

موزوں کریں گے نالہ ہی گر ہو گا ناگزیر
ٹانکے دہانِ زخم کے خنداں دکھائیں گے

ہر تلخ و ناگوار کو شربت سمجھ کے ہم
تفریحِ طبع کے لئے پی ہی تو جائیں گے

پڑ جاتی ہے جو ڈالئے عادت مزاج کو
بر رغمِ غم خوشی کو ہی عادت بنائیں گے

کرلیں گے مشقِ خوابِ پرستان دیکھنا
خلد و ارم کے ذہن میں نقشے جمائیں گے

سامانِ ظاہری سے تصوّر میں کیا نہیں
تارے بھی گر ضرور ہوئے توڑ لائیں گے

لعنت اُس عیش پر جو ملے بعد صد محن
دل بُجھ کے رہ گیا تو مزہ خاک پائیں گے

صدقہ سمجھ کے جان کا نقصان مال کو
سرمایہ اپنے سُود دِ بقا کا بڑھائیں گے

اُجڑا کبھی جو بادِ حوادث سے خانماں
اور آشیانہ کُنجِ چمن میں بنائیں گے

پَت جھڑ ہوا چمن تو اُمیدِ بہار میں
سُوکھی ہی ٹہنیوں میں نہ پھُولے سمائیں گے

مرگِ محب و اہل و عزیز و قریب پر
دل سخت کر کے صبر کا مرہم لگائیں گے

کہہ دیں گے ہر سوارِ عدم سے پکار کر
جاتے ہو تم جدھر کو چلو ہم بھی آئیں گے

افسوس کے عوض خبرِ انتقال پر
"غم سے چھُٹا بھلا ہوا" یہ گیت گائیں گے

وردِ زباں رکھیں گے ترانوں کو عیش کے
غم کے فسانے ہیچ ہیں سب بھول جائیں گے

ہست آج سے نہیں، ہیں ازل کی ازل سی ہست
ہے نیستی غلط، غمِ ہستی نہ کھائیں گے

ہوتا قلق سوا ہے دلاسا ہے اک بلا
ہنس ہنس کے زار زار کو ہم مسکرائیں گے

صفرائے معتدل سے رہیں گے سرور میں
سودا ہے اصل غم اسے منضج پلائیں گے

نغمہ غذائے رُوح ہے بادل دوائے دل
درمانِ غم کو مطرب و ساقی بلائیں گے

گلزار ہونگے دشت و بیاباں نگاہ میں
جب خوشدلی کی عینکِ رنگیں چڑھائیں گے

زندہ دلی و حسن طبیعت کے سحر کار
ہر رنگ میں بہار کا عالم دکھائیں گے

دل غیر کا دُکھانا کہ اپنا روا نہیں
فریادِ دلخراش سے پہلو بچائیں گے

اِک پردہ پر نظارہ ہے ہر انقلاب دہر
محظوظ ہو کے نعرۂ تحسیں لگائیں گے

مُنہ مانگے دام دیں گے حسیں ہیں گے ٹُوٹکے
اک پھول سا کھلا ہوا جب دل دکھائیں گے

روتے ہیں میرؔ و غالبؔ و حالیؔ بسورتے
یہ سب امام باڑوں کو اچھا سجائیں گے

اکبرؔ، نظیرؔ، داغؔ، امانتؔ ہیں زندہ دل
محفل میں ان کے واسطے آنکھیں بچھائیں گے

کیا خوب کہہ گیا ہے سرگباش ہو جیو!
بیت الصنم کو چھوڑ کے کعبہ نہ جائیں گے

نقشِ قدم پہ اپنے رنگیلے رسول کے
جمنا کنارے برج میں بنسی بجائیں گے

ہولی دوالی اور سلونوں بسنت ہیں
کیا جل کے لکھنؤ میں محرم منائیں گے

اک زمزمی اُلٹ کے سبو لیں بزمزمہ
عاصی یہ عین کعبہ میں گنگا نہائیں گے

لاحول سے نہ بھاگیں تو لاتقنطو کو پڑھ
اندیشے معصیت کے پھٹکنے نہ پائیں گے

جوڑا نیا بدل کے نہا دھو کے مل کے عطر
ہنستے ہوئے جنازے میں جنت کو جائیں گے

یوں حُسن خاتمہ ہو تو بعدِ وصال بھی
خاکِ لحد پہ لالہ و گُل لہلہائیں گے

ہم اس تماشہ گہ میں شہیدانِ عشق ہیں
پھر مر کے زندہ ہونگے نیا سانگ لائیں گے

خوش رہ وگرنہ خیال کے ہیں نقش خواب بھی
خوابِ عدم میں بھی غمِ دُنیا ستائیں گے

محمد احتشام الدین دہلوی

سماجی انقلاب کی تیسری مجلس۔

شیر و شکر

پہلا منظر

ایک قصبہ۔ آحمد کا بنگلہ۔ کھانے کی میز پر احبابِ
خاص۔ ہندو مسلمان۔

قریشی۔ احمد دُلہن مبارک، مگر اس میز پر ہماری بھاوج کیوں نہیں؟ کیا تم نے اُن کو پردے میں بٹھا دیا؟

احمد۔ مجلس نکاح میں تم سب نے اُن کو دیکھا، پھر یہ کیا سوال ہے؟ رہی اس میز سے اُن کی غیر حاضری سو پردے سے آزادی کے معنی جو ہم نے قرار دیئے ہیں صرف یہ ہیں کہ عورت چار دیواری میں بند اور بیرونی کاروبار یا تازہ ہوا اور سیر و تفریح سے محروم نہ رکھی جائے۔ یہ نہیں کہ وہ شمعِ بزم، نقلِ محفل اور سوسائٹی کی تفریح کا آلہ بنائی جائے۔ جب تک فطرتِ انسانی میں جنسی کشش موجود ہے اور قانونِ ازدواج جاری ہے، دونوں جنسوں کا آزادانہ اتصال آگ اور بارود سے کھیلنا یا خرمنِ ناموس پر بجلی کو دعوت دینا ہے۔ تدبیرِ منزل کے نقطۂ نظر سے دیکھو تو دونوں کی جسمانی اور دماغی صلاحیتیں جُدا جُدا ہیں۔ اگر بیوی بزم آرائیوں میں زیادہ وقت صرف کرے تو گھر کی نگرانی اور بچوں کی پرداخت کون کرے؟

انصاری۔ تو خیر سے نکاح کے ساتھ ہی آپ کے ہاں بچے بھی پیدا ہو گئے؟

چچا۔ آج نہیں تو کل ہونگے۔ مگر تیار آج ہی سے ہونا چاہیئے: بچہ پروری کا فرض بھی تعلیم و تربیت چاہتا ہے۔ یہ باہر مجلسوں میں نہیں حاصل کی جاتی، جس طرح تم کسب معاش کی قابلیت کے لئے اپنی زندگی کے پندرہ سولہ سال مکتبوں مدرسوں اور کالجوں میں صرف کرتے ہو۔ بالکل اسی طرح لائق بیوی اور ماں بننے کی قابلیت کے لئے تعلیم گاہیں، تربیت گاہیں اور نصاب ہیں اور وہ مدرسوں سے ماورا، ماں بہنوں اور ساس نندوں کی تربیت اور صحبت ہے۔

انصاری۔ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ عورت کی زندگی چولھے چکی، سلائی پروئی اور بچوں کی دیکھ بھال تک محدود رہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ اُنکے فرائض میں داخل ہیں۔ لیکن انسان کی زندگی صرف فرائض کی مصروفیت میں تیر نہیں ہوتی، ایک معتد بہ حصہ تفریح اور شوق کے مشغلوں پر بھی صرف ہوتا ہے۔ ہم دن رات صرف پڑھنے یا کمائی کے دھندوں میں نہیں گذارتے۔ اپنے ذوق کی تسکین یا تفریح کیلئے بھی کافی گھنٹے نکال لیتے ہیں۔ کیا عورتیں اسکی حقدار نہیں؟

چچا۔ میں نہیں کہتا کہ نہیں۔ مگر تفریح عام مردوں کی صحبت میں منحصر نہیں۔ تفریح پیچھے ہے فرض پہلے۔ ہماری پسماندہ، پست اور فلاکت زدہ قوم کے سامنے فرائض کا یہ ہجوم ہے کہ تفریح کا زیادہ وقت نہیں۔ جدید میلان کے مطابق ہم لڑکیوں کے وقت کا زیادہ حصہ دماغی تعلیم کی نذر کر دیتے اور اُن کے خانگی فرائض کی نیازی سے غفلت برتتے ہیں۔ کنوارپتے میں اُن کی تعلیم کے اس نقص کے باوجود شادی کے بعد بھی ان کا وقت بیرونی صحبتوں، گپ بازیوں، عشوہ سازیوں یا تقریر و تحریر پر صرف ہو تو یہ خانگی کاموں سے رہیں۔ کیا آزادی اسی کا نام ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنے فرضِ منصب سے سُبکدوش ہو کر جو چاہے کرے؟

انصاری۔ تو آپ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مخالف ہیں؟

چچا۔ اعلیٰ تعلیم کا مخالف کون ہو سکتا ہے؟ مگر اعلیٰ تعلیم کے معنی تم لوگوں نے جو صرف ریاضیات، طبیعیات، منطق، فلسفہ، شاعری وغیرہ سمجھ رکھے ہیں وہ ہمارے لئے اعلیٰ ہو سکتے ہیں، لڑکیوں کیلئے کسی مرض کی دوا نہیں۔ اُن کی اعلیٰ تعلیم وہ ہے جو اُن کو فرض شناس بیوی اور ماں بنائے۔ وہ ہماری اعلیٰ تعلیم سے مختلف ہے، جزو مشترک اخلاق و ادب ہے۔ اس کے ماسوا ان کا نصاب قطعی جُدا ہونا چاہیئے۔ اقتصادیات، خانگی ہنر، اصول حفظ صحت، تیمارداری، دایہ گری، پرورشں اطفال وغیرہ بجائے خود فنون اور ہنر ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے اجزا ہیں۔ اہلِ ثروت ان میں سے بعض تعلیمات مدرسوں میں دے سکتے ہیں مگر ان کے اکثر حصّوں اور غریبوں کی تمامتر تعلیمات کے لئے اور مدرسے ہیں جہاں ناقص یا کامل تعلیم و تربیت ہوتی ہے اور وہ میکا یا سُسرال ہے۔ ماں کے نرم اور ساس کے گرم اُصول تربیت کے ماتحت۔ اب تم سمجھے میں مدرسوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا کیوں مخالف ہوں؟ پردہ شکنی کی حمایت کے باوجود میں عورت مرد کا اختلاط سخت مضر سمجھتا ہوں۔ آئے دن جو طالبات کے اسقاطِ حمل، ہلاکت، خودکشی، فرار، عاشق کی غداری، معشوق کی بے پناہی اور اضطراری حرکات کی وارداتیں دیکھتے اور سُنتے ہو کیا قیدِ پردہ ان سے بہتر نہیں؟

مذہبی فرد انکی نے اظہار کی ضرورت سمجھی

انصاری:۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کیا حق ہے کہ عورتوں سے روٹیاں تھپواؤ، چولھے پھنکواؤ، کپڑے سلواؤ، جھاڑو دلواؤ، خدمتیں لو، جب یہ کام نوکر چاکر کر سکتے ہیں۔ تم خود بھی تو سارے کام آپ نہیں کرتے؟

احمد:۔ ہم جو مردانہ کام آپ نہیں کرتے وہ دوسرے مرد ہی تو کرتے ہیں عورتیں نہیں۔ اسی طرح عورتوں کا اپنے کام آپ کرنا یا دوسری عورتوں سے لینا ایک ہی بات ہے۔ اوّل تو نوکروں سے اہلِ ثروت کام لے سکتے ہیں اور وہ اقلیت کی بنا پر مستثنیٰ طبقہ ہے۔ قوموں کے پروگرام اور دستور العمل بنا کرتے ہیں نادار طبقہ کی زندگی کو پیشِ نظر رکھکر، جو سماج کا جزو اعظم ہے، نہ کہ اہلِ ثروت کی زندگی پر جو غیر معمولی اور غیر قدرتی ہے۔ دوسرے اہلِ ثروت بیبیوں کے لئے بھی جو اوروں سے کام لیتی ہیں اپنے خاص ہنر اور فن کا علم عام نگرانی کے لئے بھی ضروری ہے۔ جس طرح بچہ اپنے عوض دوسرے سے جنوانا ناممکن ہے، بچے کو دودھ بھی دوسروں کا پلوانا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ قدرت نے جو فرائض جس کے لئے مخصوص کئے ہیں اُن میں ردّ و بدل یا کوتاہی نظامِ اجتماعی کو درہم برہم کرنے کا باعث ہو رہا ہے۔ یورپ ہو یا ایشیا معاشی گتھیاں بڑھتی جاتی تکلفات اور اسراف سے زندگی بے مزہ ہوتی جاتی ہے۔ ہر شخص تنگدستی کا شاکی ہے۔ کسی کو سو پچاس پورے نہیں پڑتے، کسی کو ہزار پانسو کافی نہیں۔

صغیر:۔ اچھا جانے دو اس بے مزہ بحث کو۔ ہم اقتصادیات پر تمہارا لکچر سننے نہیں بیٹھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ بھابی صاحبہ مسلمان ہیں؟ کس کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئیں؟

احمد:۔ ہاں۔ وہ برہمو مسلمان ہیں اور کسی کے ہاتھ یا پاؤں یا سر پر اسلام لانے کی ضرورت نہ تھی۔

صغیر:۔ یہ برہمو مسلمان اسلام کا کون سا فرقہ ہے؟

احمد:۔ میں فرقہ ورقہ تو جانتا نہیں۔ شرط اسلام میں تو وہی جانتا ہوں جو قرآن مجید نے بتائی ہے، کہ اللہ کو اکیلا مالک و معبود سمجھے تمام مذاہب کو سچا جانے ان کی تعلیمات کو حق جانے اللہ کی کل طاقتوں یا فرشتوں کو موجود سمجھے۔ اپنے آپ کو اپنے اعمال کا جوابدہ یقین کرے یا دوسرے لفظوں میں قیامت پر ایمان رکھے اور نیک چلن بھی ہو، بس وہ مسلمان ہے۔ میری بیوی برہمو کی حیثیت سے یہ سب پہلے ہی سے مانتی ہے اور نیک چلن بھی ہے۔ اس کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہے۔ بلکہ وہ تو بہت سے اُن جاہل خاندانی مسلمانوں سے زیادہ مسلمان ہے جو زبان سے اللہ کو مانتے ہیں اور مُردوں کی ہڈیاں اور تبرکات پوجتے، غیر اللہ سے مرادیں مانگتے اور صرف نماز روزہ سے ڈرتے ہیں۔

صغیر:۔ تو تمہارے خیال سے برہمو مسلمان ہیں، اور محمدؐ رسول اللہ کے ختم نبوت پر ایمان؟

احمد:۔ ہاں صرف برہمو نہیں۔ ہر وہ فرد یا جماعت جو ان عقائد کا قائل ہو مسلمان ہے۔ ختم نبوت پر اعتقاد کی شرط قرآن شریف نے نہیں منوائی۔ حدیث صحیح بھی بتاتی ہے کہ جو اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھے وہ جنت میں جائے گا۔ رسولؐ اللہ نے قیامت میں اُس کی شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔

پرسوتم:۔ میں تو اس بنا پر اُن کو آخری نبی مانتا ہوں کہ آدمیوں کی ہدایت کا وہ طریقہ جو شخصی وحی و الہام، دھیان گیان اور ریاضت تپسیا سے جاری تھا، حضرت محمدؐ پر ختم ہو گیا۔ وحی اور دھیان کے بدلے عقلی دور شروع ہو گیا۔ جاتیوں، نسلوں اور دیسیوں کے سدھار کے بدلے نوعِ انسان کا سدھار اور سنسار کی آزادی مذہب کا مقصد قرار پائی اس سے آگے انسانیت کہاں جا سکتی ہے اور کس الہامی تعلیم کی ضرورت باقی ہے؟ اگر اسلام میں حالات زمانہ کے مطابق اڈپٹیبیٹی اور لچک موجود ہے تو ہمیں ختم نبوت سے بھی انکار نہیں نہ کسی معقول ہندو کو ہو سکتا ہے۔ رہی مورتی پوجا یا قدرت کی پرستش، سو وہ ہندو دھرم کی شرط نہیں۔ ویدوں کے عالم اسکے قائل نہیں۔ بھلا ایسے ہندو کو تم مسلمان کہوگے؟ اپنی سوسائٹی میں لوگے، بیوہتا کروگے؟

احمد:۔ نہیں۔

موہن:۔ کیوں؟

احمد:۔ ابھی نہیں بتاتا۔ بحث زیادہ سنجیدہ ہوتی جاتی ہے اور کھانے میں مخل۔ سہ پہر کو پہاڑی پر پک نک پارٹی ہوگی۔ باقی گفتگو وہاں ہوگی۔

دوسرا منظر

ایک پہاڑی جھرنا۔ وقت نو بجے صبح۔ وہی احباب۔

قریشی:۔ پرسوتم، تم آج کچھ سست نظر آتے ہو۔ ہو تو اچھے؟

پرسوتم:۔ ہوں تو اچھا خاصہ، صرف رات نیند نہیں آئی۔

قریشی:۔ کیوں؟

پرسوتم:۔ خبر نہیں۔ اچھا احمد، رات کی ناتمام بحث تمام کی جائے۔ تم کہہ رہے تھے کہ ایسے ہندو کو جو تمہارے خیال کے مطابق اسلام کی ضروری شرطیں پوری کرتا ہے اپنی سوسائٹی میں نہیں لے سکتے۔ کیوں؟

قریشی:۔ اب پاپی تیرے نیند نہ آنیکا سبب اب میں سمجھ گیا۔

پرسوتم ۔ بتاؤ کیا سمجھے؟

قریشی ۔ ایک لفظ میں جواب دوں؟

پرسوتم ۔ ایک یا دو، مگر سچ ہو ورنہ تہمت کی سزا ہوگی۔

قریشی ۔ رقیبہ!

سب پرسوتم کی طرف دیکھنے لگتے ہیں وہ جھینپ جاتا ہے۔ سب ہنستے ہیں۔

پرسوتم ۔ اچھا یہی سہی۔ پھر اس میں پاپ کیا ہے؟ اگر پاپ ہے تو وہی ہے جو احمد نے پہلے کیا۔ چچا آپ ہی انصاف کیجئے قریشی قابل سزا ہے یا نہیں اور سزا کیا ہو؟

چچا ۔ بیشک۔ اور سزا سندر گری پر پورے کالج کو پک نک پارٹی جہاں ہماری سبھا کا جلسہ ہو۔

قریشی ۔ تم نے میری غیب دانی کی خوب داد دی۔ مجھے تو انعام ملنا تھا۔ خیر یہ سزا منظور ہے بشرطیکہ طالبات کی مدارات کا نظم بھاوج صاحبہ شانتا دیوی اپنے ہاتھ میں لیں۔

احمد ۔ وہ خوشی سے قبول کرینگی۔

ہاں پرسوتم اب رہا تمہارے سوال کا جواب۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندو دھرم سب رسولوں پیغمبروں، رشیوں، منیوں کو مانتا ہے۔ مگر ماننے پر بس نہیں کرتا، پوجنے لگتا ہے۔ ہندوؤں کی غیر معتدل عقیدت انسانوں سے گذر کر حیوانات نباتات اور جمادات کی پرستش تک پہونچ جاتی ہے۔

پرسوتم ۔ اگر کوئی ہندو خدا کے سوا کسی شخص یا شے کی پرستش نہ کرتا ہو تو؟ تم لوگ ایک غلط فہمی رفع کرلو۔ ہماری تعظیم و تکریم کے طریقے ایسے ہیں جو تم کو پرستش معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری پوجا اور تعظیم کا فرق تم نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ ہمارے لفظوں کا صحیح مفہوم نہیں جانتے۔ مثلاً دیوتا ہمارے ہاں پرماتما پرمیشور اور خدا کا مرادف نہیں۔ دیوتا مقدس ہستی ہے، جیسے رسول، فرشتے، اولیا۔ ان کی تعظیم بجالانے کے طریقوں میں بھی ہمارے تمہارے درمیان اختلاف ہے اور یہ محض ملکی، نسلی، مقامی کلچرل (تہذیبی) فرق ہیں۔ ہم بزرگوں اور متبرک چیزوں کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں۔ تم بوسہ دیتے ہو۔ ہم ماں باپ اور گرو کے پاؤں چھوتے ہیں، تم سر پر ہاتھ رکھکر سلام کرتے ہو۔ ہمارے طریقے تم کو مشرکانہ نظر آتے ہیں۔

احمد ۔ ذرا صبر کرو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہندو دھرم دراصل کوئی مذہب ہی نہیں۔ یہ تو درویشی اور تصوف کی قسم کا ایک مشرب ہے۔ ہر مخلوق کو خدا کا مظہر سمجھنے والا، ہر کے آگے سر جھکانے والا، ہر نصیحت، تعلیم، فلسفہ، سفسطہ پر ایمان رکھنے والا۔ موجودہ ہندو دھرم نام ہے صرف ایک سماجی بندش کا جو برہمنوں نے پیدا کر رکھی ہے۔ یہ صرف جاتیوں اور چھوت کی پابندی ہے۔

پرسوتم ۔ تو ہندو مت میں اسلام کا تصادم مذہب سے ہوتا ہی نہیں۔ پھر یہ ہندو مسلم کے آپس کا بیر کیسا؟ یہ بچار اور جھگڑے کس بات کے۔

احمد ۔ احمق ہیں جو ہمارے اس تصادم کو مذہبی تصادم کہتے ہیں۔ یہ جھگڑا لڑائی دین و مذہب کیلئے نہیں۔ ہندو خدا کو ایک بھی کہتا ہے، سب رسولوں اور بزرگوں کو مانتا ہے۔ وہ جس طرح رام چندر جی، سری کرشن جی کو مانتا ہے اسی طرح گوتم بدھ، عیسیٰ مسیح، محمد عربی، آپکے شہید نواسوں، گرو نانک اور خواجہ چشتی کے آگے سر عقیدت جھکاتا ہے۔ کوئی ہندو گرجا میں شریک عبادت ہو یا مسجد میں نمازیں پڑھے، روزے رکھے۔ قرآن پڑھے، ہندو برادری کوئی تعرض نہیں کرتی جب تک وہ اپنی جاتی اور چھوت کا پابند ہے۔ تو بھائی جاتی اور چھوت تو دھرم نہیں، پھر یہ ہندو مسلم کی لڑائی دھرم کی کیونکر ہوئی؟

پرسوتم ۔ پھر یہ لڑائیاں کیوں ہیں؟ جب ہندو دھرم ایک گنگا جی ہے جسکے پیٹ پر سب بہے چلے جاتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، جینی، بودھ، پارسی، گنگا جی کو کوئی چنتا ہی نہیں۔

احمد ۔ یہی تو ہمارا بھی کہنا ہے۔ جھگڑا دھرم کا تمہارے لئے نہیں ہمارے لئے ہے۔ اسلام دھرم صرف عقائد اور عبادات کو قرار نہیں دیتا۔ اس کا مقصد اس سے بلند تر ہے۔ نوع انسان کی تمام اصلاحات روحانی، جسمانی، سماجی، سیاسی، اقتصادی۔ صرف نمازیں پڑھکر کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ اسے ہر اصلاح میں حصہ لینا ہے۔ ہندو سماج کا ظلم اور بے انصافی اسے گوارا نہیں۔ نوع انسان کی مساوات اور آزادی کی بنیادوں پر اس کی عمارت ہے، مسلمان اسے کھوکھلا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ چھوت اور جاتیوں کا بچار اس کی جڑ پر کلہاڑے ہیں۔ ان کو وہ برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ سبب ہے کہ ہندو اگر موحد بھی ہو تو ہم اسے اپنے میں نہیں لے سکتے۔ چھوت انسان کی انسان سے منافرت کا سبب ہے یا نتیجہ۔ جو کچھ ہو، منافرت کے ساتھ ازدواجی رشتہ کیا معنی، سماجی رشتہ بھی مضبوط نہیں ہوسکتا۔

پرسوتم ۔ ہمارے بدھیمان جاتیوں اور چھوت کا بچار اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہزاروں برس کی رسم و عادت دنوں اور مہینوں میں مٹ نہیں سکتی۔ مگر ہم میں سے جو افراد کامیاب ہوکر موجودہ سطح سے بلند ہو چکے ہیں اور ان امتیازات کو اٹھا چکے ہیں ان کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟

احمد۔ بیشک جو موحد ہیں اور جاتی اور چھوت کے روگ سے آزاد ہیں وہ مسلمان ہیں۔ اور اسلام میں رکھا کیا ہے؟

پرسوتم۔ ایسوں کا بیاہ بھی مسلمانوں میں ہوسکتا ہے؟

احمد۔ عام مسلمان کیا کرینگے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمہارے برہمنوں کی طرح ہمارے علمانے بھی مذہب کو کم مسخ نہیں کیا ہے۔ میں بذات خود ایسے لوگوں کو اسلامی برادری میں داخل سمجھتا ہوں۔ رہا بیاہ تو اس کا تعلق صرف میاں بیوی تک محدود نہیں ہوتا۔ دونوں کی برادریاں جب تک قبول نہ کریں ایسا رشتہ چین اور امن کا باعث کہاں تک ہوسکتا ہے۔ ادھر دولھا کی برادری دولھا سے مقاطعہ کرے گی اور دولہن کی دولہن اور اسکے گھر سے۔

قریشی۔ ارے یار چچا کر باتیں کرنے کی ہی نہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتا کہ رقیبہ سے شادی کرنے کی تدبیر بتاؤ۔ تو سنو دل لگی برطرف، سماج کا مقابلہ سماج ہی کرسکتا ہے، فرداً فرداً نا ممکن ہے۔ صرف بین الاقوامی ازدواج ہی نہیں اور بھی سماجی اصلاحات کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ ہمارے ہم خیال کچھ ترقی پسند جوان اکٹھے ہوکر قربانیوں کے لئے تیار ہوجائیں، برادری کے مظالم کا مقابلہ کریں۔ جیسے رسول اللہ اور گذشتہ صدی میں راجہ رام موہن رائے اور دوسرے مصلحوں نے کیا اور آخر کامیاب ہوئے۔ ہمارے لئے اتنی دشواریاں نہیں، زمانہ ہمارے ساتھ ہو۔ جاہل سماج ہمارے اس زبردست سماج کا مقابلہ دیر تک نہیں کرسکتا پرسوتم پر تو رقیبہ سوار ہے۔ موہن تم کیا کہتے ہو؟ کتنے ہندو جوان اس سماج میں شریک ہوسکتے ہیں؟

موہن۔ ہندو تم سے زیادہ سماج کے ستائے ہوئے ہیں۔ زمین تیار ہے، فضا موافق ہے۔ کالجوں کے زیادہ تر نوجوان جو بندے ماترم اور گائے باجہ، اردو ہندی کے جھگڑوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں، سچائی کی اس کرن کے پھوٹتے ہی سب بھول کر اس نئے سماج میں آکودینگے اور تم سے زیادہ حصّہ لیں گے۔

تیسرا منظر

وقت شب۔ احمد کی کوٹھی۔ کھانے کی میز۔

صغیر۔ آج کی گفتگو میں مجھے ایک بات کھٹک رہی ہے۔ تم نے مسلمانی کیلئے صرف توحید اور مساوات کی شرط قرار دی ہے۔ مگر یہ نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ سب ہوا ہوگئے؟

احمد۔ تم مولوی آدمی ہو، شاید مجھے نیچری کہدو، اس لئے میں چچا سے تصدیق چاہتا ہوں۔ کیوں چچا قرآن میں مومن اور مسلم دو اصطلاحیں علیحدہ علیحدہ استعمال کی گئی ہیں یا نہیں؟ میں نے ان میں جو فرق سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم تو ہر وہ شخص ہے جو توحید، رسالت، ملائکہ، حشر و نشر کا قائل اور نیکوکار ہو۔ ایسے لوگوں کو صرف یہی نہیں کہ کوئی اندیشہ عذاب نہ ہوگا بلکہ ہر لا الہ الا اللہ یعنی قائل توحید کے لئے جنّت کی بشارت ہے۔ قرآن مجید نے کل اہل کتاب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا۔ ارشاد ہے کہ "یہ سب یکساں نہیں۔ اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو راتوں کو نماز میں کھڑے آیاتِ الٰہی پڑھا کرتے، اللہ کے آگے سجدوں میں گرتے، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے، اچھے کاموں کو کہا کرتے، برائیوں سے منع کرتے اور نیک کاموں میں دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ نیک بندے ہیں"۔ (آل عمران۔ ع ۱۲)

ظاہر ہے کہ یہ لوگ نہ مومن کی طرح نمازیں پڑھتے نہ روزے رکھتے تھے۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو تبلیغ کی اور سرور کائنات نے مسیحی فرمانرواؤں کے سامنے جو الٹی میٹم پیش کیا وہ بس اتنا ہی قول و قرار تو تھا کہ "آؤ ان باتوں پر ہم تم متفق ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور انسان انسان کو مالک نہ سمجھے" یعنی امرا اور پادریوں کی غلامانہ تابعداری اٹھ جائے اور سوسائٹی کے سب طبقے مساوی اور ایک ہوجائیں۔ (آل عمران ع ۷) مسیحی بادشاہ حبشہ اسی معنی میں مسلمان تھا جس کی وفات کی خبر معلوم کر کے حضور انورؐ نے نماز جنازہ غائب پڑھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہل کتاب سے معاشرت و مناکحت جائز سمجھی گئی اور جاری رہی۔ بلا قید صوم و صلوٰۃ یہ مسلمان تھے اور مقررہ شرطوں کے ساتھ آج بھی ہیں۔

رہے مومن۔ مومن اور ایمان والوں سے اُن خواص کو خطاب کیا گیا ہے جن سے اعلیٰ اخلاقی معیار اور قربانیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ انکو صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی دعوت نہیں دی گئی۔ بلکہ حیا، وفا، ایثار، حلم، سخاوت، جہاد اور بے نفسی کی بھی فرمائش نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی سخت شرطیں عوام کے لئے لازم نہ ہوسکتی تھیں۔ یوں سمجھو کہ اسلام کی عالمگیر کانگریس میں دو طرح کے ممبر قرار دئے گئے ہیں۔ ایک چار آنے والے۔ ان میں موحد، نیک چلن، اہل کتاب اور کل نیکوکار موحدین داخل ہیں۔ دوسرے وہ خاص صالح، عبادتوں، ریاضتوں اور قربانیوں سے نفس کو پاک کر کے قابو میں رکھنے والے ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ یا انتظامیہ) کے ممبر ہیں۔ جو خود امن سے رہنے والے، دنیا میں امن و صلح پھیلانے والے، امن و صلح سے انکار کرنے والوں سے (اور کافر کے یہی معنی ہیں) جانی اور مالی جہاد کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں مومن۔

ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ہمارے جیسے لاکھوں مسلمانوں کو یہ درجہ نصیب نہیں۔

چچا:۔ واقعی یہ نکتہ تم نے خوب سمجھا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید اور خلافت راشدہ کی تاریخ اسکی مؤید ہے۔

صغیر:۔ یہی میری کھٹک جاتی رہی۔

پرسوتم:۔ اگر یہی اسلام ہے تو دُنیا میں لاکھوں ایسے مسلمان ملیں گے جو اور دھرموں سے نامزد ہیں۔

چچا:۔ نامزد کسی دھرم یا دین سے ہوں پھر بھی مسلمان رہ سکتے ہیں۔ اسلام اس معنی میں دین نہیں جو اور اقوام میں مفہوم ہے۔ ان میں دین محدود ہے نفس اور رُوح کے تزکیہ تک، یہ تزکیہ اسلام کا صرف ایک جزو ہے۔ اسلام دین و مذہب سے ماورا، سوشلزم کی طرح ایک نظامِ اجتماعی ہے۔ صرف روحانیت مستزاد ہے۔ نظام اجتماعی کی حیثیت سے دُنیا کی کوئی کمزور قوم یا جماعت اس سے جدا نہیں رہ سکتی۔ یہ وہ سوشلزم ہے جو اخلاقی بے لگامی اور رُوحانی افلاس سے پاک ہو۔ صلح و امن کی بھوکی دُنیا کو اُصولِ اسلام کے بغیر چین نہیں آ سکتا خواہ اس اصول کا نام جو کچھ رکھ لیا جائے۔

موہن:۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم اسلام کو صلح و امن کا پیغام کہا کرتے ہو۔ پھر جہاد کے کیا معنی ہیں؟

احمد:۔ مَیں مجملاً بتا چکا ہوں، جب طبیعت بشری میں نفسانیت، شر، خود غرضی موجود ہے اور رہے گی، تشدّد کی ضرورت بھی برقرار رہیگی۔ سب لوگ محض نصیحت اور نرمی سے راہِ راست پر آنے والے نہیں، یہ ممکن ہوتا تو شایستہ سے شایستہ اور مہذب قوموں میں قانون تعزیرات مدوّن نہ ہوتا اور قید خانے تعمیر نہ ہوتے۔ شریروں کو سزا دینے کی ضرورت نہ کبھی دفع ہوئی ہے نہ ہوگی۔ ان کو صلح و آشتی سے سمجھانے کے بعد بدرجہ آخر زور اور طاقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے بعض دفعہ زخمی کے بعض عضو کاٹ کر باقی جسم کو محفوظ کر لیتے ہیں اور جان بچا لیتے ہیں۔ یہی ہے جہاد۔ لیگ اقوام نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی مگر کارہند نہ ہو سکی۔ کیوں؟ اس قانون کو مذہبی تقدّس حاصل نہ تھا۔ رب العالمین کا جزو اعظم غائب تھا۔ جس کے بغیر کوئی قومی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اہنسا اور ستیا گرہ صرف ہندوستان کے مجبور اور بے دست و پا غلاموں کے لئے ایسا ہی ہتھیار ثابت ہو سکا جیسے عورتوں اور بچوں کے لئے مَردوں کے مقابلے میں دانت اور ناخن۔ پھر بھی حبشیوں کا ستیہ گرہ مسولینی کے مقابلے میں یا یہود کا ہٹلر کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ غرض دُنیا میں کوئی ایماندار مظلوم شخص مسلمان ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ؏۔

کافر نتوانی شُد ناچار مسلماں شو

یوں نام جو چاہے رکھے۔

موہن:۔ پھر اسلام اور ہندو مت میں کوئی بَیر نہیں۔ آج ہندو دھرم میں پوجا پاٹ، دھیان گیان کوئی حصّہ بھی ضروری نہیں۔ کچھ زیادہ سنسکرت آمیز بھاکا، گائے، باجہ، دھوتی، پتّوں میں رسوئی، لوٹا، جنیو جن پر ہندوؤں کا اصرار ہے اور ہندو کی پہچان، ان میں سے ایک کا تعلق مذہب سے نہیں۔ اصل میں ہندو مت بھی ایک مقامی سماجی نظام ہے، مذہب نہیں۔ اور اسلام ایک عالمگیر سماجی نظام ہے۔ تو فرق جزو و کل کا ہے، زمانے کا ہے، مقام کا ہے۔ صرف آخری نظام کی حیثیت سے اسلام کا مطمح نظر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ہم تو ہندو رہ کر مسلمان رہ سکتے ہیں۔

احمد:۔ بیشک ملکی لحاظ سے ہمیں بھی ہندو ہونے سے چارہ نہیں۔ ہندوستانی کی حیثیت سے ہم ہندو، انسانی برادری کے ممبر کی حیثیت سے مُسلم۔ اور اگر ایثار و تزکیہ نفس حاصل کر کے نوعِ انسان کے سچّے خادم بنیں تو مومن بھی ہیں۔

موہن:۔ قرآن کہتا ہے خدا ایک ہے۔ سب مخلوق برابر ہیں۔ وید کہتے ہیں خُدا کے سوا کوئی موجود ہی نہیں، ہر چیز جو ہم دیکھتے ہیں خُدا کا ظہور ہے، جزو ہے، یعنی سب جیو مقدّس ہیں، اس لئے برابر ہیں۔ خُدا کی اصل عبادت مخلوق کی سیوا۔ اور مخلوق کی سیوا پرماتما کی سیوا اور عبادت ہے کہ ہر میں ہر (خدا) ہے۔ یہ بھی تو توحید ہے، ٹھیک توحید، توحیدِ الٰہی ہی نہیں، توحید ہستی۔ فرق صرف تعبیرات اور اصطلاحات کا ہے۔ مقصد صرف ایک ہی ہے اور اس کے حصول کا اُصول اور ذریعہ بھی ایک ہی۔ طریق کار میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ زمانہ کے لحاظ سے ضرورت ہے صرف مطابقت ماحول (اڈیپٹیبلٹی) کی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ، پارسی سب دھرموں کو اسی مطابقت ماحول (اڈیپٹیبلٹی) کے بغیر سوشلسٹوں، نازیوں اور فیسسٹوں نے مذہب سے بدگمان اور عاجز ہو کر سرے سے اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ مگر مذہب سے بدتر بندھنیں قائم کر کے دُنیا سے امن اور شانتی چھین لی ہے اور ایسا اُپدرو مچا رکھا ہے کہ بدنام مذہب نے بھی کبھی اس سے زیادہ نہ کیا ہوگا، جو مظالم مذہب کے نام پر ہوتے تھے اُن سے زیادہ اب نسل کے نام پر ہو رہے ہیں۔

چچا:۔ قرآن بتاتا ہے کہ تمام اقوام عالم ایک ہی اُمّت تھیں۔ بعد میں

اصل میں دین یعنی توحید سے کٹ کٹ کر بٹ بٹ گئیں۔ خدا کہتا ہے ہم نے روئے زمین کی ہر قوم کے لئے عبادت کی خاص خاص نشانیاں بنا دی ہیں۔ وہ محض نشانیاں ہیں۔ اصل قانون یا اصول ایک ہی ہے۔ اس میں اختلاف جائز نہیں۔ وہ قانون کیا ہے؟ توحید کامل۔ جس میں توحید باری، وحدت خلائق وطبقات وجماعات، آزادی ومساوات داخل ہے۔ جو ایثار، قربانی اور تہذیب اخلاق سے حاصل ہوتی ہے۔ خیام عبادت کی نشانیوں کی یوں شرح کرتا ہے:۔

بتخانہ وکعبہ خانۂ بندگی است
ناقوس واذاں ترانۂ بندگی است
محراب وکلیسا وتسبیح وصلیب
حقا کہ ہمہ نشانۂ بندگی است

محمد مسلم

کلامِ فرحت

محفلِ حُسنِ یار میں، پھولوں کی جلوہ زار میں ۔۔۔ لُٹ گئی آبروئے دید، آج بھری بہار میں

آگ سی ہے لگی ہوئی، دامنِ قلبِ زار میں ۔۔۔ کوندرہی ہیں بجلیاں، جلوۂ حُسنِ یار میں

عشق کا راز ہے نہاں، دیدۂ اشکبار میں ۔۔۔ گوہرِ اشک بھر دیئے، دامنِ حُسنِ یار میں

ایک نگاہِ ناز سے چھیڑیئے پھر حیات کو ۔۔۔ میرا سکونِ زیست ہے، آپ کے اختیار میں

جذبۂ عشق، مستقل، برقِ جمال، بیقرار ۔۔۔ ہے کوئی فتنہ گر ضرور، پردۂ روزگار میں

بیٹھا ہوں محوِ بیخودی، سامنے ہے دھری ہوئی ۔۔۔ دولتِ خوابِ زندگی، دامنِ تارتار میں

رحمتِ کارساز کا، دل کو یقین ہوگیا ۔۔۔ ذوقِ گناہ بڑھ گیا، قلبِ گناہگار میں

جام وسبو کا ڈھیر ہے، اہلِ نظر کے سامنے ۔۔۔ شانِ شکستِ توبہ ہے، توبۂ بادہ خوار میں

واہ رے رعبِ حُسنِ یار! اشک سمٹ کے رہ گئے ۔۔۔ حالتِ دل نہ کہہ سکا، کوششِ اختصار میں

موجِ تلاطم آفریں، تہ میں لئے ہے اک سکوت ۔۔۔ رُوح، سکوں پذیر ہے، قلب کے انتشار میں

اہلِ نظر نے دیکھ لیں، ذوقِ نظر کی شوخیاں ۔۔۔ تم ہو تبسّم آفریں، جلوہ گہِ بہار میں

پوچھ لیا جو حالِ دل اشک اُمنڈ کے بہ چلے ۔۔۔ جانے کہاں کا سحر تھا، پُرسشِ غمگسار میں

رُوح تری ہے، دل ترا، جان تری ہے، میں ترا ۔۔۔ کس کی بنا پہ ہو غرور، ہستیِ مستعار میں

واہ رے آبِ ضَو فگن، موج پہ موج موجزن ۔۔۔ کھیل رہی ہیں بجلیاں، دامنِ آبشار میں

فرحتِ خستہ وخراب آہی گیا کشاں کشاں
عشق کی بارگاہ سے، بزمِ جمالِ یار میں

فرحت کانپوری

ظالم محبت۔

رُوبہ صحت

آہ! آج بھی جب کبھی میں گذشتہ واقعات کو یاد کرتی ہوں تو قلب پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مارچ کا مہینہ ختم ہو چکا تھا ایشیائی اپریل کا آتشیں مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ شہتوت کی ٹہنیاں نیلے نیلے شہتوتوں سے لدنے لگی تھیں، تالاب میں کنول کھلے ہوئے تھے، رات کے وقت دریچوں سے ہار سنگھار اور چنبیلی کی لپٹیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سنہری دھوپ اب سُرخ لوہے کی طرح تپنے لگی تھی۔ ہری ہری گھاس دھوپ کی تپش سے جل کر سُنہری ہو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں عُریاں تھیں۔ اور باغ میں گرم ہواؤں کے سبب دن بھر ویرانی طاری رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس سال ریاست کیپاس میں سخت گرمی پڑیگی۔

اب بھیا منیر کی صحت میں نمایاں تبدیلی معلوم ہوتی تھی۔ سب کو اطمینان سا ہو چلا تھا۔ مگر جہاں اُن کی تندرستی پر سارا خاندان خوشش ہو رہا تھا وہاں چند اندیشوں نے بعض لوگوں کو نہایت ہراساں کر رکھا تھا۔ میں نے زندگی کو اُس شانت سے کبھی نہ دیکھا تھا جیسا اُس زمانے میں کیپاس میں دیکھ رہی تھی۔

اُس دوپہر گرمی اور دِلی اُلجھنوں کے سبب میں نڈھال ہو رہی تھی۔ پورا دن میں نے خوابگاہ میں بسر کیا۔ کوئی تین بجے ایک ہلکا پھلکا سا سفید زرّیں لباس پہن کر نیچے اُتری۔ دل بیحد اُداس ہو رہا تھا۔ رات کی باتیں ذہن میں تازہ تھیں۔ یہ سوچ کر میں نیچے جا رہی تھی کہ تھوڑی دیر بھیا منیر کے کمرے میں بیٹھ کر دل بہلاؤں گی کہ اتنے میں باڑا خانے کے زینے پر موتیا کنیز ملی: "خاتون روحی" اُس نے کہا، "آپ اس سفید لباس میں بالکل چنبیلی کی کلی معلوم ہو رہی ہیں۔ مگر مرجھائی ہوئی سی!"

میں نے دھیمے سے کہا: "کیا میں اُداس معلوم ہوتی ہوں موتیا؟"

"بہت" اُس نے کہا: "شاید گرمی کی وجہ ہو۔ بیگم زبیدہ آپکو پوچھ رہی ہیں"

"سب لوگ کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"حرم سرا کے ایوان میں سب کے سب موجود ہیں۔ سر جعفر (چچا لوث کے سکرٹیری) بھی آئے ہوئے ہیں۔ صاحبزادے منیر کی صحتیابی پر ایک جشن منایا جانے والا تھا نا۔ اسی سلسلے میں بات چیت اور تیاریاں ہو رہی ہیں"

اتنا سُنکر میں نے ایک آہ بھری: "اچھا میں بھی وہاں جا رہی ہوں۔۔۔!"

موتیا دو لمحے کھڑی رہی، پھر مسکرا کر کہا: "ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ سر لوث آپ کو ڈھونڈ رہے تھے، شاید سر ہارکی کا کوئی پیام دینا چاہتے تھے"

اتنا سُنکر میں شدّتِ مسرّت سے گلابی ہو گئی۔ جھک کر موتیا کو زور سے پیار کیا، پھر زینے پر سے دوڑتی ہوئی حرم سرا میں چلی گئی۔

جب میں ایوانِ نشست میں داخل ہوئی تو دادی زبیدہ سکرٹیری سے کہہ رہی تھیں: "جلسہ رقص قصرِ نسرین کے مہمان خانے کے بڑے ایوان میں منعقد ہوگا"

بوڑھے سر جعفر ایک چھوٹی سی تپائی کے پاس کاغذات کے بنڈل لئے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر گار اور بھیا منیر دریچے کے پاس شطرنج کھیل رہے تھے۔ کنیزیں اِدھر اُدھر مصروف تھیں۔

مجھے دیکھکر سر جعفر اُٹھ کھڑے ہوئے: "آداب خاتون روحی۔ نواب لوث آپکو ڈھونڈ رہے تھے"

"میں آئی بھی اُنہیں کی تلاش میں ہوں سر جعفر" یہ کہتے ہوئے میں دادی زبیدہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر حبشی خانہ زاد دادی زبیدہ کے حکم کے مطابق عطرِ گلاب اور عطرِ خس پانی میں ملا کر چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ صنوبر کنیز دادی جان کے بائیں ہاتھ کے قریب اُنکے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

اُس دوپہر دادی زبیدہ نے اپنے بال اس انداز سے سنوارے تھے جیسے کبھی نورجہانی عہد میں سنوارے جاتے تھے۔ اپنی طرف سے وہ اُنہیں بہت سٹائلش سمجھے بیٹھی تھیں اور بار بار فخر سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔

"میں گناہگار کس مُنہ سے اپنے اللہ کا شکریہ ادا کروں سر جعفر؟" دادی زبیدہ نے اپنی زرّیں پنکھیا ہلاتے ہوئے کہا: "اُسنے یہ دن بھی دکھایا!"

"میری بچاری مادام" سر جعفر نے کہا۔
بوڑھا ڈاکٹر گار شطرنج کھیلتے کھیلتے مڑ کر بولا: "اس تمام موسم میں بیگم زبیدہ نے ایک جشن بھی نہیں منایا۔"

"میں نے مادام کو اپنی عمر میں اتنا پریشان کبھی نہ دیکھا تھا" سر جعفر نے جواب دیا۔

"اور کیا ــــ" دادی زبیدہ اپنی ریشمین دستی کو ناک کے پاس لیجاتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "جب سے کیمباس آئی ہوں نہ مجھے اپنے کپڑوں کا ہوش ہے نہ زیوروں کا۔ منیر کی علالت نے حواس باختہ کر رکھا تھا۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر، مجھے اپنے قدیم ہیروں سے کس قدر عشق ہے۔ مگر میں نے انہیں یہاں اس موسم میں ایک بار بھی نہیں پہنا! اب انشاء اللہ منیر کے غسلِ صحت پر پہنوں گی۔"

"اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟" سر جعفر نے اپنی خشخشی ڈاڑھی کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں اکتا سی گئی۔ "نہ جانے چچا لوٹ مجھے کیوں بلا رہے تھے...."

دادی زبیدہ متوجہ ہوئیں۔ "مجھے نہیں معلوم.... شاید تمہیں کوئی پیام دیتا.... صنوبر! یہ دریچی بند کر دو۔ گرم ہوا اندر آ رہی ہے۔"

"آپ نے کیا فرمایا دادی جان؟" میں نے مچل کر پوچھا۔

"شاید کوئی پیام.... جی ہاں جی ہاں سر جعفر۔ میں نے سلطان حمید کو اور اُن کے لڑکوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا ہے۔ تم کیا پوچھ رہی تھیں بیٹی؟"

میں چڑ سی گئی۔ اُٹھنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھُلا، اور چچا لوٹ ایک خط ہاتھ میں لیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"روحی، تم کہاں تھیں؟" انہوں نے آتے ہی کہا۔ "سر ہارلی کا خط آیا ہے۔ وہ اس ہفتہ کے اختتام پر دریائے ناشپاس کے کناروں پر تفریحاً آ رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سب کو وہاں پکنک کی غرض سے مدعو کیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" دادی زبیدہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں ــــ" چچا لوٹ نے کہا، پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ "اور خصوصیت سے روحی کو مدعو کیا ہے اور سلامِ شوق لکھا ہے۔"

"پھر تو ضرور چلئے چچا لوٹ" میں نے مچل کر کہا۔

چچا لوٹ ابتک مسکرا رہے تھے بولے۔ "کم از کم میں تو انکی دعوت ٹال نہیں سکتا۔ ضرور جاؤنگا۔"

"اور میں بھی ــــ کیوں دادی جان پیاری؟ کیونکہ میں نے سر ہارلی کے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا۔ جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔" میں نے دادی جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے تم لوگ کس طرح برداشت کر لیتے ہو!" دادی زبیدہ نے حسبِ عادت دخل در معقولات شروع کر دی۔ "میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک خط کا جواب نہ لکھ لوں چین نہیں آتا۔ رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں خطوط کے جواب لکھوانے میں مصروف رہتی ہوں۔"

"میرا جی بھی بہت چاہتا ہے کہ سر ہارلی کی دعوت قبول کر لوں" بھیا منیر نے کہا۔

چچا لوٹ بولے۔ "انہوں نے یہی لکھا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کا تم پر مفید اثر پڑے گا۔ مزید براں جسوتی بھی شادی سے پہلے تفریحاً کہیں جانا چاہتی تھی۔ اور ہاں ڈاکٹر گار ــــ تمہیں ساتھ لانے کی انہوں نے بہت تاکید کی ہے۔ لکھا ہے کہ گار کی بذلہ سنجی کے بغیر وہاں کا لطف ادھورا رہے گا۔"

"شکریہ" ڈاکٹر گار نے کہا۔ پھر بولا۔ "بڑا لمبا چوڑا خط معلوم ہوتا ہے جس میں اتنی ساری باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کچھ سوچکر اچانک کہا۔ "آپنے سر ہارلی کو دعوتی رقعہ بھیجدیا دادی جان؟"

"لو، اور سُنو! بھیجا کیوں نہیں!" دادی زبیدہ کہنے لگیں۔ "میں تو کسی کو نہیں بھولتی۔ چہ جائیکہ سر ہارلی! میرا حافظہ تو تم لڑکیوں سے زیادہ تیز ہے۔ انہیں کیونکر مدعو نہ کرتی؟"

"تو زبیدہ" چچا لوٹ نے فرمایا۔ "کہو کب تک چلتی ہو؟"

"میں تو شاید نہ جاسکوں" دادی زبیدہ نے کہا۔ "اس جشن کا انتظام میں اپنی خاص نگرانی میں کرانا چاہتی ہوں۔ مزید براں اس ہفتہ سلطان حمید کی والدہ ــــ وہی ملکہ ثمر ــــ کو مدعو کر رکھا ہے، کس طرح جاسکتی ہوں؟ تم لڑکیوں لڑکوں اور ڈاکٹر گار کو ساتھ لیجاؤ۔ اور جب لوٹو تو سر ہارلی کو جشن کیلئے ساتھ لیکر لوٹو۔"

مجھے اس پروگرام سے دلی خوشی ہوئی کہ دادی جان یہیں رہینگی۔

یہ سُنکر چچا لوٹ بولے۔ "تم نے بڑا اچھا کیا زبیدہ، جشن کی تاریخ مقرر کر لی۔ ورنہ گرمی بڑھ جاتی تو بے لطفی ہوتی اور مہمانوں کو تکلیف جُدا ہوتی۔"

"اور کیا لوٹ ــــ" دادی فخریہ کہنے لگیں۔ "میں ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ یہ تو میری ہمیشہ کی عادت

ٹہری، سر جعفر؟ بعض لوگ کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ مارے سُستی کے ایک دن کا کام دو مہینوں میں ـــ"

چچا لوٹ بات کاٹ کر بولے "شادی مئی کے آخری ہفتے میں ہو جائے تو کیسا ہو زبیدہ؟"

"بڑا اچھا ہو" ڈاکٹر گار شطرنج کھیلتے کھیلتے بولا۔

"مگر ڈاکٹر" دادی زبیدہ نے کہا "ایسی عظیم الشان شادی کا انتظام بھی تو اعلیٰ پیمانے پر ہونا ہے۔ خود میری اپنی شادی پورے تین سال کی تیاری کے بعد ہوسکی تھی۔ اور پھر بھی شہزادی عائشہ کہتی رہیں کہ کسر رہ گئی۔ تمہیں تو یاد ہوگا"

"مگر اس شادی میں دیر نہ ہونی چاہیئے بیگم" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ میں جانتی ہوں" دادی زبیدہ نے کہا اور سگرٹ جلایا۔

"تمہارا شکریہ پیارے ڈاکٹر" بھائی منیر نے جھک کر ڈاکٹر گار سے سرگوشی کی۔

دادی نے سگرٹ کا ایک کش کھینچکر فرمایا "یہ تو جشن والے دن طے پائیگا کہ کونسی تاریخ شادی کے لئے مبارک ہوگی۔ نجومیوں سے رائے لونگی، فال کھلواؤں گی، مزید براں . . . . ."

"جیسی تمہاری مرضی بہن" چچا لوٹ نے کہا۔

اصل میں دادی زبیدہ کی اپنی دلی تمنا یہی تھی کہ شادی کل کی ہوتی آج ہو جاتے۔ مگر عادتاً عذر کئے جا رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد خود ہی مسکرائیں اور بولیں "جب آپ سب لوگ مُصر ہیں تو میں بھی رضامند ہوں۔ اور منیر؟ تم کہو۔ اب کیسے ہو؟"

"اپنے آپ کو بیحد تندرست پاتا ہوں دادی جان پیاری" اُنہوں نے ہنسکر کہا۔

"پھر تو ٹھیک ہے" بوڑھے ڈاکٹر گار نے دستی سے حسب معمول ناک رگڑتے ہوتے کہا "شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیئے"

اُسی وقت میں اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اوپر جا کر جسوتی کو تمام حالات سے آگاہ کروں۔

دادی جان بولیں "بیٹی روحی، جسوتی سے کہدو کہ اُس کے ساتھ ناشپاس کے سفر میں شعلہ، سوسن، کاسنی اور موتیا جائیں گی۔ تم بھی ساتھ بوڑھی جشن زرد ناش کو لیجاؤ۔ چمپا اور غنچہ تمہیں تبدیل لباس میں مدد دینگی اور سرلی تمہارے لئے زیور . . . . ."

میں نے آخری فقرہ نہیں سُنا، دوڑتی ہوئی بالاخانے کے زینے پر پہونچ گئی۔ شدت مسرت سے میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔

اوپر جسوتی موسم گرما کے سفید مہین مزلین کے لباس میں پنکھے کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بلورین کٹورے میں اُس کی رنگین مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ انہیں مشغلے کے طور پر غذا کھلا رہی تھی۔

جاتے ہی میں بولی "تم نیچے کیوں نہیں آئیں پیاری؟ یہاں اُداس بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ نیچے تو بہت سے مراحل طے ہو رہے ہیں ـــ"

"مبارک ہو" جسوتی نے سر اُٹھا کر طنز سے کہا "کہو تمہاری شادی کا مرحلہ بھی طے ہوگیا؟"

میں حیران ہو کر اس خلاف توقع جُملے پر اُسے دیکھنے لگی۔ عام حالات میں اُس کا یہ تلخ جُملہ شاید مجھے ناگوار گذرتا۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس دوپہر میں کچھ اس قدر خوش ہو رہی تھی کہ میں نے جسوتی کے اِس فقرے کی کوئی پروا نہ کی، صرف اتنا بولی "میری شادی! نہیں تو، ایسی اُلٹی پلٹی باتیں نہ کیا کرو جسوتی۔ کس نے تم سے کہا؟"

"کیا میں آنکھیں نہیں رکھتی روحی؟ مگر خیر . . . مجھے تم سے شکایت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پیاری میں خُوب جانتی ہوں کہ ایسے موقعے پر انسان دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر روحی ایک بات میری مانو گی ؎

بُری ہے اے داغ راہِ اُلفت

. . . ."

"کیا فضول بکتی ہو جسوتی" میں نے نہایت غصّہ سے کہا "تم نے زرد ناش کی افیون تو نہیں کھالی؟ شادی تمہاری ہو رہی ہے کہ میری؟ کچھ عقل و ہوش کی باتیں کیا کرو"

جسوتی بولی "میں تو اپنے عقل و ہوش میں مہینوں سے نہیں ہوں، اب تم بھی اسے کھو بیٹھیں"

"کیا کہتی ہو جسوتی" میں نے بے ضبط ہو کر کہا "کسی نے تم سے کچھ کہا ہے؟ تم سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار کر لیتی ہو؟"

"میں سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرتی روحی۔ نہ لگی لپٹی رکھتی ہوں۔ صاف صاف کہتی ہوں کہ تمہارے چاہنے والے نے مجھ سے کہا" یہ کہکر جسوتی نے کتاب کھول لی۔

میں دو لمحے سوچتی رہی پھر بولی "میرے چاہنے والے نے!! یعنی؟ اُس شخص کا نام لو جسوتی"

"میرا مُنہ نہ کھلواؤ روحی۔ منصور نے کہا ہے کہ عنقریب

مَیں زیادہ نہ سُن سکی غصّے سے بولی "آہ ـــــ منصور صاحب کس قدر نامعقول ہیں"
اتنا کہکر مَیں اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اُس شام جب میں نے ایک زرد ریشمی لباس زیبِ تن کیا تو بوڑھی حبشن زونانش نے حیران ہو کر کہا تھا "اے خاتون رُوحی! آپکا چہرہ آپ کے لباس کی طرح زرد ہو رہا ہے! خیر تو ہے؟"
"خیر کہاں کی بوڑھی لومڑی" یہ کہتے کہتے مَیں رو پڑی۔

حجاب امتیاز علی

بزمِ انجم

مؤقر سالنامہ ساقی میں اپنے گرامی قدر اور ہر دلعزیز ادیبوں اور شعرائے کرام کی تصاویر دیکھکر طبیعت بیحد مسرور ہوئی۔ اس سے جو لطیف اثرات مترتب ہوئے اُن کا خلاصہ ذیل میں عرض ہے:-

(۱) جو بیندہ یابندہ۔
(۲) طفلِ ادب پر "بزرگی" کا دست شفقت۔
(۳) "چِنتا" "جوار بھاٹا" اور کنگھا برش کر یوی!
(۴) بیسویں صدی میں قیسِ عامری کے لئے بھی صرف "جنون" بے معنی ہی ثابت ہوتا!
(۵) آنکھوں کی معنی آفرینی قابل غور! تبحّرِ علمی کے ساتھ ہی پریم رس کی لہریا خُدا ہی جانے یہ کس چیز کی پُجاری ہیں؟
(۶) کبھی آپ نے "پ" میں کوئی "اسکیچ" ملاحظہ فرمایا ہے؟
(۷) تخیّل کی "بلند پروازیوں" کی حقیقت!
(۸) ذکاوت اور صحافت کا امتزاج!
(۹) کوہسار آبشار، نغمہ زار سوز و ساز! اور حُسن و عشق!!
(۱۰) کون کہتا ہے کہ "پیام" خلوص رنگینی سے خالی ہے؟
(۱۱) سحر نگار مترجم! جرّاح ادیب!!
(۱۲) رختِ سفر سے بھرپور! تکانِ سفر غالب!
(۱۳) جبّہ و دستار، ریش و بُروت لازمۂ "فتوئے" کیوں ہو؟
(۱۴) "تحسین و تشکیل" کا تضاد! "تعمیل" خدا ہی جانے!
(۱۵) ؟
(۱۶) خُدا بھی عجیب کارساز ہے!

"دلفگار"

ظالم محبّت

حجاب امتیاز علی

کا

تازہ ترین شاہکار

مُصوّر ناولٹ جس میں ؏

"کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر"

ایک مشرقی رئیس زادی کی داستانِ رنگین۔ نواب لوٹ کے خاندان کی دلچسپ پیچیدگیاں حُسن و جمال کے دیوتا منصور، اور فرشتہ خصال منیر کی حکایتِ زندگی۔ مشرقی افسانوی فضا اور ایشیائی الف لیلوی ماحول، اس پر غضب رُوحی کا بیانِ رنگین!

کچھ بلبلوں کو یاد ہے۔ کچھ قمریوں کو حفظ
دُنیا میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

نوٹ:- اس دفعہ جگہ جگہ افسانے کے افراد کی تصاویر بھی ہیں۔

ملنے کا پتہ:- ۷ ریلوے روڈ۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

ایک ایکٹ کا ڈرامہ:۔

جوشِ عمل

فنجی ——————— ایک انقلابی خاتون
وولفگ ——————— کانوں کا رہنما
ایڈرتھ ——————— میڈرڈ کا شاعرِ اعظم
اور دوسرے لوگ

پہلا منظر

اسپین کا دارالسلطنت میڈرڈ، فرانکو کے حملے سے ایک مہینہ پیشتر۔ وقت ۸ بجے شام۔
ایک متوسط طبقہ کے رسٹوران میں جشن ہو رہا ہے۔ رسٹوران خوب روشن ہے۔ جگہ جگہ پر قمقمے اور کاغذ کے پھول پتیاں لگائی گئی ہیں۔
بہت سے مرد اور عورتیں جمع ہیں۔ زیادہ تر لوگ مزدور پیشہ ہیں اور کچھ طالب علم اور کلرک بھی۔ کچھ لوگ کرسیوں پر بیٹھے شراب یا قہوہ پی رہے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ اِدھر اُدھر ٹہل کر ہنس بول رہے ہیں۔ کہیں کہیں چار چار پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولیاں جمع ہیں اور خانہ جنگی کے متعلق زور زور سے گفتگو ہو رہی ہے، قہقہے بھی لگ رہے ہیں۔
وولفگ اور فنجی ایک میز پر بیٹھے کچھ ناشتہ کر رہے ہیں اور شراب پی رہے ہیں۔

فنجی:۔ آج مہینوں کے بعد یہ اطمینان نصیب ہوا ہے۔

وولفگ:۔ باغی کتے آج اپنے سروں پر پٹیاں باندھ رہے ہونگے۔

فنجی:۔ ہمارے مزدور بڑی جوانمردی سے لڑے۔

وولفگ:۔ میڈرڈ کے حملے کی پسپائی فرانکو کے مُنہ پر بڑا زبردست تھپیڑ پڑا۔

فنجی:۔ اسپین کے مزدوروں نے دُنیا کے مزدوروں کا سر بلند کر دیا۔

وولفگ:۔ آج ایڈرتھ کہاں ہے؟

فنجی:۔ لو، آگیا۔

(ایڈرتھ داخل ہوتا ہے اُس کی وضع قطع سے لاابالی پن برستا ہے۔ وہ کچھ گنگنا رہا ہے۔ کئی لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے اور اُس کا پُرجوش استقبال کرتے ہیں)

چند آوازیں بلند ہوتی ہیں:۔ خوش آمدید
مزاج بخیر
شاعر! مبارک ہو۔

ایک شخص نعرہ لگاتا ہے:۔ میڈرڈ کا شاعرِ اعظم۔

دوسرے لوگ:۔ زندہ باد!

ایڈرتھ:۔ آج بعد مدت کے جشن ہو رہا ہے۔

ایک شخص:۔ ہمارے نہتے مزدوروں نے کس بہادری سے دریا کے قریب فرانکو کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔

ایڈرتھ:۔ اسی لئے آج شہر میں جلوس بھی نکل رہے ہیں۔

(رسٹوران کے سامنے سے ایک جلوس نکلتا ہے۔ جلوس میں بہت جوش و خروش ہے۔ آگے آگے بینڈ ہے اسکے بعد مزدوروں کی فوج اور اُسکے پیچھے ایک جمِ غفیر نعرے لگا رہا ہے۔ رسٹوران کے لوگ پہلے تو بہت زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر رومال ہلاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔)

جمہور اسپین!
زندہ باد!
دُنیا کے مزدورو!
ایک ہو جاؤ!
مادرِ وطن!
زندہ باد!

(نعرے بار بار ...)

(مجمع گانے لگتا ہے۔ کچھ عورتیں ناچنے کی بھی کوشش

کرتی ہیں، جلوس نکل جاتا ہے۔ ایڈرتھ بالکل خاموش ہوتا ہے۔ رستوران میں پہلے ایک لڑکی شروع کرتی ہے پھر تمام لوگ سوائے ایڈرتھ کے گانے لگتے ہیں۔)

مزدور ہیں ہم!
مزدور ہیں ہم!
جھکتے جھکتے پتے پتے
اب پلٹا ہم نے کھایا ہے
اب پلٹا ہم نے کھایا ہے
آکاش پہ دھاوا بولینگے
آکاش کے تارے توڑینگے
آکاش کے تارے توڑینگے
مزدور ہیں ہم!
مزدور ہیں ہم!

(گانا بند ہو جاتا ہے)

فنجی۔ (پکارتی ہے) ایڈرتھ! ایڈرتھ!

ایڈرتھ۔ میری جان تم وہاں ہو۔

(فنجی کی طرف بڑھتا ہے۔)

ایک لڑکی۔ (راستہ روک کر) شاعر اعظم! ہم نے بہت دنوں سے تمہاری کوئی نظم نہیں سنی۔

ایڈرتھ۔ آج تم لوگ اس کے سننے کے لئے موزوں نہیں۔

(وولفگ اور فنجی بڑھکر ہاتھ ملاتے ہیں۔)

فنجی۔ کئی دن سے کہاں تھے؟

ایڈرتھ۔ مجھے خود نہیں معلوم۔

وولفگ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کسی معرکتہ الآرا نظم کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ایڈرتھ۔ میری مصروفیتیں اور تمہاری مصروفیتیں اور۔ میرا خدا اور ہے اور تمہارا خدا اور۔

وولفگ۔ میرا خدا کوئی نہیں۔

ایڈرتھ۔ میرا خدا حسن و شباب ہے۔

فنجی۔ لیکن اسپین کو اس وقت ایسے خدا کی ضرورت نہیں ہمیں اس وقت عمل و جہد کے خدا کی ضرورت ہے۔

ایڈرتھ۔ تم وقت اور ماحول کے تقاضے سے اپنا خدا بدلتے رہتے ہو۔ میں حسن و شباب کیلئے پیدا ہوا اور حسن و شباب ہی کیلئے مرونگا۔

وولفگ۔ لیکن ہر شخص کو تو حسن و شباب نہیں میسر آسکتا!

ایڈرتھ۔ فنجی تم میرے یہاں آؤ تو میں تمہیں اپنی نئی نظم سناؤں۔

فنجی۔ ضرور! لیکن نظم کا موضوع کیا ہے؟

ایڈرتھ۔ زندگی حسن و شباب کیلئے ہے۔

وولفگ۔ میں تمہاری بصیرت اور مشاہدہ کی تعریف کرتا ہوں شاعرِ اعظم کہ اس وقت بھی جبکہ اسپین خاک و خون میں لتھڑا ہوا ہے تم ہر جگہ حسن و شباب دیکھ رہے ہو۔

ایڈرتھ۔ (فنجی کی طرف اشارہ کرکے) کیا تم کو حسن و شباب نہیں نظر آتا۔

وولفگ۔ لیکن اس حسن و شباب سے پیشتر اپنے مزدور بھائیوں کا عمل و جدوجہد۔ کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ اس حسن و شباب کی پرستش تو کروں لیکن اس کو قائم و دائم رکھنے کی کوئی فکر نہ کروں۔

ایڈرتھ۔ ہشت۔ بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تمہاری تلوار فانی ہے اور میرا قلم غیر فانی۔ میں فنجی کے حسن و شباب کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ سکتا ہوں۔

فنجی۔ لیکن فنجی کو نہیں۔

(ایڈرتھ ایک سگرٹ سلگاتا ہے اور اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ایڈرتھ۔ اچھا شب بخیر فنجی کل شام کو چار بجے ملو۔

فنجی۔ اچھا خدا حافظ۔

(ایڈرتھ چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

(دوسرے روز ساڑھے چار بجے شام کو۔ ایڈرتھ کا کمرہ۔ بہت سی کتابیں اِدھر اُدھر پڑی ہیں۔ دیواروں پر حسن و شباب کی تصویروں کے بہت نادر اور عجیب غریب نمونے آویزاں ہیں۔ فنجی اور ایڈرتھ باتیں کر رہے ہیں۔)

فنجی۔ تمہاری نظم بہت خوب ہے۔

ایڈرتھ۔ تمہاری تعریف کی میں سب تعریفوں سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔

فنجی۔ تمہیں وولفگ کو بھی بلانا چاہیے تھا۔

ایڈرتھ۔ مجھے تم سے چند خاص باتیں بھی کہنا تھیں۔

فنجی۔ کیا؟

ایڈرتھ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

فنجی۔ میری خاطر نہیں اپنے آرٹ کی خاطر۔

ایڈرتھ:۔ (مسکراکر) محبت تو ہمیشہ ہی کی خود غرض ہوتی ہے۔
فنجی:۔ اچھا تو پھر۔
ایڈرتھ:۔ میری محبت اور دوسرے کی محبت میں بہت بڑا فرق ہے۔ میری نظر منتخب ہے اور بڑے انتخاب کے بعد میں نے تم کو پسند کیا ہے۔
فنجی:۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔
ایڈرتھ:۔ میں تم پر اپنا دل و جان فدا کرتا ہوں اور تم کو اپنا اور بالکل اپنا بنانا چاہتا ہوں۔
(فنجی کچھ بولنا چاہتی ہے لیکن خاموش رہتی ہے)
ایڈرتھ:۔ میں اپنی نوجوانی کا آدھا حصہ اپنی جراتِ رندانہ اور رلذتِ گناہ میں صرف کر چکا، اب چاہتا ہوں کہ زندگی کا بقیہ حصہ تمہارے قدموں پر گذار دوں۔
فنجی:۔ لیکن......
ایڈرتھ:۔ (بات کاٹ کر) پیاری فنجی پہلے مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکال ڈالنے دو۔
فنجی:۔ لیکن پیارے ایڈرتھ جو کچھ تم کہہ رہے ہو میری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ میں نے تو شادی کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا۔ میں اپنی ساری زندگی اپنے ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرنا چاہتی ہوں۔
ایڈرتھ:۔ تم شادی کے بعد بھی ملک و قوم کی خدمت کرسکتی ہو۔
فنجی:۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ایڈرتھ؟ آج ہمارا پیارا اسپین انگاروں پر لوٹ رہا ہے اُس کے بچے ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے ہیں۔ مقتولین کی لغشیں سڑکوں پر تڑپ رہی ہیں، اور بیواؤں اور یتیموں کی آہ و بکا سے آسمان تھرا رہا ہے۔ کیا اس وقت شادی بھی کوئی ضروری چیز ہے؟
ایڈرتھ:۔ ہاں بہت ضروری! جب ہر طرف سے موت اور تباہی کی تاریکی ہماری طرف دوڑتی چلی آرہی ہے تو اگر ایک آدھ لمحہ بھی ہم مسرت و عیش میں گذار دیں تو بہت ہے۔
فنجی:۔ مجھے اس وقت میدانِ جنگ میں ہونا چاہیئے نہ کہ حجلۂ عروسی میں۔
ایڈرتھ:۔ پیاری فنجی۔ (فنجی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے) جوش اور جذبہ میں نہ آؤ۔ اسپین پریشان ہے لیکن اسکی پریشانی عارضی ہے اور میری شاعری دائمی۔
فنجی:۔ ایڈرتھ اپنا مقابلہ اسپین سے نہ کرو! جہاں تمہارا حسن و شباب کا فلسفہ باطل ہے وہاں تمہارا یہ خیال بھی باطل ہے کہ تمہاری شاعری دائمی ہے۔ آج مجروح اور مقید مادرِ وطن تم سے آزادی اور زندگی مانگتی ہے اور تم ایک خود غرض شاعر اپنی ابدی زندگی کے فاسد خیال کے بھروسہ پر اس سے غیر متعلق حسن و شباب کے نغمے گانا چاہتے ہو؟ ابدی زندگی سستی نہیں بکتی؟ ابدی زندگی وہی شاعر حاصل کریگا جس کے نغمے محاذِ جنگ پر گا گا کر اسپین کے مظلوم اور بھوکے کسان دشمنوں پر یلغار کرینگے۔ ابدی زندگی وہ شاعر نہیں حاصل کرسکتا جو گھروں میں چھپ چھپکر......
(ایڈرتھ پہلو بدلتا ہے فنجی کہتے کہتے رُک جاتی ہے)
ایڈرتھ:۔ کہے جاؤ فنجی مجھے ایک نئی روشنی نظر آرہی ہے۔
فنجی:۔ مجھے معاف کرو ایڈرتھ۔
ایڈرتھ:۔ نہیں پیاری فنجی! تم مجھے ایک فرشتہ معلوم ہوتی ہو۔
فنجی:۔ شاعرِ اعظم! میں تمہیں شاعرِ انقلاب دیکھنا چاہتی ہوں۔
ایڈرتھ:۔ میں اپنے میں ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہوں، میں کوشش کروں گا۔
فنجی:۔ اب اجازت دو۔ (اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)
ایڈرتھ:۔ اچھا پیاری!...... ہاں تم سے مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے۔
فنجی:۔ کیا۔ (بیٹھ جاتی ہے)
ایڈرتھ:۔ حکومت کے حکم سے کل یا پرسوں میڈرڈ خالی ہوجائیگا۔ ریل کے سفر کیلئے میں تمہیں ایک پاس دینا چاہتا ہوں۔
فنجی:۔ شکریہ۔ لیکن حکومت خود مجھے کرمان بھیجنا چاہتی ہے۔
ایڈرتھ:۔ تو تم یہ پاس ڈولنگ کو دے سکتی ہو۔ (جیب سے ایک پاس نکال کر دیتا ہے)
فنجی:۔ ہاں اس کے لئے یہ پاس مفید ہوگا۔ وہ محاذ سے پیچھے کسانوں کی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔ اچھا تو میں چلی!
ایڈرتھ:۔ خدا حافظ، اب کب ملیں گے؟
فنجی:۔ شاید اسپین کی جمہوریت کی فتح کے بعد۔
ایڈرتھ:۔ (فنجی کو چوم لیتا ہے) میری جان یقین مانو آج میں تم سے بہت متاثر ہوا۔
فنجی:۔ (جلدی سے اپنے آپکو علیحدہ کرکے) شاعرِ اعظم!
ایڈرتھ:۔ میں تمہارے اشاروں اشاروں ہی میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ میری فنجی تم بہت پیاری ہو!
فنجی:۔ آپ کا شکریہ۔
(رخصت ہوتی ہے۔)
ایڈرتھ:۔ بس ایک بات فنجی! تمہیں میری زندگی کا مقصد یاد ہے۔
فنجی:۔ کیا؟
ایڈرتھ:۔ آہ! تم بھول گئیں؟ زندگی حسن و شباب کے لئے ہے!

فنجی:۔ (جاتے ہوئے) ہاں اچھی طرح!

(ایڈرڈ۔ جھکا کر بیٹھ جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(وولفگ ایک کمرے میں تنہا ٹہلتا ہے۔ نیچے سڑک بالکل
تاریک اور خاموش ہے ایک راہگیر بھی نظر نہیں آتا۔ دُور
سے توپیں سر ہونے اور بینڈ بجنے کی آواز آتی ہے۔)

وولفگ:۔ بھیڑیوں اور کتوں نے ہمارے مزدوروں کو پھاڑ کھایا! (غصّہ میں میز پر ہاتھ پٹختا ہے) بازی ختم ہو گئی! ایک مرتبہ پھر سرمایہ جیتا اور محنت ہاری لیکن! (سینہ تان کر) مزدور جیتے گا جیتے گا (چیخکر) جیتے گا! آہ مظلوم اسپین! پیارے ملک! تیرے ہی بچّوں نے تیری عصمت لوٹ لی..... فرانکو! غدار فرانکو! ہمارا عزم تیری مکّاری اور بزدلی پر قہقہے لگا رہا ہے۔ کیا تُو اپنے کو محفوظ سمجھتا ہے (تلخ ہنسی ہنستا ہے) انتقام! انتقام! مزدور کی عزّت کا انتقام! ملک کی عصمت کا انتقام! (آہٹ ہوتی ہے) کون؟

فنجی— ؟۔

فنجی:۔ (داخل ہوتی ہے) وولفگ! ابھی سب نہیں ختم ہوا ہے۔

وولفگ:۔ سب تو کبھی نہیں ختم ہوگا۔

فنجی:۔ فرانکو آج گیارہ بجے رات کو فاتحانہ کر و فر سے شہر میں داخل ہوگا۔ فینٹ کے جنگلوں میں ہمارے آدمی جمع ہو رہے ہیں۔ وہ اچانک اس پر ٹوٹ پڑیں گے اور ایک آخری قسمت آزمائی کرینگے۔

وولفگ:۔ لیکن پیاری اب یہ کوشش بے سُود ہے۔

فنجی:۔ وولفگ تم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بے سود ہے۔

وولفگ:۔ ہمارے نہتے مزدور لکڑی اور مولی کی طرح کاٹ کر پھینکدے جائینگے۔

فنجی:۔ لیکن اگر ہم فرانکو کی گاڑی تک پہونچ گئے؟

وولفگ:۔ چلو یہی سہی۔ میں چلتا ہوں۔ اسوقت کیا بجا ہے؟

فنجی:۔ نو بج چکے ہمیں دس بجے تک ضرور پہونچ جانا چاہیئے۔

(وولفگ اپنا کوٹ پہنتا ہے اور میز کی دراز سے ایک
ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیتا ہے۔)

وولفگ:۔ مزدور زندہ باد!

فنجی:۔ انقلاب زندہ باد! (دونوں جاتے ہیں)

چوتھا منظر

(ایک ویران گلی)

فنجی:۔ آج ہماری آخری رات ہے۔

وولفگ:۔ (ٹھنڈا سانس لیکر) پیاری فنجی!

(دونوں مضبوطی سے ایکدوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں)

(ایک قبرستان آجاتا ہے)

فنجی:۔ ایڈرتھ کو کیا ہوا؟

وولفگ:۔ آہ بہادر شاعر! ہم اسے کبھی نہیں سمجھے! اس نے اپنا پاس مجھے دیدیا تھا اور خود ہمارے ساتھیوں کے ساتھ میڈرڈ کے خوفناک مورچہ پر بڑی جانفروشی سے لڑا۔

فنجی:۔ (اُچھل پڑتی ہے) کیا سچ!

وولفگ:۔ ہاں! ہاں! جب ہماری فوج میڈرڈ سے پسپا ہو کر یہاں کریمان پہونچی تو وہ بھی اُس میں شامل تھا۔

فنجی:۔ پھر! پھر! پھر کیا ہوا؟ (وولفگ کے کوٹ کا دامن کھینچتی ہے)

وولفگ:۔ وہ پہلے ہی سے زخمی تھا اور یہاں سپتال میں مر گیا۔ جانکنی کی حالت میں جب پادری نے اُس سے خدا کا نام لینے کو کہا تو اُس نے تمہارا نام لیا۔

(فنجی دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیتی ہے اور ایک
قبر کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

فنجی:۔ آہ شاعر اعظم!

(ایکدم سے بہت زور سے بینڈ بجنے کی آواز آتی ہے اور توپیں سر ہوتی ہیں)

وولفگ:۔ فرانکو قبل از وقت آپہونچا اب؟

فنجی:۔ پیارے وولفگ سب کچھ ختم ہو چکا۔

وولفگ:۔ ہمت کرو فنجی! جب تک ہمارا سُرخ پرچم دُنیا کی ہر بلندی پر لہرا نہ لے گا ہم دم نہ لیں گے۔

فنجی:۔ اور وہ یقیناً لہرائیگا۔ انقلاب کی لغت میں مایوسی کا لفظ نہیں۔

وولفگ:۔ آخری وقت شاعر اعظم نے بھی یہی الفاظ کہے تھے۔

فنجی:۔ ایڈرتھ! ایڈرتھ! شاعرِ اعظم! میرا شاعرِ انقلاب! (رونے لگتی ہے)

وولفگ:۔ (اس پر جھکتا ہے اور اُسکی پیشانی چُوم لیتا ہے) ہیں ہیں فنجی!

فنجی:۔ وولفگ یہ خوشی کے آنسو ہیں!

وولفگ:۔ شاعر اعظم نے اپنے کتبہ قبر کے لئے یہ مصرع منتخب کیا تھا—
—— زندگی عمل و جد و جہد کے لئے ہے۔

فنجی:۔ اُس نے یہ مصرع اپنے خون سے لکھ دکھایا اور صرف اس ایک مصرع کی بدولت اُسے ابدی زندگی مل گئی۔

(بینڈ قریب آجاتا ہے اور زور زور سے بجنے لگتا ہے۔)

——— (پردہ) ———　　وجاہت سندیلوی

توبہ میری!

"کھوں کھوں ـــ اے کھوں۔ توبہ میری! کھوں۔ ذری باہر آنا بڑھیا ـــ ب ـــ بڑھیا! وہ لٹھیا اِدھر سرکا دے ری۔ توبہ میری! کھوں کھوں۔ کریم تو اب اچھا ہے، تو کدھر جا کر مر گئی؟ توبہ میری!"

چوہے کی سی سفید ڈاڑھی، گنجا سر، لٹکی ہوئی ناک، اندر گھسے ہوئے ہونٹ، سلوٹیں پڑا چہرہ! جیسے کوئی لاش بیٹھی کھانس رہی ہے! دہلیز کے باہر ایک کھٹولے پر بیٹھا پھیپھڑوں کے سمٹنے پھیلنے کے جھٹکوں سے گھٹنوں میں سر دیئے جھک جھک جاتا تھا۔ ساتھ کی دیوار بلغم سے پٹی پڑی تھی۔ دور دو بیل کھڑے خشک تنکوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس پار پنہاریاں پانی بھری گاگروں سے لدی سینہ تانے ایک گلی میں گھسی جا رہی تھیں۔

کبڑی بڑھیا اندر سے ہانپتی ہوئی نکلی: "ارے کیا شور مچا رکھا ہے تو نے؟ گھڑی بھر کیلئے اندر جاتی ہوں کہ تیرے گولی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر لٹھیا کھٹ کالی ہوئی۔"

بوڑھا کھانستے ہوئے بولا: "اے اتنا غصہ نہ دکھا۔ گھونٹ بھر پانی پلا دے میرا حلق جل رہا ہے۔"

"تجھے کیا معلوم اندر تیرے لال پر کیا بیت رہی ہے، سانس لینا بھی دوبھر ہے اسے۔ اب پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ ہاتھ پیر جھٹکاتا ہے اور بے مطلب باتیں کرتا ہے، ایک بار تو پتھرا گئی تھیں اس کی آنکھیں۔"

بوڑھے نے لٹھیا لیکر وہیں دھر دی اور کھٹولے پر سے اپنی سوکھی لکڑی ایسی ٹانگیں لٹکا کر بولا: "لے ذری مجھے تھام کے لے چل میں سمجھا موسمی تاپ ہے، اتر جائیگا۔ تو نے تو بڑی بھکی بات کر دی۔ کلیجہ دہلا دیا میرا۔ لے ذری تھام میرا ہاتھ۔ کھینچ مجھے۔ توبہ میری۔"

کھسکتے ہوئے دونوں اندر گئے۔ پھٹے پرانے بستر پر ایک نوجوان پڑا کراہ رہا تھا۔ گردن کو اس بیقراری سے جنبش دیتا تھا جیسے اس کے سر میں شعلے اٹھ رہے ہیں۔ پاؤں یوں جھٹکتا تھا جیسے تپتے لوہے پر چل پھر رہا ہے، ہونٹ اوپر چڑھ گئے تھے۔ بتیس کے بتیس خوبصورت زرد دانت مسوڑوں سمیت نظر آ رہے تھے!

بوڑھا اس کی کھاٹ کے قریب جا کر تقریباً گر پڑا: "اے کریم خاں! اے کریم بیٹا۔ بیٹا کریم۔ اے کریمو۔ اے بات تو سن میری۔ سن رہا ہے کیا؟ کھوں ـــ کھوں کھوں ـــ کھوں ـــ اے ـــ اے سنتا ہے کچھ؟ تیرا بوڑھا باپ تیرے سامنے بیٹھا ہے۔ کیا کھائے گا؟ پانی پیئے گا؟ پیاس ہے؟ نہیں ہے؟ ـــ ارے دیکھ سر ہلا رہا ہے تیرا لال ـــ پیاس نہیں ہے اسے۔ کیا کھائیگا؟ صبح والی کھچڑی گرم کر لا بڑھیا ـــ اے سنتی ہے؟ ـــ کریم بیٹا تم بولتے کیوں نہیں؟"

بے قرار سرخ آنکھیں بوڑھے کے زرد چہرے پر جم گئیں اور پپڑیاں جمے ہونٹوں میں ناتواں سی جنبش ہوئی: "میرے دل پر بہت بوجھ ہے ابا۔ میں بہت پریشان ہوں!"

"یہ بخار کمبخت اسی طرح شدت سے چڑھتا ہے، اور اترتا بھی پل میں ہے، بس چٹکی بجاتے میں!" بوڑھے نے اپنی بوڑھی بے رونق انگلیوں سے چٹکی بجانا چاہی مگر ناکام رہا!

نوجوان پھر اسی دھیمی دردناک آواز میں بولا: "کل مولبی جی کہہ رہے تھے۔ میں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا اس لئے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے ـــ" اس نے چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔

بوڑھا بھی ہول گیا۔ مگر تسلی دیتے ہوئے بولا: "آج اسی لئے تو بہت سی گھنگنیاں بانٹی تھیں تمہاری اماں نے۔ مٹھی مٹھی بھر معصوم بچوں کو دیتی گئی اور وہ تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگتے رہے، شکر رکھوڑ کر مولبی جی کے ہاں بھی بھجوا دی تھیں۔ کورے برتن میں ڈال کر بڑھیا نیم تلے بھی بکھیر آئی تھی۔ اب تو اچھا ہو جائے گا۔ لے آئی کھچڑی؟" بوڑھے نے ہاتھ ٹیک کر بیٹھتے ہوئے کہا: "رکھ دے اِدھر۔ اٹھا اپنے لال کو۔ کھا لے میرے بچے۔ دو چار دانے نگل لے۔ طاقت آ جائے گی۔ پریشانی مٹ جائے گی۔ نہیں کھائے گا تو وہیں ہنڈیا میں ڈال آ ری۔ باہر رہنے سے بو پڑ جائے گی اس میں۔ شام کو کام آئے گی۔ بیٹے، کچھ سونے کی کوشش... کھوں ـــ کھوں کھوں ـــ کھوں ـــ اغ ـــ اغاہ ـــ تھوہ!"

بوڑھا زمین پر جھک گیا۔ اور پھر دونوں آنکھیں کپڑے سے رگڑتے ہوئے بولا: "توبہ میری!"

کبڑی بڑھیا ہانپتی ہوئی آئی اور بچے کے سرہانے بیٹھ کر اس کے

ماتھے کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔ بوڑھا کھاٹ کے ایک بازو پر کہنیاں دھرے کریم کے ابھرتے اور بیٹھتے سینے کو ٹکٹکی باندھے گھورنے لگا۔ کریم اب اتنا بیقرار نظر نہ آتا تھا۔ بڑھیا ہولے ہولے پھٹی پھٹی آواز میں گنگنانے لگی:۔ الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمٰن الرحیم ......!

بوڑھے کے ہونٹ بھی ہلنے لگے اور آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

اور پھر ایک ساتھ دونوں نے کریم کے ماتھے پر "چھو" کی۔ کریم کی کھیر پھیل گئیں اور بوڑھا جوڑا خوشی سے لرزنے لگا۔ جیسے انہوں نے اپنے لال کو آبِ حیات کا ایک مٹکا پلا دیا ہے!

کریم کی آنکھ لگ گئی۔ بڑھیا آہستہ سے اٹھکر دہلیز پر آبیٹھی۔ اور بوڑھا پیچھے کھسکتا ہوا دیوار سے لگ کر اونگھنے لگا!

دو سال سے بوڑھا کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔ اور دو سال سے اُن کا نوجوان خوبصورت بیٹا کریم چھکڑا چلاتا تھا۔ گاؤں سے قصبے تک اُسے چونگی مل جاتی تھی۔ اور پھر ہفتے میں دو تین بار تو قصبے کے سیٹھ اُسے ضرور بلا لیتے تھے۔ مہینہ بھر سے بوڑھے والدین کو کریم کی شادی کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس لئے کھانے کے بجائے بچانے میں انہیں مزا آنے لگا۔ ماں باپ کا یہ نیا شوق دیکھکر کریم بھی لمبے لمبے سفروں پر جانے کے لئے تیار ہو جاتا۔ بڑھیا پڑوس کر تی پڑتی گاؤں میں ایک لڑکی کے متعلق بات بھی کر آئی تھی۔ اور اُسے لڑکی کے والدین کی باتوں میں اُمید کی جھلکیاں بھی نظر آگئی تھیں۔ کیونکہ جب وہ واپس آئی اور بوڑھے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا "لے اب بتا بھی۔ منہ اُٹھائے کدھر بھاگی جا رہی ہو؟" تو وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی "میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں، پھر بتاؤنگی سارا حال"! بوڑھے کو وفورِ مسرت میں کھانسی چھوٹ گئی۔ اور وہ زمین پر زور زور سے تھوکتے ہوئے بولا "توبہ میری۔ اے توبہ ــ شکر ہے تیکر ہو میرے مالک۔ اخ تھو! شکر ہے ــ توبہ میری!"

کل شام سے کریم کو بخار آرہا تھا۔ سارے گاؤں میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر سے بنفشے کے کاڑھے کی بو آتی تھی۔ اور لوگوں کو چائے کی چسکیاں دے دیکر ذیلدار تنگ آگیا تھا۔ دکانداروں نے سونف اور گلقند کا بھاؤ چڑھا دیا تھا۔ بوڑھے نے بھی پرانے میلے چیتھڑوں میں بندھی ہوئی جڑی بوٹیوں کو کھول کر "پھنکی" بنائی اور کریم کو کھلادی۔ مگر اُسے ایسا بخار چڑھا کہ اُس کے جسم سے گز گز بھر کے فاصلے سے تپش محسوس ہوتی تھی۔ پہلے تو دیوانے ہو گئے دونوں۔ بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ گرتے پڑتے رینگنے لگتے، اور بڑبڑاتے جاتے: "اب کیا کیا جائے۔ اب کیا ہوگا! نبض کیسے چل رہی ہے؟ سانس کیسے آرہی ہے؟ ماتھے پر پسینہ آگیا کیا؟ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے؟ طبیعت متلا رہی ہے اسکی؟ اب کیا ہوگا!"

آدھی رات کو کریم کا بخار ہلکا ہوا تو جان میں جان آئی۔ مگر نیند نہ آئی۔ بوڑھا کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا۔ کسی نے اچانک زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کریم کی آنکھ لگ رہی تھی بھڑک کر اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ بوڑھا چلا کر بولا "اے کون ہو اسوقت؟ کیا کام ہے؟ دہلا دیا میرے بچے کو!"

باہر سے ایک کرخت آواز آئی "اے بوڑھے۔ ملک جی کہہ رہے ہیں آج سوتو گے بھی یا یونہیں کھانستے اور کھنکارتے رہو گے۔ تیری کھانسی نے محلے بھر کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ ملک جی کروٹیں بدل رہے ہیں شام سے! کہتے ہیں بوڑھے کو کہو اتنا زور سے نہ کھانسے۔"

"مجال ہے حضور۔ مجال ہے میری۔ کھ کھ کھوں.... (منہ میں کپڑا ٹھونس کر) مجال ہے مجھ غلام کی"۔

کریم نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کون تھا؟"

"ملک جی نے تمہارے متعلق پوچھ بھیجا ہے"۔

کریم نے دو ایک بار آنکھیں جھپکائیں اور بند کر لیں ــــ

ملک جی انکے پڑوس میں رہتے تھے۔ قصبے میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ذرا بد دماغ واقع ہوئے تھے۔ ایک بار صاحب بہادر دورے پر تھے۔ ملک صاحب کے آگے بوڑھے نے ہاتھ جوڑے کہ بالشت بھر زمین پر اُگتا تو خاک نہیں لگان کہاں سے ادا کروں۔ لیکن انہوں نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ "صاحب بہادر کے سامنے پیش کر دونگا۔ وہ حوالات میں بند کر کے نکال لیں پیسے تیری گڑی ہوئی تجوری سے۔ سرکار اپنی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتی۔ سمجھے؟ تو تو سٹھیا گیا ہے!"

اور واقعی ملک صاحب نے صاحب بہادر کے سامنے بوڑھے بڑھیا کو پیش کر دیا۔ صاحب بہادر کو بھی بوڑھے نے وہی جواب دیا تو انہوں نے اپنی پتلی چھڑی سے بڑھیا کی بالیاں چھوتے ہوئے کہا۔ "وَل انہیں بیچ ڈالو۔ سرکار پیسہ نہیں چھوڑیگا۔ سرکار کا پیسہ تم نہیں رکھو! سرکار جیل بھیجدیگا۔ سرکار سزا دیگا۔ سمجھا تم لوگ؟ ایں؟"

صاحب بہادر نے بڑھیا کی بالیاں کیا چھوئیں بوڑھے کے کلیجے پر انگارہ دھر دیا۔ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ بڑھیا کو اشارہ کیا۔ اس نے بالیاں نوچ کر صاحب بہادر کے قدموں میں ڈال دیں اور دونوں گھر چلدئے۔ "بڑا واہیات ہے یہ اولڈ مین!" صاحب بہادر سگار کو انگلیوں

میں گھماتے ہوئے بولے۔ لیکن بوڑھے کے دل میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا تھا! بل کھاتا جا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا۔ بڑا آیا صاحب بہادر بن کر وہاں سے! گاؤں بھر کے سامنے بالیوں پر چھڑی پھیرنے لگا۔ حاکم تھا ورنہ کمبخت کی یوں گردن اینٹھتا کہ صاحب بہادری ہوا ہو جاتی۔ پیسے کی خاطر میری عزت پر ہاتھ پھیرتا ہے، اونہہ!"

اور بڑھیا بے چاری نے بھی وہ رات روتے بسورتے گزاری۔

ملک جی نے اُس دن سے اُس گھر سے مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر اب اتنا کرم کرتے تھے کہ کبھی کبھار کریم کو بلانے آنکلتے تھے۔ اور وہ دن بھر سر پٹخ کر چونی کما لاتا تھا۔

آج پو پھٹتے کریم پر بخار نے پھر حملہ کیا۔ ایک بار درد کی بھی شکایت کی۔ مگر بوڑھے کی پھکی آڑے آ گئی۔ دوپہر کو بخار کچھ ہلکا ہوا تو بوڑھا باہر آن بیٹھا تھا کہ بڑھیا کے کہنے پر پھر اندر جانا پڑا۔

اب کریم سو رہا تھا۔ بوڑھا دیوار کا سہارا لیتا بڑھیا کے پاس چل بیٹھا اور بولا "کتنی رقم ہو گئی؟ ہنسلی بن جائے گی؟ کپڑے بھی تو بنوانے ہیں! اور سنا ہے ہماری بہو سلوار پہنتی ہے، "گھیرے دار"، کوئی اچھا سا بھڑکیلا کپڑا خرید لو سلوار کے لئے، یہ جو نئے نئے کپڑے نکلے ہیں۔ اِن ہی میں سو چھانٹنا دیکھنا۔ حرف نہ آئے میرے لال کی جوانی پر۔ اسی کی کمائی ہے، اسی پر خرچ ہو تو ہمیں درو کیا۔ ہمیں تو خوشی ہے، ہمیں دو وقت کے کھانے سے غرض ہے، سو کچھ کمی نہیں، اللہ کا فضل ہے!"

بڑھیا بولی "ساڑھے بارہ روپے ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ روپیہ دوا دارو اور گھنگنیوں پر خرچ آئے۔ پانچ آنے کی شکر بھی لائی تھی۔ اچھا ہو کر اور کمالائیگا میرا لال۔ اِدھر ملک جی سے کچھ مانگا ہوتا"

"اُلٹا جوتا دکھاتے ہیں ملک جی۔ لگان والی بات یاد ہے؟"

بوڑھی کے کانوں کی لویں لرز گئیں۔ جن میں ایک کھلا سوراخ جیسے پرانی یاد کو تازہ کر رہا تھا!

کچھ دیر کے بعد بڑھیا اندر گئی اور پھر ہاتھ نچاتی باہر آ کر بولی۔

"اُتر گیا بخار۔ چہرے پر رونق آ رہی ہے، اب اچھا ہو جائیگا"

بوڑھا اکڑوں بیٹھکر تھوکتے ہوئے بولا "پھکی کی کرامات کا یقین تھا مجھے۔ تین روز ہوتے لورے کے اونٹ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ گڑ میں ملا کر یہ پھکی کھلائی تو اُٹھ کر اسی وقت بھاگنے اور ڈکرانے لگا۔ بڑے بوڑھوں کی چٹکیاں اکسیر ہوتی ہیں"

دونوں اندر کریم کے پاس چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پر اٹھکر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی ماں بہت دیر تک اس کے شانے اور پیٹھ سہلاتی رہی۔

چراغ جلے ملک جی آ دھمکے۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ بوڑھے نے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا کہ کھانس نہ سکے۔ بڑھیا پریشانی میں ہاتھ ملنے لگی اور کریم چارپائی پر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ملک جی بولے "کیوں؟ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"بخار ہو گیا ہے اسے؟" بڑھیا بولی۔

"اب کیسا ہے؟"

"جی اچھا ہوں اب تو"

"اب اچھا ہے جی" بوڑھا منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے بولا۔ "اب اچھا ہے ورنہ ہم تو نا اُمید ہو بیٹھے تھے۔ قرآن شریف کے ختم کے ارادے کر رہے تھے ہم تو"

ملک جی بولے "جنگ کی وجہ سے گیہوں کا نرخ چڑھ گیا ہے نا۔ اس لئے میں آج سو بوریاں قصبے میں بھجوانا چاہتا ہوں۔ صبح صبح وہاں ضرور پہونچ جانی چاہئیں۔ کریم اگر آ سکے تو آج رات چھ آنے ملینگے"

"توبہ" بوڑھا بولا "یہ کیسے آ سکتا ہے جی۔ یہ تو کھاٹ پر سے مشکل سے اُٹھا ہے"

بڑھیا بلبلا اٹھی "سانس لینا بھی دو بھر ہے اِسے، بہت کمزور ہے جی"

"میں اچھا ہوں" کریم بولا "میں چلوں گا قصبے میں۔ کس وقت چلنا ہو گا؟"

ملک جی بولے "ابھی۔ دوسرے چھکڑوں والے تو لاد بھی چکے ہوں گے"

"تو میں آیا!"

ملک جی چلدئے۔ بوڑھے اور بڑھیا نے کریم کی منتیں کیں کہ اس حالت میں چھ آنے کے لئے سرد رات میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن کریم بولا "کمبل اوڑھ لوں گا۔ آخر ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر یوں آرام کرنے لگے تو پیٹ کیسے بھرے گا اور ہنسلیاں، کپڑے اور سلواریں کیسے بنیں گی؟ میں صبح سویرے پلٹ آؤں گا گھر کو۔ جاتے بھی لے آؤنگا قصبے سے۔ اور کچھ ضرورت ہو گی؟"

کریم اُٹھا۔ بوڑھا جوڑا پریشان اور حیران اُسے دیکھتا رہا۔ کریم نے کمبل اوڑھا چہرے پر پگڑی کا ایک پلو پھیلا دیا اور باہر آ کر چھکڑے کے آگے بیل لگا دئے،

بوڑھا بولا "دیکھ رہی ہے ری! شادی کی خوشی میں جان کی پروا نہیں کرتا"

"ہاں۔ کل کہہ رہا تھا، میں کوڑی کوڑی اکٹھی کرونگا مگر تمہیں دم بھر کے لئے بھی کسی کا محتاج نہ ہونے دوں گا۔ اُسے اپنی شادی کی اتنی فکر نہیں جتنی ہماری فکر ہے۔"

"اے تو کیا جانے" بوڑھا بولا "تو نہیں جانتی۔ دیکھ وہ چلدیا۔ یا الٰہی خیر۔"

"فی امان اللہ۔ اُف کتنی سردی ہے۔"

"توبہ میری!"

⁂

چھکڑوں کی قطار کچی سڑک پر چرچراتی ہوئی چلی تو یکے بعد دیگرے سب چھکڑے والے کریم کو کوسنے لگے "اے باگ ہلا اور نہ پیچھے ہٹ آ۔ ہمیں تو راستہ دے۔ کیا ٹخ ٹخ لگائے جارہا ہے؟ سو رہے ہیں تیرے بیل؟ پیچھے ہٹ آ۔"

اور اس طرح پیچھے ہٹتے ہٹتے کریم قطار کے آخری سرے پر پہونچ گیا۔ تمام چھکڑوں والے کریم سمیت بوریوں پر لیٹے جا رہے تھے اور اندھیری رات پہیوں کی بھیانک چیخوں سے گونج رہی تھی!

صبح کو دن چڑھے ملک جی غصے میں لال پیلے ہوتے بوڑھے کے پاس آئے اور چلا اُٹھے "گدھر گیا وہ تمہارا لاڈلا۔ کہاں پھینک آیا میری بوریاں۔ اُسکے ساتھی قصبے سے ہوکر آبھی گئے کب کے۔ اور وہ ابھی تک یہاں نہیں پہونچا۔ گھر میں تو سب کچھ نہیں ڈال گیا؟" — اور ملک جی اندر آکر چارپائیوں کے نیچے جھانکنے لگے "کدھر مر رہا وہ بدمعاش"

بوڑھا کانپتے ہوئے بولا "وہ جی بس رات کو نکلا تھا سب کے ساتھ پھر واپس نہیں آیا اب تک۔"

بڑھیا بولی "اُسے سودا خریدنا تھا قصبے میں! ابھی واپس آجائیگا۔"

"مگر میری بوریاں کیا ہوئیں؟" ملک جی زور سے فرش کو ٹھکراتے ہوئے گرجے!

اچانک بوڑھا چلا اُٹھا "وہ رہا ہمارا چھکڑا۔"

"بوریوں سمیت" بڑھیا بولی۔

"اور بادشاہ سلامت سو رہے ہیں اُوپر۔ خدا جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹ کر آرہے ہیں بیل" ملک جی بولے۔

لوگ چھکڑے کی طرف جھپٹے۔ بوڑھا جرڑا بھی انکے عقب میں رینگتے ہوئے جانے لگا۔

"اے حضورِ عالی۔ اے ملک کریم خاں۔ اٹھو جی" ملک جی کریم کا لٹکا ہوا بازو ہلا ہلا کر بولے۔

اُن کا ایک ملازم آگے بڑھا۔ اور کریم کے چہرے سے کمبل کھینچکر پکارا "اے کریمو۔ اُٹھو بھی۔ ایسی بھی کیا نیند ہوئی کہ....."

"اے ذرا دیکھنا اُوپر چڑھکر" ملک جی بولے "کیا ہوگیا ہے اِسے"

ایک شخص چھکڑے پر چڑھ گیا۔ کریم کی پتلیاں اُوپر چڑھ گئی تھیں اور تھکی ہوئی آنکھیں ہڈی کے پُرانے بٹنوں کی طرح بے نور تھیں!

ملک جی ناک پر رومال پھیلاتے ایک طرف ہوکر بولے۔ "مر گیا ہے۔"

دُور بوڑھا بڑھیا کا ہاتھ تھامے آرہا تھا اور پکار رہا تھا "اے ذرا تیز چل۔ تیری آواز سے جاگ اُٹھے گا۔ قدم تک نہیں اُٹھا سکتی تو! توبہ میری!"

احمد ندیم قاسمی

⁂

فاؤسٹ

"فاؤسٹ" اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم اور مسحور کُن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شُہرۂ آفاق شاعرِ المانیہ "گوئٹے" نے دُنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھینگے جو بیک وقت سہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول ڈاک۔

محبت اور نفرت

تہدیہ محبت نفرت کے نام

اُردو کے سب سے جدّت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ محبّت ایک کانٹا ہے چُبھنے کیلئے اور نفرت ایک پھول ہے سُونگھنے کیلئے۔

قیمت ایکروپیہ چار آنے محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر صاحب کوئی پچاس کے لگ بھگ ہونگے۔ گذشتہ سال ڈیڑھ سال سے وہ اپنے وطن رائے بریلی سے منتقل ہوکر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے اور یہیں اپنا مطب کھول لیا تھا۔ ویسے تو وہ دانتوں کے ڈاکٹر تھے لیکن علاج ہر مرض کا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہیں طب کی ہر شاخ میں تھوڑا بہت دخل ضرور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کثیر العیال اور اسی نسبت سے غریب۔ آئے دن کی مالی پریشانیوں کی ہی وجہ سے اُنہوں نے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں دُکان لگائی تھی۔ لیکن جس چیز سے بھاگ کر وہ آئے تھے اُس نے یہاں بھی انکا پیچھا نہ چھوڑا۔ انتہائی کوشش اور غیر معمولی صبر کے باوجود اُن کا مطب یہاں بھی نہ چلا۔ صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک وہ اپنی دُکان پر بیٹھے رہتے لیکن کبھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اور وہ روز بروز قرض کے بار کے نیچے دبتے گئے۔

میری اُن کی ملاقات بھی عجیب طرح ہوئی۔ میرے اخبار کا دفتر بازار کے قریب ہی ایک گلی میں ہے۔ ایک روز صبح کو مَیں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ ایک ڈاکٹر صاحب اپنی دُکان کے اشتہار کے سلسلہ میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی اُن کو بُلوا لیا اور کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھئے، کہئے جناب نے کیسے زحمت کی۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟"

"جی ہاں، شکر ہے خدا کا — میں اس وقت اس لئے حاضر ہوا تھا کہ اپنی دُکان کے اشتہار کے متعلق کچھ گفتگو کروں۔"

"شوق سے، شوق سے، فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"جی ہاں، آپ کو تکلیف ہی تو دینے آیا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں، دانتوں کا۔ میری ایک دُکان ہے، یہاں سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ یہی آپ کی گلی کے نکڑ کے قریب بازار میں۔ حضرت ایک سال سے نہایت محنت اور دیانتداری سے کام کر رہا ہوں۔ لیکن کاروبار کسی طرح نہیں بڑھتا۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ کے روزنامے میں اپنی دُکان کا اشتہار دوں۔ کہئے آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ضرور، ضرور، یہ نرخنامۂ اشتہارات ہے۔ آپ اسکو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ اسکے علاوہ ہم نے اشتہاروں کے مضمون بنانے کیلئے ایک آدمی لازم رکھا ہے جس نے خاص طور پر اس فن میں مہارت حاصل کی ہے۔ آپکی منشا کے مطابق اشتہار تیار کر دیا جائیگا۔"

"بہت خوب، جی میں نے آپ کے اشتہار کی بہت تعریف سُنی ہے۔ اِسی وجہ سے میں نے سوچا کہ آپ کو تکلیف دوں۔"

"آپ کے اِنچ کا اور اخبار کے کونسے صفحے پر اشتہار چاہتے ہیں؟"

"یہی بس ایک چھوٹا سا مضمون ہو۔ لیکن کسی ایسی جگہ شائع کیجئے کہ اخبار پر نظر پڑتے ہی اشتہار صاف دکھائی دے جائے۔"

"تو آپ پہلے صفحے پر چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں، جہاں آپ مُناسب سمجھیں، بڑی عنایت ہے آپکی۔"

"اجی صاحب، عنایت ہی کیا۔ ہم لوگ تو آپ حضرات کے خادم ہیں، خادم! لیکن جیسا کہ آپ کو نرخنامہ سے پتہ چلا ہو گا ہم لوگ پہلے صفحے کیلئے زیادہ روپے لیتے ہیں۔"

"دُرست ہے، دُرست ہے — تو پہلے صفحے پر اشتہار شائع کرانے کیلئے زیادہ اُجرت دینی ہوتی ہے، بہت زیادہ!"

"آپ فرمائیے تو کس قدر خرچ کر سکتے ہیں اور کتنے دن تک اشتہار شائع کرانے کا ارادہ ہے؟"

"مَیں بہت مجبور ہوں، جی ہاں، بہت زیادہ، میری مالی حالت اس درجہ سقیم ہوگئی ہے کہ اس وقت تو مَیں کچھ بھی خرچ نہیں کرسکتا۔ آپ اشتہار شائع کرینگے۔ اللہ نے چاہا تو میرا روزگار بڑھے گا۔ اسوقت میں حسب استطاعت آپکی کوئی خدمت کر دونگا۔"

"تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ مفت ہی اشتہار شائع ہو جائے۔ لیکن آپ خود ہی سوچئے یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم لوگ بھی تو آپ کی طرح تاجر ہیں۔"

"جی یہ تو دُرست ہے۔ لیکن آپ کا کاروبار خدا کے فضل سے خوب چل رہا ہے۔ آپ کا اخبار ہزاروں کی تعداد میں بکتا ہے۔ بھلا میرا اور آپکا مقابلہ کیا ہوسکتا ہے۔"

"بہر حال مجھے سخت افسوس ہے کہ ان حالات میں تو مَیں آپکی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموشی سے میرا مُنہ دیکھا کئے

اسکے بعد آہستہ سے کھڑے ہوئے، نرخنامۂ اشتہارات پر ایک نظر ڈالی اور سلام کرکے کمرے سے باہر چلے گئے۔

چپراسی جو شاید باہر سے ہم لوگوں کی گفتگو سن چکا تھا۔ ڈاک لیکر بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "نہ معلوم کہاں سے دُنیا زمانے کے مفت خورے آجاتے ہیں"۔

میری اور ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کو کئی دن ہو چکے تھے اور میں اِس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا۔ ایک دن رات کو دفتر سے کام ختم کرکے کوئی دس بجے جب میں گھر جارہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی تک اپنی دُکان پر بیٹھے ہیں۔ ایک میلی کچیلی چمنی کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں نے دُکان کے پاس سے گذرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا، لیکن وہ نہ معلوم کن خیالات میں غرق تھے کہ جواب تک نہ دیا۔

دوسرے دن صبح کو جب میں دفتر گیا تو میں نے چپراسی کو ایک پرچہ دے کر ڈاکٹر صاحب کو بُلوایا۔ ڈاکٹر صاحب بہت اُداس معلوم ہورہے تھے۔

"کہئے مزاج تو اچھا ہے جناب کا۔ کچھ سُست سُست سے نظر آرہے ہیں آپ"۔

"جی ہاں، کئی دن سے سخت پریشان ہوں۔ منجھلی بچی کو میعادی بخار ہوگیا ہے، بہت تکلیف ہے اُسے"۔

"اوہو، ہو، نہایت افسوس ہے ـــــ اُس روز آپ اشتہار کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ میں نے اُس کے متعلق سوچا، مجھے آپ کے مزید حالات بھی اپنے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوئے۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ میں جو کچھ بھی آپ کے لئے کرسکتا ہوں، کرتا رہونگا۔ بہرحال کل سے آپ کی دُکان کا اشتہار کسی اچھی جگہ شائع کردیا جائیگا"۔

"واقعی ـــــ! میں آپ کا بیحد شکر گزار ہونگا۔ مجھے جناب سے ایسی ہی اُمید تھی۔ اسی لئے تو میرا دل رہ رہ کے کہتا تھا کہ مایوس ہونیکی کوئی وجہ نہیں......"

"خیر، اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ میری ذات سے اگر آپ کو تھوڑا سا فائدہ پہونچ جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔ بہتر ہے۔ بس اسی لئے میں نے آپ کو اس وقت تکلیف دی تھی"۔

رفتہ رفتہ میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بڑھتے گئے۔ اب اُن کا زیادہ وقت میرے اخبار کے دفتر میں ہی گذرتا۔ دُکان پر وہ اپنے کسی بچے کو بٹھا آتے اور اگر کبھی کبھار کوئی مریض آجاتا تو تھوڑی دیر کیلئے چلے جاتے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا۔ نہ معلوم کیوں، انتہائی کوشش کے باوجود لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی دُکان کی طرف توجہ نہ کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مَیں ڈاکٹر صاحب کے کم و بیش تمام خانگی حالات سے واقف ہوگیا اور مجھے ہر وقت یہ خیال رہنے لگا کہ ایسے نیک نفس کی کسی نہ کسی طرح مدد کی جائے، چنانچہ میں نے ذاتی طور پر اپنے تمام دوستوں سے ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ کردیا تھا۔ اور سب نے وعدہ کرلیا تھا کہ اگر کبھی کسی کو کوئی شکایت ہوئی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے ضرور رجوع کرینگے۔

اِسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کی رفیق زندگی کا ایک بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے اس قدر تنگدست ہورہے تھے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔

بیوی کی موت کا ڈاکٹر صاحب پر بہت بُرا اثر پڑا۔ انکی پریشانیاں پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نئی زندگی کے بھی عادی ہوگئے۔

اسکے بعد سے ڈاکٹر صاحب کا بیکاری میں سوائے اسکے کچھ کام نہ تھا کہ وہ ہر کس و ناکس سے میری تعریف کرتے رہیں یا میری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ اُنکی اس تبدیلی پر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ افلاس نے اُنکی ذہنیت حد درجہ خوشامدانہ کردی تھی۔

میری والدہ عرصے سے دانت لگوانے کا ارادہ کررہی تھیں۔ چنانچہ مَیں اپنی جگہ طے کرچکا تھا کہ جونہی وہ چھوٹے بھائی کے یہاں سے ناگپور سے آئیں، مَیں اُنکے دانت ڈاکٹر صاحب سے ضرور لگوادونگا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کی تھوڑی بہت آمدنی بھی ہوجائیگی۔

دن گذرتے گئے لیکن والدہ صاحبہ نہ آئیں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ وہ کئی مہینے سے دُکان کا کرایہ تک ادا نہ کرسکے تھے۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر ایسی کونسی تدبیر نکالی جائے جس سے ڈاکٹر صاحب کا کام کسی طرح چلے جائے۔

ایک دن صبح کو جب مَیں دانت صاف کررہا تھا تو میرے مسوڑھوں سے تھوڑی سی رطوبت اور خون نکلا۔ جب کھانا کھانے کے بعد مَیں دفتر جانے لگا تو اُس وقت بھی میرے دانتوں میں ٹیس تھی۔ میں نے سوچا کہ دفتر جاتے جاتے ڈاکٹر صاحب سے دوا لگوالونگا۔ لیکن جب مَیں اُن کی دُکان پہونچا تو وہ وہاں موجود نہ تھے۔ اُنکے بچے نے بتایا کہ وہ دفتر میں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تازہ پرچہ لئے پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میرے اُس مقالۂ افتتاحیہ کی تعریف کرنے لگے جو میں نے آج کے اخبار کیلئے لکھا تھا اور جس میں اپنے اہلِ وطن سے سامراجی جنگ میں شریک نہ ہونے کی پُرزور تلقین کی تھی۔

میں نے اُن کا قطع کلام کرتے ہوتے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، آج صبح سے میرے مسوڑھوں میں سخت تکلیف ہے، کوئی ایسی دوا لگا دیجئے کہ یہ درد جاتا رہے۔"

ڈاکٹر صاحب کچھ پریشان سے ہوگئے۔ دیر تک میرے مُنہ اور دانتوں کا معائنہ کرتے رہے۔ پھر اپنی دُکان لے گئے اور وہاں بھی یہ سلسلہ کم و بیش آدھا گھنٹہ تک جاری رہا۔

"آپ کے مسوڑھوں میں پیپ ہوگئی ہے اور شدید قسم کا پائیریا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کو اپنے دانتوں سے ہاتھ نہ دھونا پڑے ——"

"لیکن ڈاکٹر صاحب میرے مُنہ سے بدبو تو آتی نہیں اور نہ ہی کبھی اور نہ ہی کبھی پیپ وغیرہ نکلی ہے۔ آج نہ معلوم کیوں تھوڑی سی رطوبت اور خون نکل آیا!"

"جی ہاں، یہ تو دُرست ہے۔ ابھی پیپ اوپر نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے تو مجھے اُمید ہے کہ اگر پوری توجہ سے علاج کیا گیا تو آپ کے دانت بچ جائیں گے، بہرصورت حالت تشویشناک ضرور ہے اور آپ کو فوراً پوری توجہ سے اس کا علاج شروع کر دینا چاہیئے ——"

چُنانچہ ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا کہ فی الحال ایک سفوف جو انہوں نے خود تیار کیا تھا استعمال کرنا شروع کردوں اور اسی دوران میں وہ ایک اور دوا تیار کر دیں گے جس کے اجزاء انہیں کلکتے کی کسی بڑی دُکان سے منگانا پڑیں گے۔

شام کو جب مَیں گھر گیا تو بیوی کو سارا قصّہ سُنایا۔ وہ بیچاری سخت پریشان ہوئی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے ڈاکٹر صاحب کے گھر کی راہ لی اور مجھے آکر بتایا کہ بیس پچیس روپے لگا کر وہ ایک ایسی دوا تیار کر دیں گے جس سے یہ مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی حالت کو دیکھتے ہوتے میں اُنہیں زیرِ بار کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے شام کو دفتر سے واپسی پر پچیس روپے کے نوٹ ڈاکٹر صاحب کو دیدئے تاکہ وہ جلد از جلد میرے لئے دوا تیار کرسکیں۔ ڈاکٹر صاحب نے رسماً اور اخلاقاً روپیہ لینے سے انکار کیا۔ لیکن میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا۔

دوسرے دن اخبار کے ایک کام کے سلسلہ میں مجھے لکھنؤ سے باہر جانا پڑا اور پانچ چھ دن کے بعد واپسی ہوئی۔ دفتر جاتے ہوئے جب مَیں ڈاکٹر صاحب کی دُکان کے پاس سے گذرا تو اُسے بند پایا۔ دفتر پہونچنے پر جب میں نے چپراسی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ مالک دُکان نے کرایہ کی عدم ادائیگی کی وجہ سے دُکان خالی کرالی ہے۔

تیسرے پہر کو جب مجھے ذرا فرصت ہوئی تو میں نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے اُن کے گھر جاکر مل لوں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب گھر خالی کرکے کہیں باہر جاچکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اس طرح غائب ہوجانا میرے لئے یقیناً حیرت انگیز امر تھا۔ بیوی کو جب شام کو سارا حال معلوم ہوا تو وہ بہت جز بز ہوئی اور بگڑی۔ بہرحال یہ مَیں بھی نہ سمجھ سکا کہ اُن کی ناراضگی آیا اس وجہ سے تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری دوا تیار کرنے سے پہلے ہی چلے گئے یا اُن پچیس روپوں کی وجہ سے جو ڈاکٹر صاحب کو دے جاچکے تھے۔ لیکن اُنہیں کیا معلوم کہ مَیں ان پچیس روپوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً اور کتنے روپے دے چُکا تھا۔

دوسرے دن بیوی کی ہدایت کے مطابق مجھے کسی اور ڈاکٹر سے اپنے دانتوں کا معائنہ کرانا تھا کیونکہ اب اُنہوں نے بھی میرے مُنہ سے کچھ عجیب سی بُو سُونگھی تھی۔ چُنانچہ مَیں ڈاکٹر راج کے یہاں پہونچا جو یورپ کے سند یافتہ ہیں اور دانتوں کی بیماریوں کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے سخت تعجب ہوا جب اُنہوں نے معائنہ کے بعد بتایا کہ میرے دانتوں میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب کسی شدید غلط فہمی میں مُبتلا تھے۔

لیکن مَیں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسا کیوں کیا۔

بیچارے ڈاکٹر صاحب!!!

⁂

شاہد لطیف

عُمر

(شخصی و قومی)

نفس نفس، رواں دواں ہے عمر، مست و بیخبر
نہ سمت ہے نہ رہ گزر، مگر ہے بر سرِ سفر
خرام اک خیال ہے، قیام ایک انتظار

وہ برق جو تلاطمِ اثیر میں ہے موجزن
نسیم ہے کہ خود بخود رواں ہے سوئے خویشتن
خود اپنی آپ راہبر خود اپنے آپ پر سوار

تصورات چند کی وہ مختصر سی اک لڑی
جو دلربائے زندگی کے ہاتھ میں سے گر پڑی
بکھر گئی تو گُم ہوئی دِکھا کے خندۂ شرار

یہی ہے عمر قوم بھی ذرا سا امتیاز ہے
وہ اک جھپک ہے چشم کی یہ عشوۂ دراز ہے
مگر یہ طولِ عُمر بھی ہے لغزشوں سے تار تار

اگرچہ عُمر، زندگیِ سرمدی کی ہے کڑی
چڑھی بڑھی تو مہر ہے، نہیں تو صرف پھُلجھڑی
کہ اک زمانِ مختصر، سو وہ بھی موت میں شُمار

مُسافرانِ اجنبی کو چشم و دل ہیں راہبر
جہاں نظر ہی راہ ہو تو کیجئے نظر کدھر
کہ رہ نوردِ خویشتن ہے زندگیِ روزگار

قیام ہے کہ ہے سفر، مگر عیاں ہیں حرکتیں
حقیقتیں بدل رہی ہیں صورتوں پہ صورتیں
کہ رُوح و تن کے عالموں پہ چھا رہی ہے نو بہار

مرزا نظام شاہ لبیب

فرشتہ یا عورت

زیبا ـــــ کیا معلوم یہ اُس کا اصلی نام ہے یا تخلّص؟

ـــــ ہاں تو زیبا نے مجھے ایک نامۂ استفسار بھیجا ہے اور مجھ سے دریافت کیا ہے کہ فرشتے مذکر ہیں یا مؤنث۔ اور ساتھ ہی ساتھ خوشامد بھی کی ہے کہ میں چونکہ ہر فن مولا ہوں، اس لئے اس سوال کا جواب بھی ضرور جانتا ہونگا۔

بہت اچھا... میں ہی یہ "حجابِ راز" اُٹھاتا ہوں۔ زیبا لکھتی ہے۔ "تقریباً ہر مُلک اور ہر زبان میں فرشتہ مذکر ہے اور ہند کے شاعر تو اسے مذکر ہی باندھنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ لیکن کیا آپ ایک فرشتہ کا نظارہ ایک مردانہ تنومند اور کرخت جسم میں کر سکتے ہیں؟ (یاد رہے، کہ ناصح اور واعظ جیسی مستی کش ہستیاں بھی شعرا کے نزدیک فرشتے ہیں۔) نہیں۔ بلکہ فرشتہ کا تصوّر ایک لطیف مرمریں پیکر رعنائی میں ہی مجسم ہو سکتا ہے!

واقعی فرشتے صنفِ نازک میں سے ہیں"

زیبا کے اِن الفاظ میں نسائیت محوِ تکلم ہے۔ اس کی یہ آواز اور اس کے یہ احساسات دُنیا کی ہر عورت کے دل و دماغ میں موجود اور لرزاں ہیں۔ جہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ہر وہ ہستی کہ جسے "خوابِ طفلی، اور آرزوئے شباب" کہا جا سکے، اپنے آپ کو سو فی صدی فرشتہ تصور کرتی ہے، وہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے مردانہ دِلوں میں اپنے متعلق ایسے احساسات کا گزر تک بھی نہیں۔ مثال کے طور پر مجھے کبھی اپنے پر فرشتہ ہونے کا گمان نہیں گزرا، اور نہ ہی مجھے توقع ہوئی کہ کوئی ارضی حور مجھے بھی فرشتہ کے لقب سے موسوم کرے، اِس کے برعکس بارہا کسی دوشیزہ کے جلوۂ بے محابانے میری آہوں میں یہ صدا بھی ممتزج کر دی ہے کہ "خاصہ کی چیز ہے، فرشتہ ہے!" اور یقیناً ایسے واقعات دوسرے مَردوں پہ بھی بیتے ہیں، مگر اسکے مستثنیات بھی موجود ہیں کہ کئی مرد اپنے کو مَلک کہتے نہیں شرماتے، مثال کے طور پر لاہور کے ایک مشہور پروفیسر، امرتسر کے ایک مشہور حکیم اور لکھنؤ کے ایک مشہور حجّام ـــــ! لیکن اس کے باوجود ہمیں اِن حضرات کے فرشتہ ہونے کا اتنا ہی یقین ہے، جتنا انہیں خود ـــــ،

یہ امر واقعہ ہے کہ کسی حسینہ کے پیش نظر ہوتے ہی ہم بے اختیارانہ فرشتوں کے متعلق سوچنے لگتے ہیں، اور تو اور اُجڈ دہقانی بھی اپنے گیتوں میں عورتوں کو فرشتہ کہہ جاتے ہیں۔ کسی مدرسے کی تفریح کے وقت آپ اسکول کے بکڈپو پر کھڑے ہو جائیے، جب کوئی لڑکا زنانے سے نکلتا ہے تو آپ کہتے ہیں کیا خوش و توانا ہے اور جب کوئی بچی اُچھلتی کودتی باہر نکلتی ہے تو آپ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں "تیتری ہے، فرشتہ ہے!"

کیا ہم میں سے ہر ایک نے کبھی نہ کبھی کسی مجسمۂ ناز و نزاکت کے سامنے سرِ نیاز خم نہیں کیا؟ اور اِس طور اُس کے پاؤں نہیں پکڑے گویا وہ کوئی فرشتہ ہے۔ کہ ابھی اُڑا جاتا ہے۔ ہمیں اس وقت غیر شعوری طور پر ان تصویروں کا خیال آتا ہے جن میں فرشتوں کی لطافت اور معصومیت ان کے پروں سے عیاں ہوتی ہے۔ اور یا یہ جتانے کے لئے کہ فرشتے بھی عورتوں کی طرح زیب و زینت کے دلدادہ ہیں ان کو پرِ طاؤس سے مزیّن کیا جاتا ہے۔!

ایک مشہور شاعر کا خیال ہے کہ ہر حسین عورت ایک فرشتہ ہے۔ اور ایک صہبائے شباب سے مست نازنین کا خمار سے ہم میں انگڑائیاں لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پھر اپنے اصلی مسکنِ فلکی کی طرف اُڑ جانے کیلئے بازو پھیلائے ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

ـــــ اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا (عزیز لکھنوی)

اِسی دُنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو عورت کو فرشتہ ماننے سے قطعی منکر ہیں۔ ہمیں تو ان کی کم عقلی پر ہنسی چھوڑ رونا آتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "عورتیں شکل میں مَردوں سے مشابہ اور رتبے میں اُن سے کم ہیں" ہم مانتے ہیں کہ عورتیں قدرے مَردوں سے ہم شبیہہ ہیں۔ اور ان کا جسم و چہرہ انسانی ہے۔ لیکن یہ بات تو بچّہ بچّہ جانتا ہے کہ فرشتے انسانی اُمور میں دخل اندازی کرتے وقت ہمیشہ انسانی شکل و شباہت اختیار کر لیتے ہیں!

ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو۔ ایک مشہور شاعر اپنی ایک نظم میں گویا ہے:۔

"گاؤں کی الھڑ کنواری لڑکیاں چاندنی کے فرش پر محوِ رقص

تھیں، گرمیٔ حُسن کو فضا کی خنکی میں سمونے کے لئے اور اس خیال سے کہ اِس وقت بھلا کون اِدھر آئے گا اُنہوں نے وہ لباس پہن رکھا ہے جو حوّا نے کیلے کے پتّوں کے فیشن سے پہلے استعمال کیا تھا اور جس کے متعلق کسی شاعر نے لکھا ہے کہ "اس کا نہیں اُلٹا سیدھا، رقص زوروں پر ہے۔ کہ ایک طرف سے گرجے کا بوڑھا پادری سر جھکائے آتا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ اپنے اپنے کپڑوں کی طرف لپکتی ہیں۔ چند دانا لڑکیاں اپنے برگِ گل جیسے نازک لبوں سے یوں پھول بکھیرتی ہیں کہ کپڑوں میں تو پادری ہمیں پہچان لیگا۔ بہتر ہے کہ ناچتی جاؤ اور اس کا خیال تک بھی نہ کرو!" پادری یہ منظر دیکھکر ٹھٹکتا ہے اور وہیں سے واپس لوٹتا ہے اور خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ اُسے فرشتے نظر آئے۔ کیونکہ فرشتے دیکھنا فصل کی زرخیزی کی علامت ہے!"

اگر اور نمونہ مطلوب ہو تو ملاحظہ ہو اناطولِ فرانس کی رائے فرماتے ہیں:۔

"کنواری سینٹ آربرے سیا کا حسین وجمیل پیکر ایک ہی وقت میں بہت سی محفلوں کی "شمعِ انجمن" بننا پسند کرتا تھا۔ دن تو اپنے ایک عاشق کے بازوؤں میں گزار دیتی لیکن ہر رات اپنے چاند سے چہرے کو لیلیِ شب کی زُلفوں میں چھپائے ایک جوان گڈریئے کی جھونپڑی میں پہونچتی۔ اور وہاں "نوروز بستر و بہار آغوش" نہ بنتی ـــ لیلیٰ شب تو اس کے اِس معاشقہ کی بدرجۂ اتم پردہ پوشی کرتی۔ لیکن صبح صبح واپس آتے وقت اِسے افشائے راز کا دھڑکا لگا رہتا۔ کیونکہ سحر گریباں دریدہ تو ہمیشہ سے شبِ وصل کے قتل اور عشاق کی پردہ دری پر آمادہ رہی ہے۔ اِن خطرات سے بچنے کی خاطر اُس نے یہ ترکیب نکالی کہ اگر آتی دفعہ راستہ میں کوئی دہقان مل جاتا تو وہ اپنا سفید براق لبادہ اپنے بازوؤں پر پھیلا کر بیباکانہ انداز سے کہتی "اے اجنبی اپنی آنکھیں نیچی کرلے تاکہ تو خداوند یسوع مسیح کا پاک فرشتہ نہ دیکھ سکے" یہ سُنکر سادہ دل کسان دوزانو ہو کر سر جھکا آنکھیں بند کرلیتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خداوند یسوع کا فرشتہ دیکھنا بہت سی تکلیفوں کا پیش خیمہ ہے"

یہ ہے ایک نبّاضِ فطرت اور مردم شناس مفکّر اور ادیب کے تجربہ کا نچوڑ ـــ!

اب اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ شیطان جو فرشتوں کا سردار تھا۔ گو راندۂ درگاہِ ایزدی ہی سہی، صنفِ نازک میں سے ہے۔ تو کیا یہ مکمل ثبوت نہ ہوگا کہ فرشتے مؤنث ہیں؟ مَیں یہاں ثبوت دینا نہیں چاہتا صرف ضمناً ذکر آپڑا ہے۔

کیا کبھی مَردوں کے متعلق بھی سُنا گیا ہے کہ یہ "جنّت سے نکالے ہوئے فرشتے" ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ شیطان جب چاہے نوری فرشتے کا رُوپ دھار لیتا ہے؟۔ اور کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ جب کبھی شیطان نے کسی رشی یا کسی ولی کو بہکانا چاہا تو وہی اپنا اصلی زنانہ رنگ نکھارا؟ یوں بھی دُنیا میں عورت کے سوا کیا اور بھی کسی کے دامِ شیطنت میں کوئی مرد اسیر ہوا ہے؟۔ کیا پری، آسیب، سایہ کے الفاظ ہمیں عورت کا خیال نہیں دلاتے؟ ـــ معرکۂ آدم وشیطان میں فتح شیطان کی ہوتی تھی، زن ومرد کے معاملہ میں بھی میدان عورت کے ہاتھ رہتا ہے!

اِس دلیل کو زیادہ ٹھوس اور پختہ بنانے کے لئے مندرجہ ذیل محاورات ملاحظہ ہوں:۔

"خوبصورت شخص شیطان کا منظورِ نظر ہوتا ہے!"

"شیطان گناہ کو قند آمیز بنا دیتا ہے"

"شیطان بہت ضدّی ہے!"

ـــ نیز اِن دو محاورات کا تقابل بھی بصیرت افروز ہے۔

"خدا کو پوجو اور شیطان سے کوئی تعلق نہ رکھو"

"خدا کی عبادت کرو ـــ اور عورت کا خیال نہ کرو"

شیطان نے جب کبھی کسی مَرد کے لئے دام پھیلایا ہے تو دانہ کا کام عورت ہی سے لیا ہے، کیا ہم آدم وحوّا کے قصّہ کو بھول سکتے ہیں؟ ـــ کہتے ہیں شیطان بندے کے خیالات خُدا سے ہٹا دیتا ہے۔ لیکن کیا حسین عورتیں بھی گرجے کے بیچوں بیچ بے نقاب جلوؤں سے یہی مقصد حاصل نہیں کرلیتیں؟!

پولینڈ میں شیطان کا لباس نیلا ہے۔ ہمارے ہاں اس کا لباس سیاہ ہے، اٹلی میں سُرخ رنگ ہے اور گورا اقوام میں سفید ـــ بعینہٖ یہی حالت عورتوں کے ملبوسات رنگا رنگ کی ہے!

شیطان یا جن عموماً کسی بوڑھی عورت کے سر پر اُترتا ہے۔ اگر وہ مرد ہوتا تو کیا کسی ضعیفہ صد سالہ اور از کار رفتہ عورت پر ہی نظرِ انتخاب ڈالتا؟!

سب جانتے ہیں کہ محافظ فرشتے، بچّوں کی حفاظت پر متعین ہیں۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ بچّوں کی خبرگیری کیلئے آیا عورت ہوتی ہے یا مَرد؟!۔

انور مختار صدیقی۔ بی۔ اے، ایل ایل بی

پھانسی

چوتھا باب

ہم اوریول سے آئے ہیں

یانسن کو جس فوجی عدالت سے سزائے موت ملی تھی اُسی عدالت نے ایک اور دیہاتی کو بھی پھانسی کا حکم دیا تھا۔ یہ دیہاتی حکومت اوریول، علاقہ یلٹزک کا رہنے والا تھا۔ نام میکائیل گولیوبٹس اور عرف سگالوک تھا۔ پیا کا نام تاتارن بھی تھا۔ تازہ واردات، جس کے متعلق اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں تھی، اُس نے یہ کی تھی کہ ایک جگہ مسلح ڈاکہ ڈالا اور تین آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس سے پہلے کے سارے واقعات ماضی کے اندھیرے اور راز کی گہرائیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ افواہیں تھیں کہ کئی اور قتل کئے ہیں اور اکثر جگہ ڈاکے ڈالنے میں بھی یہ شریک تھا۔ کہا جاتا تھا کہ خون، آگ، شراب اور حرامکاری سے اُس کی گزشتہ زندگی مُترتّب ہوئی تھی۔ یہ شخص اپنے آپ کو بڑی بے تکلفی اور خلوصِ دل سے قاتل کہتا تھا۔ اور اُن لوگوں کو بڑی نفرت و حقارت سے دیکھتا تھا جو فیشن کے مطابق خود کو قاتل کہنے کے بجائے بیگناہ کہتے تھے۔ چونکہ انکار کی اب کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے تازہ واردات کے سلسلہ میں وہ ایک ایک بات کو تفصیل سے بیان کرتا تھا اور ذرا نہیں جھجکتا تھا۔ لیکن جب اور پچھلی باتوں کے بارے میں اُس سے دریافت کیا جاتا تو وہ اپنے دانت بھینچ لیتا یا سیٹی بجانے لگتا اور کہتا "ہوا کھاؤ ہوا!"

جب اُس سے جرح کی گئی تو وہ چڑ گیا اور بہت سنجیدہ بن کر بولا،
"ہم سب اوریول کے رہنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ اوریول اور کروما کے ڈاکو بہترین ہوتے ہیں۔
کراچیو اور لیونا میں ڈاکو پروان چڑھتے ہیں۔ اور یلٹزیز۔ سارے ڈاکوؤں کا باپ ہے۔ اب اور کیا کہنا باقی رہ گیا؟"

اُس کا عُرف سِگالوک (خانہ بدوش) تھا کیونکہ اس کی شکل و صورت اور حرکات اُٹھائی گیروں کی سی تھیں۔ بال سیاہ رنگ کے تھے۔ دُبلا پتلا چھریرا بدن اور تاتاریوں جیسی اُبھری ہوئی رُخساروں کی ہڈیوں پر زرد زرد دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُس کی نظریں تیز اور بھانپنے والی تھیں۔ ذرا کسی چیز پر نظر جمائی اور گویا اُس کی تلاشی لے لی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دیکھتے ہی اُس چیز میں کچھ کمی ہو گئی ہے اور اب وہ چیز پہلی جیسی رہی ہی نہیں۔ اگر سِگالوک نے کسی سگریٹ کو نظر بھر کے دیکھ لیا ہے تو اُسے لیتے ہوئے اتنی کراہیت محسوس ہو گی گویا اُس کے مُنہ کا نکلا ہوا سگریٹ ہے۔ اُس میں ایک طرح کی بےچینی سی تھی۔ ابھی رسّی کی طرح بل کھا رہا ہے، ابھی ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا تار کا گچھا ہے کہ لپٹا جا رہا ہے۔ پانی پینے پر آتا تو بالٹی کی بالٹی چڑھا جاتا۔

مقدمے کے دوران میں سوالوں کے جواب مختصر اور جما جما کر دیتا۔ اور بعض دفعہ اُچھل اُچھل پڑتا جیسے خوشی کی انتہا ہی نہیں رہی اور کہتا،
"بالکل ٹھیک!"
کبھی زور دیکر کہتا "بِل کُل ٹھیک!"
ایک دفعہ بالکل اچانک کسی معمولی سوال کے جواب میں وہ اُچھلکر کھڑا ہو گیا اور صدر منصف سے کہنے لگا "کیا آپ مجھے سیٹی بجانے کی اجازت دیں گے؟"
منصف نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟"
"ابھی انہوں نے کہا تھا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ دیا تھا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اشارہ کس طرح دیا جاتا ہے۔ بہت دلچسپ طریقہ ہوتا ہے!"
منصف نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اجازت دیدی۔ سگالوک نے جلدی سے چار اُنگلیاں، دو ایک ہاتھ کی اور دو دوسرے ہاتھ کی، مُنہ میں رکھکر اپنے دیدوں کو خونخواری سے گھُمایا — اور پھر عدالت کی خاموش فضا قاتل کی تیز سیٹی سے گونج گئی — وہ سیٹی جسے سُنکر گھوڑے اُچھل کر الف ہو جاتے ہیں اور انسانی چہروں کا خُون سُت جاتا ہے۔ قتل ہونے والے کی ہراسانی، قاتل کی وحشیانہ مسرّت، خطرناک آگاہی، ڈاکوؤں کے جمع ہونے کا اشارہ، طوفانی رات کا اندھیرا اور سناٹا۔ اس سیٹی میں یہ سب چیزیں یکجا تھیں۔

صدر منصف نے جِھڑک کر سگالوک کو منع کیا اور وہ بڑی اطاعت شعاری سے خاموش بیٹھ گیا۔ کسی بڑے فن کار کی طرح جس نے اپنا فن بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہو، سگالوک مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی گیلی اُنگلیاں کوٹ سے پونچھتے ہوئے چاروں طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

منصفوں میں سے ایک نے اپنا کان سہلاتے ہوئے کہا: "کیا ڈاکو ہے!"

ایک اور منصف جس کی چھدری روسی ڈاڑھی اور سگانوک کی طرح تاتاری آنکھیں تھیں، کسی گہرے خیال میں غرق اُسکی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مُسکرا کر بولا: "واقعی ہے دلچسپ۔"

منصفوں نے بغیر کسی رحم کے شائبے کے سگانوک کو پھانسی کا حکم سنا دیا۔

حکم سنتے ہی سگانوک نے کہا: "بالکل ٹھیک۔ کھُلے میدان میں پھانسی کا پھندا۔ بالکل ٹھیک۔"

پھر محافظ کی طرف دیکھکر بولا: "اچھا تو کیا اب ہمیں یہاں سے چلنا نہیں ہے؟ چل نا پوستی! اور ذرا اپنی بندوق سنبھالے رہنا —— کہیں مَیں چھین نہ لوں۔"

سپاہی نے اُس کی طرف گھُور کر دیکھا اور خوفزدہ نظروں سے دوسرے سپاہی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بندوق ٹٹولنے لگا۔ اَوروں نے بھی اپنی اپنی بندوق سنبھالی۔ اور سارے راستے اُنہیں ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ وہ چل نہیں رہے بلکہ اُڑ رہے ہیں۔ گویا قیدی نے اُنہیں مسحور کر دیا تھا اور اپنے قدموں تلے نہ تو زمین محسوس کر رہے تھے نہ وقت گزرتا معلوم ہو رہا تھا اور نہ اپنے آپے ہی کا کچھ ہوش تھا۔

سگانوک کو بھی یانسن کی طرح پھانسی پانے سے پہلے سترہ دن جیل میں گزارنے پڑے۔ اور یہ سارے سترہ دن اس طرح گزر گئے گویا ایک ہی دن تھا اور اسی ایک دھن میں کہ کس طرح جان بچائی جائے، کیسے آزادی حاصل کی جائے، کیسے زندہ رہا جائے۔ سگانوک کی بیچینی کو جیل کی دیواروں، سلاخوں اور اندھی کھڑکی نے کچل دیا تھا اور اب یہی بیچینی طپش کی صورت میں خود اُس کی رُوح پر پلٹ پڑی تھی، اور اُسے اس طرح جلا رہی تھی جیسے دہکتے انگارے لکڑی کے تختے پر پھیل جائیں۔ جیسے شراب دماغ کو چڑھ گئی ہو اُسے چمکدار لیکن ناتمام پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھیں جو مدھم پڑتے پڑتے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں اور پھر ایکدم سے اُن کی ایک آندھی سی اُٹھتی جو اُس کے دماغ کو اُڑائے لئے جاتی۔ اور اِن سب کا رُخ بس ایک ہی جانب تھا —————— جان بچانے، زندہ رہنے اور آزادی کی طرف۔ گھوڑے کی طرح نتھنے پھُلائے سگانوک گھنٹوں ہوا کو سُونگھتا رہتا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بان کی بُو سُونگھ سکتا ہے، آگ کے دھوئیں کی بُو، جلنے کی بے رنگ بُو سُونگھ سکتا ہے۔ کبھی کوٹھری میں لٹّو کی طرح گھُومتا اور دیواروں کو جلدی جلدی ٹٹولتا۔ کبھی اُنگلیوں سے اُنہیں بجا کر دیکھتا۔ نشانہ لیتا، چھت کو اپنی نظروں سے برماتا، اور سلاخوں کو خیال ہی خیال میں ریتی سے کاٹتا۔ اپنی بیچینی سے اُس نے محافظ سپاہیوں کو تھکا دیا۔ وہ اندھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتے اور بعض دفعہ تو تنگ آ کر گولی مار دینے کی دھمکی بھی دیتے۔ سگانوک بھدّے پن سے جواب دیتا اور بُرا بھلا کہنے پر تُل جاتا۔ یہاں تک کہ گالیوں اور گندہ دہنی پر اُتر آتا تو محافظ چُپکے ہو جاتے کہ ایسے پراگندہ حواس انسان پر گولی کیا چلائی جائے۔

سگانوک رات کو گہری نیند سوتا۔ کروٹ تک نہ بدلتا لیکن اِس بے حرکتی میں بھی جان تھی۔ جیسے بل کھایا ہوا تار عارضی طور پر بیکار رہے۔ لیکن آنکھ کھُلتے ہی وہ فوراً گھومنا شروع کر دیتا۔ منصوبے گانٹھتا اور دیواریں ٹٹولنے لگتا —— اُس کے ہاتھ ہمیشہ خُشک اور گرم رہتے تھے لیکن اُس کا دل کبھی کبھی ایکدم سے سرد پڑ جاتا۔ جیسے نہ پگھلنے والی برف کا ایک ڈلا اُسکے سینے پر رکھدیا گیا ہو اور اِس سے اُس کے سارے جسم میں ایک ہلکی سی خشک کپکپاہٹ دوڑ رہی ہو۔ ایسے مواقع پر سگانوک کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا اور ڈھلے ہوئے لوہے کی طرح ہلکی سی نیلاہٹ اُس پر جھلکنے لگتی تھی اور ایک عجیب عادت اُس میں پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے اُس نے بے تحاشہ مٹھاس کھالی ہو وہ اپنے ہونٹ چاٹتا رہتا چٹخارے لیتا رہتا۔ اور دانت بھینچکر فرش پر تھوک کی پچکاریاں مارتا رہتا۔ جب بات کرتا تو اپنے الفاظ ختم نہ کرتا۔ اسکے خیالات اتنی تیزی سے ذہن میں گذرتے تھے کہ الفاظ اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

ایک دن داروغہ جیل ایک سپاہی کے ساتھ اُس کی کوٹھڑی میں آیا۔ فرش کی طرف نظر ڈال کر سگانوک سے بولا: "دیکھو۔ کتنا گندہ کر رکھا ہے!"

سگانوک نے فوراً تڑخ کر جواب دیا: "تم نے ساری دُنیا کو گندہ کر رکھا ہے موٹل! مگر میں نے تو تمہیں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تم یہاں آئے کیوں ہو؟"

داروغہ نے اکھڑپن سے کہا: "کیا تم جلّاد کا کام کر سکتے ہو؟"

سگانوک نے قہقہہ لگایا اور دانت چمکا کر بولا: "تمہیں اور کوئی نہیں ملا؟ چلو اچھا ہوا۔ ہا ہا ہا! گردنیں موجود ہیں۔ رسّی موجود ہے لیکن پھندا ڈالنے والے کوئی نہیں ہے۔ واللہ۔ یہ خُوب ہوا۔"

داروغہ نے کہا: "اگر تم جلّاد بن جاؤ تو تمہارا گلا بچ جائیگا۔"

سگانوک بولا: "یہ تو ہے ہی۔ اگر میں مر گیا تو اُنہیں پھانسی کیسے دونگا۔ واہ بے احمق، یہ بھی خوب کہی۔"

داروغہ نے کہا: "اچھا تو تم کیا کہتے ہو؟ تمہیں یہ کام کرنا ہی یا نہیں؟"

"بھلا تم انہیں پھانسی کس طرح دیتے ہو؟ شاید دھوکے سے؟"

داروغہ نے تڑخ کر کہا: "نہیں تو، باجے گاجے سے۔"

"دیکھا کیسا بیوقوف ہے! ہاں باجے گاجے کے ساتھ بھی پھانسی دی جاسکتی ہے۔ دیکھو ایسے۔" اتنا کہا اور سگانوک نے نڈر ہو کر بے تحاشہ گانا شروع کر دیا۔

داروغہ بولا: "دوست، تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ کیا کہتے ہو پھر؟ ذرا سمجھ کر بات کرو۔"

سگانوک نے دانت نکوس کر کہا: "کس قدر مشتاق ہو تم۔ اچھا پھر کسی وقت آنا تو بتائیں گے۔"

اس کے بعد سگانوک کے ذہنی چمکدار سایوں میں ایک اور سایہ نمودار ہوا۔ جلّاد کی سرخ قمیص اس کے جسم پر کیسی بھلی معلوم ہوگی! اس نے اپنے خیال میں ایک بڑی واضح تصویر بنائی۔ اِس تصویر میں ایک چوک لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ بیچ میں ایک اونچی سی پھانسی گڑی تھی۔ اور پھانسی کے چبوترے پر کلہاڑا لئے خود وہ ٹہلتا پھر رہا تھا۔ سورج سر پر تھا اور کلہاڑا چمک رہا تھا۔ ہر چیز اتنی خوش نظر آتی تھی کہ وہ شخص بھی جس کا سر اڑایا جانے والا تھا مسکرا رہا تھا۔ تماشائیوں کے ہجوم کے پیچھے گاڑیبان اور گھوڑوں کے سر دکھائی دے رہے تھے ــــ دیہات سے دہقان تماشہ دیکھنے آتے تھے، اور ان سے بھی پیچھے کچھ فاصلے پر دیہات بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"آخ تھو!"

سگانوک نے اپنے ہونٹ چاٹ کر چٹخارہ لیا اور کھنکار کر تھوکا۔ اور ایکدم سے اُسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک بڑی سی ٹوپی اُسے پہنا دی گئی جس نے اُس کا منہ تک ڈھک لیا ــــ چاروں طرف اندھیرا ہو گیا اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اور اُسکا دل پھر نہ پگھلنے والی برف کا ڈلا بن گیا جس سے خشک کپکپی اُسکے سارے بدن میں دوڑنے لگی۔

داروغہ دو مرتبہ اور اسکی کوٹھری میں آیا اور سگانوک نے دانت نکوس کر پھر وہی کہا: "کسقدر مشتاق ہو تم۔ پھر آنا۔"

آخر کار ایک دن داروغہ نے اندھی کھڑکی میں سے آواز دیکر کہا "احمق! تو نے اپنا موقع کھو دیا۔ ہمیں ایک اور آدمی مل گیا۔"

سگانوک نے دانت پیس کر جواب دیا: "لعنت ہو تجھ پر۔ خود پھانسی لگا لے۔" اسکے بعد سگانوک نے جلّاد اور مقتل کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور موت قریب آتی گئی مبہم سایوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ سگانوک اب محسوس کرتا تھا کہ وہ ساکت کھڑا ہے۔ جیسے ٹانگیں پھیلائے کھڑا ہے ــــ لیکن خیالات کا ایک طوفان آیا ہے اور اُسے بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے پکڑ کر سہارا لیلے۔ ہر چیز بہی چلی جا رہی ہے۔ اور اُسکی نیند بھی بےچین ہونے لگی۔ اُس کے خیالات سے بھی زیادہ شدید خواب اُسے دکھائی دینے لگے ــــ نئے نئے خواب۔ ٹھوس، بھاری، جیسے لکڑی کے رنگین ٹکڑے۔ اب اُن کی شکل رَو کی سی نہیں تھی بلکہ ایک لامتناہی آبشار کی سی تھی۔ جو ایک لامتناہی گہرائی میں گر رہا ہو۔ بیشمار رنگوں سے بھری ہوئی دُنیا میں ایک چکراتی اُڑان سے مشابہ۔

جب سگانوک آزاد تھا تو اُس کی صرف بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ لیکن جیل میں اُس کی گھنی ڈاڑھی بھی نکل آئی تھی جس سے اُس کا چہرہ وحشتناک بن گیا تھا۔ جیسے پاگلوں کا چہرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات سگانوک کے ہوش و حواس واقعی زائل ہو جاتے تھے اور وہ کوٹھری میں دیوانہ وار گھومتا اور دیواروں کو بجا بجا کر دیکھتا۔ پانی پیتا تو گھوڑے کی طرح پیتے چلا جاتا۔

بعض دفعہ شام کے وقت جب چراغ جلائے جاتے سگانوک چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور بھیڑیے کی سی آوازیں نکالتا۔ بڑی سنجیدگی سے یہ حرکت کرتا۔ اور اس طرح بھیڑیے کی آواز نکالتا گویا کوئی بڑا ضروری اور اہم کام کر رہا ہے۔

پہلے ہوا سے خُوب اپنا سینہ پھلا لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک لمبی کپکپاتی آواز نکالتا اور آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے اِس آواز کو سُنتا رہتا۔ کپکپاہٹ وہ دانستہ پیدا کرتا تھا۔ ایک دم سے چیخ نہیں مارتا تھا۔ بلکہ ہر سُر بڑی احتیاط سے ادا کر کے ایک غمناک آواز نکالتا جو ناقابلِ بیان رنج و خوف سے بھری ہوئی ہوتی۔

پھر ایکدم سے اس آواز کو بند کر دیتا اور کئی منٹ تک اُسی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر خاموش کھڑا رہتا۔ پھر یکایک زمین کی طرف گھورتے ہوئے بڑبڑانا شروع کرتا۔

"میری پیاریو۔ میری دلبرو! ... میری پیاریو، میری دلبرو! رحم کرو ... میری پیاریو ... میری دلبرو!"

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی آواز کو بڑے غور سے سُن رہا ہے۔ جو لفظ کہتا اُسے سُنتا جاتا۔

پھر وہ اُچھل کر کھڑا ہو جاتا اور پورے ایک گھنٹے تک اول فول بکتا رہتا۔ چلاتا رہتا اور اپنے لال لال دیدے گھُماتا رہتا۔

"اگر تم مجھے پھانسی دو تو مجھے پھانسی دیدو" اور پھر بجنا شروع کر دیتا۔ پہرہ دار اُس کی چیخ پکار سُنکر خوف سے سفید پڑ جاتا۔ دروازے پر بندوق کا کُندہ مارتا اور بے سود چیختا رہتا "خبردار، گولی ماردونگا۔ اپنی جان کی قسم میں تجھے مار ڈالونگا۔ سُنتا ہے یا نہیں؟"

لیکن گولی وہ نہیں مار سکتا تھا۔ جنہیں پھانسی کا حکم مل چکا ہو اُن پر اُس وقت تک گولی چلانے کی اجازت نہیں تھی جب تک کہ وہ بغاوت نہ کردیں۔ اس کے جواب میں سگا نوک دانت پیستا، گالیاں دیتا اور تھوکتا۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک تیز تلوار رکھی تھی اور اس پر سگا نوک کا دماغ کٹ کٹ کر مٹی کے خشک ڈھیلے کی طرح کھیل کھیل ہوا جارہا تھا۔

جب آدھی رات کو چند آدمی اُسے پھانسی دینے لے چلے تو سگا نوک بالکل ٹھیک ہوگیا گویا اُس کی پہلی فطرت عود کر آئی۔ اب پھر اُس کے منہ کا ذائقہ میٹھا ہوگیا اور منہ میں تھوک بھرنے لگا۔ لیکن اس کے رخسار گلابی ہوگئے اور آنکھوں میں وہی پہلی سی شاطرانہ چمک نمایاں ہوگئی۔ کپڑے پہنتے ہوئے اُس نے افسر سے پوچھا۔

"پھانسی کون دے گا؟ کوئی نیا آدمی ہے؟ شاید اس نے اپنا کام ابھی سیکھا بھی نہیں ہوگا"

افسر نے سرد مہری سے جواب دیا "تمہیں پریشان ہونیکی ضرورت نہیں —"

"پریشانی کا تو میں کوئی علاج نہیں کرسکتا حضور، پھانسی مجھے ملنے والی ہے نہ کہ آپ کو۔ سرکاری صابن جو رسّی پر مَلا جائیگا کم سے کم اُس میں تو کنجوسی نہ کرنا"

"اچھا اچھا۔ خاموش رہو"

سگا نوک نے داروغہ کی طرف اشارہ کرکے کہا "اِس شخص نے تمہارا سارا صابن کھا یا ہے۔ دیکھو اس کا چہرہ کیسا چمک رہا ہے!"

"خاموش!"

"کنجوسی مت کرو" یہ کہکر سگا نوک نے قہقہہ لگایا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کا مُنہ میٹھا ہوتا چلا جارہا ہے اور ایکدم سے اُسکی ٹانگیں کچھ عجیب طرح سے سُن ہونے لگیں۔ پھر بھی جب نکل کر صحن میں آیا تو بولا۔

"اچھا! نواب بنگال کی گاڑی!"

پانچواں باب

پیار کرو —— اور کچھ نہ کہو

پانچوں دہشت پسندوں کا آخری فیصلہ سُنا دیا گیا اور اُسی دن اُس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مجرموں کو یہ نہیں بتایا گیا کہ اُنہیں پھانسی کب دی جائیگی۔ لیکن وہ اتنا جانتے تھے کہ عام دستور کے مطابق اُنہیں اُسی رات کو یا زیادہ سے زیادہ اگلی رات کو پھانسی دیدی جائے گی۔ اور جب اُن سے کہا گیا کہ آئندہ جمعرات کو وہ اپنے عزیزوں سے ملیں گے تو وہ سمجھ گئے کہ جمعہ کی صبح کو اُنہیں پھانسی دیدی جائیگی۔

تانیا کا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ اور اگر کوئی تھا بھی تو بہت دُور دراز مقام پر۔ اتنی دُور کہ مقدمے اور سزائے موت کی اطلاع بھی وہاں نہیں پہونچی ہوگی۔ مسیا اور ورنر نے اپنا اتہ پتہ ہی نہیں دیا تھا اس لئے سمجھ لیا گیا تھا کہ اُن کے عزیز رشتہ دار ہیں ہی نہیں۔ صرف دو سرجے گول ون اور ویسیلی کیشرن ایسے تھے جنہیں اپنے والدین سے ملنا تھا۔ یہ دونوں اِس ملاقات کے خیال سے خوفزدہ اور پریشان تھے۔ پھر بھی وہ بوڑھے ماں باپ سے آخری بات چیت اور آخری پیار کرنے سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔

سرجے گول ون اس ملاقات سے بیحد متوحش تھا۔ ماں باپ سے اُسے بے انتہا محبت تھی۔ حال ہی میں وہ اُن سے ملا تھا اور اب اُسے یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ اب جو وہ ملنے آئیں گے تو کیا ہوگا۔ پھانسی اور پھانسی کے جُملہ وحشتناک لوازم اور ان کا دماغ اُڑا دینے والے خوف کا اندازہ وہ کرسکتا تھا لیکن ملاقات کے اُن چند لمحات پر غور کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ یہ چند لمحات اُسے وقت کی قیود اور زندگی کی حدود سے بھی باہر نظر آتے تھے۔ کس طرح دیکھے، کیا سوچے اور کیا کہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ باپ سے مصافحہ کرکے اُسے پیار کرنا اور مزاج پُرسی کرنا —— ایسی عام بات بھی ناقابلِ بیان حد تک بھیانک، وحشتناک اور مہمل معلوم ہوتی تھی۔

سزائے موت سُنانے کے بعد مجرموں کو ایک جگہ نہیں رکھا گیا۔ سب کو الگ الگ تنہا قید کیا گیا۔ صبح سے گیارہ بجے تک گول ون اپنی کوٹھری میں دیوانہ وار ٹہلتا رہا اور اپنی ڈاڑھی نوچتا رہا۔ اس طرح بھویں چڑھاتا گویا ترس آرہا ہے اور خود بخود بڑبڑانے لگتا۔ کبھی کبھی ایکدم سے رُک جاتا اور لمبے لمبے سانس لیتا جیسے پانی میں غوطہ لگا کر بڑی دیر میں اُبھرا ہو۔ لیکن اُس کی صحت اتنی اچھی تھی اور اُس کی جوان رُوح جسم میں اتنی مضبوط تھی کہ اتنی شدید ذہنی تکلیف کے باوجود خون برابر جلد کے نیچے سے جھلک رہا تھا۔ اُس کے رخسار سُرخ ہورہے تھے اور نیلی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی۔

لیکن اُس نے جو کچھ بھی اندازہ لگایا تھا وہ بالکل غلط نکلا۔

سرجے کا باپ نکلولے گولون جو فوج میں کرنل رہ چکا تھا پہلے اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں یہ ملاقات ہوتی۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید تھا چہرہ سفید، ڈاڑھی سفید، بال سفید، ہاتھ سفید — گویا برف کا ایک مجسمہ تھا انسانی لباس میں۔ وہ اپنا پُرانا فوجی کوٹ پہنے ہوا تھا لیکن یہ کوٹ صاف ستھرا تھا۔ کندھے پر کی آڑی پٹیاں نئی تھیں۔ اُس کی یہی وضع تھی۔ کمرے میں دل سخت کر کے قدم جما کر رکھتا ہوا۔ اپنا سفید دُبلا ہاتھ بڑھا کر بولا "کیسے ہو سرجے؟"

اس کے پیچھے پیچھے سرجے کی ماں چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی آئی اور اُس کے چہرے پر ایک عجیب مُسکراہٹ تھی۔ اِس نے بھی سرجے کے ہاتھ زور سے دبائے اور بآواز بلند پوچھا "کیسے ہو سرپوژینکا؟"

پیار کر کے وہ خاموش بیٹھ گئی۔ اُس پر جھپٹی نہیں۔ پھُوٹ پھُوٹ کر روئی نہیں۔ چیخیں نہیں ماریں۔ اُس نے کوئی حرکت وہ نہیں کی جس سے سرجے ڈر رہا تھا۔ اُس نے بس پیار کیا اور چپکی بیٹھ گئی۔ بلکہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا سیاہ لباس ٹھیک بھی کیا۔

سرجے کو علم نہیں تھا کہ کرنل نے ساری رات ایک کمرے میں بند ہو کر اِس ملاقات کے نشیب و فراز پر غور کیا تھا۔ کرنل نے بالآخر یہ طے کیا تھا کہ ہمیں اپنے بچے کے آخری وقت کو اجیرن نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اُسکی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اُس نے بڑی احتیاط سے ہر عنوانِ گفتگو پر غور کیا۔ ہر حرکت اور ہر بات کو اچھی طرح سوچا۔ لیکن نہ جانے کس طرح وہ سب کچھ بھُول گیا اور کوچ کے کونے میں مُنہ چھُپا کر بے اختیار رونے لگا۔ صبح کو اُس نے اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ جب ملاقات ہو تو اُسے کیا کرنا چاہیئے۔

ماں نے رو کر کہا "میں سمجھ رہی ہوں نکلولے"

"تمہیں رونا نہیں چاہیئے۔ خدا کیلئے روؤ نہیں۔ تم رو کر اُسے مار ڈالو گی —"

"اور تم کیوں رو رہے ہو؟"

"عورتوں کے ساتھ رونا ضبط نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تمہیں رونا نہیں چاہیئے"

"اچھا نکلولے"

گاڑی میں سوار ہو کر اُس کا ارادہ تھا کہ پھر اُسے سب باتیں سمجھا دے۔ لیکن وہ بھُول گیا۔ اِس لئے وہ خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں محو شہر کے غُل غپاڑے میں سے گزرتے رہے۔ ایک تہوار قریب تھا اور شہر میں خوب چہل پہل تھی۔

وہ بیٹھ گئے۔ پھر کرنل اُٹھا۔ مشق کے مطابق تن کر کھڑا ہوا اور دایاں ہاتھ سینہ پر کوٹ میں رکھا۔ سرجے ایک لمحہ کیلئے بیٹھا۔ اپنی ماں کے جھریاں پڑے چہرے کو بغور دیکھا اور اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

ماں نے کہا "بیٹھ جاؤ سرجے"

باپ نے بھی کہا "بیٹھ جاؤ سرجے"

سب خاموش ہو گئے۔ ماں مُسکرائی۔

"ہم نے تمہارے لئے بڑی کوشش کی سرپوژینکا۔ تمہارے ابا —"

"آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیئے تھا اماں —"

پھر کرنل نے جما جما کر کہا "ہمیں یہ کرنا پڑا سرجے۔ تاکہ تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ ماں باپ نے تمہیں بھُلا دیا"

پھر سب خاموش ہو گئے۔ ایک لفظ بھی ادا کرنا انہیں مصیبت نظر آتا تھا۔ گویا زبان کا ہر لفظ اپنے اصلی معنی کھو چکا تھا اور ہر لفظ کے صرف ایک ہی معنی رہ گئے تھے — موت۔ سرجے نے اپنے باپ کے کوٹ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا "اب ان کے پاس کوئی نوکر نہیں ہے۔ انہوں نے خود ہی کوٹ صاف کیا ہوگا۔ عجیب بات ہے کہ پہلے میں نے یہ بات کبھی سوچی ہی نہیں کہ یہ اپنا کوٹ خود صاف کرتے ہیں۔ شاید صبح ہی صبح صاف کر لیتے ہوں گے"

یکایک اُس نے پوچھا "بہن کیسی ہیں؟ اب تو اچھی ہیں؟"

ماں نے جلدی سے جواب دیا "ننوشا کو کچھ بھی خبر نہیں"

کرنل نے سختی سے ٹوک کر کہا "جھُوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ بچّی نے اخبار میں پڑھ لیا تھا۔ سرجے سے کیوں چھُپاؤ کہ سب — وہ سب جنہیں یہ چاہتا ہے — اس وقت سرجے ہی کو یاد کر رہے ہیں۔ اور —"

آگے وہ بول نہ سکا اور چُپکا ہو گیا۔ یکایک ماں کا چہرہ سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں اور وحشت برسنے لگی۔ اس کی بے رنگ آنکھیں اندھوں کی طرح گھُورنے لگیں اور اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔

"سے — سے — سے۔ سر — سر"

ماں کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا۔ مُنہ کھُلا ہوا اور لب ساکت تھے۔

"پیاری اماں!"

کرنل آگے بڑھ کر آیا۔ کوٹ کی ہر شکن، چہرے کی ہر جھرّی کانپ رہی تھی۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ موت کی سی زردی خود اس کے چہرے پر چھا رہی ہے اور کتنا بھیانک ہو گیا ہے، اُس نے بڑا جبر کر کے بیوی

کہا "خاموش رہو۔ اُسے تکلیف مت پہونچاؤ۔ اُسے مرنا ہے۔ اُسے تکلیف مت پہونچاؤ"۔

خوف کے مارے وہ خاموش ہو چکی تھی۔ لیکن کرنل اپنی مٹھیاں بھینچے اب بھی کہہ رہا تھا "اُسے تکلیف مت پہونچاؤ"۔

یہ کہکر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کپکپاتے ہاتھ اپنے پیچھے کرلئے اور بہ آواز بلند زبردستی کے سکون کے ساتھ زرد لبوں سے پوچھا "کب؟"

سرجے نے جواب دیا "کل صبح" اُسکے ہونٹ بھی زرد تھے۔

اُس کی ماں زمین کی طرف نظریں جھکائے ہونٹ چبا رہی تھی۔ گویا اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ ہونٹ چباتے ہوئے اُس نے یہ سیدھے سادے الفاظ کہے مگر کچھ اس طرح کہ ہر لفظ سیسے کے ڈلے کی طرح گر رہا تھا۔

"ننوشا نے کہا تھا میری طرف سے پیار کرلینا"

سرجے نے کہا "میری طرف سے بھی اُسے پیار کرلینا"

"اچھا خوستو نے کہا تھا ہماری طرف سے پوچھ لینا"

"کونسے خوستو؟ اچھا وہ۔ ہاں ہاں"

کرنل نے بات کاٹ کر کہا "بس اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ اُٹھو سرجے کی ماں۔ چلنا چاہیئے"۔ باپ بیٹے نے مل کر مضمحل بوڑھی عورت کو اُٹھایا۔

کرنل نے حکم دیا "سرجے سے رُخصت ہولو۔ صلیب کا نشان بناؤ"۔

ماں سے جو جو کہا کرتی رہی۔ لیکن جب صلیب کا نشان بنایا اور اپنے بچے کو پیار کیا تو اُس نے اپنا سر ہلایا اور آہستہ سے کہا "نہیں، یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ میں کیا کہوں؟ میں کیسے کہوں؟ نہیں یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے"۔

باپ نے کہا "خدا حافظ سرجے"۔ یہ کہکر ہاتھ ملایا اور دونوں نے ایک دوسرے کو جلدی سے گرم دلی سے پیار کیا۔

"آپ ــــ"

سرجے نے کچھ کہنا چاہا۔

باپ نے ایکدم سے قطع کلام کیا "کیا؟"

"نہیں نہیں! یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے! کیسے کہوں؟"

یہ الفاظ ماں نے سر ہلا کر بڑی نحیف آواز میں کہے اور پھر بیٹھ گئی۔

سرجے نے پھر کہا "آپ ــــ"

ایکدم سے اُس کے چہرے پر غمناک شکنیں پڑ گئیں اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چمکدار آنسوؤں میں سے اُس نے باپ کے سفید چہرے کو قریب سے دیکھا۔ اُسکی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے۔

"آپ، ابا، آپ بہت اعلیٰ وارفع ہیں"

"کیا ہے؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

کرنل نے تعجب سے کہا۔ اور پھر جیسے اُس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں وہ اپنے بچے کے کندھے پر سر رکھکر سب کچھ بھول گیا۔ کرنل قد میں اُونچا تھا لیکن اب وہ پست ہو گیا تھا۔ اُس کا خشک سفید سر برف کے ڈلے کی طرح بیٹے کے کندھے پر رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چپکے چپکے گرمجوشی سے پیار کر رہے تھے۔ سرجے اُسکے روپہلے بالوں کو اور بڈھا کرنل قیدی کے کپڑوں کو چوم رہا تھا۔

ایکدم سے چیخ سُنائی دی: "اور میں؟"

اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سرجے کی ماں کھڑی تھی۔ سر پیچھے کی طرف کھنچا ہوا وہ غصّے سے بلکہ ایک حد تک نفرت وحقارت سے اُن کی طرف گھُور رہی تھی۔

کرنل نے کہا "سرجے کی ماں، کیا ہے؟"

ماں نے دیوانہ وار شدّت سے سر ہلاتے ہوئے کہا "اور میں؟ تم تو پیار کرو ــــ اور میں؟ تم مرد! میں؟ اور میں؟ اور میں؟"

"اماں!" کہکر سرجے اُسکی طرف لپکا۔

اِس کے بعد کیا ہوا نہ تو بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ بیان کرنے کی ضرورت.......

کرنل کے آخری الفاظ یہ تھے:-

"سریوزا! اس موت میں میری دُعائیں اور برکتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمّت سے جان دینا، افسروں کی طرح"

اس کے بعد وہ چلے گئے۔ کسی نہ کسی طرح چلے گئے۔ وہ وہاں گئے تھے، وہاں موجود تھے، وہاں کھڑے تھے، باتیں کی تھیں ــــ اور یکایک چلے گئے۔ یہاں اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ وہاں اُس کا باپ کھڑا تھا ــــ اور یکایک وہ چلے گئے تھے۔ اپنی کوٹھری میں واپس آکر سرجے کھٹیا پر پڑ گیا۔ مُنہ دیوار کی طرف کر لیا تاکہ سپاہی نہ دیکھ سکیں اور دیر تک روتا رہا۔ روتے روتے تھک کر وہ گہری نیند سو گیا۔

وسیلی کیشرن کے پاس صرف اس کی ماں آئی۔ اُس کا باپ ایک مالدار تاجر تھا۔ اُس نے آنا پسند نہیں کیا۔ جب بوڑھی ماں ملنے آئی تو وسیلی کمرے میں بےچینی سے ٹہل رہا تھا۔ موسم خاصہ گرم تھا لیکن وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ بات چیت مختصر اور دردناک تھی۔

"اماں تم ناحق آئیں۔ تم خود بھی پریشان ہوگی اور مجھے بھی پریشان

کروگی۔"

"تم نے یہ کیوں کہا وِسیا؟ کیوں کیا؟ یا اللہ!" اتنا کہکر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور سیاہ رنگ کی اوڑھنی کے کنارے سے آنسو پونچھنے لگی۔
وِسیلی کو معلوم تھا کہ ماں جب بکھر جاتی تھی تو پھر کوئی بات نہیں سُنتی تھی۔
وِسیلی سردی سے کپکپانے لگا اور غصّے سے بولا "دیکھا۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ تم ذرا نہیں سمجھتیں اماں۔ ذرا بھی۔"

"اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ کیا تمہیں ــــ سردی لگ رہی ہے؟"

وِسیلی نے طنز سے کہا "سردی!" اور پھر کمرے میں گھومنے لگا۔ کبھی کبھی ماں کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ لیتا تھا، گویا ماں کی باتوں سے چڑ گیا تھا۔

"شاید تمہیں سردی لگ گئی ہے؟"

وِسیلی نے بے بسی سے ہاتھ جھٹک کر کہا "اماں سردی کیا چیز ہے جب ــــ"

اور اُس کی ماں کہنے ہی کو تھی کہ "تمہارے ابا نے گیہوں کی کٹی ملنے کا انتظام کر دیا ہے۔ بس اگلے پیر سے" مگر وہ ڈر گئی اور بولی "میں نے اُن سے کہا وہ تمہارا بیٹا ہے۔ تمہیں اُسکے پاس جانا چاہیئے اور دُعا دینی چاہیئے۔ مگر وہ بڈھا جانور اپنی ضد پر اَڑا رہا۔"

"لعنت ہو اُس پر! باپ ہو کر اُس نے میرے ساتھ کیسا سُلوک کیا؟ ساری عُمر تو اُس نے بدمعاشی میں گزاری اور اب بھی پکّا بدمعاش ہے۔"

بڑھیا نے پینترا بدلا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

"وِسینکا! تم اپنے باپ کے متعلق ایسے الفاظ کہہ رہے ہو؟"

"باپ کے متعلق!"

"خود اپنے باپ کے متعلق!"

"میرا باپ نہیں ہے وہ"

یہ کچھ عجیب اور مہمل باتیں تھیں۔ اس کے سامنے تو موت کا خیال تھا یہاں چھوٹی چھوٹی اور دُور از کار باتیں نکل آئیں۔ اور اُس کے الفاظ اس طرح چٹخ گئے جیسے سخت چھلکے جُوتے کے نیچے چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ وِسیلی اور اُسکو سب سے قریبی عزیزوں میں ہمیشہ سے ایک غلط فہمی کی دیوار حائل رہی تھی جو اس وقت بھی، مرنے سے چند گھنٹے پہلے بھی، بدستور قائم تھی۔ وِسیلی نے شدّتِ غم سے روتی آواز میں کہا "کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ جلدی ہی پھانسی ملنے والی ہے؟ پھانسی! سمجھتی ہو؟ پھانسی!"

بڑھیا نے جھنجھلا کر کہا "تم اگر کسی کو نقصان نہ پہونچاتے تو کوئی تمہیں ــــ"

"یا اللہ! یہ کیا ہے؟ جانور بھی ایسا سُلوک نہیں کرتے! کیا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں؟"

وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ بڑھیا بھی اپنے کونے میں بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ محبّت کے جذبے کو بروئے کار لانے کی اس میں قدرت نہیں تھی۔ آنے والی موت کے ہراس کو دُور کرنے کیلئے وہ تنہائی کے سرد آنسو بہاتے رہے جن سے اُن کے دل گرم نہیں ہوتے۔

ماں نے کہا "تم پوچھتے ہو میں تمہاری ماں ہوں یا نہیں؟ تم مجھے طعنہ دیتے ہو! اور ان دنوں میں میرے سارے بال سفید ہو گئے۔ میں بالکل بڑھیا ہو گئی۔ اور پھر بھی تم کہتے ہو، تم مجھے طعنے دیتے ہو"

"خیر، اماں یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ اب تمہارے جانے کا وقت ہو گیا۔ میرے بھائیوں کو میری طرف سے پیار کر لینا"

"کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ کیا مجھے تمہارا غم نہیں ہے؟"

وہ وہاں سے چلی گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی جاتی اور اوڑھنی سے آنسو پونچھتی جاتی۔ سڑک اُس نے دیکھی نہیں۔ جیسے جیسے قید خانے سے دُور ہوتی جاتی رونا بڑھتا جاتا۔ وہ پھر اُلٹے قدم لَوٹی اور راستہ بھول گئی۔
عجیب بات ہے کہ جس شہر میں پیدا ہوئی، ساری عُمر گزار کر بڑھیا ہوئی، اُسی شہر میں بھٹکتی پھری ــــ چلتے چلتے وہ ایک ویران باغیچے میں پہونچ گئی۔ یہاں چند جلے ہوئے مُڑے تُڑے درخت تھے۔ ایک بنچ جو برف کے پگھل جانے سے گیلی ہو رہی تھی اُس پر بیٹھ گئی۔

ایکدم سے اُس کی سمجھ میں آگیا۔ اُس کے بچّے کو کل پھانسی ملنے والی ہے!

بڑھیا ایک دم سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور بھاگنے کو تھی کہ یکایک اُس کا سر زور سے چکرایا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ برف آلود پگڈنڈی گیلی اور پھسلواں تھی۔ بڑھیا اُٹھنا چاہتی تھی مگر اُٹھ نہ سکی۔ وہ لڑھکتی رہی کہنیوں کا سہارا لیکر اُٹھتی مگر کروٹ کے بل گر جاتی۔ اوڑھنی پھسل کر نیچے آرہی۔ میلے سفید بالوں میں ایک جگہ سے چندیا کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ پھر جانے کس طرح اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک برات کی ضیافت میں شریک ہے۔ اُس کے بیٹے کی برات ہے اور زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اُسے نشہ ہو رہا ہے۔

اُس نے چیخ کر کہا "اور نہیں۔ میرے بس کی نہیں۔ یا اللہ بس" گویا کسی چیز کے پینے سے وہ انکار کر رہی تھی۔ (بقیہ بر صفحہ ۴۳)

ساقی کے دس سال کا انتخاب

ریزۂ مینا

جس میں پچاس افسانہ نگار حضرات کے بہترین افسانے شامل ہیں

اِن پچاس بےمثل افسانوں کا اِنتخاب شاہد احمد صاحب اڈیٹر ساقی نے کیا ہے

ضخامت چھ سو صفحات۔ کتابت وطباعت اعلیٰ درجے کی، جلد مضبوط کپڑے کی اور سُنہری ٹھپہ والی ہے

مندرجہ ذیل افسانے اِس جِلد میں شامل ہیں۔

افسانہ	مصنف
(۱) عجب تماشا ئیست	خان بہادر میر ناصر علی دہلوی
(۲) نقیر کا تکیہ	میر باقر علی دہلوی (داستانگو)
(۳) یوسفی اور صادقہ	علامہ راشد الخیری دہلوی
(۴) دربار اکبری کی ایک جھلک	شمس العلماء مولوی عبد الرحمٰن
(۵) جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا	خواجہ حسن نظامی دہلوی
(۶) لال قلعہ کی ایک جھلک	خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی
(۷) دربار شاہانِ اودھ	خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی
(۸) پورن چندر کی کہانی	مولانا عنایت اللہ دہلوی
(۹) برات	منشی پریم چند
(۱۰) خزانچی کی بیٹی	مولانا اسلم جیراجپوری
(۱۱) سیرِ گل فروشاں	افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی
(۱۲) شکست کی آواز	پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی
(۱۳) جذبۂ کور	سلطان حیدر جوش
(۱۴) میری بیوی	مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی
(۱۵) عقدِ مکرّر	لطیف الدین احمد اکبر آبادی
(۱۶) نخلِ بے ثمر	ایم۔ اسلم۔
(۱۷) نمونے کا خطبۂ صدارت	ڈاکٹر سید عابد حسین
(۱۸) دُکھیاری ماں	خواجہ غلام السیّدین
(۱۹) عید کا بناؤ	آغا حیدر حسن دہلوی
(۲۰) خرافات	سیّد امتیاز علی تاج
(۲۱) دُنیا کی سب سے پہلی کہانی	سُدرشن
(۲۲) اجنتے کا پرستان	سیّد وزیر حسن دہلوی

کتاب شائع ہو گئی ہے۔ اِس نایاب مجموعے کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے۔

ساقی کے مُستقل خریداروں کیلئے دو۲ روپے علاوہ محصولڈاک

لوٹ:۔ خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ رعایتی قیمت نہیں لی جائے گی ۔

جو حضرات ساقی کے مُستقل خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے تین۳ روپے علاوہ محصولڈاک

محصولڈاک مع رجسٹری آٹھ آنے (۸؍)

مہتمم، ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

زندانی

"لڑکی! لڑکی!! ارے او لڑکی!!!"۔۔۔۔ شنکر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھکر ایک دم چلّایا۔

"ابے راجو! دیکھتا ہے! ۔۔۔ وہ ۔ وہ!! وہ رہی ۔۔۔"

"کہاں! کہاں؟" راجو نے چونک کر پوچھا ۔۔۔

"ہائے رام بھرپور جوانی ہو ۔۔۔"

"یہ کہاں سے ٹپک پڑی؟" بوڑھے رمیش نے گھاس کا ٹکڑا، جس سے وہ اب تک اپنے شکستہ دانت کرید رہا تھا، پھینک کر کہا۔

"ارے وہ! ۔۔۔ نئے داروغہ کی بٹیا ہوگی" رامو نے لاپروائی سے گھٹنوں کے سہارے اوپر اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھ! ۔۔۔ وہ بھی تو چھوٹے لڑکے کی انگلی پکڑے آ رہا ہے"

"جوانی ہے رنگین ۔۔۔" کمار نے اپنا نچلا ہونٹ دانت سے دبا کر ایک مست سانس لیتے ہوئے حسرت سے کہا ۔۔۔ "چھلکے پڑتی ہے! ۔۔۔ کاش اس کی زندگی کی چند رنگین ساعتیں میری جوانی کی نذر ہوتیں ۔۔۔ کاش! میری تاریک راتوں میں وہ ایک بھٹکی ہوئی کرن ثابت ہوتی ۔۔۔"

ہم سب دن بھر کام کرنے کے بعد ایک درخت کے سایئے میں بیٹھے تھے۔ میں ان کا نگراں تھا۔ مجھے اس جیل میں آئے ہوئے ابھی صرف چند ماہ گذرے تھے۔ مجھے مزدور سبھا کے سالانہ اجلاس میں ایک تقریر کرنے کے سلسلے میں تین سال کی سزا ہوئی تھی۔ میرے تمام ساتھی بڑے پرانے پاپی تھے۔ وہ سب قتل، خون اور ڈاکے کے الزام میں لمبی لمبی سزائیں کاٹ رہے تھے۔ شنکر اور کمار دونوں جوان آدمی تھے۔ ان کی عمر کوئی تیس تینتیس برس کی ہوگی ۔۔۔ راجو ادھیڑ عمر کا تھا۔ رمیش اور رامو بوڑھے ہو چکے تھے ۔۔۔ عمریں ڈھل چکی تھیں ۔۔۔ زندگی کی آخری منزل کی طرف تیزی سے گام زن تھے ۔۔۔ وہ سب انسان تھے ۔۔۔ زندہ انسان ۔۔۔ لیکن زندگی کی شعریت اور اس کی لطافتوں سے وہ ایک عرصہ سے بیگانہ تھے ۔۔۔ وہ اس پیڑ کے مانند تھے جس کی جڑ کو پانی نہ ملنے سے گھن لگ جاتا ہے۔ وہ زندگی کی ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیئے گئے تھے ۔۔۔ یوں تو انھیں کھانے، رہنے اور سونے کو مل جاتا تھا۔ لیکن صنفی تعلقات سے جو انسانی زندگی کا جزوِ لاینفک ہیں وہ قطعی ناآشنا رکھے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک عرصہ سے عورت کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ تشنگی جو رنگ نہ لاتی کم تھا۔ وہ بہت سی بیماریوں کا شکار ہو چکے تھے ۔۔۔ بہت سی اخلاق سوز حرکات ان میں پائی جاتی تھیں ۔۔۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا ایک جوان لڑکا قیدیوں کے زمرے میں شامل کر دیا گیا تھا ۔۔۔ چند دن بعد ان میں ایک اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ سرکاری کمیشن کا چاہے کچھ ہی بیان ہو لیکن جاننے والے اصلی لڑائی کا سبب خوب جانتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو ہمارے جیسے انسان ہیں ۔۔۔ جنھوں نے ایک جوان لڑکی کو دیکھکر ایسا محسوس کیا کہ ان کی روح ایک خواب گراں کے بعد انگڑائی لیکر بیدار ہوئی۔ ان کی کشتی حیات نے دریائے زندگی کی ہلکی ہلکی موجوں کے جھکولے محسوس کئے۔

مجھے سرکاری طور پر چند اخبار اور رسالے پڑھنے کو مل جایا کرتے تھے۔ اکثر نوجوان قیدی جو میرا کمرہ جھاڑنے آتے ان پرچوں میں سے عورتوں کی تصاویر پھاڑ کر لے جاتے۔ انھیں لپیٹ کر اپنی چڈیوں کے نیفوں میں چھپا لیتے۔ تنہائی میں ان کو سامنے رکھ کر عجیب عجیب حرکتیں کرتے ۔۔۔ میں نے شنکر اور راجو کو ان تصاویر کی پرستش کرتے اور ان کے سامنے آنسو بہاتے پایا۔

"اجی! کمار جی!" لڑکی کے جانے کے بعد شنکر نے کہا ۔۔۔ "تم تو ویسے بہت گنگناتے ہو ۔۔۔ کوئی ہیر ویر کہو نا؟"

کمار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وقت کہیں اور تھا۔ بوڑھا رامو ہنستے ہنستے کہنے لگا ۔۔۔ "بڑا عاشق کی دُم بنا پھرتا ہے ۔۔۔ لڑکیوں کی تصویریں تھوک لگا لگا کر سینے پر چپکاتا ہے ۔۔۔ مجنوں ہے مجنوں ۔۔۔ ایک لڑکی کیا دیکھ لی سینے سے ہاتھ ہی نہیں ہٹتا ۔۔۔ جیسے کوئی چیز نکل بھاگے گی نا؟"

"بس بس! چپ رہ بڈھے!!" شنکر نے غصہ سے کہا۔

"ذرا بوڑھے کا خیال ہے ۔ کوئی اور ہوتا تو ۔ اور تو جانے کیا ۔ ساری عمر تو چوری کرتے گذری ۔ ارے میں نے ایک لڑکی کے لئے خون کیا ہے خون ! ۔ اسی کی سزا بھگت رہا ہوں "

"ٹھیک بات ہے " کمار مسکرایا ۔ "ہمیشہ اوروں کے ہاں چوری کی، اگر کبھی تمھارے متاعِ دل پر ڈاکہ پڑتا تو معلوم ہوتا ۔ کیوں بابو جی ! سچ کہتا ہوں نا ؟ " اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ۔

یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ کمار لکھا پڑھا آدمی ہے ۔ لیکن ان کے حالات سے میں ناواقف تھا ۔ آج ان کے گذشتہ واقعات معلوم کرنے کی ایک زبردست خواہش پیدا ہوئی ۔ میں اکثر ان کا نگران رہتا تھا ۔ ان کے ساتھ محبّت اور ہمدردی سے پیش آتا تھا ۔ کبھی کبھی اپنے سگار سے ان کی تواضع بھی کرتا تھا ۔ وہ سب مجھ سے خوش تھے ۔ آج میں نے ان کے حالات معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی ۔ میری تحریک سے ہر شخص میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ۔ فضا ہی کچھ ایسی تھی ـــــــ گذرے ہوئے واقعات ہر شخص کو یاد آرہے تھے ـــــــ میرے اشارے پر راجو کہنے لگا :۔

"بابو جی ! ۔ میری ساری عمر چوری کرنے، ڈاکہ ڈالنے میں گذری ۔ بس یہ سمجھ لو کہ دو تین سال جیل کے اندر رہا، دو تین سال باہر ـــــــ لوگ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو آرام کرتے ہیں ـــــــ بس یہی میری حالت ہے ۔ جب چوری، ڈاکے، عیّاشی سے تھک جاتا ہوں تو چند دن آرام کرنے چلا آتا ہوں ـــــــ ہاں ! تو میں آپ کو سناتا ہوں کہ یہ زندگی میں نے کیوں اختیار کی ۔ بڑی پرانی بات ہے ۔ میری عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی ۔ ایک رئیس کے ہاں نوکر تھا ـــــــ ان کے رکھ رکھاؤ ۔ ان کے ٹھاٹ دیکھکر میرے منہ میں پانی آجاتا ـــــــ جی چاہتا کہ میں بھی ایسی ہی مست زندگی گزاروں ـــــــ مگر میں تو صرف تین روپئے کا نوکر تھا ـــــــ ہولی کے دن تھے ۔ ہر شخص نشے میں جھول رہا تھا میں نے بھی نشے کیلئے صاحب کی جیب سے دو روپے مار دیئے ـــــــ انھوں نے مجھے پولس کے حوالے کر دیا ـــــــ خیر، ہم تو سزا کاٹ آئے مگر اب ہم بچّے ہو چکے تھے ـــــــ ہر دولت مند سے مجھے نفرت ہو چلی تھی ـــــــ اب بھی کسی بڑے آدمی کو دیکھتا ہوں تو غصّہ سے جسم پر تھرتھری آجاتی ہے ۔ ایک آگ سی لگ جاتی ہے ۔ مجھے ان کے یہ ٹھاٹ ایک آنکھ نہیں بھاتے ـــــــ بس انھیں لوٹتا ہوں اور اپنی زندگی گذارتا ہوں "

اس کے بعد میں شنکر کی طرف رجوع ہوا ۔

"کیا پوچھتے ہو بابو جی !" شنکر کہنے لگا ـــــــ میں ایک اچھوت کے گھر پیدا ہوا ۔ باپ دادا چمار کا پیشہ کرتے تھے ۔ ایسا مضبوط ٹانکا لگاتے کہ گاؤں میں کیا کوئی لگائے گا ـــــــ میں روزانہ ندی نہانے جاتا تھا ۔ وہاں ایک دھوبی کی لڑکی رانی سے پریم ہوگیا ۔ بڑی ہی سُندر تھی وہ ـــــــ مجھ پر جان دینے کو تیار تھی ۔ وہ میرے لئے دیس کو ٹھکرانے پر تیار تھی ـــــــ رانی کا باپ اس کی شادی اپنی ہی برادری کے ایک جوان موہن سے کرنا چاہتا تھا مگر رانی شادی سے دریا میں ڈوب مرنا زیادہ پسند کرتی تھی ـــــــ میری اور موہن کی دشمنی بڑھتی گئی ـــــــ ایک دن ندی کے کنارے ہماری خوب لڑائی ہوئی ۔ وہ مجھے ڈھکیلتا کنارے تک لے گیا ۔ شاید ایک اور دھکے میں میں کئی سو فٹ نیچے پہونچتا ـــــــ مگر میں فوراً لیٹ گیا ۔ اور موہن کو ٹانگوں پر اٹھا کر پیچھے پھینکا ۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر سنبھل نہ سکا اور گیند کی طرح لڑھکتا دریا میں جا گرا ـــــــ تین دن بعد اس کی لاش پاس کے ایک گاؤں میں ملی ـــــــ اور اس جُرم میں پانچ سال سے یہاں پڑا ہوں ۔ ـــــــ کون جانے میرے بعد رانی کا کیا ہوا ـــــــ مگر جب اس کی یاد آتی ہے تو ـــــــ"

شنکر آگے کچھ نہ کہہ سکا ـــــــ شام ہو چکی تھی ـــــــ شنکر کی آنکھوں میں بھی ستارے جھلملا رہے تھے ـــــــ سات بجنے کی آواز سن کر ہم سب اپنی کوٹھریوں کی طرف چل دیئے ۔

دوسرے دن شام ہم لوگ پھر اسی درخت کے نیچے جمع ہوئے ۔ میری فرمائش پر راجو نے اس طرح اپنی داستان شروع کی :۔

"میں اپنی اکلوتی لڑکی کے ساتھ خاموشی سے ایک شہر میں اپنی زندگی گذارتا تھا ۔ میں ایک مل میں نوکر تھا ۔ اتنا کما لیتا تھا جو ہم دونوں کیلئے کافی ہوتا ـــــــ ہمارے گھر کے قریب ایک "بڑے صاحب" کا چپراسی رہتا تھا ۔ وہ اپنے کو صاحب بہادر سے کسی طرح کم نہ سمجھتا تھا ۔ تمام محلے والوں کو خواہ مخواہ ڈانٹتا دھمکاتا رہتا تھا ۔ بیچارے غریب اس سے بہت ڈرتے تھے ـــــــ اسے جمعدار کہہ کر پکارتے تھے ۔ اس کے خلاف کوئی شخص زبان نہ ہلا سکتا تھا اس نے پہلے تو میری بہن کو پھانسنے کی کوشش کی جب کچھ دال

تو ایک روز گھر میں گھس کر زبردستی اس کی عزت لے لی ——
بڑی نیک تھی بیچاری —— یہ داغ دار چہرہ دنیا کو کیا دکھاتی۔
فوراً پڑوس کے کنوئیں میں ڈوب مری —— شام کو جب میں گھر
واپس آیا تو بہن کی لاش سامنے رکھی تھی۔ سچ کہنے کا کسے حوصلہ تھا۔
سب خاموش تھے۔ مگر اتنی بڑی بات کیونکر چھپتی —— جیسے ہی
مجھے معلوم ہوا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور پھر ——
میری کلہاڑی جمعدار صاحب کے سر میں چار انچ اندر گھس گئی۔"
اس دردناک قصے سے ہر شخص متاثر تھا۔ سب کی نظریں جھکی
ہوئی تھیں۔ بوڑھے رامو نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا "بہت اچھا کیا
تو نے" —— کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ میرا اشارہ پاکر بوڑھے
رتیش نے کہنا شروع کیا:۔

"آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اپنے سگے چھوٹے
بھائی کا خون کیا ہے" کچھ ٹھیر کر وہ پھر کہنے لگا —— "میں اس کے
لئے مجبور تھا۔ واقعات کچھ اس قدر الجھ گئے تھے کہ ہم دونوں میں سے
ایک کو مرنا ضرور تھا —— اسے میری خوش قسمتی کہو یا بدقسمتی
کہ میں بچ رہا اور میرا بھائی —— ہاں میرا بھائی میرے ہاتھوں قتل ہوا۔
باپ نے مرتے وقت کافی کھیتی باڑی چھوڑی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے اسے
آپس میں تقسیم کر لیا اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ کچھ دن بعد اس کے
چند خود غرض دوستوں نے اس کے کان بھرے کہ میں نے اچھی اچھی زمین
اپنی طرف کر لی ہے اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ——
کشیدگی بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ کھیت میں ہماری لڑائی ہوگئی۔ اس نے
مجھ پر لکڑی سے متواتر وار کئے اور اس کے جواب میں میں نے بھی وار
کئے —— آخرکار —— میری لکڑی کی ایک ضرب سے اس کا
بھیجہ پاش پاش ہوگیا" —— اتنا کہہ کر بوڑھا آہستہ خاموش
ہوگیا۔

کمار گھٹنوں پر سر رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ ہم سب کی نظریں اسکی
طرف اٹھ گئیں۔ کیونکہ اب اس کی باری تھی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا اور پھر
اس طرح اپنے حالات بیان کئے:۔

"میں یہاں ایک قاتل کی حیثیت سے موجود ہوں۔ لیکن واقعہ یہ
ہے کہ میرے اس جذبہ سے جس کے تحت میں نے خون کیا اور اس سزا
سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے سزا تو فعل قتل کی دی گئی ہے۔ اس لئے
میں اکثر اپنے فعل کے متعلق سوچا کرتا ہوں —— کیا میں حق بجانب تھا،
یا میں نے زیادتی کی؟ میرا فعل جائز تھا یا ناجائز —— چار سال
سے میں اسی مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن اب تک کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔
ہاں! ایسے میں اپنے حالات سناتا ہوں —— میں ایک یونیورسٹی
کا گریجویٹ ہوں۔ میرے والد ایک بیوپاری آدمی تھے۔ ان کے انتقال
کے بعد سارا بار مجھ پر آپڑا۔ اس سلسلے میں مجھے اکثر گھر سے باہر رہنا
پڑتا تھا۔ یہ بات میری بیوی کو سخت ناگوار تھی۔ میری شادی معاشقہ کا
نتیجہ تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے بیحد محبت تھی۔ اس کی محبت میری
مجبوریوں کو نظر انداز نہ کرسکی۔ وہ کچھ رنجیدہ سی رہنے لگی۔ اس کی صحت
گرنے لگی۔ میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے جو ڈاکٹر تھے اس کی
ملاقات کرا دی کہ صحت کے متعلق وہ ان سے رائے لیتی رہے۔ اس کے
بعد میں اپنے کاروبار میں محو ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے دیکھا اس کی
حالت روبہ صحت تھی۔ وہ ہشاش بشاش رہنے لگی۔ اب وہ اکثر ڈاکٹر کے
ساتھ گھومنے اور سینما بھی جانے لگی۔ لیکن چند دن بعد عجیب عجیب خبریں مجھ
تک پہونچیں —— میں نے حتی الامکان درگذر کرنے کی کوشش کی
مگر سماج کی انگلیاں مجھے تیر و نشتر کی طرح چبھنے لگیں۔ آخر ایک روز میں نے
اپنی بیوی کی خوب خبر لی۔ اس نے وعدہ کیا کہ نہ وہ ڈاکٹر کو گھر آنے دیگی نہ
اس سے کوئی تعلق رکھے گی۔ یہ قصہ یہاں ختم ہوگیا۔ ہم پھر ہنسی خوشی رہنے لگے۔
ایک مرتبہ مجھے چند روز کیلئے باہر جانا پڑا۔ لیکن میرا کام جلد ختم ہوگیا۔ میں ایک
روز قبل ہی مکان پہونچا۔ میں اچانک پہونچ کر بیوی کو حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا۔
آہستہ آہستہ مکان میں داخل ہوا۔ اندر میں نے کیا دیکھا۔ اُف! میرے تن بدن
میں آگ لگ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ لڑکھڑاتا ہوا آفس روم میں پہونچا۔ الماری میں
سے ریوالور نکال لیا۔ میرے دل میں صرف ایک خیال تھا اس کے سوا میں کچھ نہ
سوچ سکا۔ بیوی اور ڈاکٹر کے سامنے پہونچکر ان پر گولیوں کی بارش کر دی جب میں
ٹھیرا تو سینکڑوں خیالات میرے دماغ میں گذر گئے۔ اچانک ایک خیال آتے
ہی میں نے ریوالور کی نال اپنے سینہ پر رکھ لی لیکن افسوس۔ وہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا"
صدر دروازہ سے بگل اور گھنٹوں کی آواز آرہی تھی۔ ہم سب اپنی
اپنی کوٹھریوں کی طرف چلنے لگے۔

رات کو سوتے وقت میں نے سوچا کہ تمام فتنہ و فساد، لڑائی جھگڑے
صرف زر۔ زن۔ زمین کیلئے ہوتے ہیں۔ ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔
بہت سے انسان اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ انسانوں کا ایک بڑا حصہ ان
تکالیف سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ آخر یہ سب کیوں؟
—— مجھے نیند آگئی۔

ریاض رؤفی

میرا مالی

کچھ عرصہ گذرا کہ مجھ کو اپنے مکان کے سامنے باغیچہ لگوانے کا سودا سر میں سمایا۔ چنانچہ میں نے یار دوستوں سے مشورہ کیا کہ باغیچہ لگانے کیلئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ سب نے یہی کہا کہ بھئی ایک مالی رکھ لو۔ گھر کے سامنے زمین تو ہے ہی۔ اس طرح جب "زمین" اور "مالی" یکجا ہوں گے تو باغ اور باغیچہ دونوں پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب مجھ مالی کی تلاش ہوئی۔ مگر اس معاملہ میں کچھ دقت پیش نہیں آئی کیونکہ جن دنوں مجھے باغیچہ لگوانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی ان ایام میں میری استفسارات اس زور شور سے ہو رہے تھے کہ آس پاس کے مہتر، چمار، دھوبی، نائی۔ غرضیکہ گھر گھر میں جب میاں بیوی دن بھر کی محنت کے بعد چار گھڑی آرام کرنے سے پہلے بیٹھ کر باتیں کرتے تو گھر بار کے دیگر معاملات کے علاوہ میرے باغیچہ لگوانے کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا۔

قصہ مختصر ایک دن صبح میں نہا دھو کر اخبار پڑھنے بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازہ کو نہایت آہستگی سے کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا "اندر تشریف لے آئیے" اس پر ایک پتلی سی صورت اندر داخل ہوئی۔ عجیب حُلیہ تھا۔ ننگے پاؤں جن پر پتلی پتلی ٹانگیں میلی سی دھوتی سے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ دھوتی پر ایک قمیص ڈھیلی ڈھالی اور اس پر کسی سپاہی کا خاکی سرج کا پرانا کوٹ۔ کوٹ کے موٹا ہونے پر بھی اس انسان کے جسم کی لاغری عریاں تھی۔ پتلے پتلے شانوں کے اوپر پنڈلیوں سے ذرا ہی موٹی گردن پر ایک نہایت پتلا چہرہ لگا ہوا تھا۔ چہرہ کی رنگت بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس کا رنگ گہرے سبزی مائل سے لیکر گہرے چاکلیٹ تک کسی قسم کا ہوگا۔ مونچھیں بھی اس کی پتلی پتلی مگر لمبی اور مڑی تڑی ہوئی تھیں۔ ایک گھٹیا قسم کی کرسٹی ٹوپی جس کو سر کے بال بھی گول نہ بنا سکے تھے دھری ہوئی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپکی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ جواب میں کہنے لگے کہ وہ خود خدمت کرنے آئے تھے۔ انھوں نے پاس کے کسی چمار سے سُنا تھا کہ مجھ کو ایک مالی کی ضرورت تھی اور وہ بذاتِ خود مالی تھے۔

میں نے دل میں سوچا کہ یہ حضرت مالی کا کیا کام کریں گے۔ ان کا پتلا پن ان کی کمزوری کی دلیل تھا۔ مگر مونچھیں اور سامنے کے دانت جن میں سونے کی میخیں لگی ہوئی تھیں ان کے تجربہ کار ہونیکے شاہد تھے۔ غرضیکہ یہ فیصلہ ہوا کہ دس روپیہ ماہانہ پر میرے ہاں مالی کا کام کیا کریں گے۔

دوسرے دن صبح مالی صاحب تشریف لائے اور پوچھا کہ باغیچہ کس قسم کا لگایا جائے۔

میں یہ سوال سن کر چکرایا۔ سوچنے لگا کہ باغیچہ کی کونسی قسم بتاؤں۔ آخر ہمت کر کے کہا کہ مالی سنو! تم سے دو سیدھی سادی باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں کوئی شاہجہاں تو ہوں نہیں کہ تاج محل جیسا گلزار لگوانے کی جرأت کر سکوں۔ بس کسی قسم کا باغیچہ ہو۔ یعنی معمولی سی قسم کا۔ دوسرے یہ کہ چونکہ آجکل زمانہ میں آزادی کا دَور دَورہ ہے اس لئے میں نے باغیچہ لگانے میں تم کو مکمل آزادی دے دی۔ جس طرح چاہو باغیچہ لگاؤ۔ جو چاہو کرو مگر اس ویرانے کو بسا دو۔ مالی "سلام سرکار" کہہ کر رخصت ہوا۔

اس دن مالی نے اس اُجڑی زمین کا جائزہ لینے میں صرف کیا۔ اس زمین کو ہر ایک زاویئے سے دیکھا۔ اس کی مٹی کو ہاتھ اور پاؤں دونوں سے ٹھکور ٹھکور کر دیکھا۔ اپنی انگلی سے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے خیالی دائرے کھینچے۔ بیچ میں اُگے ہوئے درختوں پر غور کیا۔ غرضیکہ ہر پہلو سے اس معاملہ کو بھانپا۔ پھر گویا اس دن کا کھیل ختم کر کے کسی انجینئر کی طرح اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

تیسرے دن صبح کو پھر مالی صاحب نظر آئے۔ کہنے لگے۔ "سرکار اس زمین کے گرد جنگلہ لگنا چاہیے تاکہ بچے، ڈھور، ڈنگر اور اسی قسم کی چیزیں بننے والے باغ میں سے نہ گذر سکیں۔" میں نے پوچھا "پھر کیا کیا جائے۔" مالی نے کہا "جی کچھ نہیں۔ تین چار روپے کے بانس، ایک بیلچہ، پھاوڑا، سو گز تار اور اسی قسم کی کچھ اور چیزیں درکار ہونگی۔ میں خود جنگلہ کھڑا کر لوں گا۔"

یہ نئے عشق کی پہلی مشکل تھی۔ نئی نئی تنخواہ آئی تھی۔ میں نے بیس روپے حضرت مالی کی نذر کئے اور کہا کہ سب سامان لے آؤ اور جنگلہ وغیرہ شروع کر دو۔ چنانچہ جنگلہ وغیرہ بننا شروع ہو گیا اور کچھ عرصے تک بنتا رہا۔ جب بن چکا تو میں نے سوچا کہ اب باغیچہ لگنا

شروع ہو جائیگا۔ اور پھر گھر کے سامنے باغ اور باغ میں بیٹھ کر بندرہ شام کی چاء پیا کریگا۔ اور مشکل مسائل پر غور کرتے وقت اس میں ٹہلا کریگا۔ میں انہی خیالات میں تھا کہ مالی صاحب پھر تشریف لائے اور کہا کہ "حضور جنگلہ تو تیار ہو گیا اب اس کو رنگ کرنا چاہیئے بہت خوشنما معلوم دیگا۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ مالی پر غصہ آیا۔ اس چمار پر بھی غصہ آیا، جس نے اس مالی کو میرے پاس ملازم ہونے کی صلاح دی تھی۔ اور سب سے زیادہ خود پر غصہ آیا کہ کیوں میں نے یہ درد سر مول لیا۔ اور غصہ آنے کی وجہ بھی تھی۔ میں باغیچہ لگوانے کی فکر میں تھا اور مالی جنگلہ کھڑا کر رہا تھا اور اس کو رنگنے کی فکر میں تھا۔ مگر میں نے پھر سوچا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جو کام آہستگی سے ہوگا وہ اچھا ہوگا۔ اس لئے میں نے جنگلہ رنگنے کی تجویز کو بھی پسند کیا اور رنگ و برش کیلئے پیسے مالی کو دیدیئے۔ ایک شام کو جبکہ میں جنگلے کا پاس سے معائنہ کر رہا تھا تو میں نے مالی کو زیر لب گنگناتے سُنا، بالکل سہگل کی طرح:۔

اک جنگلہ بنے نیارا

خیر سے جنگلہ بھی رنگا گیا۔ دوسرے دن پھر مالی صاحب آموجود ہوئے۔ کہنے لگے "صاحب! باغیچہ لگانے کیلئے بیج لانے ہونگے۔ اس کے علاوہ پانی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا جس کیلئے دو کنستر دل اور ایک فوارہ کی ضرورت ہوگی"۔ مالی کو میں نے ان سب چیزوں کے لئے بھی پیسے دیئے اور اس نے کام شروع کر دیا۔ پہلے چند دن تو کیاریاں بنانے میں لگ گئے۔ پھر اس نے شاید بیج بوئے۔ اور روزانہ جب میں کام کر کے واپس آتا تو مالی جانفشانی سے باغ میں پانی دے رہا ہوتا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک دو پھول بھی باغیچہ میں اُگ پڑے۔ مگر باغیچہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ میں اس میں بیٹھکر چاء پی سکتا یا پیچیدہ گتھیاں سُلجھا سکتا۔

میرا باغیچہ میں بیٹھنے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ کم بخت زمین کا ٹکڑا باغیچہ کی شکل ہی اختیار کرنے میں نہیں آتا تھا بے چینی کے ایام کا ذکر ہے کہ مالی صاحب ایک صبح پھر نمودار ہوئے اور اس مرتبہ یہ فرمائش لیکر آئے کہ نئے موسم کیلئے نئے بیجوں کی ضرورت ہوگی۔

سوال پھر پیسوں کا تھا۔ در اصل تمام دنیا پیسوں کا کھیل ہے میں پیسے کمانے کیلئے کام کرتا ہوں۔ میرا باپ پیسے کمانے کیلئے کام کرتا تھا۔ میرا نوکر پیسے کمانے کیلئے میرا کام کرتا ہے۔ لڑکے اسکولوں اور کالجوں میں دن رات اس لئے مطالعہ کرتے ہیں کہ پڑھ لکھکر دنیا میں پیسہ کما سکیں قحبہ پیسوں کیلئے حسن فروشی کرتی ہے۔ وکیل پیسوں کیلئے جھوٹ بولتے ہیں اور پہلوان گردنیں اور شانے تڑواتے ہیں۔ خود میرے مالی نے بھی پیسوں کیلئے یہ جال بچھا رکھا ہے۔ گھٹتے ہوئے دل سے اور دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح میں نے پوچھا "مالی! تو کیا پہلے بیج ختم ہو گئے۔ کیا ان کی بہار چل گئی؟ بڑی جلدی چلی گئی۔ میں نے تو صرف دو پھول باغیچہ میں دیکھے تھے۔ پھر وہ پہلے بیج کیا ہوئے؟"

مالی نے یوں جواب دیا۔ جیسے پہلے ہی سے تیاری کر کے آیا ہو "سرکار! در اصل کام موسم کے بیچ میں شروع ہوا تھا اس لئے ادھورا سارہ گیا تھا۔ اب کے دیکھئے باغیچہ کو پھولوں سے بھر دوں گا۔ آپ کونسی قسم کے پھول زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

میں نے شکست خوردہ فریق کی طرح کہا "مالی! خدا کیلئے اس اُجڑی زمین کو سرسبز کردو۔ کوئی بھی پھول لگاؤ مگر وہ پھول ہوں کوئی اور شے نہ ہو۔ اگر میری صلاح پوچھتے ہو تو مجھے موتیا بہت پسند ہے۔ یہ پھول ہے بھی ہندوستانی طرز کا۔ اور میں نے دل میں سوچا کہ ؎

کانٹے سے بھی خراب ہے جس گل میں بو نہ ہو

اس لئے میرے باغیچہ میں موتیا ضرور ہو۔ یہ کہہ کر مالی کو حسب ضرورت بیجوں کیلئے اور پیسے دیئے۔ مالی سلام کر کے رخصت ہوا۔ اور مجھے یہ سوچتا چھوڑ گیا کہ نہ معلوم یہ اخراجات کب تک جاری رہیں گے مالی کو رکھے ہوئے پانچ مہینے گذر گئے۔ مگر باغ میں یعنی اس زمین میں جس کے گرد باغیچہ بنانے کی خاطر جنگلہ کھڑا کیا گیا تھا ابھی پھول اُگنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ مالی کی نت نئی ضروریات ابھی تک طوفانی تیزی سے جاری تھیں۔ اگر میں مالی ہوتا تو مجھے تو روز روز پیسے مانگتے ہوئے شرم آجاتی خاصکر اس حالت میں جبکہ باغیچہ میں ابھی پھول بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہاں باغیچہ کے بیچوں بیچ ایک جھاڑی سی نمودار ہو رہی تھی۔ عجیب قسم کے بدنما پتوں کے ساتھ! میں نے مالی سے پوچھا کہ "کیوں بھئی! یہ کس قسم کے پھول ہیں؟"

مالی کہنے لگا "حضور! آپ نہیں جانتے؟ یہی تو موتیا ہے۔"

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں موتیا دیکھا تھا مگر شاید مالی کی اصطلاح میں اسی بدنما جھاڑی کو موتیا کہتے ہونگے۔ میں دنیا کے کسی شخص سے ہر ایک شرط لگانے کیلئے تیار ہوں کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ جو جھاڑیاں میری زمین میں اُگ رہی ہیں وہ موتیا ہی کی پھول ہیں۔ مزید براں موتیا میں تو خوشبو ہوتی ہے۔ نہایت دلفریب خوشبو

جس سے گھر بار مہک جائے۔ ان کمبخت جھاڑیوں میں تو بد بو بھی نہیں آتی بعض داناؤں کا قول ہے کہ انسان کو بد کردار بیوی نہ ملے۔ مگر وہ عاقل شاید مصیبت کی اس دکان کو بھول گئے تھے جن کو مالی کہتے ہیں۔ کم از کم میرا مالی تو دن رات میری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ ہر ایک بات میں دھوکا دیتا ہے۔ سچ غلطی سے بھی کبھی نہیں بولتا۔ اے دنیا کے باغیچہ بنانے والو۔ میری یہ بات یاد رکھنا ان انسانوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔

میرے مالی نے اپنا لباس تبدیل کر لیا ہے۔ آجکل وہ دھوتی نہیں پہنتا بلکہ خاکی قمیص اور خاکی رنگ کا ہی پاجامہ پہنتا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید جنگی لباس پہن کر مجھے ڈرانا چاہتا ہے کہ میں اس کے روزمرہ کے مطالبات پورا کرتا رہوں۔ یا شاید آج کل جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے خاکی لباس نہایت فیشن ایبل متصور ہوتا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے مالی کو اس خاکی رنگ سے محبت ہو اسی وجہ سے تو میرے باغیچہ میں خاک اڑا کرتی ہے اور پھولوں کی جگہ سوکھی ہوئی جھاڑیوں نے لے رکھی ہے۔ وائے نادانی میں نے ایسے شخص کو مالی کیوں رکھا!

اور سنئے! میرا مالی چار عدد بچوں کا باپ ہے اسی لئے تو کمبخت ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہوئی کہ جب ایک آدھ مہینے کے بعد اس زمین (جس کو باغیچہ بنوانے کی کوشش میں میں نے اپنی پونجی صرف کر دی ہے) کی جھاڑیاں سوکھ کر اس قابل ہو جاتی ہیں کہ جلائی جا سکیں تو ان ایام میں مالی کے چھوٹے چھوٹے بچے کہیں سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کی طرح اپنے باپ کی راجدھانی پر پھیل جاتے ہیں۔ اور آنِ واحد میں اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کی وہی حالت کر دیتے ہیں جو مالی رکھنے سے کچھ دن پہلے تھی۔ یعنی باغیچہ صفاچٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ خاردار جھاڑیاں بھی نہیں رہتیں۔ جنگلے سے گھرا ہوا زمین کا یہ حصہ بھیڑ بکریاں رکھنے کی جگہ معلوم ہونے لگتا ہے ... وہ چار بچے اپنا کام نہایت صفائی سے کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میرے مالی سے تو اس کے یہ بچے ہی بھلے۔ کم از کم مہینے میں ایک دفعہ باغ کی ایسی صفائی کر دیتے ہیں کہ تنکا بھی ڈھونڈنے پر نظر نہیں آتا۔

کئی موسم بدل چکے ہیں۔ مالی کو رکھے ہوئے اب ایک سال ہونیکو ہے۔ مالی نے باغ کو بھی اپنا جیسا خاکی لباس پہنا رکھا ہے یعنی گھاس کی جگہ خاک اڑتی ہے۔ پھولوں کی جگہ خاردار جھاڑیاں رونما ہیں، جو گاہ بگاہ مالی کے گھر میں ایندھن کا کام دیتی ہیں۔

مالی ہر روز میری کھال ادھیڑتا ہے۔ کبھی جھاڑیاں کاٹنے کے لئے قینچی مانگتا ہے۔ گھاس کاٹنے کیلئے مشین کی ضرورت بتاتا ہے۔ زمین کیلئے کھاد چاہتا ہے۔ بیوی بچوں کے رکھنے کیلئے مکان کی بھی ضرورت جتلاتا ہے۔ ان کی دوا دارو کیلئے ڈاکٹر کے نام چٹھی بھی لکھواتا ہے۔ میں کیا کروں، اس کے مطالبات کو حتی المقدور پورا کرتا ہوں۔ جب سے مالی آیا ہے میں نے ایک کپڑا نہیں سلوایا۔ جوں جوں مالی کے کپڑے اچھے ہوتے جا رہے ہیں میرے پھٹتے جا رہے ہیں۔ اس پر بھی اس مردِ ملعون کو میری حالت پر رحم نہیں آتا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں بڑا الو ہوں) جو اس قسم کے انسان کو نوکری سے علیحدہ کیوں نہیں کر دیتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تو میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح باغیچہ لگ جائے اور بطرف دیگر مالی کے مطالبات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ نہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً حال کا واقعہ ہے کہ مالی صاحب صبح صبح تشریف لائے اور کہنے لگے کہ "سرکار! کچھ سرو کے پودے بک رہے ہیں۔ اگر حکم ہو تو تین چار خرید لاؤں؟"

میں نے کہا: "مالی! تمھارا موتیا تو دیکھ لیا۔ اب شاید تم سرو کی جگہ چیڑ کا درخت لگانا چاہتے ہو!"

مالی نے نہایت متانت سے جواب دیا: "جی نہیں اس دفعہ بالکل خالص قسم کا سرو لگاؤں گا۔ موتیا تو یہاں ملتا ہی نہیں اس لئے میں نے آپ کو خوش کرنے کیلئے موتیا کی قسم کی ایک اور چیز بو دی تھی"

میں نے کہا: "اچھا مالی تو سرو لگا لو"

"بہت بہتر حضور" کہکر مالی نے پھر کہنا شروع کیا: "سرکار! میں بال بچے دار ہوں۔ میری تنخواہ بڑھنی چاہیئے۔ دس روپیہ میں میرا گذارہ نہیں ہوتا"

میں نے کہا: "اچھا مالی! اس معاملے کو سوچیں گے اور سوچ کر جواب دیں گے"

مالی نے پھر کہا: "سرکار کچھ گملے باغ کے گرد لگنے چاہئیں"

میں جل بھن کر کوئلہ ہو گیا۔ باغ میں نام کو بھی پھول نہ تھا۔ اور نہ معلوم یہ شخص گملوں میں کیا لگانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا: "مالی! گملوں کیلئے اس وقت پیسے نہیں ہیں پھر کبھی سہی"

مالی ان ہستیوں میں سے نہ تھا جو گملوں پر ہی رک جاتا کہنے لگا: "سرکار جیسے آپ کی مرضی۔ مگر دیوالی آ رہی ہے اور آپ نے اب تک چراغ نہیں منگوائے اگر حکم ہو تو میں چراغ لے آؤں اور ان کو دھو دھا کر دیوالی کیلئے تیار کر رکھوں"

اب آپ ہی بتایئے ایسے انسان کو کوئی کیا کرے۔ اگر گملوں کیلئے میں پیسے نہیں دیتا تو مالی دیوالی کیلئے چراغ تجویز کر دیتا ہے۔ بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتا ہے۔ اگر میں کمرہ میں بیٹھا ہوں تو کھانس کھانس کر اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور جب وہ میرے کمرے کے سامنے آکر آہستہ سے کھانستا ہے تو میری روح قبض ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نئی تجویز پیش ہوگی اس لئے اپنی جیب پر مضبوطی سے ہاتھ دھر لیتا ہوں مگر جب کبھی مالی آتا ہے مجھے الو بنا کر پیسے لے جاتا ہے۔ مگر باغیچہ ابھی تک نہیں بن سکا۔ اسی طرح بنجر اور ویران ہے جس طرح پہلے تھا۔ پھولوں سے اسی طرح خالی ہے جس طرح میری جیبیں آجکل پیسوں سے ہوتی ہیں۔

میری باغیچہ میں بیٹھکر چاء پینے کی آرزوئیں اور اس میں ٹہلتے ہوئے پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے سہانے خواب حرف غلط کی طرح مٹ چکے ہیں۔ آجکل جس پیچیدہ گتھی کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سلجھا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے باغیچہ لگوانے کا قصد کیا تھا۔ اس آفت کو مول لینے سے تو یہی بہتر تھا کہ میں ہاتھی رکھ لیتا۔ کوئی بڑا سا کتا پال لیتا۔ ایسی موٹر خرید لیتا جو ایک گیلن پٹرول سے صرف چھ میل ہی چلتی۔ یا شادی کر کے ایک دو بچوں کا باپ ہی بن جاتا ۔۔ ان چیزوں پر زر خرچ کر کے کچھ فائدہ بھی تو ہوتا۔ مگر اس پتلے مالی نے میری حالت بہت پتلی کر دی ہے

ہش!! میرے دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مالی کے کھانسنے کی میٹھی اور مدھم آواز قریب تر ہو رہی ہے۔ میں اب قلم رکھ دوں تاکہ آنے والی مصیبت کا دونوں ہاتھوں سے مقابلہ کر سکوں۔

اب جگر تھام کے بیٹھوں مرا مالی آیا!

بھارت چند کھنہ

وعدہ فراموش سے!

یہ گھنی پلکوں کے سائے ہیں ترے رخسار پر
ہائے یہ نیچی نگاہیں! ہائے یہ غمگیں جمال
تیرا سینہ اور پریشاں! تیری آنکھیں اور نم!
میں نہیں کہتا کہ تو کیوں وقت پر آئی نہیں
میں نہیں کہتا کہ کیوں تو نے ادائے ناز سے
میں نہیں کہتا کہ اب ملنے کی گھڑیاں جا چکیں
میں نہیں کہتا کہ افشا ہو گیا ہے تیرا راز
میں نہیں کہتا کہ اب تیری تجلی عام ہے
میں تو بس اتنا کہوں گا اے مرے گل پیرہن
وہ جو دل میں ایک چنگاری ہے ہر دم بیقرار
اس کی لو سے جب دہک اٹھتا ہے شاعر کا دماغ
روح کہتی ہے "اسے اس وقت آنا چاہیئے"
راہ تکتے تکتے تھک جاتا ہوں رو دیتا ہوں میں

چھا رہی ہے یا گھٹا ساون کی شالامار پر
کیوں ہے اپنا راز کھل جانے کا تجھ کو احتمال
بڑھ رہا ہے اور بھی ان سے مرا رنج و الم
کیوں مری باہوں پہ تو نے زلف بکھرائی نہیں
میرے دل پر سر نہیں رکھا اسی انداز سے
صبح کی پریاں وہ پورب کے افق پر چھا چکیں
میں نہیں کہتا کہ ہر جائی ہیں تیرے حسن و ناز
یا تجارت اپنی رعنائی کی تیرا کام ہے
فی الحقیقت یوں نہیں ہوتا محبت کا چلن
وہ جسے کہتے ہیں دنیا کی زباں میں "انتظار"
یعنی جب نس نس میں جل اٹھتے ہیں چاہت کے چراغ
اس کو لانے کے لئے کچھ دور جانا چاہیئے"
آنسوؤں میں اپنی امیدیں ڈبو دیتا ہوں میں

صبح جب اٹھتی ہے مشرق سے برافگندہ نقاب
بیٹھ جاتی ہیں امیدیں ٹوٹ جاتے ہیں حباب

احمد ندیم قاسمی

چرخ نے مُردہ جسم میں سے اپنی تھوتنی نکالی اور اُوپر اُٹھا کر اپنے کانوں کو کھڑا کیا۔ اُس کی زرد زرد آنکھیں اس طرح متحرک ہوئیں گویا وہ نامطمئن و مُشتبہ ہو۔ دُور اندھیرے جنگل میں سے کسی لشکر کے آگے بڑھنے کی آواز آرہی تھی ـــ دھب، دھب، دھب، دھب!

ایک گدھ بولا، پھر اپنے پر پھڑپھڑا کر ایک درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ باقی دو گدھوں نے لمبی اُڑان بھری اور تاؤ دے کاٹ کاٹ کر اُونچے ہونے لگے، یہانتک کہ ایسے نظر آنے لگے کہ نیلے آسمان کے ریشمی شامیانے میں آویزاں ہوگئے ہیں۔

گدھ کہہ رہے تھے: "تماکو آرہا ہے"!

سگ صورت بندروں کی ایک ٹکڑی جو جھاڑیوں میں غارتگری کرتی رہی تھی قلانچیں بھرتی باہر میدان میں نکل آئی۔ اُن کے گلگچھے پھڑپھڑا رہے تھے، دُمیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ آگے آگے ایک جغادری تھا جو اُن کا سردار تھا۔

جغادری نے اپنے زرد زرد دانت نکوس کر کہا "تماکو آرہا ہے"!

باقی سب بندروں نے بھی مُنہ چڑا کر کہا: "تماکو کیلئے راستہ چھوڑ دو"!

اُن کا سردار ایک چھلانگ مار کر اُوپر پھیلے ہوئے ٹہنیوں کے جال میں پہونچ چکا تھا۔ باقی سارے بندر بھی چھلانگیں مارتے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

چرخ اکیلا کھڑا ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ اس کے سامنے شیر ببر کا پس خوردہ زبرا پڑا تھا۔ چرخ کی تھوتنی ایک بار پھر زبرا کے مُردہ جسم میں غائب ہوگئی۔ ایک ہی لمحہ بعد اُس نے اپنی خون میں لتھڑی ہوئی تھوتنی اُٹھائی اور دُور سے آنے والی آواز کی طرف کان لگا کر سونگھنا شروع کیا۔

دھب! دھب! دھب! زمین کانپنے لگی۔ سامنے کا درخت قریب آنے والے کے خوف سے لرزتا نظر آتا تھا۔ پھر ایکا ایکی جنگل کے سناٹے میں دہشتناک چنگھاڑیں گونجنے لگیں۔ جیسے سینکڑوں نقیبوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی تُرتی پھونک دی ہو۔ پواو۔ پواو۔ پواو۔ پواو۔

یہ ہاتھیوں کی چنگھاڑ تھی۔ ان میں سب سے اُونچی ایک آواز تماکو کی تھی جو اپنی ڈار کا سردار تھا۔ اس کی چنگھاڑ کا جواب باقی اور سب ہاتھی دے رہے تھے۔ پواو! پواو! پواو! پواو!

چرخ کے لئے یہ اعلان کافی تھا۔ اُس نے اپنی بالوں سے ڈھکی تھوتنی میں سے کچلیاں چمکائیں، تیزی سے ایک پلٹا کھایا اور خاک کا ایک بادل سا اُڑاتا ہوا سبز رنگ گھنی جھاڑیوں میں سایہ کی طرح غائب ہوگیا۔

ٹہنی پر بیٹھے ہوئے گدھ نے ایک زور کا قہقہہ سا لگایا۔ "تماکو آرہا ہے"

ایک گیدڑ دُم دبا کر راستے میں سے بھاگا۔ کالے ناگ نے بھی بھاری بھاری قدموں اور کچل دینے والی موت کا خطرہ محسوس کر لیا تھا اور جلدی جلدی اپنی کنڈلی کھول جھاڑی میں سٹک گیا۔

شیر ببر کے پنجوں سے چری ہوئی زبرا کی لاش دھوپ میں پڑی سڑ رہی تھی۔ چیونٹیوں کی چمکدار قطار جو زبرا تک پھیلی ہوئی تھی وہ بھی یکایک غائب ہوگئی تھی۔ گھنے جنگل کا یہ چھوٹا سا میدان پُراسرار سناٹے سے معمور ہو گیا تھا۔

بھاری بھاری قدموں کی خوفناک گرج قریب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی کے ایک پہاڑ نے اس چھوٹے سے میدان کو ڈھانک لیا۔ سورج کی شعاعیں منقطع ہوگئیں اور جنگل کے سبز رنگ پردوں کو ہٹاتا یہ کالا پہاڑ عجیب شان و شکوہ سے آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

یہ تماکو تھا جو اپنی ڈار کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کی سونڈ درختوں کو راستے میں سے ہٹاتی جاتی تھی اور اپنے چارے کو سونگھتی جاتی تھی۔ بڑے بڑے کان پنکھوں کی طرح ہل ہل کر مکھیوں اور کیڑوں کو بھگا رہے تھے اور تماکو بڑی ہوشیاری سے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ لمبے لمبے زرد رنگ کے دانت موت کے نقیب معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر چیز کو شُبہ کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے بھاری بھاری قدم اِسی طرح اُٹھ رہے تھے جیسے کوئی انسان اندھیرے میں بڑی احتیاط سے پنجوں کے بل چلے۔

پواو! پواو! پواو! پواو!

اب تماکو نے یہ آواز اتنی ہلکی نکالی کہ بالکل سرگوشی بن گئی۔

جنگلی سفید چڑیاں اس کی پیٹھ پر بیٹھکر اپنے پر پھڑپھڑانے اور چہچہے مارنے لگیں۔ تماکو نے اپنا پچھلا دھڑ ذرا سا آگے کو کر دیا۔ اس پر کھلال کی بہت سی بٹیں پڑی ہوئی تھیں اور یہ وہ مقام تھا جہاں کبھی کسی شکاری کی گولی لگی تھی۔

تماکو وہاں آکر ذرا ٹھٹکا جہاں مُردہ زیبرا پڑا تھا۔ تماکو کی بل کھائی ہوئی سُونڈ اُس کی طرف سُونگھتی ہوئی بڑھی، پھر سر سے اُونچی اُٹھ گئی۔ تماکو کی ایک ہلکی سی چیخ سُنائی دی اور وہ کترا کر الگ ہٹ گیا۔ اُسے مُردار سے نفرت تھی۔ یہ تو چرغ اور گِدھوں ہی کا من بھاتا کھاجا ہے۔

درخت پر بیٹھے ہوئے گِدھ کے قہقہے کی آواز اُس نے سُنی۔ اُسے غصّہ آگیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ اس کی سُونڈ درخت کے تنے میں لپٹ گئی اور ایک ہی جھٹکے میں درخت جڑ سے اکھڑ آیا۔ گِدھ اپنی بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ تماکو نے اُکھڑا ہوا درخت جھاڑی کی طرف اُچھال دیا۔ جھاڑی میں دبکا ہوا چرخ چیخ مار کر اور بھی اندر جا چُھپا۔

ہاتھی کی آواز سنائی دی: "راستہ صاف کرو، تماکو آرہا ہے"۔

جیسے کسی جنازے کے ساتھ لوگ خاموش چلتے ہیں اسی طرح باقی اور سب ہاتھی اپنے سردار کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ گویا جنگل کے سائے کالے دیو قطار بنائے چل رہے تھے۔ چند بچّے بیچ میں کُلیلیں کرتے جارہے تھے۔ پُرانے ہاتھیوں کے لمبے لمبے دانت نکلے ہوئے تھے۔ ہتھنیاں بچّوں کو قطار میں کرتی چلتی تھیں۔

درختوں کو ہٹاتا، اکھاڑتا اور جھاڑیوں کو کچلتا روندتا ہاتھیوں کا یہ جلوس چلا جارہا تھا۔ چھوٹے سے میدان میں زیبرا کے سڑے ہوئے جسم پر دھوپ کی دھاری پھر پڑنے لگی۔ اب پھر اس کُھلی جگہ میں سنّاٹا تھا اور سینکڑوں آنکھیں جھاڑی میں سے جھانک رہی تھیں۔

لیکن یہ جھانکنے والے جانور بالکل ساکت تھے۔ گِدھ اب بھی آسمان میں لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ صرف کالے ناگ نے ذرا بلند ہوکر اپنا پھن کھول دیا کیونکہ اب وہ ایک اور بھی زیادہ خطرناک بو پا رہا تھا۔ کوئی انسان قریب آرہا تھا۔

ایک لمحہ بعد وہ انسان جنگل کا پردہ ہٹاکر نمودار ہوا۔ یہ ایک گوری رنگت کا نوجوان تھا۔ دھوپ سے تمتماتے ہوئے چہرے پر مسرّت اور فخر و شوق ظاہر تھا۔ سیدھے ہاتھ میں ہاتھی کے شکار کی رائفل تھی۔

اُس نے آسمان کی طرف نظر نہیں اُٹھائی اور نہ اُن گِدھوں کو دیکھا جو ہوا میں مُعلّق تھے۔ اُس کی نظریں تو ہاتھیوں کے اُن پیر کے نشانوں پر جمی ہوئی تھیں جو تماکو اور اسکی ڈار اپنے جلو میں چھوڑ گئی تھی۔ نیچے جُھکے جُھکے وہ اسی کھوج کو دیکھتا بھاگا سا چلا جارہا تھا۔

اِس اُجلے رنگ کے نوجوان کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح ایک دیسی کالے رنگ کا بندوق بردار لگا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک پُرانی خاکی وردی تھی۔ قوسین کی طرح مُڑی ہوئی ٹانگیں جُھلسی ہوئی لکڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

یہ دیسی ٹھیک اُسی جگہ ٹھٹکا جہاں تماکو نے ٹھہر کر زیبرا کے مُردہ جسم کو سونگھا تھا اور کترا کر نکل گیا تھا۔

دیسی نے کہا: "صاحب! ان پگّوں پر چلنا جان جوکھم کا کام ہے"۔

صاحب نے اپنی نیلی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھائیں اور تعجب سے دیکھا۔ دیسی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

"عبدل! ہاتھی کا شکار ہی جان جوکھم کا کام ہے۔ ابھی انہوں نے ہماری بُو نہیں پائی ہے، آدھ گھنٹے میں ہم انہیں جالیں گے اور جس کو چاہیں گے گرالیں گے"۔

دیسی نے بددلی سے کہا: "یہ پگ خطرناک ہیں صاحب"۔

صاحب کے چہرے سے نفرت ٹپکنے لگی۔

"تو تمہیں ڈر لگ رہا ہے عبدل؟"

دیسی کا سر جُھکا رہا۔

"میں نے بہت سے بہادر شکاریوں کی بندوقیں اٹھائی ہیں صاحب"

صاحب نے حقارت سے کہا: "ہاں مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا"۔

عبدل نے اسی طرح بے دلی سے کہا: "صاحب اب میں اس کام میں پُرانا ہوگیا ہوں اور کچھ سُوجھ بوجھ بھی بڑھ گئی ہے۔ ایسے ہاتھی کا پیچھا کرنا جسے کوئی نہیں مار سکتا آسان نہیں ہے"۔

"ہیں! کیا کہا؟" صاحب نے اپنی بندوق اور بھی زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے جو کہا سچ ہے صاحب۔ ہم تماکو کے پگّوں پر چل رہے ہیں۔ اُس ہاتھی کے جسے کوئی نہیں مار سکتا"۔

عبدل کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باقی تین دیسی بھی اتنے میں آگئے اور صاحب کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

صاحب نے عبدل کے الفاظ کو دُہرایا: "تماکو! جسے کوئی نہیں مار سکتا! یہ تو پہلی بار میں نے تم سے سُنا ہے"۔

تماکو کا نام دیسیوں کے دماغ پر بجلی بن کر گرا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے خوفزدہ سرگوشیوں میں کہا۔

"تماکو! صاحب تماکو کو ماریگا!"

عبدل نے بڑبڑا کر کہا: "صاحب میں نے آپ سے جو کہا ہے اُس میں جُھوٹ نہیں ہے۔ بہت سے شکاریوں نے تماکو کا شکار کھیلنا چاہا مگر ایک بھی اُس کے مارنے کی خبر لیکر نہیں لوٹا۔ جنگل کا سب سے بڑے دانتوں والا

ہاتھی تماکو ہی ہے۔ اس کے دماغ میں ایک بھوت رہتا ہے اور اس کے جسم میں ایک کالے امیرکن رُوح ہے۔ کئی بہادر اور ہوشیار شکاریوں نے تماکو کا پیچھا کیا۔ چھ نے اس پر گولی چلائی، ایسی کہ اُسے گر جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ گولی ابھی ڈھلی ہی نہیں ہے جس سے تماکو گر جائے۔ جنگل کے اندھیرے میں سے وہ ابھرا ہوا نکلتا ہے اور جو اُسے شکار کرنا چاہتے ہیں اُنہیں روند ڈالتا ہے۔ اُس کے پیروں سے سات آدمی اب تک روندے جا چکے ہیں۔ صاحب آپ ذرا ہوشیار رہیئے۔ کہیں آٹھویں آپ ہی نہ ہوں۔"

صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"ایسا ہاتھی تو شکار کرنے کے لائق ہے۔ کالے شیطانو۔ میرے ساتھ آؤ۔ اِس ہاتھی کو مارنے کے لئے تو میں جہنم تک اس کا کھوج لگاؤنگا۔"

یہ کہکر بے اختیاری میں آگے بڑھا۔ عبدل نے اُسے روکنے کیلئے اپنا دُبلا سیاہ ہاتھ بڑھایا۔ صاحب نے غصہ سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اگر تُو ڈرتا ہے تو یہیں ٹھہر جا۔ میں کسی ڈرپوک کو اپنے ساتھ لیجانا نہیں چاہتا۔"

عبدل کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اُس شخص کے لئے جس کی زندگی کا آغاز ہی ہاتھی کے شکار سے ہوا ہو جس نے ساری عمر اس طرح شکار کھیلا ہو کہ درخت پر سے جنگلی ہاتھی کی پیٹھ پر کُود کر اُسے چھری سے مار گرایا ہو، بھلا وہ اتنا بڑا طعنہ کیسے سہ سکتا تھا! اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"صاحب میں آپ کی بندوق اُٹھانے کیلئے نوکر رکھا گیا ہوں۔ اگر آپ جائینگے تو میں بھی آپکے ساتھ جاؤنگا۔"

یہ کہکر اُس نے اور دیسیوں کو ایسی نظر سے دیکھا جس سے چابک برس رہے تھے۔ پھر میدان طے کر کے جنگل کے گھنے سبزے میں غرق ہو گیا۔ ان کے جاتے ہی گیدڑ کی تھوتنی جھاڑی میں سے نکلی اور بو سونگھنے کے بعد وہ مُردار زیبرہ کے پاس دبکتا ہوا پہونچ گیا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر خود سر صاحب اور عبدل نے ہاتھیوں کی ڈار کو جالیا۔ ہاتھی ٹہر گئے تھے اور جنگلی سبزیاں کھانے میں مصروف تھے۔ بچّے اُچھلتے پھر رہے تھے اور ہتھنیاں ان کی نگرانی کر رہی تھیں لیکن کان سب کے لٹکے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شکاریوں کے قریب ہونے کا گمان نہیں تھا۔

یہ منظر دیکھکر صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وقت کی ساری قیود توڑ کر وہ لاکھوں سال پہلے کی دُنیا میں پہونچ گیا ہے۔ سامنے ہیں ہاتھی کھڑے لمبے لمبے دانتوں سے سبزہ کو اُلٹ اُلٹ کر کھا رہے تھے۔ سفید جنگلی چڑیاں ایک کی پیٹھ پر سے پُھدک کر دوسرے کی پیٹھ پر جا بیٹھتی تھیں۔ صاحب اِس وقت تہذیب و تمدن کی دُنیا کو بھول چکا تھا۔ عورتوں کی دلکشی اور بجلی کی روشنی کو فراموش کر چکا تھا۔ اب وہ جانوروں کے سامنے کھڑا تھا اور خود بھی ایک حیوانِ ناطق سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اس مختصر سے وقفے میں اُس نے زندگی کا اصلی مزہ چکھا۔ اُس کے دل میں وہی احساس پیدا ہوا جو مرنے والے کے دل میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ جیسے کوئی برکت حاصل کرنے کے لئے گھٹنوں کے بل جھک جائے یہ جوان بھی ایک گھٹنے پر جھک گیا۔ رائفل کا کُندہ اس کے کندھے سے لگ گیا اور ٹھنڈی نال رخسار سے چھُو گئی۔ تیزی سے اس کی نظر اُٹھی اور دو سو گز پرے ہاتھیوں پر جم گئی۔

عبدل نے برابر سے کہا "ہوشیاری سے صاحب!"

بوڑھے دیسی کی نظروں نے ہاتھیوں کی ڈار میں خوفناک تماکو کو پہلے ہی سے تلاش کر لیا تھا۔ اس نے یہ دیکھکر اطمینان کا سانس لیا کہ تماکو اور ہاتھیوں سے کچھ الگ کھڑا جھول رہا تھا۔ جب صاحب نے بندوق چھتیائی تو نال کا رُخ ایک اور ہاتھی کی طرف تھا جو اپنے دانتوں سے زمین اُدھیڑ رہا تھا۔

بندوق کا دھماکہ ہوا۔

دھوئیں کا ایک ہلکا سا پردہ اور بارود کی بو کا بھبکا دیسیوں کی طرف آیا۔ جب سامنے کی ہوا صاف ہوتی تو اُنہوں نے دیکھا کہ ہاتھی گویا جم کر پتھر کے بن گئے ہیں۔ خوف سے وہ ایسے ساکت کھڑے تھے کہ جُنبش کا نام تک نہیں تھا۔

جس ہاتھی پر گولی چلائی تھی وہ کچھ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی سُونڈ اُوپر اُٹھائی اور زور سے چنگھاڑا۔ اسکے بعد ہی وہ ایک گھٹنے پر جھک گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کالے پہاڑ کی طرح لڑھک کر ڈھیر ہو گیا۔ دو درخت جو اُس کی لپیٹ میں آ گئے تھے اس طرح ٹوٹ گئے گویا دو چھپٹیاں تھیں۔

عبدل نے خوش ہو کر کہا "بڑا اچھا نشانہ لگا صاحب!"

صاحب خوشی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"نیچے نیچے صاحب!"

عبدل نے صاحب کی قمیص پکڑ کر نیچے زمین کی طرف گھسیٹا۔ اور اسی وقت صاحب کو معلوم ہوا کہ جانوروں سے مقابلہ تو اب شروع ہوا ہے۔ کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری ڈار اس طرح حرکت میں آ گئی جیسے گھڑی کے سارے کل پُرزے ایک مقررہ اصول کے ماتحت چلتے ہیں۔ زخمی

ہاتھی دم توڑ رہا تھا۔ اُس کو کپکپاتے دیکھکر اور ہاتھیوں نے اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے پھیر لیں۔

کالے پہاڑ حرکت کرتے رہے یہاں تک کہ سب نے نصف دائرہ بنا لیا۔ یہ اُسی طرح کا ہلال بنایا تھا جیسے افریقہ کے وحشی زولو دُشمن سے مقابلہ کرنے میں اپنی صفوں کو آراستہ کرتے ہیں۔ باہر کے رُخ ہاتھی تھے۔ اُن کی سُونڈیں اور کان کھڑے ہوتے تھے تاکہ جس رُخ سے بھی بُو یا آواز آئے وہ اُسے پا سکیں۔ بڑی چالاکی سے بچّوں کو پیچھے چُھپا لیا گیا تھا۔

یکے بعد دیگرے چالاک سُرخ آنکھوں نے اُس مقام کو تاڑ لیا جہاں صاحب اور چار دیسی زمین پر پڑے ہوتے تھے —— صاحب نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی خُنکی رینگتی محسوس کی۔ لیکن ہاتھیوں کی سُرخ آنکھوں نے اُسے مسحور سا کر دیا تھا۔ اُنکے دانت نیچے کو جُھکے ہوتے تھے اور وہ کھڑے جُھوم رہے تھے۔

آہستہ آہستہ اور کسی ارادے سے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ بہت ہی آہستہ۔ وہ گویا جُھوم جُھوم کر رقص کر رہے تھے اور اپنے دُشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے جنہوں نے اُن کے ایک ساتھی کو مار ڈالا تھا۔ ہاتھیوں کی بُو جیسے ہی صاحب کی ناک میں پہونچی اُسکے حواس بجا ہوگئے۔ اُس نے محسوس کیا کہ ایک کالے ہاتھ نے اُس کے ہاتھ میں ایک اور رائفل تھما دی تھی۔ اور وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور سامنے تکنے لگا۔

عبدل نے چیخ کر کہا "ٹھیرئیے صاحب ٹھیرئیے" کیونکہ وہ ہاتھیوں کے داؤں گھات خُوب جانتا تھا۔ لیکن یہ آگاہی دیر سے ملی۔ رائفل چل چکی تھی۔

صاحب نے اپنی گولی اُس ہاتھی پر چلائی تھی جو ہلال کے وسط میں تھا۔ صاحب کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی کیونکہ بیچ والا ہاتھی لڑکھڑا گیا تھا۔ لیکن وہ ہاتھی ایک طرف گر پڑا تھا تاکہ اُسکے پیچھے جو سب سے بڑے دانتوں والا ہاتھی تھا وہ آگے بڑھکر حملہ کرے۔ یہ پہاڑ کا پہاڑ چیختا چنگھاڑتا چشم زدن میں صاحب کے آگے آگیا۔

عبدل نے چیخ مار کر کہا "یہ تماکو ہے صاحب، خونی ہاتھی۔ بھاگو صاحب، بھاگو"

رائفل کی گولی پھر چلی۔ مگر تماکو کے غضبناک حملے کو روک نہیں سکی۔ دیسی مُنتشر ہوگئے اور جہاں جس کے سینگ سمائے چیختیں ہانپتا بھاگ نکلا۔ ڈار اپنے داؤ گھات برابر لگا رہی تھی۔ ہلال کے سرے بڑھتے جا رہے تھے اور اِن سروں پر خوفناک دانت والے ہاتھی تھے۔ شکاری اب خود شکار بن گیا تھا۔

صاحب بھی اوروں کے ساتھ پلٹ کر بھاگ نکلا تھا مگر اُس کے پیچھے کالا دیو زمین دَہلاتا اُڑا چلا آرہا تھا۔ خوف و ہراس پھیل چُکا تھا۔ سارا جنگل چیخوں اور چنگھاڑوں سے گونج رہا تھا۔ سارے ہاتھی مرنے مارنے پر تُل گئے تھے۔

صاحب کا پاؤں کسی چیز میں اُلجھا اور وہ گر پڑا۔ مرنے سے پہلے اِس مختصر سے وقفے میں اُس نے ایک مضحکہ خیز جاگتے کا خواب دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ دوستوں کی ایک محفل میں اُسے پہلی دفعہ جامِ شراب پیش کیا گیا، اور اُس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ مَیں نہیں پیتا۔ اس پر چاروں طرف سے سب اس پر ہنس پڑے۔

یہ اُس کی زندگی کا آخری خواب تھا۔ صُور کی سی چنگھاڑ کے ساتھ تماکو اس پر لوٹ پڑا۔ اس کی سُونڈ کمر میں لپٹ گئی اور اُسے ہوا میں اُچھالکر زمین پر دے مارا۔ ان سفید بندروں پر جو اُس کی ڈار کے ہاتھیوں کو مارتے رہتے تھے تماکو کا غصّہ دیوانگی کی حد تک پہونچ چُکا تھا۔ بے رحم آنکھیں اُس سفید بندر کو گھُور رہی تھیں جو اس کے قدموں میں بے جان پڑا تھا۔ پھر اُس نے ایک بھاری پاؤں اُٹھایا اور سفید بندر کے جسم پر رکھکر کامیابی کا ایک نعرہ لگایا۔

پُواو۔ پُواو۔ پُواو۔ پُواو۔

ڈار نے جواب دیا۔

پُواو۔ پُواو۔ پُواو۔ پُواو۔

ایک اور شکاری شکار ہو چُکا تھا۔ دیسیوں میں سے ایک اور کُچلا جا چُکا تھا۔

باقی ہاتھیوں کی ڈار بھی اب بڑھتے بڑھتے تماکو کے قریب آگئی تھی۔ اب سارے ہاتھی خاموش کھڑے اپنے سردار کو دیکھ رہے تھے۔ تماکو نے ذرا سا جُھک کر اپنے لمبے زرد دانتوں سے ایک ہی وار میں زمین میں ایک گہری قبر کھود دی۔ پھر بڑی نفرت سے اُس نے کُچلے ہوئے انسانی جسم کو اپنی سُونڈ میں اُٹھا کر قبر میں جُھونک دیا۔ یہ تھا سُلوک جو وہ اپنی ڈار پر حملہ کرنے کی جُرات رکھنے والوں سے کرتا تھا۔ اس کے بعد بغیر اپنی ڈار کی طرف دیکھے ہوئے وہ اس جگہ سے ہٹ گیا اور دیوانہ وار غصّہ کو فرو کرنے کے لئے یہ پہاڑ کا پہاڑ جُھومتا جھامتا واپس لوٹنے لگا۔ جب مُردہ ہاتھی کے نزدیک پہونچا تو کترا کر اس ڈھیر کے قریب سے نکل گیا۔ موت سے تو سبھی کو ڈر لگتا ہے۔

موت کے اِتنی خوف کے باوجود تماکو کچھ اُوپر سو سال سے اِسی جنگل

میں زندہ تھا۔ ہاتھیوں سے لڑلڑاکر وہ اِس ڈار کا سردار بنا تھا۔ کئی سفید آدمیوں نے اسے شکار کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ یہ تماکو تھا۔۔ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا۔

ایک بار پھر اُس نے اپنی سُونڈ اُٹھائی اور جنگل کی ہوا کو سونگھنے لگا۔ پھر گھنے جنگل کی طرف چل پڑا اور ڈار اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ صرف عبدل ایک درخت میں چھپا ہوا خوف کی نظروں سے ہاتھیوں کو جاتا دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ کہو راؔبن کہ ہاتھی دانت کی لالچ میں تم پھر یہاں کھنچ آئے"

یہ الفاظ علاقہ افسر نے ایک اور صاحب سے کہے۔ یہ صاحب دُبلے پتلے اور پستہ قد تھے اور اِس وقت خیمہ میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

راؔبن نے کہا "نہیں بھئی۔ ہاتھی کا شکار کھیلنے کے لئے اب میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ یہ تو جوانوں کا شکار ہے۔ میں تو اپنے حصّے کا شکار کھیل چکا۔ میں تو جنگل میں یونہی پھرنا چاہتا ہوں۔ ولایت کے شاندار بازاروں میں پھرنے سے زیادہ لطف مجھے جنگلوں میں آتا ہے"

علاقہ افسر نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا "مجھے اس میں شُبہ ہے کہ یہ جوانوں کا شکار ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بوڑھے شکاری کا نشانہ بہتر ہوتا ہے"

راؔبن نے کہا "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

علاقہ کے افسر نے کہا "اسٹوکلی ایک مالدار اور بہادر جوان تھا۔ ہاتھی کے شکار کا بہت شوقین۔ چھ ہفتے ہوئے وہ جنگل میں گیا تھا۔ عبدل اُس کا بندوق بردار تھا۔ جنگل میں ہاتھیوں کا کھوج اُنہیں مل گیا"

"بڑا خوش قسمت تھا!"

"اسٹوکلی کے لئے یہ بدقسمتی کے نشان تھے۔ کیونکہ تماکو اِس ڈار کا سردار تھا"

"تماکو؟"

راؔبن کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ بھوری آنکھوں میں گزرے ہوئے دِنوں کی یاد جھلکنے لگی۔

"ہاں۔ اسٹوکلی نے پٹھے کو گرالیا تھا مگر ڈار نے حسبِ معمول اپنے داؤگھات شروع کردئے"

راؔبن نے سرہلاکر کہا "زولو کا گھیرا۔ میں جانتا ہوں۔ اور پھر تماکو نے حملہ کیا؟"

علاقہ افسر نے کہا "ہاں۔ تماکو نے دھاوا بول دیا"

ایک لمحہ کیلئے خاموشی رہی۔

راؔبن نے پوچھا "کل کتنے اِس موذی کی بھینٹ چڑھے؟"

"آٹھ"

پُرانے شکاری نے تعجب سے کہا "آٹھ"

بیتے ہوئے دنوں کی یاد اب بھی اُس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ وہ اُٹھا اور اُٹھکر اُس نے ایک انگڑائی لی۔ پھر بے پروائی سے بولا "اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ اُمید ہے کہ پھر آپ سے جلد ملنا ہوگا"

علاقہ افسر نے سرہلایا۔ وہ راؔبن کو خوب جانتا تھا۔ اور جب راؔبن ذرا ٹھٹکا تو اُسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ پھر اُسی بے پروائی سے راؔبن نے کہا "اچھا، وہ عبدل کہاں ہے؟"

علاقہ افسر نے سر کو جُنبش دے کر کہا "میرے ملازموں میں ہے۔ ایک ہفتہ ہوا کہ اُس نے یہ خبر سُنائی تھی"

ایک منٹ بعد علاقہ افسر نے پُرانے شکاری کو عبدل سے باتیں کرتے دیکھا۔ خاکی کپڑوں میں عبدل کا کالا چہرہ چمکنے لگا۔ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا اور بار بار سرہلا رہا تھا۔ دوسرے منٹ میں اُس نے راؔبن کا شکاری سامان کندھے پر لادلیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے جنگل میں چلا جارہا تھا۔

علاقہ افسر نے دل ہی دل میں کہا "اگر یہ تماشہ میں دیکھ سکتا تو اپنی ایک مہینے کی تنخواہ نذر کردیتا"

عبدل اپنے معزز آقا کے پیچھے پیچھے ایک جنگلی گیت گاتا چلا جارہا تھا۔ اِس گیت میں اُس کالے دیو تماکو کا ذکر تھا جس نے آٹھ آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ تماکو جسے کوئی مار نہیں سکتا۔ لیکن صرف ایک زبردست شکاری ہے جس نے ہزاروں ہاتھی مارے ہیں، جس نے تماکو کو گرانے کی قسم کھائی ہے۔ یہ ایک زبردست شکاری ہے۔ راؔبن صاحب اس کا نام ہے۔

بُواو۔ بُواو بُواو بُواو!

"تماکو آرہا ہے!"

سارے جنگل میں ایک کان سے دوسرے کان تک یہ سرگوشی پھیل گئی۔ جتنے جاندار تھے سب کے سب اِس بلا سے جان کا راستہ چھوڑ کر کھسک گئے۔ چیتا بھی ناک بھوں چڑھاکر کچلیاں دکھانے لگا اور ذرا سے ذرا ٹھٹک کر جنگل میں جا دبکا۔ سارے جانور اُس کالے پہاڑ سے واقف تھے، جو ہاتھیوں کی ڈار کا سردار تھا۔

تنہا شہنشاہ کی طرح تماکو جھومتا جھامتا چلا آرہا تھا۔ تماکو نے اپنی اس

شان وشوکت کا اندازہ اپنے چالاک دماغ میں لگایا۔ ایک صدی سے زیادہ کا بوجھ اُس پر تھا۔ وہ اُس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب جنگل میں جانوروں کا راج تھا۔ جب شیر کا ڈکرانا، چیتے کا غرانا اور ہاتھی کا چنگھاڑنا گویا ایک جیون کا دوسرے حیوان کو دعوتِ جنگ دینا سمجھا جاتا تھا۔

وہ اُن دنوں کی مدھم یاد اجاگر کر رہا تھا جب وہ بچہ تھا اور اپنی ماں کی جھریاں ہوئی کھال سے لگا لگا چلا کرتا تھا۔ وہ اُس بے پایاں مسرت کو محسوس کر رہا تھا جو دلدل کی کیچڑ اپنے بدن پر اُچھالنے میں اُسے حاصل ہوتی تھی۔ اُسے جنگل کا علم سکھایا گیا تھا۔ زہریلے پودوں سے الگ رہنا اور جنگل میں چھپی ہوئی موت سے ہوشیار رہنا۔

اُسے جو سبق سونڈ کی مار اور دانتوں کے کچوکوں سے سکھایا گیا تھا یہ تھا کہ "ہمیشہ ڈار کے ساتھ رہو" اتفاق ہی میں طاقت اور ساتھ رہنے ہی میں عافیت ہے۔ سردار کی اطاعت ہر حال میں فرض تصور کی جائے جنگل میں اکیلے پھرنا گویا یقینی موت ہے۔ اکثر ایسا ہوا تھا کہ تماکو کو یہ نصیحتیں بادلِ ناخواستہ قبول کرنی پڑی تھیں اور ڈار کے قانون کی پابندی کرنی پڑی تھی۔

مگر جیسے جیسے اس کے جسم میں دیووں کی سی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ تماکو میں اپنی قوت کا اظہار کرنے کی خواہش بھی بڑھتی جاتی تھی۔ پہلا اظہار اِس قوت وشجاعت کا اُس موقع پر ہوا جب ایک کالی ایال والا شیرِ ببر ڈار پر جھپٹا اور سارے ہاتھی اُس کے خوفناک پھٹے ہوئے دہانے کو دیکھکر مارے ڈر کے بدحواس ہو گئے۔ سردار بھی جھجک کر پلٹ گیا اور ساری ڈار اسکے پیچھے ہولی مگر تماکو وہیں ڈٹ گیا۔

یہ جوان ہاتھی کھڑا ببر سے آنکھیں لڑاتا رہا۔ بڑے بڑے لٹکے ہوئے کان اُبھر گئے، آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ دعوتِ جنگ قبول کر لی گئی تھی۔ متعجب شیرِ ببر نے اپنا مُنہ اور بھی پھاڑ کر ایک زہرہ گداز دھاڑ ماری جسے سُنکر سارے جانور بدحواس ہو کر دُور دُور تک راستہ صاف کر دیتے تھے۔ دھاڑ کے ساتھ ہی گُچھے دار دُم نے ہوا میں ایک چکر کاٹا گویا حملے کا اعلان کر دیا گیا۔

تماکو نے کچھ نہیں کیا۔ بس کھڑا جھولتا رہا۔ لیکن اس کی چالاک آنکھوں نے ببر کے سُبک جسم کو غصے سے کپکپاتے دیکھ لیا۔ سفید ناخن مُلائم پنجوں میں سے باہر نکل آئے اور ایک لحظ بعد ببر اُس پر جھپٹ پڑا۔ لیکن اس کا مُہلک تھپیڑ پڑنے سے پہلے تماکو کی سونڈ متحرک ہو چکی تھی۔ اس کی ایک ہی بیہوش کر دینے والی ضرب نے ببر کی جست کا رُخ بدل دیا۔ لیکن سفید ناخنوں نے پُٹھے پر جم کر کھال اُدھیڑ دی اور گوشت تک اُتر گئے۔ تماکو تکلیف سے بلبلا گیا۔ تیزی سے پلٹ کر اُس نے دیکھا کہ ببر اُس کے پُٹھے سے رپٹا ہوا نیچے گر رہا ہے۔

غصہ سے چنگھاڑ کر تماکو نے اُس کے جسم کو اپنی سونڈ میں لپیٹ کر اُوپر اُٹھا لیا۔ ببر بے بسی سے ہوا میں پنجے چلاتا رہا اور پھر زمین پر اِس شدت سے پٹخا گیا کہ زمین ہل گئی۔ ایک دبے گھٹے سے سانس لینے کی آواز سُنائی دی اور اس کے بعد ایک بھاری پاؤں بے پر بیدردی سے رکھ دیا گیا۔ چند لمحوں بعد جانوروں کا بادشاہ گُھلا ہوا سا ڈھیر بن کر رہ گیا، جسے ٹھکانے لگانے کے لئے آن کی آن میں کالی چیونٹیوں کا فیتہ سا بن گیا۔ تماکو چپکے سے ایک طرف کو ہٹ گیا اور لنگڑاتا ہوا ڈار کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

مگر یہ لڑائی دیکھ لی گئی تھی۔ ڈار کے سارے ہاتھیوں نے اپنی سونڈیں اُٹھا اُٹھا کر تماکو کا خیر مقدم کیا۔ سردار نے اُس کی طرف سوچ بچار کی نظر سے دیکھا۔ اس کے لئے ایک ہمسری کا مُدعی پیدا ہو گیا تھا، ایک پٹھا جس کے دانت ابھی نکلنے ہی شروع ہوئے تھے۔ جب سردار کے دانت دو ہاتھ کے ہو گئے تو وہ ڈار سے الگ ہو کر دلدل کی طرف چل دیا۔ یہ دلدل ہاتھیوں کا قبرستان تھی اور سردار اس میں غرق ہو گیا۔ اب تماکو بے مقابلہ اپنی ڈار کا سردار ہو گیا۔ اس وقت سے ابتک وہ لڑتا رہا تھا اور اپنی شہنشاہیت تسلیم کرانے کے لئے ہلاک کرتا رہا تھا۔

پھر اصلی مدِمقابل سامنے آیا — انسان۔ پہلے چند پستہ قد جنگلی آئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور کلہاڑیاں تھیں۔ یہ بہت مکار تو لے تھے، زہریلے حشرات الارض سے بھی زیادہ خطرناک۔ مگر تماکو اور اُس کی ڈار ان کے مقابلے میں فتحمند رہی تھی۔ کتنے ہی کالے کالے جسم شکست کھا کر کُچلے جا چکے تھے۔

لیکن سفید بندر ان سے مختلف تھے۔ انکے ہاتھوں میں شل کر دینے والی لکڑیاں تھیں۔ ان لکڑیوں سے سیدھ باندھی، ان میں سے ایک شعلہ نکلا اور جیسے کسی چیتے نے پنجوں سے چیر پھاڑ کر دل نکال لیا۔ ایک ایک کر کے کئی ہاتھی ان سفید بندروں نے اِن لکڑیوں سے مار ڈالے تھے۔ مرے ہوئے ہاتھی تو وہیں چھوڑ دئے جاتے تھے۔ بس اُن کے دانت کالے مزدوروں پر لاد کر چل دیتے تھے۔ اِن تباہکاریوں اور شکستوں سے تماکو نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اُسے گوشت کے پرخچے اُڑانے والی گولیوں کی تکلیف کا تجربہ خود بھی تھا۔ اس کے سیاہ چمڑے کو تین ۳ گولیاں پھاڑ کر اندر گھس چکی تھیں۔ ایک نے تو اُس کا پچھلا دھڑ بیکار سا کر دیا تھا۔ لیکن آج تک کسی نے اُسے گھٹنوں کے بل بھی نہیں جھکایا تھا۔ آٹھ سفید بندروں سے تماکو انتقام لے چکا تھا۔ اس کا نام تماکو ۲۰ ا وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں

مار سکتا۔

جنگل کی نرم سبزی میں تماکو اپنا مرغوب چارہ تلاش کر کر کے کھا رہا تھا۔ ڈار دو میل دُور تھی۔ تماکو اِس قطعے میں تنہا آیا تھا تاکہ خُوب سیر ہو کر کھائے۔ اُس میں بھی بُڈھوں کی سی ہوسناکی و خود غرضی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے سب سے الگ تھلگ اپنا پیٹ بھرنے کا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے زرد دانت زمین کو اُدھیڑ رہے تھے۔ چاروں طرف جنگل کا سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔ تماکو بلا شرکتِ غیری سارے جنگل کا بادشاہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ہر چیز پر ایک سُستی سی چھائی ہوئی تھی۔ دُور سے دلدل کی خوشگوار بُو آ رہی تھی۔ اِس پُرسکون سمے سے متاثر ہو کر تماکو نے اپنی سُونڈ سُورج دیوتا کی طرف شکر گذاری سے اُٹھائی۔ پھر ایکا ایکی سُونڈ اُونچی اُٹھکر رہ گئی اور بڑے بڑے کان ہوشیاری سے ہلنے لگے۔ انسان' کوئی سفید بندر قریب تھا۔

عقلِ حیوانی نے اُسے بتایا کہ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا شکاری کا نشانہ بنا چاہتا ہے۔ اور یہ بھی اُس نے محسوس کیا کہ سفید بندر بڑے صبر و سکون سے اُس کی گھات لگا رہا ہے۔ صرف بُو سے اُس کی موجودگی کا پتہ چلا تھا، اور وہ بھی جبکہ اُس کا فاصلہ چند قدم ہی زیادہ نہیں تھا۔ تماکو کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پیچھے جو چالاک دماغ تھا بجلی کی سی تیزی سے کام کرنے لگا۔ چالبازی کا جواب چالبازی سے دینا چاہئیے۔

راَبن بھی اکیلا تھا۔ عبدل کو اُس نے پیچھے کیمپ پر بضد ہو کر چھوڑ دیا تھا۔ خود اکیلا ہاتھی کے پگوں کا کھوج لیتا ہوا یہاں تک پہونچا تھا۔ جنگل میں چلنے کی خاص چال سے، جس میں میلوں چلنے پر بھی تھکان نہیں ہوتی، راَبن چلتا رہا اور بُڑھاپے کی کمزوری اور زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتا رہا۔ اُسے اپنی موجودہ زندگی بے کار نظر آ رہی تھی۔ مارو یا مر جاؤ۔ بس یہی اُصولِ زندگی ہے۔ شہروں میں بھی اور جنگلوں میں بھی۔ اپنے شکار پر جست کرنے کیلئے درندے گلی کوچوں کی تاریکی میں بھی چھپتے رہتے ہیں اور جنگل کی قد آدم گھاس میں بھی۔ بجلی کے کھمبے ہوں یا جنگل کے درخت، دونوں انسانی زندگی کی شاہراہِ موت میں یکساں طور پر تباہ کار ہیں۔

لیکن جب راَبن کو اس کا خیال آیا کہ آج جنگل میں ایسا مقابلہ ہے جو اِدھر یا اُدھر ہو کر رہیگا تو اُس کی آنکھیں سُکڑ گئیں۔ برسوں سے یہ پستہ قد سفید آدمی اُس عظیم الجثہ بڑے بڑے زرد دانتوں والے ہاتھی کی فکر میں تھا جس کا نام تماکو تھا۔ مختلف موقعوں پر راَبن نے پانچ گولیاں اُس ہاتھی کی کھال میں پیوست کی تھیں جسے کوئی نہیں مار سکتا۔ لیکن اُن موقعوں پر بھی موت تماکو سے زیادہ راَبن کے قریب تھی۔ شکاری کچھ تو اپنی قسمت سے اور کچھ جنگل کی چالبازیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے بچ بچ گیا۔ تماکو پر گولیاں بظاہر بے اثر ثابت ہوتی تھیں اسلئے اور بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

ایسے جانور کا پیچھا اس طرح کرنا کہ رائفل میں صرف پانچ گولیاں ہوں بجائے خود ایک حماقت تھی۔ راَبن نے اپنے دل میں ہنس کر کہا۔ "یہ بھی ایک بُڈھے کی بیوقوفی ہے۔" اُس نے ساری عمر جوا کھیلا تھا۔ درندوں کے ساتھ زندگی اور موت کا جوا کھیلنے ہی میں عمر گُذری تھی۔ اب تک وہ برابر جیتتا رہا تھا۔ مارو یا مر جاؤ پر اس کا عمل تھا۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سب سے بڑا جُوا بھی وہ جیت جائے۔ آہستہ آہستہ وہ رینگ کر آگے بڑھا۔ اُس کے دُبلے پتلے خشک ہاتھ میں رائفل بھی آگے کھسکتی آئی۔

لمبی لمبی گھاس میں اُس نے کچھ فاصلہ پر ہاتھی کا سایہ دیکھا جانور کے چوکنے ہونے سے اُس نے سمجھ لیا کہ وہ بُو پا گیا ہے۔ لیکن کیا جانور کو اُس کی جگہ کی بھی خبر ہو گئی ہے؟ اُس نے تماکو کو پھر سُونڈ نیچے کر کے چارہ اُٹھاتے دیکھا۔ راَبن کو یہ چال دھوکہ نہ دے سکی۔ تماکو بھی آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ شکاری اور شکار دونوں ایک دوسرے سے اِسوقت جان بوجھکر لاعلمی ظاہر کر رہے تھے۔ راَبن ساکت رہا اور تماکو اپنی سُونڈ خواہ مخواہ سبزے میں پھراتا رہا۔

آدھ گھنٹے تک یہ اِبتدائی حرکات جاری رہیں۔ سفید بندر جہاں پڑا ہوا تھا تماکو کو اس مقام کا صحیح اندازہ تھا۔ اُس کی چالاک آنکھوں نے ایک سفید چڑیا کو وہاں سے بچپک اُڑتے دیکھا تھا۔ وہ اکھاڑ اکھاڑ کر کچھ کھاتا جاتا تھا اور دھاوا بول دینے پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اگر ایسا کیا تو سو گز پرے ہی سے شکاری اپنی شعلہ اُگلنے والی لکڑی چلا دیگا۔ اُس نے اپنے دل میں سمجھ لیا کہ آج جنگل میں کسی بے وقوف سے مقابلہ نہیں ہے۔

شام ہو چلی تھی۔ سُورج شفق کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اِس پس منظر پر مُرجھائے تُڑتے درخت کالی پرچھائیاں سی نظر آ رہے تھے، اِس وقت وہ گھاس متحرک ہوئی جہاں سفید بندر دبکا ہوا تھا۔ چُپکے چُپکے تماکو چند قدم آگے بڑھا تاکہ خطرے کے مقام سے ہٹ جائے کیونکہ غروب ہونے والے سورج کے پس منظر پر اس کا ڈیل ڈول آسانی سے نشانہ بن سکتا تھا۔ اسکے ہٹتے ہی شکاری بھی کھسکا۔

راَبن مُنہ ہی مُنہ میں ایک گالی بڑبڑا کر رہ گیا۔ کیونکہ ہاتھی کی اِس حرکت نے اُسکے منصوبے درہم برہم کر دئے۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گولی چلانا

کارآمد ثابت نہ ہوتا۔

راَبن اور بھی آگے کِھسکا۔ تماکو اُسے لالچ دے رہا تھا۔ اُس کا گھاس کھانا فریب آمیز تھا۔ راَبن نے قریب کے ایک مضبوط درخت کو تاڑا۔ اگر ہاتھی حملہ کردے تو جان بچانے کا ایک یہ سہارا بھی ہوسکتا ہے۔ درخت دس گز کے فاصلہ پر تھا۔ بس ایک گز اور اُس کی طرف کِھسک جائے تو خطرے سے نکل جائے۔

لیکن اُسی لمحے میں زمین لرزنے لگی۔ تماکو نے اُس کا مدعا تاڑ کر دھاوا بول دیا تھا۔ اب یہ دیوکا دیو اُس کی جانب دانت تانے رتھ کی طرح گرجتا چلا آرہا تھا۔ راَبن کیلئے اب ایک ہی صورت باقی تھی۔ فوراً ایک گھٹنہ جُھکا، رائفل چھتیا اُس نے گولی داغ دی۔ سامنے کا وار وہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب جان ہی پر آبنی تھی تو یہی کرنا پڑا۔

گولی نشانے پر بیٹھی مگر اِس ریلے کو کس کی مجال تھی کہ روک سکتا! راَبن ایک ہاتھ میں رائفل لئے لئے درخت کی طرف لپکا اور اُچھل کر ایک ٹہنی میں جُھول گیا۔ جب درخت پر چڑھ گیا تو ایک دبی ہوئی چیخ اس کے مُنہ سے نکلی۔ ہاتھی کے گزرنے سے ہوا کا ایک زناٹا آیا۔ پھر غصہ کی چنگھاڑ سُنائی دی۔ اور خاک کا ایک بادل زمین سے اُٹھا چشم زدن میں تماکو پلٹ پڑا اور درخت سے ٹکرایا۔

ایک خوفناک تڑاخہ ہوا۔ ابھی درخت گر جائیگا۔ ٹہنے پر سنبھل کر راَبن نے شست لگائی اور اسکے ریڑھ پر گولی چلائی۔

دھماکہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ درخت جُھول گیا۔ اس کی گولی نے کھال پھاڑ دی تھی لیکن مہلک ثابت نہ ہوئی تھی۔ تماکو اس کے صدمے سے ذرا کے ذرا رُکا اور ایک گھٹنے پر کچھ جُھکا بھی مگر راَبن اس کی نگونساری دیکھ نہیں سکا۔ وہ کانٹوں دار جھاڑیوں میں گھُسا چلا جارہا تھا۔ رائفل اب بھی اُسکے ہاتھ میں تھی۔ درخت سے گرنے میں اُسے چکّر سا آگیا تھا۔ وہاں پڑا ہوا وہ آسمان کی طرف گھُور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب ہاتھی کا پاؤں اُس پر پڑا اور اب پڑا۔ چکرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے میں بھی اُسے آسمان سفید نظر آرہا تھا جیسے کسی مُردے کا چہرہ ہو۔

ہاتھی کا پاؤں راَبن پر نہیں پڑا۔ تماکو غصّے میں جھنجھلا رہا تھا۔ کوئی چیز اُس کی جان اُس کے جسم میں سے نکال رہی تھی۔ اُس نے اپنی سُونڈ اُونچی کی اور ڈار کو آواز دی:۔

پُواو پُواو پواو پواو!

یہ چنگھاڑ جنگل میں گونج گئی۔ لیکن ڈار کئی میل دُور تھی۔ اس سے پہلے کہ سارے کالے پہاڑ جمع ہوں اور گھیرا ڈال کر حملہ کریں موت یا تو انسان کو یا جانور کو آنی لازمی تھی۔

چنگھاڑ کی آواز نے راَبن کو چونکا دیا۔ وہ اُچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ نیم بیہوشی کی حالت ہی میں اُس نے دیکھا کہ کالا پہاڑ چند گز کے فاصلے پر کھڑا چیخیں مار رہا ہے۔ بڑی ہمّت کر کے اُس نے پھر رائفل چھتیائی اور گولی چلادی۔

دھماکہ کے ساتھ ہی ایک اور غصّے کی چنگھاڑ سُنائی دی اور ہاتھی غائب ہوگیا۔

کیا اس نے کالے پہاڑ کو گرالیا تھا؟ راَبن کے کپڑے کانٹوں میں اُلجھ اُلجھ کر تار تار ہوچکے تھے اور جگہ جگہ کھرنچیں لگ لگ کر وہ خون خون ہو رہا تھا۔ کانٹوں کی باڑ میں سے بمشکل تمام وہ باہر نکلا۔ اُسے اُمید تھی کہ سامنے مرا ہوا ہاتھی پڑا ملے گا، لیکن وہاں میدان صاف نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین پھٹ گئی اور تماکو اُس میں سماگیا۔

اُس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ شام کی ملگجی روشنی میں اُس نے ایک بڑا سا سایہ جھاڑیوں میں گزرتا دیکھا۔ تماکو فرار ہو رہا تھا۔ راَبن تھک کر چور ہو رہا تھا مگر یہ دیکھکر اُس کی ساری تھکان جاتی رہی اور بڑھتے ہوئے حوصلے سے اسکے تعاقب میں چل پڑا۔

جھاڑیوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوتوں کا جلوس نکل رہا ہے۔ دن کی روشنی تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ لیکن راَبن کو روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس آخری کھوج کو وہ کیسے چھوڑ دیتا؟ خون کی ایک لکیر نے بتایا کہ ہاتھی بُری طرح زخمی ہوا ہے اور بجائے سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے راَبن جھاڑیوں میں اُڑا چلا جارہا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں کو کچلنے اور توڑنے کی آوازیں اسکے کانوں میں آرہی تھیں۔

پھر خاموشی ہوگئی۔ تماکو رُک گیا تھا۔ کیا آخری حملہ کرنے کیلئے تیار ہو رہا تھا؟ راَبن ٹھٹکا نہیں۔ اُس نے سمجھ لیا کہ ہاتھی اُس کا انتظار کر رہا ہے اور اب مقابلے کی آخری گھڑی آن پہونچی ہے۔ وہ اُچھل کر اور آگے بڑھا۔

مرنے والے دن کی سسکتی ہوئی روشنی میں تماکو دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے ڈھنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ ہزیمت خوردہ اور لائقِ رحم ہے۔ راَبن کو اُس پر ترس آنے لگا۔ زمانے نے ایک دفعہ پھر اُنہیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا — پُرانا ہاتھی اور پُرانا شکاری — اُس نے دیکھا کہ تماکو کی دُھندلی سُرخ آنکھیں اُسے گھور رہی ہیں اور ایک لمحہ کیلئے جو پھیل کر لامتناہی ہوگیا تھا، انسان اور جانور ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے۔

جیسے مشین خود بخود چلتی ہے راہن نے بلا ارادہ رائفل پھر چھتیائی یہ جان کرکہ اب کے جو وار ہوگا مہلک ہوگا بوڑھے ہاتھی نے تن کر مقابلہ کیلئے اپنی سونڈ اوپر اٹھائی مگر مقابلے کی دعوت دینے والی چنگھاڑ ایک بی ہوئی کمزور چیخ بن کر نکلی۔

پواو پواو پواو پواو۔
رائفل کا دھماکہ ہوا۔

بارود کے دھوئیں میں سے راہن نے آنکھیں مچکا کر اس سمت میں دیکھا جہاں تماکو کھڑا تھا۔ مگر یہ دیکھکر اُسے حیرت ہوئی کہ بوڑھا کالا دیو اُس پر ایک خفگی کی نظر ڈال کر پلٹ گیا اور آہستہ آہستہ آگے چلا گیا۔ معجزہ سچ ثابت ہوچکا تھا۔ کوئی گولی اس ہاتھی کو ہلاک نہیں کرسکتی تھی جسے کوئی نہیں مار سکتا۔

راہن اول فول بکتا، جاتے ہوتے ہاتھی کے پیچھے لپکا اُسکے پاس صرف ایک کارتوس اور باقی رہ گیا تھا۔ اُسے ایک گز کے فاصلہ سے ہاتھی پر چلانا چاہتا تھا۔ تھکان نے اُس کے پیر شل کردئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

ایک لمحے بعد ایسا معلوم ہوا کہ کمر تک کا دم نکل گیا۔ بوڑھا شکاری بے سود کوشش کرتا رہا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ بات کیا ہے۔ تماکو اُسے اپنے پیچھے دلدل میں لگا لایا تھا۔ وہی دلدل جو ہاتھیوں کا قبرستان تھا۔ یہاں یہ بڑے بڑے جانور مرنے آتے تھے تاکہ اُسی کالی کیچڑ میں دھنس جائیں جس سے کبھی ان کا جسم بنا تھا۔ راہن کے پیروں تلے ہاتھی دانت کا دفینہ تھا مگر دھسن میں وہ اس طرح پھنس چکا تھا جیسے مکھی سریش میں پھنس جاتی ہے۔

اُس نے ناامیدی سے چاروں طرف دیکھا۔ چند گز آگے تماکو دلدل میں خاموش ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ مر بھی رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سے بڑے بڑے آنسو نکل کر بہنے لگے۔ سونڈ اپنے دشمن انسان کی طرف بڑھا دی گویا وقتِ آخر دوستی کا ہاتھ اُس کی طرف پھیلا دیا۔ راہن کی کشمکش ختم ہوچکی تھی۔ اُس کا اپنا وقت بھی آپہونچا تھا۔ اُس نے رائفل دُور اُچھال دی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دلدل میں غرق ہوگئی۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ بھی وہیں پہونچ جائے گا جہاں رائفل پہونچ گئی تھی۔

ایک بار پھر انسان اور حیوان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راہن اپنی قسمت پر صابر ہوچکا تھا۔ یہ انجام دونوں کے شایانِ شان تھا۔ اُس نے لمبے لمبے زرد دانتوں کو دلدل میں دھنستے دیکھا اور اس نے چلا کر کہا "ہم پھر ملیں گے تماکو!"

اس کے بعد دلدل ان کے سروں پر ہموار ہوگئی اور رات نے اپنا تاریک امن کالی کیچڑ پر پھیلا دیا۔

(ادبی دنیا)

مترجمہ۔ شاہد احمد

پھانسی

(بسلسلہ صفحہ ۵۵)

اپنا سر ہلاتی وہ گیلی برف پر رینگ رہی تھی اور اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ براتی اُسے شراب پر شراب دے رہے ہیں۔

اُس کے دل میں درد ہونے لگا جیسے کوئی نشے میں ہنستے ہنستے بے حال ہوجائے یا ناچتے ناچتے بےدم ہوجائے — مگر براتی شراب برابر اُنڈیل اُنڈیل کر اُسے دئے جا رہے تھے — شراب پر شراب۔

تشدد پسند باغیوں کو قیدِ تنہائی میں جو جو رستی تکلیفیں پہونچیں آئندہ پرچے میں اُنکی پہلی قسط پیش کی جائیگی۔

مترجمہ۔ شاہد احمد

تصحیح

سالنامہ ساقی بابت جنوری سنہ ۴۷ء میں جناب محمد مسیح پال امینِ حزیں کی نظم میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین کرام حسب ذیل تصحیح سے درست فرمالیں۔

پہلے بند کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرع میں "زہد" غلط "زہر" صحیح ہے۔

مولانا روم رحمتہ اللہ کا شعر یوں ہے:-

گر شود پُر نور روزن یا سرا
تو مداں روشن مگر خورشید را

لہ معنی مکان

خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمائیں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ مینیجر

نقد و تبصرہ

بہاراں خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی۔ اے، ایم۔ بی۔ ای، ڈپٹی کمشنر سیتاپور کی تقریباً پانسو غزلوں کا مجموعہ "بہاراں" کے نام سے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ حضرت اثر غزل گوئی میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔ جزبات اور تاثرات کی عکاسی میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔ کلام شگفتہ اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دل پر اثر کرتا ہے۔ تمیر کا یہ شعر زیبِ دوسرورق ہے ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

بس اسی شعر کو "بہاراں" کی روح و رواں سمجھئے۔ "بہاراں" کا ہر صفحہ ع۔ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

تغزل کے دلدادہ حضرات کے لئے یہ ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ آخر میں متفرق اشعار، "اثرستان" کا انتخاب اور فارسی کلام بھی شریک کیا گیا ہے۔ مجموعی ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جناب اثر کی عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ کتابت و طباعت خوشنما۔ جلد مضبوط۔ سرورق رنگین۔ بانکِ ورا سائز۔ قیمت صرف تین روپے۔ غالباً مصنف سے یہ کتاب منگائی جاسکتی ہے۔ "ش"

دوشیزۂ صحرا یہ انگریزی کا ایک ناول ہے جس کو مس جون کونکوسٹ نے دلکش پیرائے میں لکھا ہے اور اس کا اُردو ترجمہ مسٹر صادق الخیری۔ ایم۔ اے دہلوی نے کیا ہے۔ عزیز موصوف، جو مولانا راشد الخیری مرحوم کے صاحبزادے اور انکی ادبیت کے بھی وارث ہیں، دہلی کی ٹکسالی اُردو خوب لکھتے ہیں۔ اس لئے یہ ناول اُردو میں بھی اتنا ہی دلچسپ ہو گیا جس قدر انگریزی میں ہے۔ مسٹر صادق الخیری نے اس کا اُردو میں ترجمہ کر کے زبان اور بیان کے لحاظ سے اس کی دلچسپی قائم رکھی ہے۔ ناظرین اس کو محض ایک تمثیلی داستان سمجھکر پڑھیں تو اُن کیلئے دلکش ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ناول ادب کی ایک محض تفریحی شاخ ہے، لیکن خیالات پر اس کا ایک غیر محسوس اثر پڑتا ہے۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ ناول کی دلکشی کو کم کردوں، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ پڑھنے والے اس کو محض تفریحی دلچسپی کے لئے مطالعہ کریں اور اس کو کسی حقیقت پر مبنی نہ سمجھیں۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ مجلد۔ گرد پوش خوشنما رنگین۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دہلی۔ "اسلم جیراجپوری"

گلِ نو ملک کے مشہور ادیب و انشاپرداز حضرت ایم۔ اسلم کے بارہ تازہ افسانوں کا مجموعہ "گلِ نو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسلم صاحب کے اور دلکش مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی نہایت دل آویز ہے۔ گلستانِ ادب میں ایک نیا پھول "گلِ نو" کی صورت میں کھلا ہے۔ اسلم صاحب نے اس شعر کو زیبِ دو عنوان بنایا ہے:۔

معطر مغزِ جاں تک ہو جو میرے داغِ دل سونگھیں
چمن میں مست ہیں کیا بلبلیں پھولوں کی خوشبو پر

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلم صاحب نے اِن افسانوں میں زندگی کے اُن اغوں کو الفاظ کے پھولوں میں لپیٹ کر پیش کیا ہے جن کی ذمہ دار ہماری سوسائٹی ہے۔ ضخامت (۳۵۰) صفحات۔ کتابت و طباعت خوشنما۔ مجلد۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً عہ ہو گی۔ ملک دین محمد اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور سے منگائی جاسکتی ہے۔ "ش"

شاہ نعمت اللہ ولی امیر تیمور اور اس کے بیٹے شاہ رخ کے زمانوں میں یہ نامور سادات اور جلیل القدر مشائخ میں گزرے ہیں۔ مزار ماہان علاقہ کرمان میں ہے۔ اِن بزرگ کی سوانح عمری اور ان کی مشہور پیشین گوئی قیامت کا بیان مع نمونہ کلام جناب ایم۔ اے حفیظ نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ قیمت مع محصول ڈاک بذریعہ منی آرڈر ۴ر آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ راج نرائن سنگھ۔ درگاہ شاہ ارزاں۔ ہندرو۔ پٹنہ۔ "ش"

بیکاری و مفلسی، اور اُسکے علاج یہ چھوٹی سی کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔ بہت دلچسپ اور اسکا مطالعہ موجودہ زمانے میں غایت درجہ مفید ثابت ہو گا۔ معلومات کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ کوزے میں دریا بند کیا گیا ہے۔

ضخامت ۲۸ صفحات۔ قیمت ۳ر آنے۔ مگر ساقی کے خریداروں سے صرف ۱ر آنے مع محصول ڈاک۔ پبلشر کا بیان ہے کہ اگر کتاب ناپسند ہو

تو واپس بھیج کر قیمت طلب کی جا سکتی ہے۔ مگر اُمید ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئیگی۔ ملنے کا پتہ:۔ ایپل اینڈ کمپنی۔ مری۔ (پنجاب) "بشس"

ادبی دُنیا۔ لاہور (سالنامہ) صلاح الدین احمد صاحب اور میراجی کی ادارت میں رسالہ ادبی دُنیا۔ لاہور۔ ماشاء اللہ بڑی عمدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ گزشتہ مہینے ادبی دُنیا کا شاندار سالنامہ شائع ہوا ہے جسے اگر اس سال کا بہترین سالنامہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ اُردو کی حریف زبانوں میں، جن میں ہم انگریزی کو بھی شامل کر سکتے ہیں، اس سالنامہ کا جواب نہیں ملتا۔ مضامین کا معیار اُردو صحافت کیلئے باعثِ فخر ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر منفرد ہے۔ مسٹر کرشن چندر کا طویل افسانہ اور میراجی کا علمی مضمون خاص طور پر مستحق مطالعہ ہیں۔ رنگین تصویروں سے اعلیٰ درجے کا مذاقِ حسن ظاہر ہوتا ہے۔ سادہ تصاویر کے انتخاب سے بھی حُسنِ مذاق ظاہر ہے۔ ضخامت بڑے سائز کے تقریباً تین سو صفحے۔ ٹائیٹل ہفت رنگ۔ اور قیمت صرف عہ جو موجودہ گرانی کو دیکھتے ہوئے تو لاگت سے بھی یقیناً بہت کم ہے۔ مدیرانِ "ادبی دُنیا" مستحقِ مبارکباد ہیں اور اُن کی ہمت لائقِ داد ہے کہ محض صحافتِ اُردو کی ترقی کے خیال سے انہوں نے اتنی مالی زیر باری گوارا کی۔ ادبِ جدید کے دلدادہ حضرات کے لئے سالنامہ "ادبی دُنیا" ایک بیش قیمت تحفہ ہے جو کوڑیوں کے مول انہیں مل سکتا ہے۔ "بشس"

یورپ کے تاثرات۔ مسٹر بدر شکیب حیدرآباد دکن کے ایک جواں سال ذہین فرد ہیں۔ یورپ کے تاثرات شائع کر کے انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور غایت درجہ زحمت پذیری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب مجموعہ ہے ۲۵ اُن ہندوستانی حضرات کے مشاہدات و تجربات کا جنہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ یورپ میں گزارا ہے۔ ان میں علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر یوسف حسین۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر حمیداللہ جیسے جلیل القدر حضرات بھی شامل ہیں۔ مسٹر بدر شکیب نے ان سب حضرات سے برسوں کی کاوش کے بعد مضامین لکھوائے یا اُن کے زبانی خیالات کو تحریر کا جامہ خود پہنایا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے مقابلے میں یورپ اتنا ترقی یافتہ کیوں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ "یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے، لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے"۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ سید عبدالقادر اینڈ سنس۔ تاجرانِ کتب چارمینار۔ حیدرآباد۔ دکن۔ "بشس"

انڈین میوزک۔ ایم۔ محتشم صاحب کی یہ کتاب ہندوستانی موسیقی کے متعلق وافر معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ یہ معارف النغمات کے بعد اُردو میں یہ دوسری کتاب ہماری نظر سے گزری ہے جس میں پیرایۂ بیان بھی عام فہم اور سلیس اختیار کیا گیا ہے۔ ہر راگ کی مشہور چیزیں اور اُن کی سرگم مع ماتروں کے درج کی گئی ہیں جو ہارمونیم پر آسانی سے نکالی جا سکتی ہیں۔ اُمید ہے کہ فن سیکھنے کے شائقین اس کتاب کو اپنے لئے بہت مفید پائیں گے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً عہ ہوگی۔ ملنے کا پتہ:۔ میوزک پبلشنگ ہاؤس۔ ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی صاحبہ۔ لکھنؤ۔ "بشس"

انوارِ اختر۔ محمد اختر صاحب اختر نگینوی کا تیسرا دیوان اس نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ پہلا دیوان "نظمِ دل افروز" چالیس سال پہلے اور دوسرا "ضیائے اختر" کے نام سے تینتیس سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا اختر حضرت داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ زبان و بیان میں اُستادِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ کہنہ مشق اُستاد ہیں۔ کلام پاکیزہ اور زبان ٹکسالی ہوتی ہے۔ "انوارِ اختر" کی ضخامت بڑی تقطیع کے (۲۰۰) صفحات ہیں۔ سرورق رنگین۔ قیمت فی جلد علعہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سید محمد غضنفر کاظمی۔ محلہ سرائے میر۔ نگینہ۔ "بشس"

محکومیتِ نسواں۔ جان اسٹوارٹ مل کی تصنیف کا ترجمہ مولوی معین الدین صاحب انصاری نے کیا ہے۔ ہندوستانی مردوں اور عورتوں کے لئے اس کا مطالعہ اتنا مفید ثابت نہیں ہو سکتا جتنا کہ یورپین لوگوں کے لئے ثابت ہو چکا ہے۔ تاہم کتاب پڑھنے کے لائق ہے کیونکہ یورپ میں اس کتاب کو "عورتوں کی آزادی کا صحیفہ" سمجھا جاتا ہے۔ کتاب مجلد اور گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) مکتبۂ پنجاب۔ لاہور سے طلب کیجئے۔ "بشس"

شمعِ ازل۔ حضرت زبیری لکھنوی نے نظم میں تاریخِ اسلام کی مقتدر ہستیوں کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان بڑے پُراثر طریقے پر کیا ہے۔ اس شمع سے ہر گھر روشن ہونا چاہیئے۔ زبیری صاحب کی کاوش مشکور ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے اسلامی تاریخ کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ بانگِ درا سائز ۲۲۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ زبیر منزل۔ پاٹانالہ۔ لکھنؤ۔ "بشس"

شاعرِ جمہوری دُنیا۔ محمد عظیم الدین صاحب مُحبّت نے اِس چھوٹی سی کتاب میں جدید حیدرآباد دکن کے یا حیدرآباد میں رہنے والے چالیس شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کے منتخب نمونے پیش کئے ہیں۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ایم۔ اے۔ رین۔ روبرو نظامتِ کروڑگیری حیدرآباد۔ دکن۔ "ش"

پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب۔ جناب شبیہ الحسنین بدایونی نے اِس کتاب میں پنڈت جی کو ہندومت کا متوالا، اسلام دشمن اور مُسلم کش ثابت کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ قیمت ۵ر آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد ولی الحسنین۔ قاضی محلہ بدایوں۔ "ش"

عصرِ نو۔ یہ تینتس صفحے کی نظمیں بقولِ دیباچہ نگار "عصرِ نو کے ایک نوجوان شاعر میاں محمد صادق ضیا کی فکرِ جمیل کی ایک نئی انگڑائی ہے" ۵ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر دفتر رسالہ شاعر آگرہ سے منگائی جاسکتی ہے۔ "ش"

اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ پروفیسر محمد عاقل نے عام فہم پیرایے میں اجتماعی زندگی کے ارتقائی پہلو کو واضح کیا ہے۔ انسانوں کی آبادی جب بڑھی تو رہنے بسنے کے اُنہوں نے کیا کیا طریقے اختیار کئے؟ اس سوال کا جواب ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے۔ قیمت ۸ر۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی سے طلب کیجئے۔ "ش"

سیاسیات کی پہلی کتاب۔ یہ بھی پروفیسر عاقل کی چھوٹی سی تصنیف ہے جس میں اُردو جاننے والے طبقے کو سیاسیات کے مبادیات کو آسانی اور اختصار کے ساتھ سمجھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر مکتبۂ جامعہ۔ دہلی سے طلب کیجئے۔ "ش"

رسولِ پاکؐ۔ کون تھے؟ کیسے تھے؟ اور آپ نے کیا سکھایا؟ عبدالواحد صاحب سندھی استاذ مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ نے یہ کتاب بچّوں کیلئے لکھی ہے۔ زبان بہت سلیس ہے اور واقعات اس خوبی سے مُرتّب کئے ہیں کہ بچے بار بار انہیں پڑھیں گے۔ یہ کتاب اِس لائق ہے کہ چھوٹی جماعتوں کے نصاب میں داخل کی جائے۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔ "ش"

رحمت للعلمین۔ یہ کتاب سیرۃ پاک کی ممتاز کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری مرحوم عاشقانِ رسولؐ میں سے تھے۔ سیرۃ کے ہر لفظ سے اُن کی شیفتگی ٹپکتی ہے۔ اِس سیرت کی خصوصیت یہ ہے کہ ضعیف روایات کو اس میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں سے آنحضرت کی رسالت اور ختمِ نبوت پر استشہاد کیا ہے۔ نہایت مفصّل اور مکمّل سیرۃ ہے۔ اس کا صرف حصّہ اوّل مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ پانچواں اڈیشن ہے۔ اُمید ہے کہ بقیہ دو حصّے بھی جلد شائع ہونگے۔ کتاب مجلّد ہے۔ ضخامت ۴۶۴ صفحے۔ قیمت دو روپے۔ "ش"

ادارۂ ادبیاتِ اُردو خیریت آباد۔ حیدرآباد۔ دکن کی کتابیں۔

سرسید احمد خاں۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب۔ ایم۔ اے، ایچ۔ سی۔ ایس، نے یہ ۱۶ صفحے کی کتاب بچّوں کیلئے لکھی ہے۔ قیمت ۲ر

سر سالار جنگ اعظم۔ تاریخِ دکن میں سر سالار جنگ سے زیادہ شاید ہی اور کوئی ہستی نظر آئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت و تدبّر کی وجہ سے ہندوستان کے بسمارک کہلاتے۔ اُنکے مختصر حالاتِ زندگی شائع ہونے ضروری تھے۔ مولوی ابوالمکارم فیض محمد صاحب نے اس خدمت کو بچوں کیلئے انجام دیا ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ قیمت ۲ر "ش"

نظام الملک آصف جاہ اوّل۔ بانیِ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی عوام اور طلباء کیلئے شیخ چاند مرحوم نے تحریر فرماتے تھے۔ اب ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے انہیں

لندن سے مس کے ٹامسن

فیسرین رجسٹرڈ

کے متعلق تحریر فرماتی ہیں "میں نے "فیسرین" کو استعمال کیا ہے اور اس کو جھائیوں کے لئے بیحد مفید پایا" (ترجمہ از انگریزی چٹھی)

فیسرین کریم۔ بلاشبہ کیلوں، جھائیوں، داغوں، الغرض چہرے اور جلد کی تمام بیماریوں کیلئے اکسیر ہے۔ خوبصورت بناتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ/ر)

فیسرین سنو۔ اس کا دن میں استعمال "فیسرین کریم" کے اثر کو دس گنا کر دیتا ہے۔ چہرے کی خشکی کو دُور کر کے ملائم بناتی ہے۔ جذب ہونیوالی خوشبودار ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸ر)

پائیلزون رجسٹرڈ۔ بواسیر کا خون اور درد ایک ہی دفعہ کے لگانے سے فورًا بند ہو جاتا ہے۔ شرطیہ علاج ہے۔ قیمت عہ/ر

محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔ اپنے شہر کے جنرل مرچنٹ یا انگریزی دوافروش سے طلب کیجئے۔

وی۔ پی منگوانے کا پتہ:۔ **فیسرین فارمیسی امرتسر (پنجاب)**

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک، فی پرچہ چھ آنے
ممالکِ غیر سے ۱۲ شلنگ

جُرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں۔ مستقل
خریداروں سے انکی قیمت
الگ نہیں لی جاتی؛

جلد ۲۱ | ساقی دھلی۔ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۳

قیمت فی پرچہ چھ آنے

ساقی کے دس سال کا انتخاب

ریزۂ مینا

جس میں پچاس افسانہ نگار حضرات کے بہترین افسانے شامل ہیں

ان پچاس بےمثل افسانوں کا انتخاب شاہد احمد صاحب اڈیٹر ساقی نے کیا ہے؛

ضخامت چھ سو صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجے کی۔ جلد مضبوط کپڑے کی اور سنہری ٹھپّہ والی ہے۔

مندرجہ ذیل افسانے اس جلد میں شامل ہیں۔

افسانہ	مصنف
(۱) عجب تماشا ئیست	خان بہادر میر ناصر علی دہلوی
(۲) فقیر کا تکیہ	میر باقر علی دہلوی (داستان گو)
(۳) یوسفی اور صادقہ	علّامہ راشد الخیری دہلوی
(۴) دربار اکبری کی ایک جھلک	شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن
(۵) جب ساقی کے ہاتھ میں جام تھا	خواجہ حسن نظامی دہلوی
(۶) لال قلعہ کی ایک جھلک	خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی
(۷) دربار شاہانِ اودھ	خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی
(۸) پورن چندر کی کہانی	مولانا عنایت اللہ دہلوی
(۹) برات	منشی پریم چند
(۱۰) خزانچی کی بیٹی	مولانا اسلم جے راج پوری
(۱۱) سیرِ گل فروشاں	افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی
(۱۲) شکست کی آواز	پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی
(۱۳) جذبۂ کور	سلطان حیدر جوش
(۱۴) میری بیوی	مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی
(۱۵) عقدِ مکرر	لطیف الدین احمد اکبر آبادی
(۱۶) نخلِ بے ثمر	ایم۔ اسلم
(۱۷) نمونے کا خطبۂ صدارت	ڈاکٹر سید عابد حسین
(۱۸) دکھیاری ماں	خواجہ سلام السیدین
(۱۹) عید کا بناؤ	آغا حیدر حسن دہلوی
(۲۰) خرافات	سید امتیاز علی تاج
(۲۱) دنیا کی سب سے پہلی کہانی	سدرشن
(۲۲) اجنتے کا پرستان	سید وزیر حسن دہلوی

(۲۳) آخری تیر — دیوانہ بریلوی
(۲۴) بگلا بھگت — ڈاکٹر اعظم کریوی
(۲۵) اکیلی قبر — پروفیسر عبدالقادر سروری
(۲۶) بچوں کی تعلیم — رفیعی اجمیری
(۲۷) ساتھ ایسا تو ہو — قیسی رامپوری
(۲۸) مصنف کا وارث — پروفیسر محمد مسلم
(۲۹) بیوی آخر بیوی ہے — ناکارہ حیدرآبادی
(۳۰) مہمانداری — حجاب امتیاز علی
(۳۱) فرحت کا انجام — انصار ناصری دہلوی
(۳۲) بنات البحر — فضل حق قریشی دہلوی
(۳۳) شاہی خاندان دہلی کی بپتا — ظفر قریشی دہلوی
(۳۴) پال کی آگ — صادق الخیری دہلوی
(۳۵) شکنتلا — پروفیسر احمد علی
(۳۶) بچہ — مرزا عظیم بیگ چغتائی
(۳۷) سچی کہانی — "پریم پجاری"
(۳۸) دیوانہ شاعر — سعادت حسن منٹو
(۳۹) عورت — اختر حسین رائے پوری
(۴۰) گوالیار کے باجے — مرزا فہیم بیگ چغتائی
(۴۱) قلعۂ معلیٰ کی ایک جھلک — اشرف صبوحی دہلوی
(۴۲) انوکھی مسکراہٹ — محمد محسن
(۴۳) گواہ — رشید احمد صدیقی
(۴۴) بیگانگی — ممتاز مفتی
(۴۵) بھوک — شاہد لطیف
(۴۶) نیرا — عصمت چغتائی
(۴۷) کفارہ — سید رفیق حسین
(۴۸) داستانِ خزان وخزانی — اسعد الاشرفی دہلوی
(۴۹) عینک اُتر جانیکے بعد — علامہ مضحک دہلوی
(۵۰) مچھر خاں — ڈاکٹر ہاشمی

کتاب شائع ہوگئی ہے۔ اس نایاب مجموعے کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے؛

ساقی کے مستقل خریداروں کیلئے دو روپے علاوہ محصولڈاک

نوٹ: خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ یہ رعایتی قمت نہیں لی جائیگی؛

جو حضرات ساقی کے مستقل خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے تین روپے علاوہ محصولڈاک

محصولڈاک مع رجسٹری آٹھ آنے (۸)

مہتمم، ساقی بک ڈپو۔ دہلی؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

زیرِ نظر اشاعت میں کئی مضمون ایسے شامل ہیں جن کا مطالعہ آپ کے لئے بطورِ خاص دلکش ثابت ہوگا۔ "داغ کی شخصیت" وحید العصر علامہ بیخود دھلوی کی بے مثل نثر کا شہ پارہ ہے۔ ایسی ٹکسالی اور نتھری ستھری زبان لکھنے والے دلّی میں اب کہاں؟ دوسرا مضمون سید ابو القاسم صاحب کا ہے۔ جو زلفِ یار کی طرح دراز اور خالِ رُخ کی طرح حسین ہے۔ سید صاحب کے مضامین کی عبارت پڑھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ اتنے مشکل موضوع پر صفحے کے صفحے اس طرح لکھنا کہ ایک لفظ بھی عربی یا فارسی کا نہ آنے پائے، پھر یہ خوبی بھی ہو کہ پڑھنے والے کا دل نہ اُکتائے، عجیب وغریب ایجاد واعجاز ہے۔ پروفیسر مسلم کی لکھی ہوئی سماجی انقلاب کی مفید و دلچسپ مجلسیں اِس اشاعت کے ساتھ ختم ہوئیں۔ "ذکرِ میر" ایک نئی طرز کا تذکرہ ہے جس کی ترتیب و ترمیم میں تحقیق و کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ جانوروں کے خیالات و احساسات کو افسانوں کے پیرایہ میں پیش کرنے کا سلسلہ سید رفیق حسین صاحب نے ساقی میں شروع کیا۔ چاروں طرف سے ایسے افسانوں کی مانگ ہے۔ "تماکو" بھی غالباً اسی وجہ سے پسند کیا گیا۔ اب اس پرچے میں "بھورہ" ملاحظہ فرمائیے اور آئندہ پرچے میں سید رفیق حسین صاحب کا فسانہ "فیل" "ہر فرعونے را موسیٰ" آپ کی ضیافتِ طبع کا باعث ہوگا۔

ناظرینِ ساقی یہ سُنکر خوش ہوں گے کہ مسٹر اختر حسین رائے پوری (صاحبِ "محبت ونفرت") چند روز ہوئے کہ دو سال یورپ کے مختلف ممالک میں رہ کر ہندوستان واپس آگئے ہیں۔ موصوف نے پیرس سے سنسکرت میں بہت اعزاز کے ساتھ "ڈاکٹر" کی سند لی ہے۔ ناظرینِ ساقی کو یاد ہوگا کہ اختر حسین پہلے مسلمان "ساہتہ النکار" ہیں اور اب سنسکرت کا ڈاکٹریٹ حاصل کرنے میں بھی اوّلیت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اِس لائقِ رشک کامیابی پر اختر صاحب مستحقِ مبارکباد ہیں۔ اُمید ہے کہ اُردو کے مشہور ادارے ان کی بے مثل علمی دسترس سے مستفیض ہونگے۔ یہاں یہ کہنا شاید بے جا نہیں ہوگا کہ اختر صاحب ہندوستان کی تمام ادبی زبانیں اچھی طرح جانتے ہیں اور دورانِ قیامِ یورپ میں آپ نے مزید نصف درجن زبانوں میں استعدادِ علمی پیدا کرلی ہے۔ اگر اُردو نے ان کی خدمات حاصل کرلیں تو یہ ہماری زبان کی بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

سَو روپے انعام

حسبِ دستور جولائی میں ساقی کا خاص نمبر شائع ہوگا جو صرف افسانوں پر مشتمل ہوگا۔ چند حضرات کے مشورے سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ افسانہ نمبر کے بہترین افسانے پر سَو روپے کا انعام دیا جائیگا۔ بہترین افسانے کا انتخاب سات مشہور نقاد کرینگے۔ اِن حضرات کے نام مصلحتاً ابھی نہیں بتائے جاسکتے۔ افسانہ نمبر شائع ہوجانے کے بعد انکے نام اور اُن کی آراء شائع کردی جائیں گی۔ افسانے ہر قسم کے بھیجے جاسکتے ہیں۔ افسانہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اختصار سے کام لیں۔ زیادہ طویل افسانے شامل نہیں ہوسکیں گے۔ افسانہ نمبر کیلئے افسانے یکم مئی تک دفترِ ساقی میں موصول ہوجانے چاہئیں۔ اشاعت و عدمِ اشاعت کا اختیار ادارۂ ساقی کو ہوگا۔ جو افسانہ ناقابلِ اشاعت ہوگا محصول ڈاک وصول ہونے پر واپس کردیا جائے گا۔

شاہد

داغ کی شخصیت

کون سا دل ہوگا جو اُستاد داغ کے غم میں داغدار نہیں میں تو اُن کا شاگرد ہوں اور شاگرد بھی ایسا جو ہر گھڑی دم کے ساتھ تھا۔ نہ میں اُن سے جُدا نہ وہ مجھ سے الگ۔ سیر و سفر میں بھی اگر میں اُنکے ساتھ نہ ہوتا تھا تو سلسلۂ رسل و رسائل، بعد کی ملاقاتیں، زبانی باتیں تلافی مافات کر دیتی تھیں۔ ایک بات ہو تو بتاؤں۔ ایک قصّہ ہو تو بیان کروں۔ ایک غم ہو تو روؤں۔ بس یوں سمجھو کہ ایک مرد خدا کو میں جانتا تھا اور میری خدائی اُس سے وابستہ تھی۔ حضرتِ داغ کی تصویریں تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ اُس نقّاش کے نقش و نگار سے تو آپ کی آنکھیں آشنا ہوں گی۔ لیکن کچھ واقعات کے نقش میرے دل پر رہ گئے ہیں۔ لگے ہاتھوں وہ بھی دیکھ لیجئے۔

شام کا وقت ہے۔ دربار کا موقع ہے۔ اعلیٰ حضرت حضور نظام کا کیمپ دتّی کلب میں رونق افروز ہے۔ ایک خیمہ داغ صاحب کو ملا ہوا ہے۔ میں حاضر خدمت ہوں۔ رمضان المبارک کا مہینہ۔ افطار کا انتظام۔ اُستاد خود افطاری تیار کرا رہے ہیں۔ گو روزے سے نہیں ہیں۔ لیکن ثواب میں حصّہ بٹانا چاہتے ہیں۔ میں نے دست بستہ عرض کی کہ گھر جا کر روزہ کھول لونگا، آپ کیوں تکلیف فرما رہے ہیں۔" ارشاد ہوا "ارے سید تجھ کو تو تیرے نانا بخشوالیں گے مجھ کو بھی تو کچھ ثواب کما لینے دے"

باتیں کرتے کرتے کہنے لگے "بیخود۔ یار ہماری طبیعت تو کُند ہوئی جا رہی ہے"

میں نے کہا "اُستاد کیا فرما رہے ہیں آپ۔ آپ کی طبیعت اور کند۔ یہ تو خنجرِ برّاں، تیغ آبدار ہے۔ اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام"

بولے "تُو تو جانتا ہے۔ حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں۔ یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ۔ یہاں پریوں کے پر جلتے ہیں۔ اور ہاں میاں بیخود، ایک دفعہ تم نے ہرن کے کباب کھلائے تھے۔ وہ اس مزے کی چاٹ تھی کہ آج تک ہونٹ چاٹتا ہوں۔ حیدرآباد میں ہرن دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس کے گوشت کو جی ترستا ہے۔ ایک دفعہ تو بیٹا پھر ویسے ہی کباب کھلا دے۔ خدا کرے تیری طبیعِ شوخ و شنگ میدانِ سخن میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرے۔"

میں نے کہا "بہت بہتر، ایک دو روز میں حاضر کرونگا" پھر بڑی دیر تک صحبت آراستہ رہی۔ کس مزے کی باتیں تھیں اور کیا لطفِ صحبت تھا۔ ع:۔ دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من۔

رات گئے میں واپس آیا۔ صبح جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر آدمی نے آواز دی۔ معلوم ہوا اُستاد نے پرچہ بھیجا ہے۔ کھول کر پڑھا تو صرف یہ مصرع درج تھا۔ ع:۔

نہیں ملتی یہاں ہرنی ترستا ہوں کبابوں کو

میں ہرنی کا مطلب بھی سمجھ گیا اور کبابوں کا مدعا بھی۔ اُستاد کو آہو چشموں سے کچھ اس بلا کا عشق تھا کہ ان کی مفارقت سے وحشت ہوتی تھی اور اُن کی موانست سے طبعِ چابک دست چوکڑیاں بھرنے لگتی تھی۔ میں نے دوسرے روز ہرن کی دو رانیں منگوا دتّی کے ایک رکابدار کے حوالے کیں اور کہہ دیا کہ سیخ کے کباب اور جس جس طرح کے کباب تم کو پکانے اور تلنے آتے ہیں دوپہر سے پہلے پہلے تیار کر دو۔ مزید برآں مختلف قسم کے اور کھانوں کا بھی اہتمام کیا۔ مثلاً نورمحلی پلاؤ۔ کچّی بریانی۔ زنگترا پلاؤ۔ دو تین طرح کے پرسندے۔ متنجن اور نان پاؤ کے ٹکڑے، دو بہنگیوں میں رکھوا کر جا پہونچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ یہ ضیغم میدانِ سخنوری گو عُمر میں بڈھا ہوگیا تھا۔ لیکن طبع جوان رکھتا تھا۔ جس وقت میں پہونچا تو اُستاد نے خضاب باندھ رکھا تھا۔ فربہ اندام۔ دراز قامت۔ چوڑی ہڈی۔ بھرا ہوا چہرہ۔ بڑی بڑی شوخ آنکھیں۔ ع:۔

آنکھ میں شوخی کس بلا کی تھی!

کچھ کہا نہیں جاتا۔ نگاہ قیامت کی فتنہ زا جو سینے کے پار ہو۔ دل میں گھر کرے۔ غرضکہ داغ صاحب عجب سج دھج سے بیٹھے تھے۔ بہنگیاں دیکھکر بولے "حضرت یہ اتنا کیا لے آئے آپ؟ کیا کسی کی دُکان اُٹھا لائے"

جاڑے کا موسم تھا۔ تمام چیزیں ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ میں نے عرض کیا "کھانا نوش فرمانے سے آدھ گھنٹہ پہلے فرما دیجئے گا تاکہ کھانا گرم ہو جائے" فرمایا "وقت ہو گیا ہے خضاب دھو کر کھانا کھاؤں گا" آدمی کو بُلا کر کہا "دیکھو محبوب یار جنگ صاحب سے میرا سلام کہو اور کہنا آپ نے کھانا نہ کھایا ہو تو میرے ساتھ کھائیے" اس عرصے میں میں نے رکابدار کو حکم دیا کہ کھانا گرم کرے۔ اور اُس نے دہی اور گھمن لگا کر بغیر

سینکنی شروع کیں۔ داغ صاحب نہایت سیر خور اور خوش خوراک تھے۔ کھانا کھاتے تھے اور مزے لیکر کھاتے تھے۔

بُلبل صحن باغ سے اور شاگرد اُستاد سے دور زیادہ عرصے نہیں رہ سکتا۔ میں دلّی میں تھا اور اُستاد حیدر آباد میں۔

اعلیٰحضرت حضور نظام نے اُستاد کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا۔ یہ واقعہ بھی قصّہ طلب ہے۔ حضرت داغ نے برسرِ دربار غزل گذرانی۔ مقطع تھا۔ ؎

تم نمک خوار ہوئے شاہِ دکن کے اے داغ
اب خدا چاہے تو منصب بھی ہو جاگیر بھی ہو

وہاں کیا کمی تھی اور کیا دیر۔ حکم ہوا اور ترقی ہوگئی۔ مجھے اطلاع ہوئی۔ مبارکباد بذریعہ خط پیش کی۔ جواب آیا دُور کی مبارک باد ہم قبول نہیں کرتے۔ میں نے جانے میں عذر لنگ پیش کیا۔ دوسرا خط آیا۔ اُس میں یہ شعر درج تھا۔ ؎

دیکھئے تجھ سے ملاتا ہے خدا کون سے دن
کونسی رات ہو مقبول دُعا کونسے دن

شعر کے نیچے لکھا تھا۔ یہ شعر تم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ میرے عذر کے جواب میں یہ مصرع تحریر تھا۔ ع:۔

تجو دہلانے باز ہو تم جانتے ہیں ہم

ہم کو تو بہانہ درکار تھا۔ مجنوں راہوئے بس ست۔ داغ صاحب میرے اُستاد تو تھے ہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں عاشق تھا اور وہ معشوق۔ وہ شمع تھے میں پروانہ۔ ادھر پروانہ ملا اُدھر میں روانہ ہوا۔

حیدر آباد میں ایک روز شام کے وقت میں اُستاد صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ شعر کہہ رہے تھے میں لکھتا جاتا تھا۔ ایک صاحب تشریف لائے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُستاد کی زود گوئی کا ذکر آیا۔ ان صاحب نے دریافت کیا۔ اُستاد آپ ایسے جلدی کیونکر شعر کہہ لیتے ہیں؟ اُستاد نے کہا "اور جناب کیونکر کہتے ہیں؟" اُنہوں نے فرمایا۔ حقّہ لیکر پلنگ پر لیٹتا ہوں۔ کروٹیں بدلتا ہوں۔ کبھی اُٹھتا ہوں۔ کبھی بیٹھتا ہوں۔ طبیعت پر زور ڈالتا ہوں جب بڑی مشکل سے ایک شعر بنتا ہے۔ داغ صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ معاف کیجئے گا۔ آپ شعر کہتے نہیں شعر جنتے ہیں؛

سچ یہ ہے کہ غضب کی بذلہ سنج اور شوخ طبیعت پائی تھی۔ ایک لطیفہ کیا ہزاروں موجود ہیں نمونۃً چند مشتے از خروارے پیش کئے دیتا ہوں۔

ایک دن حضرت نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شاگرد آگئے اُن کو نماز میں مشغول دیکھکر واپس چلے گئے۔ اُسی وقت داغ صاحب نماز سے فارغ ہوئے۔ نوکر نے کہا فلاں صاحب آئے تھے۔ فرمایا دوڑ کر بلا لا؛ جب وہ آئے تو داغ صاحب نے فرمایا حضرت آپ آکر واپس کیوں چلے گئے؟ کہا آپ نماز پڑھ رہے تھے؛ فرمایا حضرت میں نماز پڑھ رہا تھا لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے؛

اور سُنیئے۔ ایک مرتبہ رام پور میں نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم کے سامنے لفظِ سانس پر بحث چھڑ گئی اس لئے کہ دلّی والے سانس کو مذکر لکھتے ہیں اور لکھنؤ والے مؤنث۔ لکھنؤ اور دلّی کے شعرا موجود تھے ان میں امیر مینائی اور داغ صاحب بھی تھے۔ لیکن اُستاد بحث کے دوران میں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر جب بحث کو طول ہوا اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو نواب صاحب نے فرمایا؛ داغ صاحب آپ بھی تو کچھ فرمایئے؛ اُستاد نے کہا حضور، میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ مؤنث کا سانس مؤنث اور مذکر کا مذکر سمجھا جائے؛ سب لوگ ہنسکر چُپ ہو رہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ قبلہ داغ صاحب نے فرمایا تھا، غدر ۱۸۵۷ء میں میری عمر چھبیس سال کی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروز پور جھرکہ آپکے والد تھے۔ آپ ڈھائی تین برس کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔

آپنے فاضل ادیبوں اور عالموں سے عربی فارسی پڑھی تھی۔ ذہین ہونے کی وجہ سے بہت جلد فارغ التحصیل ہوگئے۔ اسکے ساتھ ہی زمانۂ قدیم کی تہذیب کے موافق آپ نے فنِ سپہ گری یعنی علی مد، بانک، بنوٹ، تلوار لگانی، تیر اندازی، شہسواری وغیرہ فنون بھی حاصل کئے۔

بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ معلومات و تجربہ نہایت وسیع تھا۔ طبیعت میں شوخی، چُلبلا پن بہت زیادہ تھا۔ ابتدا ہی میں آپ کے اشعار مقبولِ عام ہوگئے تھے۔ حضرت ذوق کے شاگردوں میں جو عروج و شہرت حضرتِ داغ کو نصیب ہوئی وہ کسی اور شاگرد کو میسّر نہ ہو سکی۔ آج ہندوستان میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو حضرتِ داغ کے نام سے واقف نہ ہو۔ اور اُسے اُن کے اشعار یا غزلیں یاد نہ ہوں۔

جن لوگوں نے حضرت داغ کو دیکھا ہے اور اس زمانہ کے مشاعروں میں شرکت کی ہے، اُس وقت کی محفلوں کو یاد کرتے ہیں

اور روتے ہیں۔ آہ مجھے بھی جب وہ زمانہ یاد آتا ہے تو گھنٹوں خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ اُن کی وہ شیریں کلامی، وہ بذلہ سنجی، وہ فقروں میں لطافت وظرافت، وہ بات بات میں پھڑکا دینے والے لطیفے، وہ شستہ اور ٹکسال میں ڈھلے ہوئے الفاظ، وہ چُست فقرے، گفتگو کے وقت یہ معلوم ہوتا تھا گویا علم کا دریا ہے کہ زور و شور سے بہتا چلا جاتا ہے۔ افسوس وہ اُردو کا مایۂ ناز شاعر دُنیا میں نہ رہا جسکو یہ دعویٰ تھا اور صحیح دعویٰ تھا ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

کلام کی عام مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جو غزل رات کو مُشاعرے میں پڑھتے تھے، صبح کو کوچہ و بازار میں لوگوں کی زبان پر ہوتی تھی۔ اکثر آدمی داغ صاحب کی عام مقبولیت پر حسد کرتے تھے۔ حاسدوں میں ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ اُنہوں نے ایک دن داغ صاحب کو سرِ راہ ٹوک کر کہا: "حضرت آج میرا آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ فرمایئے، مَیں اچھا شعر کہتا ہوں یا آپ؟"

داغ صاحب نے فرمایا: "حضرت شعر تو آپ ہی اچھا کہتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کروں کہ لوگ میرے ہی اشعار پسند کرتے ہیں۔"

جسم قدرت نے ایسا بنایا تھا کہ ہر لباس زیب دیتا تھا۔ ٹوپی اس وضع کی پہنتے تھے جیسی نوہارد والے پہنتے ہیں۔ جسم پر کرتا اس پر نیچی چولی کا انگرکھا، سیدھی تراش کا پاجامہ، پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ سلیم شاہی جُوتی۔ دلی کے قدیم شرفا کی یہی وضع تھی۔ یہ لباس قیام رام پور تک رہا۔ حیدرآباد جاکر حیدرآبادی اچکن یا شیروانی، انگریزی جوتا اور منصبی پگڑی استعمال کرتے تھے، یہ لباس بھی خوب زیب دیتا تھا۔ حقہ کا شوق تھا۔ پیچوان پیتے تھے۔ اور چلم کسی وقت ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ شطرنج، چوسر، گنجفہ خوب کھیلتے تھے۔ گنجفہ میں داغ صاحب کو کبھی میں نے چکمہ کھاتے نہیں دیکھا۔ غضب کی یاد تھی۔ علم موسیقی میں بھی خوب ماہر تھے۔ ستار اچھا بجاتے تھے۔ خوش الحان تھے۔ آواز میں بے انتہا درد تھا۔

مشاعرے میں ہمیشہ تحت اللفظ غزل پڑھتے تھے۔ فصاحت زبان کی بلائیں لیتی تھی۔ الفاظ موتیوں کی طرح ڈھلتے چلے آتے تھے۔ شعر اس خوبی سے ادا کرتے تھے کہ سُننے والے کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ میں نے اُن سے بہتر غزل پڑھتے کسی کو دیکھا نہ سُنا۔ ان کے سامنے کبھی کسی کی غزل کامیاب نہ ہوتی تھی۔ اخیر عُمر میں مشاعرے میں خود غزل پڑھنی چھوڑ دی تھی، کسی اور سے پڑھوا دیتے تھے۔

طبیعت میں نفاست تھی۔ عطر سے بہت شوق تھا۔ ظہر کے وقت بیسن مل کر اُوپر کا جسم دھلتا تھا۔ پھر سارے جسم پر عطر ملا جاتا تھا۔ اس کے بعد ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ ایک کرتا، پاجامہ روز بدلا جاتا تھا۔

نہایت خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ تھے۔ حتّٰی کہ شاگردوں سے بھی آپ اور جناب کہہ کر بات کرتے تھے۔ کسی قدر زود رنج اور نازک مزاج تھے۔ لیکن بہت کم غصہ آتا تھا۔ اور تھوڑی سی معذرت پر فوراً صاف ہو جاتے تھے۔ دوستوں کی تکلیف سے بیچین اور اُن کی خوشی سے خوش ہوتے تھے۔

جوانی میں ایک بچّہ احمد مرزا خاں پیدا ہوا تھا۔ لیکن افسوس دو سال کی عُمر میں دُنیا سے چل بسا۔ اور پھر اُس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔

بیخود۔ دہلوی

(اے۔ آئی۔ آر۔ دلی)

لال قلعہ کی ایک جھلک

سید ناصر نذیر فراق مرحوم کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی۔ اور اس انحطاط کے زمانہ میں بھی وہاں کی دلچسپیوں کا کیا عالم تھا..... میں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لیکر اس وقت تک کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں جب تک وہ ختم نہیں ہو گئی.... (نیاز فتحپوری) قیمت ایک روپیہ۔

دلّی کا آخری دیدار

اب سے سو سال پہلے جب لال قلعہ میں خاندانِ مُغلیہ کی آخری شمع جھلملا رہی تھی تو دلّی کی سوسائٹی کیسی تھی اور دلّی والوں کے رسم و رواج کیا تھے۔ بادشاہ سلامت شہزادوں اور شہزادیوں کا لائحہ عمل کیا تھا۔ اُمرا کے مشاغل کیا تھے۔ غربا اپنا وقت کس طرح گذارتے تھے۔ اس قسم کے ہزاروں سوال دل میں پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا جواب آپ کو اس کتاب میں مل جائیگا۔ قیمت ۱۲؍ علاوہ محصولڈاک ؛

ملنے کا پتہ۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی؛

متعلّم سے خطاب

مشفقی جناب شاہد صاحب!

"...... ادب کے متعلق جو میرا نظریہ ہے اور جس کے ماتحت میں آج تک لکھتا رہا ہوں، وہ فٹ، نوٹ میں مختصراً عرض کر دیا گیا ہے۔ اُمید کہ آپ کو اُس سے اتفاق ہوگا۔ رومانی ادب نے نژادِ نو کی ذہنیت جس قدر بگاڑ دی ہے، اب ہر ذی ہوش اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ خُدا ہمارے ادیبوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ قارئین کرام کی ذہنی تربیت صحیح طریق پر کریں ورنہ فطرت کا انتقام ایک یقینی بات ہے۔ فطرت اپنے نونہالوں کا اس طرح ناکارہ اور بے معنی انسان بنایا جانا کبھی گوارہ نہیں کر سکتی۔ واقعہ یہی ہے کہ ہمارا ادب بھی "جنگِ زرگری" کی رَو میں بہ گیا ہے۔ اور بازار میں ایسے ادب کی مانگ جو افکار و تخیّل میں صحیح ہیجان پیدا کر دے بہت کم ہے۔ ایڈیٹر بیچارے بھی مجبور ہیں۔ وہ تو خدمتِ ادب، ادب کے لئے نہیں بلکہ "معاوضہ بصورتِ زر" کیلئے کر رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس جنگِ زرگری میں نژادِ نو کا دماغی توازن بُری طرح بگڑ گیا ہے۔ اور یہ حالت ہو رہی ہے کہ جب تک ان کے پیالوں میں افیون کی آمیزش نہ ہو وہ اُسے بُوٹ کی ٹھوکر سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس کا علاج ایک ہی ہے کہ سب ادیب اپنے فرائضِ منصبی کو سمجھ کر لکھنا شروع کر دیں اور اس "رومانی" دور کو بالاتفاق ختم کر دینے کی قسم کھالیں ......"

'محمد مسیح پال'

تری حیات حقیقت بھی ہے فسانہ بھی ہے　　تُو بے زمانہ بھی ہے اور بازمانہ بھی ہے

زمانہ تجھ میں سمویا ہوا ہے تو اُس میں　　کہ آشیانہ بھی تُو نازِ آشیانہ بھی ہے

تجھے خبر نہیں زنجیریِ "جدال" ہے تو　　کہ خود ہی پیرِ حرم بھی مئے مغانہ بھی ہے

"زمینی" ساخت ہے اور تیور آسمانی ہیں　　تُو آب و دانہ نہیں بھی ہے آب و دانہ بھی ہے

ہے جس طرح کہ نہاں دن میں رات، رات میں دن　　اسی طرح ہی تُو خانہ بھی اہلِ خانہ بھی ہے

مجاز اور حقیقت کا امتزاج ہے تُو　　کہ اپنی ذات میں بیگانہ بھی یگانہ بھی ہے

بنائے کون و مکاں ہے "جدال" سرتاپا
بشرحِ "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ"

مقامِ حرص و ہوا سے بلند تر ہو جا　　خودی شناس و عمل کوش و خودنگر ہو جا

نگارخانۂ اغیار ہے ترا پہلو ... تو اپنے آئینے میں آپ جلوہ گر ہو جا

زمیں کے ساتھ لگا رہ نہ جھاڑیوں کی طرح ... جو رشکِ طوبیٰ و سدرہ ہو وہ شجر ہو جا

ترا ہی نام ہے "فطرت کی آنکھ کا تارا" ... تو اے سرورِ نظر وسعتِ نظر ہو جا

ترے خیال کی پستی سے ہے تری پستی ... بلند کر اِسے اور زیر سے زبر ہو جا

ازل سے ذوقِ عمل کا "رومان"[۵۳] ہے دشمن ... دماغ میں اِسے بھر کر نہ خیرہ سر ہو جا

حیات کیوں تری "پیارے" مجاہدانہ نہیں؟

ہے کارخانہ یہ عالم شراب خانہ نہیں

پلا رہے ہیں تجھے مے میں گھول کر افیوں ... کہ دن بدن ہو ترقّی پہ تیرا زورِ جنوں

دِکھا رہے ہیں تجھے جھوٹ موٹ کی لیلا ... بنا رہے ہیں تجھے قیس، پھونک کر افسوں

جبھی تو کاٹ کے نہریں نکالی جاتی ہیں ... کہ آشنا نہ ہو طوفان سے ترا جیحوں

متاعِ قافلۂ زیست لُٹ رہی ہے تری ... "حیات کُش" ہے ادب کے "رومان" کا شبخوں

بگاڑا جاتا ہے دانستہ تیرا ذوقِ سلیم ... سکھائی جاتی ہے تجھکو روِش ہی ناموزوں

ادب ہو جن کا "ہوس زا" وہ عشق کیا جانیں ... سرودِ عشق کہاں اور کہاں یہ چیں چوں

وہ عشق "عشقِ کلیمی" نہیں امینِ حزیں

عصائے کُن فیکوں جس کے دسترس میں نہیں

امینِ حزیں

---

۵۱ "جدال" ہیگل کا نظریۂ جدال Dialectics" ۵۲ ب قسمیہ ہے یعنی .... شرح کی قسم؛

۵۳ "رومان" ادب کا وہ شعبہ ہے جس کا نظریہ "ادب برائے ادب" ہے۔ اگر ادیب اپنے فرائضِ ادبی کا لحاظ کماحقہٗ رکھیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے قارئین کو بے خود بنا کر کس طرح پستی کے اندھے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں۔ صحیح ادب ہمیشہ "برائے حیات" رہا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ "رومانی" ادب میرے نزدیک ادب کے لاثانی حربہ کے غلط اور مجرمانہ استعمال کا دوسرا نام ہے۔

امینِ حزیں سیالکوٹی

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی اَنچھر

یہ اس دیس کی باتیں ہیں جو آگے بڑھنے کی دُھن میں ہاتھ پیر مار رہا ہے اور سُوجھ بُوجھ کا بے سہارا لئے بڑی گہری دلدل سے نکلنا چاہتا ہے۔ جہاں دیس سدھار کے سوچ بچار کی جگہ ہندی پرچار کی چیخ پکار کو دیدی گئی ہو وہاں کی سوچ سمجھ کا کیا ٹھکانا ہے۔ جو بات سب سے پیچھے ہونا چاہیئے تھی وہی سب سے پہلے اور جسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سب سے پہلے کرنا چاہیئے تھا وہی اتنی پیچھے رہ گئی جس کا ابتک کہیں پتا بھی نہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بھاشا پرچار والی گھڑی "ایکا پرچار" کی تھی جس کا یوں ستیاناس کیا جا رہا ہے۔ ابتک آپنے یہ کہیں نہ سُنا ہوگا جو آگے بڑھنے کا لگا لگائی گھڑی میں کسی دیس نے سب سے پہلے لٹریچر اور بھاشا سدھار کا بیڑا اُٹھایا ہو۔ جَون سی بات بھی ہو اس کے لئے کوئی نہ کوئی جگہ ہوا کرتی ہے اور وہیں وہ بھلی لگتی ہے جس بات پر لے کر کے سب پل پڑے یہ ابھی کرنے کی نہ تھی۔ اس کی جگہ ان کٹھن باتوں کو لیا جاتا جن کے پورا کرنے میں دیس کی بھلائی چھپی ہوئی ہے۔

کیا ایک ایک کر کے دیس کے وہ دُہرے تہرے بندھن سب ٹوٹ چکے جن میں وہ جکڑا ہوا پڑا تھا؟ کیا وہ اُونچائی اُسے مل گئی جس تک پہونچنے کیلئے یہ دوڑ دُھوپ کر رہا تھا؟ جب اب تک کوئی ٹھیک ٹھور ہی نہیں تو پھر سوت نہ کپاس کولھو سے لٹھم لٹھا کیسی۔ اب تک جو نہ ہو سکا تھا اور جس کے نہ ہونے سے دیس کب سے بندھا پڑا ہوا ہے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہلے اسے ہی کرنا چاہیئے تھا۔ وہ ہو چکتا اور سب کے سب یہاں والے ایک ہو جاتے تو کبھی یوں للیانا، گڑگڑانا نہ پڑتا اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو چکا ہوتا۔ پر سمجھ کا پھیر سوچنے کہاں دیتا ہے۔ ادبدا کے وہی باتیں کی جاتی ہیں جن سے دیس اور نڈھال ہو۔ آپس میں پھوٹ ایسی پڑی ہے جو گھٹنے کی جگہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ دیس والوں کا کسی بات میں ایکا نہیں۔ ایک جو بات مُنہ سے نکالتا ہے دوسرا اُسے جھٹلاتا اور اُس کی ہنسی اُڑاتا ہے۔ دیس کی کوئی ایسی سبھا نہیں جس کا کیا دھرا پورے دیس کی پکار سمجھی جا سکے۔ یوں تو "مسلم لیگ"، "کانگریس" یہاں کی بڑی سبھائیں ہیں۔ پر ہیں الگ الگ۔ یہی ان کا الگ الگ ہونا الگ ہو کے انہیں ایک کر دیتا تو پھر اس کی سکت دن دونی رات چوگنی بڑھتی اور بڑھ بڑھ کے وہ سب کر دکھاتی جس کا کہیں پتا بھی نہیں۔ مسلم لیگ، کانگریس سے ہے تو چھوٹی پر اس کے سے اس میں ٹکڑے نوالے نہیں ہیں۔ کانگریس بڑی سہی پر بنگالی پارٹی، گجراتی ٹولی اور نہ جانے کن کن ٹولیوں میں یہ بٹ بٹا کے رہ گئی ہے۔ راج کہتا ہے جو کچھ کہنا سُننا ہے وہ سب مل جُل کے کہیں اور یہاں مل ملا کے کوئی ایک بات مُنہ سے نکالنا کیسا جسے دیکھئے وہ اپنی اپنی ہانک رہا ہے۔

دیسیوں میں جتنی پھوٹ پڑے راج کے لئے بہت اچھا ہے۔ ٹوٹا اور گھاٹا جو بھی ہے وہ یہیں والوں کا۔ آپس میں ایکا نہ ہونے سے راج کا کیا بگڑا۔ یہیں کے باتونی گھاٹے میں رہے اور جو مت ایسی ہی اُلٹی رہی تو آگے بھی ٹوٹا ہی ٹوٹا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ٹوٹا اور گھاٹا بھوت بن کے دیس کو ایسا چمٹا ہے جو کبھی اُس سے الگ نہیں ہو سکتا اور یونہی گلے کا ہار بنا رہے گا۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ دیس والے جی پہ رکھ لیں تو اس کا اُتار دینا گھڑی بھر کی بھی بات نہیں۔ پر نجانے سمجھ پر کیا پتھر پڑے ہیں جو ادھر کوئی آتا ہی نہیں اور آیا بھی تو "تو تو مَیں مَیں" کے جھمیلے میں پھنس کر اُس کُتھی کو سُلجھانا بھول جاتا ہے جس کے لئے اِدھر آیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ایک ہی دھرم کے لوگ آپس میں ایک نہیں ہوتے تو الگ الگ دھرم رکھنے والے جتھے آپس میں کیسے ایک ہو سکتے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیوں ایک نہیں ہو سکتے۔ کوئی دھرم لڑنے جھگڑنے اور کسی سے بیر رکھنے کو اچھا نہیں بتاتا وہ تو بُرائی سے بچانے اور اچھائی کا ایسا پروگرام بنا دیتا ہے جسے دیکھ کر چلنے میں نہ کہیں ٹھوکر لگے اور نہ کہیں کوئی کانٹا چبھے۔ سانس لینے کی گھڑیاں سُکھ چین سے چُپ چاپ کٹ کٹا جائیں۔ یہ جو گلا پھاڑ پھاڑ کے بات بات میں دھرم دھرم کی چیخ پکار مچائی جاتی ہے یہ دھرم کہاں؟ اپنا بھرم نہ کُھلنے دینے کا ایک ڈھچر بنا لیا گیا ہے جسے دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دھرم ٹنٹے جھگڑے کو مٹاتا، ہلڑ کو دباتا اور چیں پٹاخ کرنے والوں کو بُرا بتاتا ہے۔

جسے دھرم کا نام لیکر پاکھنڈ پھیلاتا دیکھئے، سمجھ لیجئے اُس نے دھرم کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا لگا کے اپنے آگے بڑھنے اور اپنی بُرائی

منوانے کے لئے یہ بھگل گانٹھا ہے اور ایسے بھگل گانٹھنے، رُوپ بھرنے سے بڑھکر اس سنسار میں کوئی اور بُرائی ہی نہیں۔ اسی کی آڑ پکڑ کے اگلی بڑی گھمسان کی لڑائیاں جتنی بھی ہوئیں اُنہیں جانچئے تو گنتی کی کچھ لڑائیاں چھوڑ کر اور سب کی سب اپنی بڑھوتری ہی کے لئے دکھائی دیں گی اور ان کا دھرم سے کوئی لگاؤ نہ نکلے گا۔ آج کل کے وہ لوگ جو کسی دھرم ورم کو نہیں مانتے وہ اس پر یہی چھدّا دھرتے اور الاہنا دیکر کہتے ہیں۔ جب سے سنسار میں چہل پہل اور گھما گھمی کی لہر دوڑی ہے اس گھڑی سے لیکر اب تک دھرم نے جتنا لہو بہایا، لڑائیاں لڑیں، نئے نئے جھگڑے اُٹھائے ان باتوں کے سامنے پورے راج پاٹ والوں کی پوری لڑائیاں بھی کچھ نہیں ٹھہرتیں۔ اس لئے دھرم سے بڑھکر اور کوئی بس بھری بات نہیں ہو سکتی اور اس کا نہ ماننا ہی ماننے سے کہیں اچھا ہے۔

ان لوگوں نے جھگڑالو دھرم والوں ہی کے کرتوت دیکھے اور کسی دھرم کی کوئی ایک بات بھی کبھی بھولے سے نہ دیکھی۔ وہ دیکھ لیتے تو پھر یہ دھرم کو نہ ٹھکراتے اور اسے آپ بھی مانتے اور دوسروں سے بھی منواتے۔ نجاننے سے یہ دھوکے میں رہے۔ دھرم والوں کو جو کرتے دیکھا اُسے وہ دھرم ہی کا کیا دھرا سمجھے۔ اسے جانتے ہوتے تو پہچان لیتے یہ کیا دھرا دھرم کا نہیں دھرم والوں کا ہے۔ کسی دھرم کو اُس کے ماننے والے اپنے پیٹ کے دھندوں کے لئے توڑ مروڑ کے کچھ سے کچھ کر دیں تو کیا اس سے دھرم میں کوئی گھٹ بڑھ ہو سکے گی؟ وہ اپنی جگہ جیسے پہلے تھا ویسے اب بھی ہے اور ایسے ہی سنسار کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ اس میں یونہی سی بھی توڑ مروڑ اور گھٹ بڑھ نہیں ہو سکتی۔ جی کو دھو دُھلا کے، اس کا میل کچیل چھڑا کے اُجلا اور چمکیلا بنانا جس کا کام ہے وہ بھلا کوڑا کرکٹ اور میل کچیل کو اکٹھا کرنے کیلئے کہدیگا؟۔

اب رہا دھرموں کا الگ الگ ہونا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جسکے پیچھے لوگ بورائے کتے بن کر آپس میں کاٹنے اور بھونکنے لگیں۔ دھرم کیسے ہی الگ الگ ہوں ہوا کریں پر ان سب کا سنگم اور استھان تو ایک ہی ہے۔ جیسے کسی بڑی اُونچی جگہ تک پہونچنے کے لئے بہت سی پگڈنڈیوں اور ڈگروں پر ٹولیاں کی ٹولیاں اور جتھے کے جتھے اپنے اپنے ڈھب پر مالا جپتے اور منتر پڑھتے چلے جا رہے ہوں۔ اس چلچلاؤ میں ایک جتھا کسی دوسرے کو ہیٹا اور بُرا سمجھ کے اُس سے اُلجھ پڑے تو اُسے گدھا پن ہی کہا جائے گا۔ ڈگروں اور پگڈنڈیوں کی بہتات سے انہیں الگ الگ سمجھ لیا جائے تو یہ اور بات ہے پر یہ سب کی سب جب ایک ہی جگہ پہونچکر رک گئی ہیں اور ان کے چلنے والے وہیں پہونچنا چاہتے ہیں تو پھر یہ الگ الگ کہاں رہیں؟ ان سب کو ایک ہی سانڈ کی چھوٹی بڑی کڑیاں مانئے۔ سب ایک ہی کے داس، ایک ہی کے منگتا، ایک ہی کے پُجاری، ایک ہی سے لَو لگائے اور ایک ہی کے پریم بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔

پرماتما، ایشور، بھگوان کو ایک ماننا اور ایک جاننا کسی ایک ہی دھرم میں نہیں۔ وہ دھرم جس کی انگنائی سینکڑوں، ہزاروں اوتاروں اور دیوتاؤں کی بھیڑ بھاڑ سے بھری پُری ہے۔ نہ جاننے والوں کو چھوڑئے وہ اسے جس رُوپ میں چاہیں مانیں اور جس سے جی چاہے اس کے ڈانڈے ملائیں۔ پر دھرم کے بھیدیوں سے پوچھئے اور آپ پتا لگائیے تو یہ بھیڑ کی بھیڑ پرماتما نہیں۔ اُس تک پہونچنے کا سہارا اور آسرا دکھائی دیگی اور ان سہاروں، آسروں کے پیچھے وہی ایک جس نے ایسے ان گنت سنسار بنا ڈالے جن کا پہلے سے کوئی ڈھچر اور کوئی بانگی سامنے نہ تھی۔

جہاں ہم رہتے سہتے، چلتے پھرتے ہیں یہاں پیروں کے نیچے کبھی نہ میلا ہونے والا ملگجا سا بچھونا، جگہ جگہ ہریالی کی چوپڑ، اس میں ہلکے گہرے ڈہڈہاتے پھول بوٹے، مہکتی ہوئی پھلواریاں، پگھلی ہوئی چاندی جیسی اُبلتی ہوئی ندیاں، مُنہ میں جھاگ بھرے بڑھتے اور ٹکراتے ہوئے پانی کے وڑ پڑے، اُمنڈتا ہوا سمندر، ہرے بھرے اُونچے اُونچے پہاڑ، چہکارنے اور چہچہانے میں اپنے بنانے والے کے بھجن گانیوالے نئے نئے پکھیرو اور اُوپر چاند، سورج اور بے گنتی نچھتروں (ستاروں) سے جگمگاتی ہوئی بڑی اُونچی سی چھت جس تک یہاں کے کسی جتن کی سیڑھی نہیں پہونچ سکتی۔

دیکھنے میں تو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے نچھتر مٹر کے بیج جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ پر ہیں یہ اتنے بڑے بڑے گولے جن میں پورے سنسار سما سکیں۔ پھر یہ ٹوٹے ہوئے ہار کے سے بکھرے ہوئے موتی نہیں۔ ان سب کی الگ الگ بڑی بڑی ان گنت لڑیاں ہیں اور لڑیاں بھی ایسی جن میں کی ایک ایک لڑی بڑا سا ایک گول گھیرا اس کے بیچوں بیچ سورج اور سورج کے اِدھر اُدھر نچھتروں کا جُھرمٹ، ان میں کھینچا کھینچ ایسی جس سے ایک دوسرے کو اور دوسرا تیسرے کو کھینچتا چلا جا رہا ہے۔ آپس کی یہ اینچا تانی کسی نچھتر کو اس گھیرے سے نکلنے نہیں دیتی اور پورے نچھتروں کو ان کے سورج کے آس پاس گھما رہی ہے۔ اور وہ کسی اور کے۔ ایسے ان گنت گھیرے اور سسٹم جو اپنے اپنے سورج اور اپنے اپنے نچھتروں کے جُھرمٹ الگ الگ

رکھتے ہیں نہ جانے کہاں تک یونہی پھیلے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کے آس پاس چکپھیری پھر رہے ہیں اور اُن کا ایسا جال بچھا ہوا ہے جس کا کوئی اُور چھور ہی نہیں۔

ہمارے رہنے سہنے کی جگہ بھی ایک گول مول نچھتر ہے جو اپنی پوری سکت سے دوسرے کو کھینچتا اور اپنے ساتھیوں کی اینچا تانی سے کھنچتا کھنچاتا سورج کی ڈنڈوت کرتا ہوا چکّر کاٹ رہا ہے۔ یہ پورا گولا اپنے سورج کے سسٹم کے سامنے اتنا بھی نہیں جتنا کوئی چھوٹے سے چھوٹا بیج۔ اِس سسٹم کے پھیلاؤ کے آگے اس چھوٹے سے گولے کا ہونا نہ ہونا دونوں ایک سا ہی۔ یہ ننھا سا گولا اپنے گھیرے کی کھینچا کھینچ سے نکل کے ٹوٹ پھوٹ بھی جائے تو اس پورے سسٹم کی نپی تُلی گھوم گھام اور چکپھیریوں میں یونہی سا بھی کچھ ال بل نہ آئے۔ ان گنت سورج اپنے اپنے نچھتروں کے جُھرمٹ کے ساتھ پرا جمائے اُس کے سامنے ناچ رہے ہیں جو اِن سب کا بنانے والا اور بگاڑنے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو یہی تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تو یہی ہوگا۔ پہلے سے پہلے بھی یہی اور پیچھے سے پیچھے بھی یہی۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں وہ نہ ہو اور ایسی بھی نہیں جس میں وہی وہ ہو اور کہا جاسکے وہ یہیں ہے اور اُس کی جگہ یہی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ سب جگہ ہے اور پھر کسی جگہ نہیں۔ مرنے اور مٹنے والوں کے لئے جگہ ہوا کرتی ہے۔ مارنے اور جِلانے والے کیلئے جگہ کیسی۔ ساںڈ اور جگہ کا گھراؤ، پھیلاؤ اُسے کیا گھیر سکتا ہے جس کا کوئی اور چھور ہی نہ ہو۔ رات دن سے گھرے ہوئے سنسار میں بھی ایک ایک کا بول بیدھڑک بولا جاتا ہے۔ پر وہ ایک پہچان سے آگے نہیں۔ اس کے سے ایک لاکھوں، کروڑوں نکل سکتے ہیں اور وہ ایک اپنے اکیلے ہونے میں ایسا ایک ہے جس کا سا کوئی دوسرا نہ ہوسکا، نہ ہوسکتا ہے اور نہ ہوسکے گا۔ اپنے امٹ راج پاٹ کے ساتھ جیسے وہ پہلے تھا ویسے ہی اب بھی ہے اور آگے بھی یونہی رہے گا۔

وہ کھلاڑی ہے۔ کروڑوں مٹی کے پُتلے جس نے بگاڑ ڈالے بنا بنا کے۔ اس کے نت نئے کرتب اور کھیل ہم کیا سمجھ سکتے ہیں؟ کُمہار جس ڈھچر پر چاہے برتن باسن بنائے، بنے ہوئے باسنوں میں بنانے والے کے کرتب جاننے کی سکت کہاں؟ ہمیں اپنی جن سکتوں پر گھمنڈ ہے وہاں وہ سب کی سب پھسپھسی اور اپاہج۔ یہ ہاتھ اسے چھو نہیں سکتے، یہ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں، یہ کان اُس کی سُن گُن نہیں لے سکتے، اٹکل کا ہاتھ وہاں تک نہیں پہونچ سکتا، دھیان کے پکھیرو کی اُڑان یہاں مانی ہوئی ہے اور اس کی بڑی دھوم ہے۔ پر وہاں وہ گیا اور اُس کی اُڑان کیا۔ اپنی پوری سکت سے اُڑا، اُڑتے اُڑتے اُوپر والی چھت سے ٹکرایا اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے گر پڑا۔ تو جس کی سکت ان گنت سنسار بنا ڈالنے پر بھی ویسی کی ویسی ہو، سانس کی ڈور کے چھوٹے بڑے پھندوں کا جال اسی کا بچھایا ہوا ہو، مٹی کے پتلوں میں پھونک اور مٹی کی گھڑیوں میں کوک اسی کی بھری ہوئی ہو اس کے آگے پورے سنسار والوں کو ایک دھرم کا بنا دینا کون سی بڑی بات تھی اور جو سب کو ایک دھرم کے بندھن سے باندھنا نہیں چاہتا تھا تو جس دھرم پر اس کی دیا تھی اُسی کے ماننے والوں کو سب سے بُرا اور اچھے سے اچھا بنا دیتا۔ وہی سنسار کا سنگار ہو اور اُن ہی سے یہ جگہ جگمگا اُٹھتی۔

گورے چٹے چمکتے اور مُسکراتے ہوئے مُنہ، اُونچے پورے ڈیل ڈول، سانچے میں ڈھلے ہوئے ہاتھ پیر، نک سک سے ٹھیک ٹھاک، باتیں کرتے تو مُنہ سے پھول جھڑتے، چُپ رہتے تو ان سے کوئی بات نہ کرسکتا، جہاں رہتے وہ گھر پھلواری سا بنا رہتا، جدھر سے نکلتے وہ جگہ مہک اُٹھتی اور جن دھرموں کو وہ نہ چاہتا ان کے ماننے والوں کو اندھا، لولا، لنگڑا، اپاہج، تھوتنیاں آگے نکلی ہوئیں۔ مُنہ کی جگہ ٹانگ، ٹانگ کی جگہ مُنہ، پیر کی جگہ کان اور کان کی جگہ پیر ایسا ڈراؤنا، بھیانک اور گھناؤنا انہیں بنا دیتا جو یہ کالے کلوٹے میلے کچیلے جہاں جاتے وہاں سڑانڈ پھیلاتے۔ انہیں دیکھے سے گھن آتی اور ان کے پاس جانا کیسا ان میں سے کسی کو بھی کوئی اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا۔ ایسی پھٹکار میں گھرے ہوئے سانس لینے والے اپنی یہ گت دیکھکر اپنے کئے پر پچھتاتے، آنسو بہاتے اور سمٹ سمٹا کے اُسی ایک دھرم کی ڈگر پر چل پڑنے کے جتن کرنے میں لگ جاتے۔ پرماتما یہ سب کرسکتا تھا۔ پر اُس نے ایسا نہیں کیا اور سبکو ایک ہی سا بنایا۔ بنانیوالے نے تو سب کا ایک ہی ڈھچر رکھا۔ پر بنے ہوؤں نے جی سے نئی نئی باتیں نکال نکال کے چھوت چھات اور اُونچ نیچ کے اُونچے اُونچے پہاڑ کھڑے کردئے۔

پرماتما کی دیا نے جیسے ایک اچھے سے اچھے پنڈت اور بڑے سے بڑے مہاتما کو ڈیل ڈول، ہاتھ پیر، آنکھ ناک اور ایسے اور دوسرے جوڑ دئے ایسے ہی ایک شودر اور ایک ملیچھ اچھوت کو بھی۔ دونوں کے پاس یہ دی ہوئی پونجی ایک سی ہے۔ پھر یہاں کا جو سسٹم بنایا اس میں کہیر جھپاکے کا پتا نہیں۔ جو بات بھی ہو وہ دھیرے دھیرے اور رسان رسان ہی پوری ہوتی رہتی ہے۔ جیسے کڑی دُھوپ پانی پر پڑی اور اُس کے

لگاتار پڑتے رہنے سے پانی بھاپ بنا، بھاپ جا جا کے اُوپر پھیلی اور پھیل پھیلا کے گھنگھور گھٹا کے رُوپ میں آگئی جس نے برس کے جل تھل بھر دیے۔ ننھا سا بیج بویا وہ جما، پھیلا، پھوٹا اور بڑھا پھر بڑھ بڑھا کے پورا پیڑ بن بنا گیا۔ اس میں کلیاں نکلیں تو پہلے پہل گول گھنڈی سی بنی گھنے پتوں کی اوٹ میں چھپی چھپائی پڑی رہیں۔ جب اُبھار اور اُٹھان پر آئیں تو چپکے چپکے مُنہ نکال کے جھانکنے لگیں۔ پر رہیں ویسی کی ویسی ڈھکی ڈھکائی اور لپٹی لپٹائی۔ پھر یہ ڈھکاؤ اور لپٹاؤ کُھل کُھلا کے پنکھڑیاں بننے لگا اور پنکھڑیوں سے مل کے مہکتے ہوئے پھول بن بنا گئے۔

ایسے ہی ایک رُت کے پیچھے دوسری رُت جو آتی رہتی ہے وہ اچانک نہیں آتی۔ جیٹھ بیساکھ کی جھلسانے والی لُو کے ساتھ ساتھ، ساون کی جھڑی لگ جائے اور ساون بھادوں کے ملتے ہی ایسا کڑاکے کا جاڑا پڑے جس سے دانت بجنے لگیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے لئے جو ریتیں بنادی گئی ہیں وہ سب کی سب ہیں ایسی اٹل اور امٹ جو پورا سنسار کبھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ پران میں یونہی سا بھی کہیں اَل بَل نہ آئے۔ نو مہینے تک ماں کے پیٹ کی کال کوٹھری میں ٹکاؤ اور ٹھیراؤ جیسے بڑے سے بڑے مہاتما، دیوتا، اوتار اور راج پاٹ والوں کیلئے رکھا گیا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی ایک بھکاری سے بھکاری، پاپی سے پاپی، اور ملیچھ سے ملیچھ کے لئے بھی۔ اِدھر آنے والوں میں سے کوئی بھی اس ڈگر سے کترا کے نہیں نکل سکتا اور اس پڑاؤ سے ٹانڈا لدنے کی گھڑی آنے پر بھی آگے پیچھے سب کو ایک ہی پگڈنڈی پر چپ چاپ چلنا پڑتا ہے۔

لڑکپن، سیانا پن، بڑھاپا یہی وہ تین پنتھ ہیں جن کی دھوپ چھاؤں سنسار کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ہے۔ بن مانس، بھلا مانس سب پر ایک سی پڑتی ہے اور کوئی اس سے نہیں بچ سکتا۔ چھٹ پن کے الھڑ پنے کا ڈھندلکا کسی کو بھائے نہ بھائے۔ پر سیانے پن کی ڈھلتی ہوئی دھوپ ایک کو بھی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں رہنے تک سب کے سب سکت اور اکڑ تکڑ کے ہتھیار ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ پر یہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ کون ایسا ہے جو سانس اُکھڑنے کی گھڑی تک اٹھارا، انیس برس کا گبرو بنا کھنچا تنا موچھوں کو تاؤ دیتا رہے اور بڑھاپے کے پھسپھسے پن کو پاس بھی نہ پھٹکنے دے۔ یہ انمول پونجی نہ مول لی جا سکتی ہے، نہ چوری اور چھینا جھپٹی سے ہاتھ آ سکتی ہے۔ جس کے پاس ہے وہ بھی آج ہے کل چلی اور جس کے ہاتھ سے نکل چکی، بس نکل چکی۔ اب سینکڑوں برس بھی جئے تو اس کا پتا نہ پائے۔ یہاں کی ڈگر انہی پیروں سے نپتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا جو اچھوت کو تو چلنا پڑے اور پنڈت جی بے ہاتھ پیر ہلائے جہاں چاہیں پہونچ جائیں۔ چلنے کے ساتھ بڑھنا رکھا گیا ہے۔ جو چلے گا وہی بڑھے گا۔ نہ چلنے والے کے لئے بڑھنا کیسا۔ سڑک اچھوت اور پنڈت کو نہیں دیکھتی وہ تو اسی کے پیر چومتی ہے جو بھاگ دوڑ سے جی نہ چرائے۔

پرماتما نے مٹی کے پتلوں کو جو کچھ دینا دلانا تھا وہ دے دلا کے سوچ سمجھ ساتھ کر دی اور سکت کی بات ہاتھ میں دیدی۔ یہی پیر تیرتھ، جاترا جانے کے لئے بھی اُٹھ سکتے ہیں اور کلال کی بھٹی پر پہونچانے کے لئے بھی۔ اسی مُنہ سے اشلوک کے بول بھی نکل سکتے ہیں اور گالی گلوج کے بھی۔ اُدھر سے ڈھیل دیدی گئی ہے۔ جس کا جو جی چاہے کرے۔ پر یہ ڈھیل یہیں تک ہے۔ آنے والے دن پر یہی ڈھیل کھنچ کھنچا جائے گی اور پل پل کی ایسی پوچھ گچھ ہوگی جس سے ایک ایک کا کیا دھرا کھلم کھلا سامنے آجائے گا۔ لاکھ لاکھ چھپانے پر بھی کرتوت نہ چھپ سکیں گے اور یہاں کے چھپائے ہوئے پاپ وہاں آپ پکار اُٹھیں گے۔

کوئی نہ کوئی دھرم ایسا نہیں جس میں اس آنے والے دن کا کسی نہ کسی رُوپ میں پتا نہ دیا گیا ہو۔ اب یہ کڑیاں ملا کر دیکھئے۔ الگ الگ دھرم والوں کی آپس میں لاگ ڈانٹ، لڑائی بھڑائی پرماتما کے لئے ہے تو یہاں والے یہ جھگڑا چکانے والے کون؟ اسے اسی پر چھوڑ دیا جائے وہ آپ سمجھ لے گا اور جو یہ چیخ پکار پیٹ کیلئے ہے تو اپنے ہی ہاتھوں سے دھرم کے ستھرے پن پر دھبا لگانا دھرم کا ماننا کیسا جان بوجھ کے اس کا بگاڑنا ہے۔ پیٹ کے دھندوں کے لئے اور سیکڑوں جتن نکل سکتے ہیں۔ ان کے پیچھے دھرم پر کالک لگانا پاپ ہی نہیں مہا پاپ ہے۔ پھر، چھوٹے سے لیکر بڑے تک یہاں سب کے ساتھ بھگوان کا ایک سا برتاؤ آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو اس کے پوجنے والے اسی کو اپنا پروگرام کیوں نہیں بنا لیتے اور اپنے الگ الگ دھرموں کی الگ الگ پوجا پاٹ کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے دھندوں میں مل ملا کے ایک کیوں نہیں ہو جاتے۔ جو جس کا دھرم ہے وہ اُسی کے لئے ہے دوسرے کو اس سے کیا لگاؤ اور جب لگاؤ نہیں تو پھر اس سے لاگ رکھنا کیوں اور کس لئے۔ کوئی کسی دھرم کا ہو، تھالی کا بینگن نہ ہو اور ہو اپنے دھرم کا پکا وہ اپنی جگہ اچھا اور بہت اچھا۔ اُسے نیچا اور ہیٹا سمجھنا گدھا پن ہے۔

الگ الگ دھرم والے کہاں نہیں سب ہی جگہ ہیں۔ پر ہندوستان پورے سنسار سے انوکھا اور نرالا ہے۔ دیس باہر چھوٹی بڑی جگھوں میں الگ الگ دھرم کے لوگ جو پھیلے ہوئے ہیں پہلے تو اُن میں آئے دن ایسی تو تو مَیں مَیں نہیں ہوتی اور جو کبھی یونہی سی کچھ ان بن ہوتی بھی تو وہیں دبدبا گئی۔ یہاں جو آگ سُلگائی جاتی ہے وہ کسی ڈھب سے نہیں بجھتی اور اس کا رہ رہ کر بھڑکنا باہر والے اچنبے سے دیکھتے ہیں۔ آپس کی پھوٹ دیس کی چھاتی کا پھوڑا بن کر رہ گئی ہے۔ جس دیس نے پالا، پوسا، بڑا کیا لوگ اُسی کے لاگو بن گئے۔ کہا تو جاتا ہے آگے بڑھنے کے لئے اور جتن کئے جاتے ہیں پیچھے ہٹنے کے۔ دیس نڈھال پڑا ہوا چونچال ہونیکے لئے ایکا ایکا کہہ کے اپنی سکت کی ٹھنڈائی مانگ رہا ہے اور دیسیوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ اس آپا دھاپی میں یہ دھیان کسے جو یہ ٹھنڈائی بنا کے دیس کو پلا سکے۔

دیس کا روگ کھونے کے لئے نجانے اب تک کتنے جتن کئے جا چکے اور کتنی بھاگ دوڑ ہو چکی۔ پر اس کا روگ گھٹنا کیسا اور بڑھتا ہی گیا۔ جیسے کوئی روگی مُنہ بگاڑ کے کڑوی سے کڑوی ٹھنڈائی پہ ٹھنڈائی پیتے رہنے پر بھی سنبھلنے کی جگہ گرتا اور نڈھال ہوتا چلا جائے۔ اپنی اپنی کر کے سب دیکھ چکے۔ اس سے جو بھی ہوا وہ کوئی بھید نہیں سب کے سامنے ہے۔ اب ایک ہی ڈھب رہ گیا ہے جسے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگانا۔ اسے بھی کر کے دیکھ لیا جائے۔ کایا پلٹ نہ ہو جائے تو سہی۔ بڑھنے اور سدھرنے کا تالا ایک ہی کنجی سے کھلتا ہے جسے ایکا کہتے ہیں۔ اپنی اپنی ہانکنے والوں کا ایک سانٹھ میں چلے آنا اور مل ملا کے آپس میں ایک ہو جانا کوئی چھوٹی بات نہیں۔ بڑی اور بہت بڑی بات ہے۔

۱۹۱۴ء میں سمندر پار کا ایک راج اپنی راجدھانی سے آندھی بن کر اُٹھا، بادل بن کر بڑھا اور اپنی بھیانک کڑک اور ڈراؤنی گرج کے ساتھ پھیل پھیلا گیا۔ یہ دیکھ کر چھوٹے بڑے راج ادھر اُدھر سے سمٹ سمٹا کے جھپٹ پڑے۔ وہ اپنے گھمنڈ میں اکیلا ہی سب کو روند ڈالنا چاہتا تھا اور جو ہتّے پر چڑھ گیا اُسے اُٹھا کے دے مارا اور روند کے ڈال بھی دیا۔ پر ایک ایک ہی ہے۔ کس کس سے اُلجھتا، کِس کِس سے بھڑتا، چومکھا کیسے لڑتا اور اکیلا سب کو کیسے پچھاڑ دیتا۔ ایک پر دو بھاری ہوتے ہیں اور وہاں تو ایک کے سامنے نہ جانے کتنے تھے۔ اس پر بھی وہ ڈٹا رہا اور اپنی جگہ سے یونہی سا بھی نہ سرکا۔ پر یہ کب تک۔ ہوتے ہوتے پَیر اُکھڑے، پَیر اُکھڑتے ہی ہارا اور بیڈھب ہارا۔ گھیرنے والوں کو بھی اس کے گھیرنے میں انتوں پسینا آگیا اور جبھی سے اس پر دانت پیس رہے تھے۔ گِھرتے ہی لے لے کر کے سب کے سب اُس پر لوٹ پڑے اور جو پاس تھا وہ سب چھین چھان کے اُس پر بھاری سے بھاری بوجھ دُہرا تہرا لاد دیا جس سے وہ کبھی سیدھا نہ ہو سکے اور اسی کے نیچے وہ دب دبا کے رہ جائے۔

دیکھنے والے ہارے ہوئے راج کی یہ گت بنتے دیکھ کر آپس میں کہہ رہے تھے اس کا پھر پنپنا اور سُدھرنا تو بڑی بات ہے یہ کبھی ان بندھنوں کو بھی نہیں توڑ سکتا جن میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اب یونہی جکڑا ہوا پڑا ایڑیاں رگڑتا رہے گا۔ سب کے سب اپنے اپنے دھیان میں لُسے روند کے اَدھ مؤا کر چکے تھے اس لئے نہ کبھی کسی کو اس کی سن گن لینے کا دھیان آیا اور نہ اُس کی دیکھ بھال کا۔ اُسے نڈھال پڑا ہوا چھوڑ کر جب سب الگ ہو کے اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے تو چُپکے چُپکے کسماتے کسماتے جکڑے ہوئے بندھنوں کو ڈھیلا کر کرا کے یہ نکل کھڑا ہوا اور بیس ہی برس میں اس میں نجانے کہاں سے ایسی سکت آگئی جو پہلے سے بڑھ کے بھیانک بن کر پھر اسی اکھاڑے میں کود پڑا جس میں ابھی پچھڑ چکا تھا۔ یہ سب ایکے کا کیا دھرا ہے۔ نہیں تو اس کے مٹنے میں رہ کیا گیا تھا۔ کب کا مٹ مٹا چکا ہوتا۔ کل کا ہارا ہوا راج آج جو گرجتا برستا چلا جا رہا ہے۔ سنبھلنے میں اُسے نجانے کیسی کیسی کھکیڑیں اُٹھانا پڑی ہوں گی۔ جب تک پورا نہ سنبھلا تھا چُپ سادھے رہا اور جب پوری سکت آگئی تو تیوری چڑھائے بپھرتا ہوا نکل پڑا۔ لڑنا جھگڑنا کوئی نئی بات نہیں۔ سنسار کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ بل اتنا ہی ہے، پہلے اس کا ڈھنگ کچھ اور تھا اور اب کچھ سے کچھ ہو گیا۔ پُرانی لڑائی بھڑائی کا ڈھچر تھا کیا؟ تھوڑی سی جگہ میں لڑنیوالوں کے جتھے کے جتھے بھالے سنبھالے، برچھیاں تانے، تلوار لئے، کیل کانٹے سے لیس، گھوڑے دوڑاتے الگ لگ آ آ کے آمنے سامنے ڈٹ ڈٹا گئے۔

اِدھر اُدھر پھریرے اُڑنے لگے، جھنڈے لہرائے، باجے بجے اور لڑائی چھڑ گئی۔ پہلے ایک ایک منچلا اونچی بنا اپنے اپنے پرے سے نکل نکل کے اپنی اپنی سکت کے کرتب دکھانے لگا اور آپس میں جو جس کے داؤں پر چڑھا اس پر ایسا جچا تلا جنیو کا ہاتھ پڑا جس سے چھاتی کے کواڑ کھل کے رہ گئے۔ لہو کی ندی اُبل پڑی۔ وہ نڈھال ہو کے گرا اور گرتے ہی دوسرا جیوٹ اس کی جگہ آ ڈٹا۔ ایسے ہی دو دو کی جوڑ آپس میں لڑتی بھڑتی رہی۔ پھر ایک پرا دوسرے پر لوٹ پڑا۔ گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ جنہیں کھیت رہنا تھا وہ کھیت رہے، جنہیں ادھ مؤا ہونا تھا وہ اَدھ موئے ہوئے اور جنہیں تلوار کی آنچ بھی نہ پگھلا سکی وہ ویسے ہی ہٹے کٹے بنے اکڑتے رہے، دونوں پروں کے گتھتے ہی گھنٹا دو گھنٹے بہت سے بہت

ایک دو دن میں جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا اور اس ہار جیت کے اکھاڑے سے الگ تھلگ جو لوگ اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے تھے انہیں یہ بھی پتا نہ چلا دوسری جگہ ہو کیا رہا ہے۔ یہ پرانی لڑائیوں کا ڈھچر تھا۔ کل کی بات کل کے ساتھ گئی، آج وہی بات بڑھ بڑھا کے اچنبا بن گئی۔

کل تک مٹی کے پتلے مٹی ہی پہ لڑتے بھڑتے رہتے تھے اور اس سے آگے کوئی اور دوسری جگہ ہی نہ تھی۔ آج اوپر، نیچے، پانی میں جگہ جگہ لڑائی کے اکھاڑے ہی اکھاڑے آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اوپر کا تو کوئی اور چھور ہی نہیں۔ نیچے بھی میلوں کی چوڑان چکلان آج کل کی لڑائی کے پھیلاؤ سے گھر گھرا جاتی ہے۔ جیسے چیلیں منڈلاتی ہیں ٹھیک ایسے ہی ایروپلینوں کا ادھر سے ادھر زناٹے سے اوپر چکر لگاتے لگاتے بم پہ بم برسانا، گھن گرج توپوں کا میلوں پر گولے پر گولے اگلنا، بیڑا ڈباؤ بجروں اور سبمرینوں کا گھات لگائے چپ چاپ ادھر ادھر سمندر میں پھرنا، جسے اپنی سیدھ میں پانا اسے تارپیڈو مار کے ڈبو با اور پھر چپکے سے ڈبکی لگا کے پانی کی اوٹ میں چھپ جانا، ان سب سے بڑھکر بس بھری گیسوں کا اوپر ہی اوپر بے روک ٹوک پھیلنا اور ان کے بس کا گھٹتے گھٹتے بھی بھلے چنگوں کو پورا روگی بنا ڈالنا، الگ تھلگ سکھ چین کے بیٹھے ہوؤں کا بھی اس روگ سے نہ بچ سکنا۔ پرماتما ایسی بری گھڑی نہ دکھائے نہ سنائے جو لڑائی بھڑائی الگ رہنے والوں کو بھی روگی بنائے۔

پر جس بات کا دھڑکا تھا وہی بات سامنے آگئی۔ یوں تو اس بری گھڑی کو دیکھکر پورا سنسار سناٹے میں ہے۔ پر سب سے بڑھکر ہندوستان پر بن گئی ہے۔ بھلا جو کسی کے لینے میں نہ دینے میں اسی کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ ایسا اپاہج دیس جسے پیٹ بھر کے کھانا بھی نہیں ملتا۔ لڑائی اور کال ایک چھوڑ دو دو روگ اسے چمٹ گئے۔ پرماتما اپنی دیا سے اسکے دن پھیرے اور اس میں ایسی سکت دے جسکے بل پر یہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے۔ لوگ کہتے ہیں برطانیہ پولینڈ کی پرچک نہ لیتی تو یہ لڑائی ابھی نہ چھڑتی۔ بات یہ ہوئی، ہارے ہوئے راج میں جب پوری سکت آچکی تو پھر وہ نچلا نہ بیٹھ سکا اور اپنی پرانی جگھوں کو ایک ایک کر کے نئے ڈھنگ سے لینے لگا۔ برطانیہ پہلے تو چپکی بیٹھی دیکھتی رہی پر یہ لے جب آگے بڑھی تو اسے دھیان آیا۔ یہ بڑھکر جاتیں گے دھاوے کہاں تک۔ اور پوری دوڑ دھوپ کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

مسٹر چمبرلین دوڑے، برلن پہونچے، ہر ہٹلر سے ملے، پوری بات چیت ہوئی اور سنسار کے سکھ چین کو روندنے سے بچانے کیلئے انہوں نے کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ پر کی کرائی باتوں پہ پانی پھر گیا اور جرمنی اپنی ہی بات پر اڑا رہا۔ بڑھتے بڑھتے جب یہ پولینڈ پر ڈورے ڈالنے لگا تو برطانیہ اور فرانس مل کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پولینڈ کو سکھا پڑھا کے اسکے ساتھ دینے کی ہامی بھری۔ جرمنی نے پھر بے لڑے بھڑے اسے ہتیا لینے کے جتن کئے۔ پر پولینڈ ٹس سے مس بھی نہ ہوا اور اس کی ایک نہ چلی۔ پھر تو جرمنی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایکا ایکی پولینڈ پر ٹوٹ پڑا۔ برطانیہ اور فرانس دونوں پولینڈ کے بچانے کا بیڑا اٹھا چکے تھے اس لئے دھاوا ہوتے ہی پہلے فرانس اور پھر برطانیہ نے جرمنی کو الٹی میٹم دے دیا۔ جرمنی جانتا تھا لڑائی چھڑتے ہی برطانیہ اور فرانس پولینڈ کو بچانے کے لئے دوڑیں گے۔ اس لئے پہلے ہی سے پولینڈ کو اس نے اس ڈھنگ سے گھیر لیا جو دونوں اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں۔

آگے آنے والی باتوں کی روک تھام کے لئے برطانیہ روس کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھی جو جرمنی کا ہاتھ آگے بڑھا اور رشیا نے اسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا۔ جرمنی نے اپنا سمجھوتا کر کے برسوں کے روٹھے ہوئے روس اور جاپان میں بھی ملاپ کرا دینا چاہا۔ ادھر ٹرکی سے روس اور برطانیہ الگ الگ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ روس کی کچھ نہ چلی اور ٹرکی نے برطانیہ سے سمجھوتا کر لیا۔ جرمنی پندرہ دن میں جب آدھا پولینڈ روند چکا تو اسی کی ہوں پر پولینڈ میں روس اپنا ٹڈی دل لئے آدھمکا اور یہ راجدھانی ان دونوں میں بٹ بٹا کے رہ گئی۔ برطانیہ اور فرانس جرمنی کو الاہنا دے رہے ہیں۔ جرمنی ہی نے بیٹھے بٹھائے لڑائی مول لیکے سنسار کے سکھ چین کا ستیاناس کر ڈالا۔ جرمنی کہتا ہے یہ سب برطانیہ کا کیا دھرا ہے۔ نہ پولینڈ کے کان بھرے جاتے اور نہ پولینڈ ہماری باتوں کو ٹھکراتا۔ بیچ میں برطانیہ ٹانگ نہ اڑاتی تو بے لڑے بھڑے جرمنی اسے بھی ایسے ہی لے لیتا جیسے اس سے پہلے اپنی اور اور جگھیں لے چکا تھا۔ سنسار کے سکھ چین کا بچاؤ جرمنی سے بڑھ کر اور کون جان سکتا ہے۔ جرمنی ہی نے اپنے راج گڑھ کے چھنے ہوئے ٹکڑوں کو بے لڑے بھڑے ایک ایک لیکے ڈانزک تک ایسا رکارڈ بنا دیا تھا جو آج کیا پہلے بھی کسی سے نہ ہو سکا۔ پولینڈ کو نہ بہکایا جاتا تو یہ نیا رکارڈ نہ ٹوٹتا اور نہ اس کی یہ گت بنتی۔ جرمنی کسی سے الجھنا نہیں چاہتا اور پھر یہ سب جس کے پیچھے تھا جب وہی نہیں رہا تو اب یہ لڑائی بھڑائی کس لئے۔

• برطانیہ اور فرانس کا یہ کہنا ہے :- اب تک جتنی جگہیں لی جا چکی ہیں جب تک وہ سب کی سب پہلے کی سی نہ ہو جائیں تب تک لڑائی رُک نہیں سکتی۔ بھلا نگلے ہوئے نوالے کیسے اُگلے جا سکتے ہیں۔ جرمنی بھی چپ نہیں رہتا وہ کہتا ہے یہ بات ہے تو پہلے ہندوستان کے جکڑے ہوئے بندھن کھول دئے جائیں، مصر سے ہاتھ اُٹھا لیا جائے، کنیڈا فرانس کو دے دیا جائے۔ آپس میں ایسی ہی نوک جھونک ہو رہی ہے اور بات دبنا کیسی اور بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اب کی لڑائی کا ڈھچرا اگلی لڑائی کا سا نہیں۔ پہلے جرمنی اکیلا سارے سنسار سے بھڑ کے گھر گیا تھا۔ کل کیا ہوگا یہ کوئی نہیں جانتا۔ پر آج ابھی تک ایک سانڈ میں جرمنی اور دوسری سانڈ میں برطانیہ اور فرانس دکھائی دے رہے ہیں اور سب کے سب چھوٹے بڑے راج الگ تھلگ اپنی اپنی جگہ کیل کانٹے سے لیس ٹکٹکی باندھے لڑائی کے اُونچ نیچ دیکھ رہے ہیں۔ ہالینڈ اور بلجیم دونوں مل کے بیچ بچاؤ کرانے اُٹھے تھے۔ پر کچھ نہ ہو سکا اور یہ دونوں اپنا سا مُنہ لیکے رہ گئے۔ پھر پوپ بیچ میں پڑے، ان کی بات بھی دب دبا کے رہ گئی۔ یوں تو کوئی آس نہیں وہ اور بات ہے جو آگے کسی ڈھب سے یہ بڑھتی ہوئی لڑائی رُک رکا جائے۔ پر ماتما ہی اپنی دیا کے پانی سے اِس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھا سکتا ہے۔ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یہی اینچا تانی رہی تو آگے بڑھ کے الگ تھلگ رہنے والے بھی اس لپیٹ سے بچ نہیں سکتے اور اسی بھاڑ میں ایک ایک کر کے سب کے سب کُود پڑیں گے۔ دیکھئے گیہوں کے ساتھ گُھن کب تک پسیں اور اس بجوگ سے کب چُھٹکارا ملے۔

بیٹھے بٹھائے روس کو آدھا پولینڈ کیا ملا وہ تو ہوکے میں پڑ گیا۔ کئی چھوٹی چھوٹی جگھوں کو ہتیاتا ہوا جب فن لینڈ تک پہونچا تو لوگ کہتے تھے :- بھلا ہاتھی اور مچھر کی کیا ٹکر۔ آٹھ کروڑ کے سامنے تین۳ لاکھ ہیں کیا۔ پر فن لینڈ تو ٹیڑھی کھیر نکلا۔ اس نے رشیا کے دانت کھٹے کر دئے اور ناک چنے چبوا دئے۔ کئی مہینے ہو چکے اور ابھی تک روس مٹھی بھر فن لینڈ والوں کو نہ دبا سکا۔ رشیا اور فن لینڈ کی جھڑپ کا یہی ڈھچر رہا تو آگے کیا ہوگا اور کب تک ہوگا اس کیلئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جرمنی نے پورے سمندر کو بلو کے ایک اودھم مچا رکھا ہے۔ جگہ جگہ سُرنگیں بچھا دی اور مائنیں ڈال دی گئی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جبر میں چھوٹے بڑے بجروں، ڈونگیوں، سبمرینوں کی ان سے ٹکرا کے ڈوب ڈاب نہ ہوتی ہو۔ ایک ہنسوڑ نے آئے دن کی یہ ڈوب ڈاب سُنتے سُنتے ایک دن کہا :- کیا اس لڑائی میں سمندر پٹ کے رہ جائے گا۔ یہ ڈوب ڈاب سمندر کو پاٹ کے رہیگی۔ چلو اچھا ہے پھر بیڑا ویڑا رکھنے کی جھنجٹ سے راج بچ جائیں گے۔ پانی میں تو یہ بس بو یا جا رہا ہے۔ اُوپر اِدھر اُدھر کے ایروپلینوں کی مڈبھیڑ ہوتی رہتی ہے۔ فرانس کی لوہا لاٹھ لائن پر بھی دھاوے یہ دھاوے ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ پر جو کچھ ہونے والا ہے اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی لڑائی ٹھٹھری ہوئی ہے۔ جاڑا جا کے جب رُت پلٹے گی تب دیکھئے کیا ہوتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا لڑائی کے اُمنڈتے ہوئے سمندر کا بہاؤ پھیل پھیلا کے کیسے کیسے بہا لے جاتا ہے۔ دیکھنے والے کہہ رہے ہیں آج کل کی لڑائی سائنس کی ہے۔ سائنس جس کی گھٹی اور مٹھی میں ہو اُسی کی جیت ہوگی۔ یہ کہنا ٹھیک ہو نہ ہو جو بھی ہو الگ تھلگ رہنے والوں کی گھڑیاں تو سانسے میں کٹ رہی ہیں اور آنیوالی باتوں کا دھیان اُنہیں ڈرا ڈرا کے نڈھال کئے دیتا ہے۔ دیکھئے یہ دھڑکا کب جاتا ہے اور یہ لڑائی جو روگ بن کے سنسار سے چمٹی ہے اس سے کب اور کیسے چھٹکارا ملتا ہے۔

سید ابوالقاسم سرور۔

شہرۂ آفاق تمثیل نگار شیکسپئر کے دو۲ ڈرامے

مُترجمہ مولٰنا عنایت اللہ دھلوی؛

ہیملٹ

دُنیائے ادب کا سب سے مشہور ڈرامہ جو دُنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ

انطونی اور کلا بطرہ

تاریخ عالم کی خونی داستانِ عشق۔ کلا بطرہ کا کیریکٹر شیکسپئر نے کس طرح پیش کیا ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ

ملنے کا پتہ :- ساقی بُک ڈپو۔ دھلی؛

تاویل

تمہید

یورپ کی سیاست اور ہندوستان کا مذہب امن اور صلح چاہتے ہیں لیکن ان کی مثال اُس حکیم کی سی ہے جو مریض کو بیماری سے نجات دلانے کی نیت سے ہلاک کر دیتا ہے۔ اس اُصول کی صحت میں کوئی کلام نہیں کہ نفرت کے بیج سے محبّت کے پھل اور فساد کی چنگاریوں سے امن کا خاکستر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا نے جنگ کے علمبرداروں کو جیتے جی اور امن کے پیغامبروں کو شہید کرنے کے بعد سجدے کئے ہیں، چُنانچہ مذہبی تاویل کاروں نے غریبوں کے سامنے سے روٹی ہٹا کر جنّت کے دروازے میں مقفّل کر دی ہے اور اُس کی کُنجی اپنے ہاتھ میں لیکر بھُوکوں میں فلسفہ کی بحث چھیڑ دی ہے۔

اس صورت میں جبکہ مُلاّ، وکیل اور قصائی متحد ہو جائیں تو یہ ایسی تثلیث بن جاتی ہے جو توحید کو شکست دے سکتی ہے۔ بیچارہ وکیل اُس پرندے کی طرح جو انڈا دے نہیں سکتا لیکن سے سکتا ہے، ہنگامہ کی ابتدا کے لئے مولوی صاحب کا محتاج ہے اور اُس کے لئے صرف ایک بانگ "مذہب خطرے میں ہے" کافی ہے۔

قصائی صاحبان ہماری قوم کے چھتری ہیں اور ہندوستان میں خانصاحبوں کے زوال کے بعد اُن کے صحیح جانشین۔ وہ اعتقاد کے بچّے اور کانوں کے کچّے ہوتے ہیں اسی لئے بات پیچھے کرتے ہیں اور گالی پہلے دیتے ہیں۔ جب وہ دن بھر جانور ذبح کرنے کے بعد مسجد میں داخل ہوتے ہیں اور مولوی صاحب اُن کے سامنے جنّت کے پُرکیف مناظر کی تصویر کھینچتے ہیں، جس میں یاقوت کے قصر، زمرد کا سبزہ، دودھ اور شہد کی نہریں، حوروں کے جُھرمٹ اور غلمانوں کے پرے جاذبِ نظر اور مرکزِ توجہ ہو جاتے ہیں تو وہ مولوی صاحب سے بڑا مہنگا سودا کر لیتے ہیں۔

دراصل سماج نے سب کو نقد رقم اور مولوی صاحب کو اُدھار ثواب تقسیم کیا ہے۔ چونکہ رزق کیلئے حیلہ اور موت کیلئے بہانہ چاہیئے اس لئے گھر کے پُرانے سامان کے ساتھ، جنّت بھی بازار میں برائے فروخت لے آتے ہیں۔ لیکن اب یہ دَور بھی ختم ہو رہا ہے کیونکہ الکشن مذہب کی جگہ لے چکا ہے۔ سرمایہ دار اپنا روپیہ اور وکیل اپنی دلیل لیکر ووٹ کا شکار کرنے نکلے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب بھی اپنا پُرانا جال لیکر اِن نئے شکاریوں کے شریک کار بن گئے ہیں۔ چونکہ سیاست میں ووٹوں کی تقسیم ایک اٹل اُصول ہے اس لئے وقتی ہنگامے بھی ضروری ہیں یہی وجہ ہے کہ جامع مسجد میں نماز جمعہ کا انتظام بھی حکومت کو پولیس کی پیش نمازی میں دینا پڑا ہے تاکہ مسلمانوں میں نقصِ امن کا تدارک ہو جائے لیکن اس کے سدِّباب کی ایک ہی صورت ہے کہ وکیلوں کی زبان پر ٹیکس باندھ دیا جائے۔ سرمایہ داروں کا روپیہ مولویوں میں تقسیم کر دیا جائے اور قصائیوں کو فوج میں بھرتی کر لیا جائے۔

ہمارے شہر میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے الکشن کا ہنگامہ تھا۔ مسلمانوں کی ایک پارٹی وکیلوں کی سیاست کے خلاف تھی اس لئے ووٹروں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا تھا تاکہ دونوں طرف کے دلائل سُننے کے بعد وہ خود اپنی قسمت کا فیصلہ کر سکیں۔ ووٹوں کا حق کھوٹے سکّوں کا تحفہ ہے کہ انہیں چلا تو سکتے ہیں لیکن بازار سے جنس نہیں خرید سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ ادھر دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں اور اُدھر حاضرین جلسہ میں کچھ تو ربیع اور خریف کا حساب لگا رہے تھے، کچھ بیڑی نہ ملنے پر پریشان ہو رہے تھے اور کچھ لوگ دن بھر کی تکان کے بعد اُونگھ رہے تھے۔

ایک کونے میں سب سے دُور، ایک مولوی صاحب میرے قریب بیٹھے ہوئے مجھکو عذابِ الٰہی سے ڈرا رہے تھے۔ ان کو کسی طرح سے پتہ چل گیا تھا کہ میرا اِس سیاسی جلسہ سے اتنا تعلق ضرور تھا کہ میں نے مقررین کے دعوتی رقعوں پر پتے اور نام لکھے تھے۔ دراصل یہ ہمارے شہر میں مولوی "بول گنبد" صاحب کے نام سے مشہور تھے، کیونکہ موٹے بھی تھے اور بولتے بھی رہتے تھے۔ وہ اتنے کالے تھے کہ بلا مُبالغہ یہ پتہ چلانا دشوار تھا کہ ان کی پیشانی کہاں ختم ہوتی ہے اور سر کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے سامنے کسی امن پسند مولوی کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا۔ ان کا تقدّس ان کے علم اور شخصیت سے زیادہ اُن کے نسب کا مرہونِ منّت تھا کیونکہ وہ خود اپنی سیادت اور خدا کی وحدانیت پر یکساں اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں اُن کی دلیل

نہیں چلتی تھی وہاں ان کی سیادت کارگر ہو جاتی تھی۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ کالا سید اور گورا چمار عجیب الطرفین نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ ان کی اُمت میں قوی ہیکل پیشہ وروں کی کثرت تھی اس لئے کسی کو زبان ہلانے کی جرآت نہیں ہوتی تھی۔

مولانا جیسی ہستی کو ایسے اہم اجلاس میں سب سے الگ تھلگ دیکھکر مجھے بہت تعجب ہوا۔ لیکن میں نے اندازہ کیا کہ ان کا یہ طرز عمل دُو باتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو مولانا کو اپنے اُمید وار کی کامیابی کا حتمی یقین تھا یا دوسرے اُمید وار کی کامیابی کا۔ بہرحال وہ اپنے خالی وقت کا کوئی مصرف چاہتے تھے اس لئے مجھ کمزور پر طبع آزمائی فرمانے لگے۔ اُنہوں نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا۔

"کیوں جناب! آپ کو مجھے حبشی لکھتے ہوئے خدا کا خوف نہ آیا؟"

مَیں کانپ گیا کیونکہ ایک نیا وکیل ہونے کے لحاظ سے مَیں اُنکا احترام کرنے پر مجبور تھا۔

"مولانا!" میں نے عاجزی سے کہا۔ "فدا ہو میری جان اور مال آپکے اُوپر سے، مَیں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ خُدا کرے آپ کو حبشی لکھنے والے کی ماں اُس کے غم میں بیٹھکر روتے۔"

"تحقیق کہ آپ نے مجھے 'سیدی' لکھا اور صاحبِ نور اللغات نے اُس سے اہلِ حبش ہی مُراد لی ہے۔"

"اوہ! اب مجھے خیال آیا میں نے آپکو سیدی لکھا تھا۔"

"خیر! الاعمالُ بالنیات، لیکن احتیاطاً آپ تشدید بھی استعمال کر سکتے تھے۔"

"معاف فرمائیے، اُردو میں تشدید اور اعراب کا لحاظ بچے ہی رکھ سکتے ہیں۔"

"مَیں مومن کی طرف سے شک نہیں کرتا کیونکہ اللہ ہی عالم الغیب ہے، لیکن اب میرا قلب بالکل صاف ہو چکا ہے۔"

اِس جھڑپ کے بعد مولانا نے اپنی تحقیقات کے دفتر کھولنے شروع کئے۔ فرمانے لگے۔

"میرے مورثِ اعلیٰ سندھ میں سادات کے باوا آدم کی سی حیثیت رکھتے تھے اور عالمِ اسلام میں پہلے شخص تھے جس نے ایک ایسی حکمی تجویز پیش کی تھی کہ اگر اُس پر عمل کیا جاتا تو تمام ہندوستان بہ یک وقت مسلمان ہو جاتا۔"

"یعنی؟"

"اور آج اقلیت اور اکثریت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔"

"وہ تجویز —؟"

"یہ تھی کہ ہندوستان میں نہتی فوجیں بھیجی جائیں جو بمبئی، کراچی، کلکتہ اور مدراس کی بندرگاہوں پر ستیہ گرہ کریں کہ جب تک تمام ہندوستان اسلام قبول نہ کرے گا ہم بحری تجارت بند کر دینگے۔"

"آج کل کا جغرافیہ بتاتا ہے کہ اُس زمانے میں ان بندرگاہوں کا وجود ہی نہ تھا۔"

اِسے مولانا نے سُنا نہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ اُس زمانے کے ہندو اہسا کا جواب اہسا ہی سے دیتے۔"

"شکر ہے کہ اہسا کا فلسفہ بھی ہماری ہی ایجاد ثابت ہو گیا۔"

"ہندوستان میں اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہاں نہتوں نے اسلام کی خدمت کی اور ہتھیار بندوں نے اس کی بیخ کنی۔ اسی وجہ سے گنگ وجمن کے شاہی صوبے میں چودہ فی صدی مسلمان ہیں اور بنگال میں چھپن فی صدی۔"

"اور سندھ میں اسّی فی صدی۔"

"اس خطے پر خدا کی خاص رحمت تھی، یہاں تک کہ راجہ داہر کی بہن بھی مسلمان ہونے والی تھی۔"

"وہ جس نے اپنے حقیقی بھائی سے شادی کی تھی۔"

مولانا ذرا چونک پڑے اور کھانس کر کہنے لگے۔ "یہ تقدیری واقعات ہیں۔ قدرتِ خداوندی تو دیکھئے کہ وہ عاشق ہوتی ہے میرے مورثِ اعلیٰ پر، جو اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ وہ ذکی الحسِ کمزور اور نازک بدن کب اِس بے رُخی کو برداشت کر سکتی تھی، لہذا اُس نے ان کو زہر دلوا دیا۔"

"انا للہ —"

"اللہ کے حکم سے یہ صحیح سلامت رہے، لیکن ان کا تمام حُسن و جمال ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گیا، یہاں تک کہ آپ کو یہ سُنکر تعجب ہو گا کہ ان کے اخلاف میں آج تک سید سالونے رنگ کے اور سیدانیاں گورے رنگ کی پیدا ہوتی ہیں۔"

"مگر آپکے مورثِ اعلیٰ نے اتنا تکلف کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ اُن کی چار ازواجِ مطہرات پہلے سے موجود تھیں۔"

"تو ایک کو طلاق دیدیتے۔"

"وہ ہاشمی تھے، نسب کی پاکیزگی پر فخر تھا اور نسل کی برتری کا خیال۔ چنانچہ آج تک بفضلِ الٰہی ہمارا قبیلہ اپنی نجابت و شرافت کے

لحاظ سے ممتاز گنا جاتا ہے۔ ایسی ہی ہستیوں کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے۔ (جوش میں آکر)

نظر کی برچھیاں جو سہ سکے سینہ اُسی کا ہی
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اُسی کا ہی

وکیل صاحب! ذرا نظر پر نظر رکھئے"۔

"جی ہاں آنکھوں سے آنکھیں لڑی ہوتی ہیں اور سینہ سامنے ہو"

"معاف فرمائیے! یہ مجاز نہیں ہے حقیقت کی کٹھن منزل ہے۔ ہم جیسے صوفی کو ساتھ لیجئے تو بیڑا پار ہو گا۔۔۔ تحقیق کہ علومِ انسانی کے دو سرچشمے ہیں، اوّلاً نظر، وثانیاً خبر۔ نظری علوم سے وہ علوم مُراد ہیں کہ جو حواس خمسہ کے ذریعے محسوس کئے جاتے ہیں اور خبری علوم سے وہ علوم کہ جو کشفِ باطنی و صفائے روحانی سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں نظر سے شاعرِ حقیقت کا منشاء مافی الضمیر، وہ مادی اشیاء ہیں کہ جو اس عالمِ رنگ و بو میں موجود فی الخارج ہیں"

"بس یہی نکتہ تھا اس شعر میں" میں نے تفسیر کی قلابازی سے پریشان ہو کر کہا۔

"انگریزی داں اس کی قدر کیا جانیں۔ آپ لاکھ سائنس پڑھیں لیکن حقیقت کے چہرے سے نقاب نہیں ہٹا سکتے۔ خبر کو ہمیشہ نظر پر فوقیت ہی رہیگی"۔

"شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ طبیعیات سے ترازو، کیمیا سے امتحانی نلی اور حیاتیات سے خوردبین چھین کر سائنس کی آنکھیں پھوڑ ڈالی جائیں تاکہ وہ پھر آپ کی کنیز بن جائے"۔

"وہ ہمیشہ سے ہماری لونڈی رہی ہے"۔

"کیونکہ اُس نے آپ کا حکم کبھی مانا ہی نہیں"۔

"وہ خود اندھی ہے"۔

"کیونکہ آپ کی طرح نہیں دیکھتی"۔

"لا واللہ! ہم وہ دیکھ چُکے ہیں کہ جسے وہ کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ سوتے مادر آگہ تیمارت کجز! جس مسئلہ کو ہمارے ادنیٰ اُسے ادنیٰ افلسفی محض تخیلات کی مدد سے حل کر ڈالتے ہیں، اُسے بڑے سے بڑا سائنسداں بھی باوجود اتنی سہولتوں کے حل نہیں کر سکتا"۔

"شاید اُن دو ماں بیٹوں کی طرح کہ جو خود کو محض اس بنا پر نجومی ظاہر کرتے تھے کہ پانی برسنے کے متعلق، کبھی ایک کی پیشینگوئی صحیح ہو جاتی تھی اور کبھی دوسرے کی"۔

"اور اگر مَیں امریکہ کے ایک بہت بڑے سائنسداں کی شہادت پیش کروں تب تو مانیے گا"۔

"یقیناً! اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مَیں اس کا نام اور پتہ بھی نہیں پوچھونگا"۔

"حکیم بو علی سینا جذام کے مریض کے متعلق لکھتا ہے کہ اس سے اس طرح ڈرو جیسے شیر سے ڈرتے ہو"۔

"یقیناً بہت بلند پایہ تحقیق ہے"۔

"ذرا شیر کے لفظ پر غور فرمائیے"۔

"کیا اچھوتا استعارہ ہے۔ واللہ"۔

"یہی مفہوم اس طرح بھی ادا ہو سکتا تھا کہ شیر کے بجائے کسی اور خطرناک جانور مثلاً چیتے، سانپ، بچھو کا نام لے دیا جاتا، لیکن چونکہ شیر کا نام خصوصیت سے لیا گیا ہے اس لئے امکانِ اغلب ہے کہ اس سے کچھ اور ہی شے مراد ہو گی"۔

"جسے امریکہ کے سائنسداں نے آج دریافت کیا ہے"۔

"جی ہاں! کہ جذام کے جراثیم ہوتے ہیں اور ان کی شکل بالکل شیر جیسی ہوتی ہے۔ اب فرمائیے کیا یہ اعجاز نہیں ہے؟"

"حکیم بو علی سینا کا نہیں۔ بلکہ آپ کا معلوم ہوتا ہے"۔

"ختم اللہ علیٰ قلوبھم وسمعھم و ابصارھم......"

"مذہب اور سائنس ہمیشہ آپکے تابع فرماں رہیں گے، جبتک کہ آپ کی مٹھی میں اعجاز کا موکل ہے اور اعجاز کا موکل ہرگز آپ کو کبھی تنہا نہ چھوڑے گا جب تک کہ آپ کے پاس تاویل کا طلسم ہے۔ بھوکے کے سامنے خالی دسترخوان پر، خیالی کھانا چننے کے بعد، زبردستی پانی پلانا اور بخوشی دعوت کا شکریہ وصول کر لینا، یقیناً تاویل ہی کا اعجاز ہے"۔

شاید مَیں جوش کھا گیا تھا، جبھی تو اکیلا بیٹھا ہوا تقریر کر رہا تھا کیونکہ مولانا پلیٹ فارم پر تشریف لے جا چکے تھے اور الکشن کے ڈرامہ کا دوسرا سین شروع ہو گیا تھا۔

پہلے مولانا نے خوابیدہ مجمع سے "وعلیکم السلام" زبردستی وصول کیا پھر درود و سلام کے چھینٹے دیکر تلاوتِ کلام پاک کی برکت اور اپنی خوش الحانی سے تمام لوگوں کو پوری طرح بیدار کر دیا، سب کی گردنیں دراز ہو گئیں، دل گرما گئے اور پھر چہار طرف زندگی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا تعارف اس طرح کیا۔

"برادرانِ ایمانی!

تمہارے سامنے ایک سیدِ آلِ رسول، پابند صوم و صلوٰۃ، حافظ

قرآن، پیرو سنتِ نبوی و شرعِ محمدی، خادمِ ملت والدین حاضر ہے۔۔۔"
لوگ پلیٹ فارم کی طرف کھسکنے لگے۔

"سر پر سبز عمامہ، نشانِ سیادت، شانوں پر پریشان کاکلیں، روایت بنو ہاشم، چہرے پر ایک مٹھی و چہار انگشت ڈاڑھی، سنتِ نبوی، ماتھے پر سجدہائے دراز کے گٹے اور گھٹنوں پر رکوع و سجود کے نشانات، عبا و قبا در بر، جوشِ اسلامی و خلوصِ ایمانی در دل"
لوگ اکڑوں بیٹھ گئے اور کان کھڑے کر کے سننے لگے۔

"میں تبلیغ ابن التبلیغ ابن التبلیغ۔ میری پیدائش تسبیح و درود اور حمد و نعت کی فضا میں، زندگی عبادتِ کردگار اور خدمتِ خلق اللہ میں اور موت مجاہدانہ شوق، والہانہ عقیدت اور عشقِ رسول اللہؐ میں۔۔۔۔۔۔"

مخالف پارٹی کے لوگ جیبوں سے رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگے۔

"ایہا الناس! میں مولودِ اسلامی کے کان میں اذان دیتا ہوں، بچوں کو کلامِ ربانی کی تعلیم دیتا ہوں، چوبیس گھنٹے میں پانچ مرتبہ منارۂ مسجد سے نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوں اور صحنِ مسجد میں سقفِ آسمان کے نیچے خدا کو حاضر ناظر جان کر امامت کے فرائض انجام دیتا ہوں۔ شادی میں نکاح اور موت میں نماز جنازہ پڑھاتا ہوں، یہاں تک کہ جنازے کے آگے میں، جنازے کے پیچھے میں، جنازے کے داہنے میں، جنازے کے بائیں میں، قبر کے باہر میں اور قبر کے اندر میں۔۔۔۔۔۔"
مولانا جیت گئے اور مسٹر ہار گئے۔

سید ابو طاہر۔ بی۔ ایس سی (ملک)

درسِ عبرت

نہیں کچھ پاس جن کو امتیازاتِ اب و جد کا
غرض جس سے ہو اس کو پاؤں اس کے چوم لیتا ہے

نہیں مدِ مقابل اس کا خود اس کے حریفوں میں
کوئی عزت نہیں رکھتا مگر عزت کا ہے طالب

اسے حاصل ہے عیاری کے فن میں وہ یدِ طولیٰ
شکایت شیر خاں کی، کی نہیں اس نے کرم خاں سے

مخاطب کون ہے اور وقت کیسا ہے، سمجھتا ہے
یہی ہے مشغلہ اس کا یہاں آنا وہاں جانا

مذاق اس کا ہمیشہ خوش ہے اس آوارہ گردی سے
ہوا جب تک نہ تھا خالد کے ان اطوار کا عرفاں

مگر جب آزمائش ہو چکی خود بن گئی جامد
سکھاتی ہے روش خالد کی ان کو فن خوشامد کا

فرشتوں کو بھی دھوکا ہو فریب اس طرح دیتا ہے
نظر آتا ہے یہ ممتاز "غیرت کش ظریفوں" میں

یہ کہتا ہے کہ سب اس کو پکاریں "مولوی صاحب"
جھلائے عمرو عیار اس کے شاگردوں کا خود جھولا

گلے کرتا ہے شیخ افضل کے یہ مرزا سلیماں سے
شعور اس بدسیر کا ہر کسی سے کب الجھتا ہے

بدی نیکوں سے کرنا یا بروں کو نیک ٹھہرانا
تمرد اس کا عزلت خواہ گرمی سے نہ سردی سے

محبت میری اس کے واسطے تھی مصدرِ احساں
بڑا خود کام ہے خالد بڑا زر دوست ہے خالد

حقیقت آشنا جو دوست ہیں میں ان کا شیدا ہوں
اب اس زر دوست کی حد تک فقط صورت شناسا ہوں

علی منظور

ریڈیائی ڈرامہ:۔

آؤ خط سُنو

کشور:۔ (اپنی بیوی سے، اشتیاق بھرے لہجے میں) اِدھر آؤ خط سُنو۔

لاجونتی:۔ کیا کہا؟ (آواز دُور سے آتی)

کشور:۔ میں کہتا ہوں، اِدھر آؤ، خط سُنو۔

لاجونتی:۔ (غصّے میں) کوئی اور کام نہ کروں ـــ لو سُناؤ کیا سناتے ہو۔

کشور:۔ (گھبرا کر) میں کیا کہہ رہا تھا؟ ـــ ہاں، . . . . دیکھو لاجونتی، پُونہ سے نرائن کا خط آیا ہے، وہ بیچارہ پچھلے دنوں بہت تکلیف میں تھا، اُس نے یہاں سے ایک کتاب منگوائی ہے اور لکھا ہے . . . . . .

لاجونتی:۔ اور ہاں . . . . وہ دوست جو آپ کی کتاب مہینہ ہوا مانگ کر لے گیا تھا ابھی تک واپس کیوں نہیں لایا؟ ـــ آپ کے دوستوں کی یہی باتیں تو مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ یہ الماری سب کتابوں سے بھری ہوتی تھی پر آج اس میں ایک کتاب بھی نظر نہیں آتی۔ چولھے میں جائیں ایسے چونٹے دوست ـــ ایک ناول بھی تو نہیں رہا پڑھنے کے لئے۔ سب کے سب آپ نے اپنے یار دوستوں کے نذر کر دئے۔ ایک بس گھر میں یہی دل بہلاوے کا سامان تھا سو وہ یوں غارت ہوا۔

کشور:۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، سب کتابیں آجائیں گی ـــ پڑھکر سب لَوٹا دیں گے، ایک تو آج ہی کمار واپس دے گیا ہے ـــ چھوڑو اِس قصّے کو . . . . ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ نرائن کا خط آیا ہے ـــ وہ لکھتا ہے . . . . . .

لاجونتی:۔ ٹھیرو تو ـــ یہ کمار ایک کتاب تو ٹھیک واپس دے گیا ہے پر "فسانۂ آزاد" کی چار جلدیں بھی تو اُٹھا کر لے گیا ہے اور جو کتاب اُس نے واپس دی ہے، کیا پہچانی جاتی ہے کہ ہماری تھی؟ ـــ کتنے چوہے کترے، جگہ جگہ موٹے سالن کے داغ، پنسل اور قلم سے بناتے ہوئے بیل بوٹے . . . . یہ کیا سب میں نے ڈالے تھے یا آپ نے؟

کشور:۔ ارے بھئی جس گھر میں بچے زیادہ ہوں وہاں ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ میں نے اُس سے کہدیا تھا کہ "فسانۂ آزاد" کی سب جلدوں کو الماری میں بند رکھا کرے اور پڑھتے وقت اُن پر کاغذ چڑھا لیا کرے ـــ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نرائن کا خط آج صبح کی ڈاک سے آیا ہے، وہ بیچارہ بہت پریشان تھا۔ تمہیں نمسکار لکھا ہے۔

لاجونتی:۔ نمسکار . . . . پہلے یہ تو بتایئے کہ قمیص میں آپ نے آج اتنا میلا کالر کیوں لگایا ہے، کیا میز کی دراز میں کوئی اور سفید کالر نہیں تھا، ابھی پرسوں میں نے سب کالر دھلوا کر استری کئے ہیں۔ آخر یہ کیا ہو رہا ہے؟ ـــ کچھ دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ اپنے لباس کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتے ـــ آپ کے شُو کے تسمے بھی ٹوٹے ہوئے ہیں، حالانکہ میں نے کل ہی نئے منگوائے ہیں۔

کشور:۔ دفتر جانے کا ٹائم ہو گیا تھا اس لئے جلدی میں نہ کالر بدلنا یاد رہا نہ تسمے . . . . لیکن یہ معمولی بات ہے، کل بدل لونگا . . . . میں نرائن کی بات کہہ رہا تھا۔ اُس کا خط آج صبح کی ڈاک سے آیا ہے۔ تم نے شاید نہیں پڑھا۔

لاجونتی:۔ پڑھتی کیسے؟ ـــ نگوڑی عینک کی کمانی جس دن سے آپ نے پیر کے نیچے دبا کے توڑی ہے، میں نے ایک حرف بھی تو نہیں پڑھا۔ کل ذرا اخبار دیکھنے لگی تھی کہ سر میں درد شروع ہو گیا ـــ آج آپ اتنی مہربانی کیجئے کہ میری عینک بنوا لائیے، مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے اُس کے بغیر۔

کشور:۔ آج ہی مرمت کے لئے لے جاؤں گا اور اگر نرائن یہاں ہوتا تو مُفت ہی میں یہ کام ہو جاتا۔ بمبئی میں وہ جب عینک سازوں کی دُکان پر نوکر تھا تو کتنا آرام تھا، تمہاری یہ عینک بھی تو اُسی نے لا کر دی تھی۔

لاجونتی:۔ وہی لاتے تھے۔

کشور:۔ آجکل وہ "پُونہ" میں ہے۔ پچھلے دنوں بیچارہ بہت پریشان تھا۔ آج صبح اُس کا خط آیا ہے، لکھتا ہے مجھے تاراپور کی دُکان سے . . . .

لاجونتی:۔ میں آپ کو بتانا بھول ہی گئی تھی۔ کل شام کو تاراپور کی دکان سے ایک آدمی بِل لیکر آیا تھا ـــ یہ آپ نے ساٹھ روپے لو آنے کی کتابیں خرید کر کہاں غائب کر دیں . . . . یہاں گھر میں تو ایک کو بھی آنا نصیب نہیں ہوا۔

کشور:۔ یہ کتابیں میری اپنی نہیں تھیں۔ دفتر میں ایک لائبریری کھولی گئی ہے اور اس کا انچارج مجھے بنایا گیا ہے۔ یہ ساری کتابیں اسی لائبریری کے لئے خریدی گئی ہیں اور اِس کا بِل وہی ادا کریں گے ـــ پر تم میری بات تو سُن لو، یہ بیچ میں کتابوں، کالروں، اور تسموں کے جھگڑے کیا لے بیٹھی ہو۔ نرائن کا خط آیا ہے بیچارہ بڑی پریشانی میں تھا اور تمہیں کچھ پرواہی نہیں۔

لو ذرا دھیان سے سنو۔ اُس نے پُونہ سے خط لکھا ہے ....

لاجونتی:۔ ٹھیریئے ابھی سُنتی ہوں ـــ پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے وہ خط تو پوسٹ کر دئے جو میں نے کل اپنی سہیلیوں کو لکھے تھے یا ابھی جیب ہی میں پڑے ہیں؟

کشور:۔ (تنگ آکر) جیب میں پڑے ہوں گے تو کون سی آفت آجائے گی؟ تمہاری سہیلیاں اور اُن کے خط جائیں بھاڑ میں۔ مَیں ڈیڑھ گھنٹے سے اپنے دوست کا ایک ضروری خط سُنانے کی کوشش کر رہا ہوں اور تم بیچ بیچ میں ٹوک ٹوک دیتی ہو۔ آخر یہ کیا مذاق ہے؟ ـــ تمہیں جو کچھ کہنا ہو ایک بار کہہ ڈالو تاکہ پھر مَیں آرام سے تمہیں اس کا خط سُنا سکوں۔

لاجونتی:۔ میری سہیلیوں اور اُن کے خطوں کو چولھے بھاڑ میں جھونک چکے، کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟ ـــ چلو اب سُناؤ، کیا سُنانا ہے؟ ـــ میں نے بھلا کیا کہا تھا کہ تم نے یوں چلّانا شروع کر دیا؟

کشور:۔ تمہاری زبان تو قینچی کی طرح چلتی ہے۔

لاجونتی:۔ آپ کہیں تو مُنہ میں بخیہ کر لوں۔

کشور:۔ تم تو طبیبی کرتی ہو، بات میں بات نکالتی جاتی ہو۔

لاجونتی:۔ آپ کی طرح پہاڑ کے رفو نہیں کرتی۔

کشور:۔ اور تم اپنی تقریر کی گلکاریاں نہیں دیکھتیں۔ باتیں کرتی ہو تو معلوم ہوتا ہے چکن کاڑھتی ہو۔

لاجونتی:۔ یہ آپ نے نیا شگوفہ چھوڑا۔

کشور:۔ اور یہ آلپن ہیونت تم نے نئی شروع کی۔

لاجونتی:۔ بھئی مَیں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی، اس مونہا ٹھیٹھی کو بند کرو۔ تمہاری سنگر مشین تو کبھی بند نہ ہوگی۔ آؤ کوئی کام کی بات کریں، کچھ سوچیں۔

کشور:۔ کیا سوچوگی تم؟ ـــ کچھ سوچ بھی سکتی ہو؟ ـــ اگر تمہارے دماغ میں سوچ بچار کا مادّہ ہوتا تو آج منے کو دست پہ دست نہ آتے، اُس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا نہ پڑتا ـــ اگر تم کچھ سوچ سکتیں تو میرے اُسترے کے نئے بلیڈوں سے اسٹنسل نہ کاٹتیں اور آج صبح ڈاڑھی مونڈتے وقت جو میں نے چھٹانک بھر لہو بہایا ہے، میری رگوں ہی میں محفوظ رہتا۔ (طنز یہ انداز میں) ـــ آپ سوچنا چاہتی ہیں ـــ یہ سوچنا ہوگا کہ میرے سر پر یہ تھوڑے سے بال کیوں باقی رہ گئے ہیں۔

لاجونتی:۔ لو جی تم سے کوئی بات کرے ـــ بھلا میں نے کیا کہا تھا جو تم یوں پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔

کشور:۔ تم نے ابھی کچھ کہا ہی نہیں ـــ پورا ایک گھنٹہ ہو گیا ہے، تمہیں یہ خط سُنانا چاہتا تھا کہ بیچ میں تم نے اپنی بکواس شروع کر دی۔ اُس نے بہت سی (ماتھو پکھا کر) جو تم کو سُنانا ضروری تھیں، پر تمہارے اپنے ہی ریکارڈ ختم نہیں ہوتے۔ ایک بجا چکتی ہو تو دوسرا سوئی کے نیچے رکھ دیتی ہو ـــ کوئی کسی حال میں ہو تمہاری بلا سے۔ یہاں جب وہ اچھی حالت میں تھا تو اُس سے تحفے تحائف تم جھٹ سے وصول کر لیتی تھیں۔ پہلی عینک تم نے توڑی تو اُس بے چارے نے اپنی گرہ سے تمہیں ایک نئی لا کر دی؛ یہ تم اپنی کسی سہیلی کو بخش آئیں تو اُس نے دوسری تمہیں مُفت لا کر دی۔ وہ بیچارہ پچھلے دنوں بیکار پھر رہا تھا سخت مُصیبت میں تھا اور تم سُنتی ہی نہیں ہو کہ اُس نے اپنے خط میں کیا لکھا ہے۔

لاجونتی:۔ مَیں تو بالکل احسان فراموش نہیں، وہ آپ کے دوست ہی ہیں جو کسی کا احسان نہیں مانتے۔ مجھے انہوں نے دو مرتبہ عینک لا کر دی، تو کیا میں نے چار دفعہ اُن کا گرم کوٹ رفو نہیں کر دیا تھا؟ ـــ پچھلے برس اُن کا نوکر ہماری نئی استری مانگ کر لے گیا تھا پر میں نے آج تک اُس کا تقاضا نہیں کیا، اس لئے کہ مَیں اُن کی احسان مند تھی ـــ اگر وہ تکلیف میں ہیں تو دس بیس پچاس بھیج دیجئے، مجھ سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے ـــ پہلے آپ نے کبھی ایسے معاملوں میں میرا مشورہ لیا ہوتا تو آج اچھے بھی لگتے مجھ سے پوچھتے۔

کشور:۔ لاجونتی، تم پوری بات سُن کر اپنی کتھا شروع کیا کرو۔ اُس نے کب ہم سے روپے مانگے ہیں، وہ آج تک ہمارے ایک پیسے کا بھی روادار نہیں رہا ـــ خط میں اس نے صرف یہ لکھا ہے ....

لاجونتی:۔ ٹھہریئے میں گھڑی میں کوک بھر دوں۔ بارہ بج رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤں اور صبح الارم ہی نہ بجے۔ (گھڑی میں کوک بھرنے کی آواز)

کشور:۔ (جھلا کر) مَیں دیواروں سے اپنا سر ٹکرا کر مر جاؤں گا لاجونتی۔

لاجونتی:۔ ہے ہے، یہ کیا دیوانگی ہے۔

کشور:۔ یہ پینتیسویں مرتبہ تم نے میرا گلا گھونٹا ہے۔ مَیں بات کرنے لگتا ہوں اور تم ٹوک کر کوئی اور ہی قصہ چھیڑ دیتی ہو ـــ آخر مَیں انسان ہوں ـــ اپنے اندر سے ایک بات باہر نکالنے کے لئے دو گھنٹے سے تڑپ رہا ہوں اور تمہیں ترس ہی نہیں آتا ـــ میرا تماشا دیکھنا چاہتی ہو تو ایک ڈگڈگی لو اور مجھے نچانا شروع کر دو ـــ اگر میری بات تمہیں نہیں سُننا ہے تو ساڑھی کا پھندا بنا کر میرے گلے میں ڈال دو اور جھٹکا دے کر قصہ ہی پاک کر دو ـــ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری ـــ اور پھر اس عذاب سے بھی جان چھوٹ جائے گی ..... (وقفہ) ..... لو سُنو ..... پر ابکی دفعہ تم بیچ میں بولیں تو خودکشی کر لوں گا۔ سمجھیں۔

لاجونتی:۔ آپ ناحق بگڑ رہے ہیں۔

کشور:۔ ایک حق پر صرف تمہیں ہو، لو بس، اب اِس جھگڑے کو ختم کرو

اور سنو۔ صبح کی ڈاک سے نرائن کا خط آیا ہے......

(نرائن کھانستا ہوا داخل ہوتا ہے۔)

نرائن۔ اور اس ڈاک سے وہ خود آگیا ہے۔ آداب عرض بھابی جان!

لاجونتی۔ آپ... آپ... آپ کیسے آگئے؟

کشور۔ تم... تم... تم آگئے.... ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا، میں اسکو بتا رہا تھا کہ صبح کی ڈاک سے تمہارا خط آیا ہے جس میں......

نرائن۔ چھوڑ دیار اس خط کو، یہ بتاؤ تمہاری صحت کیسی رہی۔ منا اچھا ہے نا؟۔ اور بھابی جان آپ؟ آپ کیسی رہیں؟

لاجونتی۔ پرماتما کا شکر ہے۔

کشور۔ نرائن تم کو واپس بمبئی میں دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ سناؤ کام کیسا چل رہا ہے؟۔ تم نے اپنے خط میں لکھا تھا.....

نرائن۔ اماں چھوڑو اس خط کو.... یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے اندر کوئی چیز کم یا زیادہ تو نظر نہیں آتی؟۔ بھابی جان آپ بھی سوچ کر بتائیں؟

کشور۔ کوئی چیز کم یا زیادہ؟۔ میرا خیال ہے تم دُبلے ہو گئے ہو؟

نرائن۔ تمہاری آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں میرا وزن آٹھ پونڈ بڑھ گیا ہے۔

لاجونتی۔ آپنے اپنی مونچھیں ذرا ہلکی کرالی ہیں۔

نرائن۔ غلط.... آپ کی آنکھیں بھی کمزور ہیں۔

لاجونتی۔ آنکھیں تو بچپن ہی سے کمزور ہیں، دراصل میں اس وقت عینک کے بغیر ہوں۔

نرائن۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو عینک اُتار دی، میری طرف دیکھئے، میں نے تو ہمیشہ کے لئے اُتار پھینکی ہے اور قسم کھالی ہے کہ آئندہ کبھی اس لعنتی چیز کو استعمال نہیں کروں گا۔ بھابی جان آپ کو معلوم نہیں کہ اس بظاہر بے ضرر شے نے میری زندگی پر کتنا بُرا اثر ڈالا ہے۔ آپ اور کشور۔ آپ اور کشور کیا دُنیا کا کوئی شخص بھی تسلیم نہیں کرے گا کہ دو شیشوں نے جو ایک فریم میں جڑے ہوتے ہیں مجھے تباہی اور بربادی کے کنارے پہونچا دیا۔ یہ تو پرماتما کی مہربانی تھی کہ میں بچ گیا ورنہ آج مجھے آپ سے یہ باتیں کرنے کا موقع کبھی نہ ملتا.... تو میں نے عینک ہمیشہ کے لئے اُتار پھینکی ہے، یہی تبدیلی تھی جس کا ذکر میں آپ سے کر رہا تھا اور جو آپ میں سے کوئی بھی بھانپ نہ سکا۔

کشور۔ لاجونتی، نرائن نے اپنے خط میں ہ....

نرائن۔ تم بیچ میں خط کا ذکر کیا لے بیٹھے ہو۔ میں تمہیں اپنی زندگی کی ایک نہایت ہی انوکھی داستان سنا رہا ہوں۔ کیوں بھابی جان، یہ بات انوکھی نہیں ہے کہ ایک عینک نے یعنی فریم میں جڑے ہوئے دو شیشوں نے مجھے قریب قریب تباہ کر دیا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں بچ گیا ورنہ آج نہ جانے کیا ہوتا کیا نہ ہوتا۔ بھابی جان میں تو اُس انجام کے تصوّر ہی سے کانپ کانپ اُٹھتا ہوں جو مجھے اس عینک کی بدولت دیکھنا پڑا.....

کشور۔ لاجونتی، تم نے اس کا خط تو سُن لیا ہوتا۔

نرائن۔ (فوراً)... جب آپ مجھ سے اِس کی بُرائیاں سنیں گی تو نہ صرف آپ اس کو چھوڑ دیں گی بلکہ اس کا نام تک نہ لیں گی۔ یہ ایک خطرناک شے ہے، بم اور زہریلی گیس سے زیادہ خطرناک۔ صحت، عزّت اور دولت کیلئے یہ ایک جیسی نقصان دہ ہے۔

لاجونتی۔ کیا سچ مچ؟

نرائن۔ میں آپ کو ایک سچّا واقعہ سُناتا ہوں جس نے میرے کان کھڑے کئے اور میں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے دُشمن کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ پُونہ سے میں الہ آباد جا رہا تھا کہ گاڑی میں ایک آدمی سے میری مُلاقات ہوئی۔ یہ عینک کا سب سے بڑا شکار تھا۔ اُس نے مجھے اپنی آپ بیتی سُنائی، اپنا سارا دُکھڑا بیان کیا اور میں نے اُسی وقت اپنے تمام دُکھوں کے باعث یعنی عینک کو جو میری ناک پر چڑھی ہوئی تھی اُتار کر گاڑی کے باہر پھینک دیا۔ بھابی جان جس وقت میں نے ایسا کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے سارے دلدّر دُور ہو گئے ہیں۔

لاجونتی۔ گاڑی میں اُس مُسافر سے آپ کی کیا باتیں ہوئیں؟

نرائن۔ باتیں تو بہت ہوئیں پر میں آپ کو اُن کا خُلاصہ سُناؤں گا۔ وہ آدمی ایک بڑے رئیس کا لڑکا تھا۔ اتفاق سے اُس کی محبّت ایک لڑکی سے ہو گئی۔ اِس لڑکی کو اُس نے ایک روز اپنے مکان سے بازار کی آخری بلڈنگ کی چھت پر بال سُکھاتے دیکھا اور فوراً ہی اُس کے تیرِ نظر کا گھائل ہو گیا۔ دو تین مہینے تک اُس نے اپنی محبت کا راز کسی کو نہ بتایا۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ اُس حسینہ کا ایک بار پھر دیدار ہو سکے مگر ناکام رہا۔ اُس کی نگاہیں ہر روز کئی کئی گھنٹے اُس طرف جمی رہتی تھیں جہاں وہ ایک مرتبہ نظر آئی تھی مگر وہ ایک بار جلوہ دکھا کر ایسی غائب ہوئی کہ پھر اُس کا سایہ تک نظر نہ آیا۔

لاجونتی۔ پر اس سے عینک کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

نرائن۔ آپ سُنتی جائیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ رئیس زادے نے اُس لڑکی کو صرف ایک بار دیکھا اور ایک بار اور دیکھنے کی ہوس اُس کے دل میں تھی۔ چھ مہینے تک وہ اِسی خواہش کو اپنے سینے میں دبا رہا، آخر کار ایک روز اُس نے اپنے دوست سے رازِ دل کہہ دیا۔ اُسنے

جب یہ کہا: "اماں یہ کون سی مشکل بات ہے، کہو تو میں تمہارا اس سے رشتہ کرا دوں۔" تو رئیس زادے کی باچھیں کھل گئیں۔ نیکی اور پوچھ پوچھ، چنانچہ فوراً ہی سلسلہ جنبانی شروع ہوئی اور شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

لاجونتی:۔ یعنی اُن دونوں کی شادی قرار پا گئی۔

نرائن:۔ جی ہاں۔

کشور:۔ ارے بھئی تم نے یہ خط تو پڑھ لیا ہوتا۔

لاجونتی:۔ پڑھ لوں گی، ہاں تو نرائن صاحب پھر کیا ہوا؟

نرائن:۔ اُن دونوں کی شادی ہو گئی — لڑکا خوش تھا کہ اُس کے دل کی مُراد بر آئی اور لڑکی کے ماں باپ خوش تھے کہ اُن کی بچی کو ایسا اچھا بر مل گیا۔ رئیس زادے نے شادی پر خوب جی کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ ہزاروں روپے کے زیورات اُس نے اپنی محبوبہ کے لئے خریدے مگر شادی کے دوسرے روز.....

لاجونتی:۔ دوسرے روز؟

نرائن:۔ شادی کے دوسرے روز جب وہ اپنے دوستوں سے ملا اور اُنہوں نے اُس کو مبارک باد دی تو اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ پندرہ روز تک متواتر اُس کی آنکھیں آنسو بہاتی رہیں اور اُس نے اپنا راز صرف اِن آنسوؤں کو بتایا اور کسی پر ظاہر نہ کیا مگر مجبور ہو کر آخر اُسے اپنا دُکھ بیان کرنا ہی پڑا — وہ لڑکی جسے وہ حسین سمجھتا تھا کانی تھی اور اُس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ لہجہ نہایت کرخت اور طبیعت بیحد چڑچڑی تھی۔

لاجونتی:۔ طبیعت اور لہجہ تو خیر معلوم نہیں ہو سکتا، لیکن اُس کی بدصورتی تو وہ پہلے روز ہی دیکھ سکتا تھا۔

نرائن:۔ اُس کی آنکھیں کمزور تھیں اور اس پر جو عینک اُس نے لگا رکھی تھی اُسکے شیشے چکنے ہو رہے تھے۔

(کشور زور زور سے ہنستا ہے)

نرائن:۔ تم ہنستے ہو، شاید اُس کی بے وقوفی پر مگر سارا قصور عینک کا تھا، جو بہت پُرانی تھی۔ اُس کی بینائی چونکہ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی اس لئے اِس عینک کے شیشے کام نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ بھابی جان اُس کی زندگی ہمیشہ کیلئے تلخ ہو گئی۔ اُس کا گھر بار اُجڑ گیا، مقدمے بازی ہوئی اور ہزاروں روپے وکیلوں کی نذر ہوئے اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ اِس عینک کی بدولت پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا۔

کشور:۔ تم نے اپنے خط میں.....

نرائن:۔ اُس بات کا ذکر میں اُس میں نہ کر سکا.... تو دیکھا آپ نے بھابی جان کس طرح ایک عینک نے ایک بہت بڑے رئیس کے لڑکے کو تباہ و برباد کیا.... اب میری داستان سُنیئے۔

کشور:۔ تمہاری؟

نرائن:۔ ہاں میری — جب میں نے اُس دُکھی آدمی سے اُس کی بپتا سُنی تو مجھے اپنی عینک کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ میری مُصیبتوں کی جڑ بھی یہی چیز ہے۔ مجھے گوپال داس آپٹیشنز (Opticians) نے اِس قصور پر ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا کہ میں نے ڈپٹی کمشنر کی میم صاحب کی عینک میں غلط نمبر کے شیشے جڑ دیے تھے، جس کے باعث اُس کا سر پندرہ روز تک چکرا تا رہا تھا۔ آپ کو شاید اِس واقعہ کا علم ہو گا۔

لاجونتی:۔ جی نہیں، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے کبھی اس کا ذکر کیا ہو۔

کشور:۔ لاجونتی، یہ سب.....

نرائن:۔ داستان کشور کو معلوم ہے..... بھابی جان دس سال میں پہلی بار مجھ سے یہ غلطی ہوئی اور مجھے اس کا اعتراف تھا، مگر میں اس غلطی کا سبب معلوم نہیں کر سکا تھا۔ مجھے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا اور میں بے روزگار ہو گیا۔ پانچ مہینے دربدر پھرنے کے بعد چلتی گاڑی میں جب میں نے اُس آدمی کی داستان سُنی تو میری آنکھیں کھلیں۔ فوراً ہی چشمہ اُتار کر میں نے غور سے دیکھا تو اُس کے شیشے اپنی جگہ پر سے ہلے ہوئے نظر آئے۔ اگر یہ اپنی جگہ پر ہوتے تو ڈپٹی کمشنر کی میم صاحب کی عینک میں غلط نمبر کے شیشے میں کبھی نہ لگاتا۔

لاجونتی:۔ آپکو عینک نے واقعی بہت نقصان پہنچایا۔

نرائن:۔ جی ہاں — نمبر دیکھنے میں مجھے بڑی مہارت حاصل تھی پر جب میری اپنی عینک کے شیشے مقررہ جگہ سے ہٹے ہوئے تھے تو غلطی کیسے نہ ہوتی.... چنانچہ میں نے بھی اپنی تباہی کی داستان عینک کے سب سے بڑے شکاری کو سُنائی۔ اُس نے مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور کہا: "جب مجھے معلوم ہوا کہ میری بربادی میں عینک کا ہاتھ تھا تو میں نے فوراً اُسے اُتار کر توڑ دیا اور ایسی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں کی طرف نکل گیا جس سے آنکھوں کی بینائی بغیر عینک کے دُرست ہو سکے۔ چنانچہ پانچ برس بڑے بڑے خوفناک جنگلوں کی خاک چھاننے کے بعد مجھے ایک سادھو بابا کی مدد سے ایسی بوٹی مل گئی جس کا سُرمہ آنکھوں کی تمام کمزوریاں رفع کر سکتا ہے۔ اس سُرمے کی ایک ہی سلائی لگانے سے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ جِتا، پھولا، موتیا بند سب مرض اس کے استعمال سے دُور ہو جاتے ہیں۔" — اِس سُرمے کا نسخہ اُس نے کمال مہربانی سے مجھے بتا دیا اور

کہا کہ میں اسے بناؤں اور لوگوں میں تقسیم کروں تاکہ سب کا بھلا ہو۔ لاگت سے ایک پیسہ زیادہ لینا میرے لئے حرام ہے۔۔۔ چنانچہ صاحبان ۔۔۔ اس سُرمہ کی چھوٹی شیشی کی قیمت صرف آٹھ آنے ہے، بڑی شیشی کی قیمت صرف ایک روپیہ، نمونے کی ایک سلائی مفت مل سکتی ہے ۔۔۔ نفع لینا مجھ پر حرام ہے (شیشیوں کی آواز) چھوٹی شیشی کی قیمت آٹھ آنے، بڑی ایک روپے میں نمونے کی سلائی مفت۔ نفع لینا مجھ پر حرام ہے۔

لاجونتی:۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ۔۔۔ کہاں عینک کی داستان اور کہاں یہ سُرمے کی شیشیاں۔

کشور:۔ (ہنستا ہے) لاجونتی، جو خط اس نے پُونہ سے بھیجا ہے اُس میں۔۔۔۔

نرائن:۔ یہ سُرمہ بہت لاجواب ہے، ہزاروں اندھے اس کے لگانے سے دیکھنے لگے ہیں ۔۔۔ یہ لیجئے دو شیشیاں، ان کی قیمت صرف ایک روپیہ، یعنی لاگت کے دام۔

لاجونتی:۔ یہ آپ نے کیا کہنا شروع کر دیا۔۔۔۔ میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا ۔۔۔!

نرائن:۔ (ہنستا ہے) وہ کیوں؟ ۔۔۔ کیا آپ کو کشور نے میرا خط پڑھ کے نہیں سُنایا جو میں نے پُونہ سے بھیجا تھا۔ میں اُس میں سب کچھ لکھ چکا ہوں۔

کشور:۔ میں پون گھنٹے سے اسے تمہارا یہی خط سُنانے کی کوشش کر رہا تھا، پر اس نے سُنا ہی نہیں۔ میں ابھی ابھی اس سے کہہ رہا تھا کہ پُونہ سے نرائن کا خط آیا ہے جس میں اُس نے۔۔۔۔

نرائن:۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں ۔۔۔ بھابی جان اب میں نے سُرمہ بیچنا شروع کر دیا ہے۔ کیا کرتا اور کوئی کام بھی تو نہیں ملتا تھا۔ اور یہ داستان جو ابھی آپ نے سُنی ہے بڑی محنت سے میں نے سودا بیچنے کے لئے بنائی ہے۔۔۔ کیوں بھئی کشور، بتاؤ کیسی رہی؟

کشور:۔ (غصّے میں) تم اور تمہاری داستان جائے بھاڑ میں۔۔۔۔ مجھے کھلونا سمجھ لیا گیا ہے، پہلے مجھ سے یہ چوہے بلّی کا کھیل کھیلتی رہی، اور تم نے بھی آتے ہی یہی کھیل شروع کر دیا۔۔۔۔ مجھے۔۔۔۔ مجھے بیوقوف سمجھ لیا گیا ہے۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں جاتا ہوں۔۔۔۔

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

نرائن:۔ ارے بھئی کہاں چلے؟

کشور:۔ (آواز دُور سے آتی ہے) وہاں چلا ہوں جہاں تم جیسے بدتمیز انسان نہ ہوں، جہاں میں تمہارا خط اطمینان سے پڑھ کر سُنا سکوں۔

سعادت حسن منٹو

نئے سال کا نیا تحفہ

نفیس مزاج پڑھنے والوں کے لئے "ریزۂ مینا" سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ "ریزۂ مینا" میں پچاس مشہور انشا پردازوں کے بے مثل افسانے شامل ہیں۔ اعلیٰ درجے کی کتابت و طباعت۔ عمدہ سفید کاغذ۔ مضبوط اور خوشنما کپڑے کی جلد۔ سُنہری ٹھپّہ۔ (۶۰۰) صفحے کی یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب پہلی مرتبہ اتنی کم قیمت پر مستقل خریدارانِ ساقی کو دی جا رہی ہے یعنی صرف دو روپے میں۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار ہو گا۔ خریدار حضرات کو ساقی کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ جو حضرات خریدار نہیں ہیں اُن کے لئے "ریزۂ مینا" کی قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

افسونی

پَو پھٹے وُہ میرے مکان کے سامنے گلی سے دردناک سُروں میں ایک گیت گاتا ہؤا گزرتا، ڈھیلے ڈھالے قدم۔ مست مست تانیں، جیسے بہت تھکا ماندہ ہے، اور جیسے ابھی دیوار کے سہارے بیٹھ کر سستانے لگے گا۔ میرے مکان کی کھڑکی گلی میں کھُلتی تھی، مجھے ایک سایہ سا گلی پر رینگتا دِکھائی دیتا اور گلی کے آخری سِرے پر ایک ننھّی سی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس جاکر گُم ہوجاتا، اس پُراسرار شخص کے گلی میں قدم رکھتے ہی سارے محلّے پر سحر سا چھا جاتا اور میری آنکھ بھی ٹھیک اُس وقت کھُلتی جب گلی کے موڑ پر اُسکی دُکھی دُکھی صدا بلند ہوتی:۔

مَیں کُھل کے لائی

او یار

مَیں تاں کُھل کے لائی[1]

اسکے بعد میں ہزار کوشش کرتا مجھے نیند نہ آتی، صبح کی روشنی پھیل جاتی اور وہ دوسرے نمازیوں میں مل کر کہیں چلا جاتا!

کچھ دنوں کے بعد ہمارے محلّے میں اس عجیب وغریب شخص کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں، مجھے ایک بار ایک ایسے مجمع میں جانے کا اتفاق ہؤا جس میں اِسی شخص کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔

ایک بوڑھا بزرگ جس کا سر کانپ رہا تھا اور ننھّی آنکھوں میں سُرمے کی موٹی دھاری اُبھری ہوئی تھی۔ بولا "بھئی آجکل بندوق پستول کا زمانہ ہے، ڈاکو اب کھُلے بندوں گھروں میں نہیں آدھمکتے، فقیروں کا بھیس بدلکر آتے ہیں اور کوئی تر نوالہ انتخاب کرکے اُسے نگل کر چلدیتے ہیں، یہ کمبخت مجھے بہت بڑا ڈاکو معلوم ہو رہا ہے"

ایک بُڑھیا جو مسوڑھوں سے بھُنے ہوتے چنے چبا رہی تھی بولی "موا صبح صبح بھانڈوں کی طرح گا کر نیند حرام کر ڈالتا ہے۔ خدا خُدا کرکے پڑوس میں جا نو کمہار کا گدھا مرا، اب دماغ چاٹنے کو یہ نئی بلا آن دھمکی"

پرلی طرف سے سیاہ رنگ کا ایک پیرِ صد سالہ اپنے عصا کو ٹٹولتے ہوئے بولا "میں اُس کی کھوپڑی پھوڑ ڈالونگا"

میں نے آگے بڑھکر کہا "وہ کوئی بہت دُکھیارا شخص ہے جی۔ پانچ وقت اللہ کے حضور میں سجدے کرتا ہے، تمہیں اُس نے آج تک کیا تکلیف پہونچائی کہ اُس کا سر پھوڑنے پر تُلے بیٹھے ہو، وہ ہم جیسے سینکڑوں بے نمازوں سے اچھا ہے، اِس کڑاکے کے جاڑے میں مُنہ اندھیرے اُٹھکر نماز کیلئے ذرا مُنہ ہاتھ دھوؤ تو سارا معمّہ تم پر کھُل جائے۔ مجھے تو یہ شخص کوئی بہت بڑا بزرگ معلوم ہوتا ہے"

"نہیں نہیں، پیغمبر کہو، پیغمبر، بیعت کرلو اُس کے ہاتھ پر" ایک اَدھیڑ عمر شخص اپنی ناک میں چھنگلیا ڈالتے ہوئے بولا "پیر جمن شاہ فرما رہے تھے، یہ جاسوس ہے انگریزوں کا۔ کل کلاں پولیس کو لے آئیگا اور یہیں ہمارے محلّے میں پکڑ دھکڑ شروع ہوجائیگی"

ایک شخص مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا "سُنا ہے تم فرنگی کے خلاف نظمیں کہا کرتے ہو، ہُشیار رہنا۔ تمہارا یہ دُکھیارا فقیر کہیں خفیہ پولیس کا انسپکٹر بن کر تمہیں دبوچ نہ لے"

میں نے دلی اطمینان سے جواب دیا "اللہ اللہ کرو بابا چنبیلی کی ڈالی میں تھوہر کے کانٹے نہیں ہوتے"

بُڑھیا بولی "نظمیں بنانے والے پاگل ہوتے ہیں۔ کل نورا بھانڈ کہہ رہا تھا میرے لئے دھرتی کا ہر گل بوٹا خُدا ہے، موا اپنی آخرت خراب کررہا ہے۔ اور مجھے تو یہ فقیر ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میری پوتی کہتی ہے اِس سے کوئی تعویذ لکھوانا چاہیئے۔ پگلی اس کے آنے سے گھنٹہ بھر پہلے کھڑکی سے سر نکالے ٹھٹھرتی رہتی ہے۔ کہتی ہے صبح صبح اللہ کے نیک بندوں کا دیدار کرنا چاہیئے، پگلی!"

"نادان۔ بھولی" ایک بوڑھا جس کی چندیا میں سورج کا عکس پڑ رہا تھا بولا "چودہ پندرہ سال کی عُمر میں اِن لڑکیوں کے دماغ ٹھکانے نہیں رہتے"

اُس رات مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ کبھی کبھی آنکھ لگ جاتی لیکن اچانک میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا۔ جیسے سوتے میں میرا کسی نے گلا گھونٹ دیا ہے، کھڑکی کھول کر باہر جھانکتا۔ کالی رات، تنگ گلیوں میں سنسنا رہی ہوتی اور دُور کسی گھر سے کسی ننھّے بچّے کے رونے کی آواز آجاتی!

[1] میں نے بھُولے سے محبت کی، اے میرے محبوب، میں نے تجھ سے بھُولے سے محبت کی۔

کتنی بوقلموں دُنیا ہے! میں سوچتا رہا! یہ ننھا نیند میں رو رہا ہے اُس کی ماں اپنی نیند حرام کئے اُسے تھپک رہی ہوگی۔ بڑا ہو کر یہ ننھا نہ جانے کس قسم کا انسان بنے گا۔ ہو سکتا ہے بدچلن ہو، بازاری کوٹھوں پر لڑکیوں کو تاکتا پھرے، چور بن جائے، افیونی ہو جائے، ماں کی ممتا اُسے اِس حالت میں دیکھ کر کتنی بے چین ہوگی، قدرت اگر کوئی ایسی حکمت کرتی کہ بھٹکے ہوئے نوجوانوں کے سامنے اُن کے بچپن کے واقعات ایک فلم کی طرح تیرتے رہتے، تو یہ ڈگمگاتے ہوئے سفینے شاید سنبھل جاتے!

پو پھٹی اور گلی کے پرلے موڑ پر اُسی پُراسرار شخص کے گانے کی آواز آئی:۔

میں بُھل کے لائی
او یار
میں تاں بُھل کے لائی!
مَیں تینوں ایویں سمجھا جیویں حرف قرآناں دا
تَیں مینوں ایویں سٹیا جیویں چھلڑ کماداں دا
میں بُھل کے لائی
او یار
میں تاں بُھل کے لائی! لہ

میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں اپنا چہرہ پیوست کر دیا۔ جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اُسے بلانا چاہا۔ مگر دُھندلائے ہوئے نظارے اور اِس پُراسرار سائے نے مجھ پر ہیبت طاری کر دی، جب وہ کچھ آگے نکل گیا، تو میں نے بصد مشکل دبی دبی آواز میں کہا: "او بھائی بات سُننا ذرا۔"

وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ گیت اچانک رُک گیا۔ اور مجھے آواز کی مُڑتی ہوئی لکیریں دُور خشک فضا میں اُوپر اُٹھتی ہوئی معلوم ہوئیں!
"کیا مجھے کسی نے پکارا ہے؟" اُس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔
"ہاں بھئی بات سُننا" میں نے لجاجت سے کہا۔
وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ کر بولا "کون ہیں آپ؟ مجھ سے کیا کام ہے آپ کو؟"
"میں آپ سے جی کھول کر باتیں کرنا چاہتا ہوں" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے آپ سے بے حد دلچسپی ہے اور مَیں آج رات صرف آپ کے انتظار میں نیند حرام کئے بیٹھا ہوں۔"
"لیکن مجھے نماز قضا ہو جانے کا خدشہ ہے" اُس نے کمبل کا ایک پلّو جھٹک کر کاندھے پر ڈالا اور مسجد کی طرف چلدیا۔
مَیں بُھل کے لائی....

میں نے تیزی سے کمبل اوڑھا اور باہر نکل کر اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ میری پڑوسن بُڑھیا کے مکان کی ایک کھڑکی کھُلی ہوئی تھی کہ میرے گزرنے پر کھڑاک سے بند کر دی گئی۔ مؤذن مینار پر چڑھ کر سُریلی اور باوقار آواز میں پکارا۔

اللہ اکبر
اللہ اکبر
اللہ اکبر
اللہ اکبر

مَیں اپنے آپ کو کائنات کا ایک حقیر ذرہ تصوّر کرنے لگا۔ ساری کائنات پر مجھے ایک عظیم الشان قوّت کا تسلّط محسوس ہونے لگا اور جب میں مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھا تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میرے لئے جنّت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں! بہت مدّت کے بعد میں نے نماز ادا کی۔ میں جان بوجھ کر اُس شخص کے ساتھ کھڑا رہا۔ اور جب وہ دُعا سے فارغ ہو کر جانے لگا تو مَیں بھی اُس کے عقب میں ہو لیا۔ وُہ چند تنگ گلیوں کے چکّر کاٹتا ایک نہایت اندھیری گلی میں پہونچا۔ جسکے آس پاس مکانوں کی دیواریں امتدادِ زمانہ نے سیاہ کر ڈالی تھیں اور جس کے فرش پر محلّے بھر کا کوڑا جمع تھا۔ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ سیاہ کمبل میں اُس کی آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصّہ سامنے تھا۔ آنکھوں کے اِرد گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور زرد ناک کی ہڈی یوں اُبھری ہوئی تھی جیسے کوئی مدّت کا بیمار ہو۔ بولا "آپ شاید میرا تعاقب کر رہے ہیں؟"
"جی ہاں۔ مَیں آپ سے مفصّل گفتگو کرنا چاہتا ہوں، مجھے آپ سے بہت سی باتیں پوچھنا ہیں۔"
وُہ دو قدم چلکر میرے قریب آ گیا اور میرے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "مرتے ہوئے بادشاہ اور دم توڑتی ہوئی رقّاصہ سے اُس کی شان و شوکت اور عالمِ شباب کے تذکرے سُننے کا مطلب

لہ میں نے بھولے سے محبت کی۔ اے میرے محبوب۔ میں نے تجھ سے بھولے سے محبت کی!
مَیں نے تجھے مقدس قرآن کا ایک حرف سمجھا! تُو نے مجھے اس طرح پھینک دیا جس طرح گنّے کا چُوسا ہوا چھلکا!
مَیں نے بھولے سے محبت کی۔ اے میرے محبوب۔ میں نے تجھ سے بھولے سے محبت کی!

یہ ہے کہ اس کا انجام اور قریب کھسک آئے، مجھے نہ چھیڑیئے، مَیں آپ ایسے بھائیوں کا راندہ ہوا مایوس سا انسان ہوں، آدم کے کسی فرزند پر مجھے یقین نہیں رہا۔ مجھے خود اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔ آپنے تکلیف فرمائی ہے، میں ابی لمبی باتیں کرنے کے قابل نہیں رہا۔ اور نہ میرے ہاں کوئی بات اتنی وقعت رکھتی ہے کہ میں اُس کے لئے اپنے لب ہلاؤں، زندگی میرے لئے ایک بازی گاہ ہے، اور اس میں بسنے والے سب کے سب فریبی اور مکار ہیں۔ ظاہر کے صاف اور باطن کے غلیظ اور متعفن۔ مرد ـــ مطلب پرست اور عیار عورتیں ـــ عصمت فروش اور بدچلن لونڈیاں جن کا مقصدِ زندگی وحشی مَردوں سے چُومے چاٹے جانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں آجکل اندھیرے میں پھر رہا ہوں، چمگادڑ سے آپ سورج کا تذکرہ چھیڑتے ہیں! اللہ اکبر!"

وہ پلٹ کر آگے چلدیا اور میں اُس کی بے نیازی سے مرعوب ہوکر واپس لوٹ آیا۔ لیکن گھر آکر یہ خلش میرے دل میں شُعلہ بنکر بھڑکی اور میرا سارا وجود جذبات کی شدّت سے دہکنے لگا!

اُسی روز شام کے وقت مجھے بوڑھوں اور بُڑھیوں کی اُسی محلّہ بر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ آج وہ کسی موضوع پر بیحد گرمجوشی سے گفتگو کر رہے تھے۔ ہر دُھندلی آنکھ میں چمک تھی اور ہر جُھرّیاں پڑے لب پہ مُسکراہٹ، میرے جاتے ہی سب باری باری پکار اُٹھے "دیکھے اپنے فقیر سائیں کے کرتوت؟ سُنا کچھ؟؟"

میں مبہوت سا ہوگیا۔ بے نور سی آنکھوں سے نکلتی ہوئی کمزور مگر تیز نظروں نے مجھے گھیر لیا "کچھ سُنا؟" کرخت قہقہوں اور خشک کھانسی کی ٹھوں ٹھوں کا ایک طوفان اُٹھا اور میرے حواس پر چھا گیا۔

"آخر کیا ـــ کیا بات ہوئی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا "کیا کیا اُس نے؟"

میری گھبراہٹ دیکھکر میری پڑوسن بُڑھیا کو ہنسی چھوٹ گئی اور یک بیک اِس ہنسی نے چھینکوں کی شکل اختیار کرلی، لال پڑگئی دُہری ہوگئی اور آخرکار میری طرف ہاتھ پھیلا کر چھینک روکتے ہوئے بولی "فقیر سائیں کے چیلے، کچھ سُنا؟"

ایک بوڑھا بولا "آج شام تمہارے بزرگ شہر کے ایک اُجاڑ حصّے میں دس بارہ آدمیوں کے ساتھ چنڈو نوشی کرتے پکڑے گئے۔ تمہارے فقیر سائیں میلے چیکٹ تکیئے پر سر رکھے فرش پر لیٹے ہوئے تھے، اور افیموں کے عرق کے کش لگا کر تقریبًا بے ہوش ہو رہے تھے کہ پولیس نے جالیا۔ اب حوالات میں بیٹھے اُونگھ رہے ہیں۔ نماز وغیرہ کا نشہ ہرن ہوگیا ہے، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔"

میں نے جیسے چاند کو غلیظ جوہڑ کے متعفن کیچڑ میں پھنسے دیکھ لیا ہو، سکتے کی حالت میں گھر لوٹ آیا۔ اور کمرے میں آکر بہت دیر تک گھٹنوں میں سر دبائے کچھ سوچتا رہا۔ فقیر سائیں کی پُراسرار شخصیت میرے سامنے عجیب و غریب رنگ اختیار کرکے گھُومنے لگی۔ کبھی ایک پاکیزہ نمازی بنکر نکلتا اور "میں کُھل کے لائی!" کی تقدس آمیز آواز بلند ہوتی۔ کبھی ایک اندھیرا کمرہ ذہن پر اُبھرتا۔ ایک ٹمٹماتا ہوا دِیا۔ کمرے میں افیون کی دھویں کی بدبو! کالی دیواریں۔ کالی چھت اور زمین پر بیٹھے ہوئے پانچ دس کمزور زرد چہروں والے آدمی جن کی جِلد کے نیچے اُن کی بوڑھی ہڈیاں جھلک رہی تھیں ـــ چنڈو کے دو چار کشوں کے منتظر! ـــ اور وہ فقیر سائیں کا دو چار کش لگا کر بے جان ہوکر ایک طرف کو لڑھک جانا ـــ اور پھر وہ مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا سایہ! ـــ میرا سر چکرانے لگا!

علی الصباح جاگ کر خُدا کے حضور میں سجدے کرنے والا اور رات کو ایسے مردود نشے میں کھو جانے والا یہ انسان میرے ذہن پر ایک خوفناک تصوّر بن کر منڈلانے لگا۔ دوسرے روز میں فقیر سائیں کو امداد بہم پہونچانے کے طریقے سوچ رہا تھا کہ اچانک میری بیٹھک کی کھڑکی کے سامنے ایک یکہ آکر رُکا۔ ایک بُرقعہ پوش خاتون اور ایک دھیڑ عمر کا بھلے مانس اُترے۔ بزرگ کھڑکی کے قریب آگیا اور میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے اور نہیں کہہ سکتا۔

میں نے آگے بڑھکر پوچھا "فرمائیے۔ فرمائیے"

بزرگ بولا "یہاں سے ہر صبح ایک نوجوان گزرا کرتا تھا۔ بیچارہ کل رات چنڈو نوشوں کی محفل میں بیٹھا گرفتار ہوگیا۔ سُنا ہے آپ کو اُس سے دلچسپی ہے، اور پولیس افسروں کے ساتھ آپکے اچھے گہرے تعلّقات ہیں۔ اگر خدا کے نام پر آپ....."

میں نے بات کاٹ کر کہا "مَیں اُسی کے لئے ایک پولس افسر کے پاس جانے کیلئے تیار بیٹھا ہوں۔ مَیں اپنی بساط سے بڑھکر اُسے امداد دونگا۔ اور میں نے سُنا ہے آج عدالت میں اُسکی پیشی بھی ہے۔"

مَیں اُنہیں اندر لے آیا۔ خاتون ایک کونے میں کھاٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئی اور بزرگ میرے سامنے ایک کُرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "ہم آپکے بیحد ممنون ہیں"

"لیکن آپ کو اُس سے کیا دلچسپی ہے"

بزرگ کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "وہ ہمارا بیٹا ہے، ہمارے اور اُسکے درمیان اَن بَن کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک

ایسی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جس کا خیال آنے سے مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے، ہم نے اُس کے لئے ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی تلاش کی۔ اُس سے شادی کر لیتا تو آج شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتا۔ بدقسمت برابر انکار کرتا رہا۔ ہم بھی یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ اُسے اپنی چہیتی کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دیکر عمر بھر کے لئے اپنی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا لگالیں۔ ہم نے سختی اختیار کی تو وہ ایک شب گھر سے نکل بھاگا۔ اکلوتا بیٹا ہے، بستے گھر کو ویران دیکھکر ہم گھبرا گئے۔ اُس کی ماں بیچاری پردہ دار بُڑھیا بھی ماتما سے مجبور ہو کر میرے ہمراہ گھسٹتی پھرتی ہے۔ آج یہاں اُس کی خبر ملی مگر افسوس کہ وہ حوالات میں ہے اور شاید کل عدالت میں ......"

بُڑھیا رو دی۔ میرا جی بھی بھر آیا۔ میں نے پوچھا "لیکن وہ لڑکی کون ہے۔ کسی بہت نیچی ذات ..... "

بوڑھا کڑک کر بولا "عزیز۔ یہ ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے!"

مجھے اپنے سوال کا جواب تقریباً مل گیا تھا۔

مَیں اُنہیں عدالت میں لے آیا۔ پولس افسروں سے ملا۔ مجھے ہر طرح سے تسلّی دی گئی کہ اگر وہ اپنے جُرم کا اقبال نہ کرے تو اُسے صرف پندرہ بیس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑے گا ورنہ نو دس مہینے جیل میں پڑا سڑتا رہے گا۔

ہم تینوں کو پولیس والے حوالات کے قریب لے گئے، وہ کوٹھڑی کے پرلے سِرے پر دیوار کا سہارا لئے زمین پر لکیریں سی کھینچ رہا تھا۔ ہمیں دیکھکر اُٹھا اور حوالات کے دروازے تک آگیا۔ اپنے باپ کو دیکھکر اُس کے چہرے پر کسی قسم کا تغیر رونما نہ ہوا۔ صرف اتنا کہا "آپ کدھر آنکلے ابّا ۔۔ مُفت میں تکلیف فرمائی۔ اور امّی۔ تم کہاں؟"

دونوں دُکھیا رُوحیں بلک بلک کر رونے لگیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے پولیس کے سپاہی بھی مغموم سے ہو گئے۔ اُوپر آسمان پر کوئی بھولی بھٹکی بدلی دو چار بُوندیاں حوالات پر برسا تی آگے نکل گئی۔ میں نے آگے بڑھکر کہا "اگر آپ اپنے جُرم کا اقبال نہ کریں تو آپ کا چھٹکارا ہو سکتا ہے ورنہ ..... "

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا "مجھے چھٹکارے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جہاں پھینکدیا جائیگا پڑا رہوں گا۔ مجھے آزادی اور اسیری کے فوائد بتانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔"

سُبکی کے احساس سے میری گردن جُھک گئی۔ اور مَیں پیچھے ہٹ آیا۔ اُس کے پشیمان باپ اور دُکھیا ماں نے اُسے بہت کچھ سمجھایا مگر وہ ہر سوال کا یہی جواب دیتا رہا "آپ ناحق کیوں سر کھپا رہے ہیں۔ آپ مجھ سے کوئی اُمید نہ رکھیئے"

کچھ دیر کے بعد سپاہی اُسے عدالت کی طرف لے گئے۔ اُسے دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ وہ سر جُھکائے ثابت قدمی سے سپاہیوں کے آگے چلتا گیا۔ اُس کے باپ کے چہرے پر بھولی سی خوفناک بے رونقی چھا رہی تھی اور اُس کی ماں کا پاؤں بُرقعے میں بار بار اُلجھ جاتا تھا!

کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھر گیا۔ لوگ مُنہ کھولے اُس کا بیان سُننے لگے۔

"جناب۔ مَیں ایک مایوس انسان ہوں، نہ کسی کا ممنون ہوں نہ شاکی۔ احساس کی گراں بہا دولت میرے سینے میں مسل ڈالی گئی ہے۔ اچھے بُرے کی تمیز سے مَیں کچھ دُور ہو گیا ہوں۔ مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ میں واقعی اِس غلیظ لنشے سے اپنی رُوح کو تسکین پہونچاتے ہوئے پکڑا گیا۔ لیکن اگر مجھے اجازت ہو تو میں یہ بھی بیان کر دوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا!"

جج صاحب اُس کی جچی تُلی باتوں کو بیحد غور سے سُن رہے تھے قلم کو قلمدان میں رکھتے ہوئے بولے "ہاں۔ کہو"

"دراصل۔ جناب عالی۔ اس میں نہ میرا قصور ہے نہ اور کسی کا تقدیر کی بات کہ ایک نیچ ذات کی لڑکی نے مجھ سے ابدی رفاقت کا وعدہ لے لیا۔ مَیں اعتراف کرتا ہوں حضور کہ میں یہ وعدہ کرنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ اُس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں اور چال ڈھال بہت شاہانہ۔ آپ سب سمجھتے ہونگے کہ یہ ایک معمولی سی بات ہے، جوانی کی ہزار ہا لغزشوں میں سے ایک عام قسم کی لغزش ہے۔ دم بھر کے لئے، نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے ایک مرد ایک عورت کے قریب رہتا ہے۔ جب اس کے سفلی جذبات کی تشنگی بجھ جائے تو وہ اس سے پرے ہٹ آتا ہو۔ شاید یہ صحیح ہو لیکن میری رُوح کے عمق میں اُس نیچ ذات کی خوبصورت لڑکی کا پیکر ایک مشعل بن کر سما گیا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے اُس سے اِس قسم کا وعدہ کر لینا چاہیئے۔

لیکن بھلا ہو میرے والدین کا۔ اُنہیں میرے مستقبل کی فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے مَیں عیش وعشرت کی زندگی بسر کروں۔ گدگدے صوفوں پر بیٹھوں، مرغن کھانے کھاؤں، ہلکی پھلکی بے آواز کاروں پر اُڑتا پھروں۔ مفلسوں کے پیسے سے اپنی کھیتی کو شاداب کروں۔

اُنہوں نے ایک اور لڑکی انتخاب کی۔ کہتے ہیں وہ خوبصورت ہے۔ روز صبح اُٹھکر سنگار میز کے سامنے صرف کرتی ہے۔ ناخن پالش کرتی ہے۔ اور لپ اسٹک ہر وقت اُس کے سینے والی جیب میں محفوظ رہتی ہے۔ اسکے زرّیں بالوں میں لونڈر کی خوشبو ہے۔ اور اُس کی زبان پر انگریزی ناچ کے شعر ——— معلوم ہوتا ہے ہالی وڈ کی کسی حسینہ نے ساڑھی باندھ لی ہے۔ آپ منصف ہیں۔ آپ کو میرے ایسے کئی وارفتہ مزاجوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ میں نے یہ نعمت قبول نہ کی۔ والدین خفا ہوگئے۔ مجھے جوشِ غضب میں گھر سے باہر نکال بیٹھے اور اُس نیچ ذات کی لڑکی کو اُس کے والدین کے مشورے سے جانے کہاں چُھپا دیا۔ محروم ہو کر مَیں اِدھر نکل آیا۔ اپنے پیدا کرنے والے کا نام جپتا ہوں، اُس کے حضور میں ماتھا رگڑتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مَیں ایک بے فکر کبوتر ہوں اور فضا میں اُڑتے اُڑتے جب مَیں زمین پر اُترتا ہوں تو درختوں کے پُھول مجھ پر نچھاور ہونے لگتے ہیں۔ میرے قلب کو بہت تسکین پہونچتی ہے۔ لیکن اِن سرد راتوں کی اُداس تنہائی میں جب مجھے خیالات کے بُھوت ستاتے ہیں تو مَیں اِدھر نکل آتا ہوں اور اپنی زخمی روح کو افیون کے نشے تلے دبانا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اِس نعمت سے محروم کرنے کے لئے آپکا قانون آدھمکا۔ مجھے کسی قِسم کا عُذر نہیں، اگر میرے نزدیک زندگی کی کچھ بھی حقیقت ہوتی تو شاید مَیں جان بچانے کیلئے جُھوٹ کا سہارا لیتا۔ لیکن نہیں، مجھے اپنے جُرم کا اعتراف ہے“

اُسکے والدین وہیں دیوار سے لگے بیٹھے تھے، خاموش او ربیجان، صدیوں کے پُرانے بُتوں کی طرح! منصف کے لبوں میں حرکت آئی۔ بزرگ کی بھویں تک کانپنے لگیں۔ سفید بُرقعہ لرزتا ہوا معلوم ہوا۔ میرا دل بھی سیماب وار بیقرار تھا۔ ”ملزموں کو اپنے جُرم کا اقرار ہے اسلئے قانون ان کے لئے قید کی سزا تجویز کرتا ہے، ہر ایک ملزم کو........“

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے تیز متوحش قدم اپنے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔ مَیں اپنے بستر میں گھس کر اپنے ملتہب دماغ کو سکون پہونچانا چاہتا تھا۔ مَیں اپنے گھر کے قریب پہونچا تو میری پڑوسن بُڑھیا کے گھر کی ایک کھڑکی کُھلی۔ اُسکی بھولی بھالی شکل والی نوخیز پوتی ہراساں نظروں سے مجھے گھُورتے ہوئے بولی ”فقیر سائیں کا کیا بنا بھیا؟“

”وہ قید ہوگئے ہیں“

——— کچھ دیر کے بعد میں نے اپنی بیٹھک کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ میری پڑوسن بُڑھیا محلّے کے حکیم جی کو نہایت تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھگائے لئے جارہی ہے!

مسجد سے مؤذّن کی آواز آئی۔

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اللہ اکبر ———!

احمد ندیم قاسمی

ہندوستان کے سب سے بڑے مُترجّم مولانا عنایت اللہ دہلوی

کے دو قابلِ قدر ترجمے

سلامبو

شُہرۂ آفاق فرانسیسی انشاپرداز گستیو فلابیئر کا شہ پارہ، جس میں قرطاجنۂ قدیم کی مٹی ہوئی تہذیب اس طرح از سرِ نو الفاظ میں تعمیر کی گئی ہے کہ آج سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ سلامبو اور ماتو کی محبت کی کہانی اسقدر حسرتناک ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔ وحشیوں کی لڑائیوں کا بیان جب آپ پڑھینگے تو سانس بھی روک کر لیں گے۔ غرض شروع سے آخر تک یہ کتاب عجیب و غریب چیز ہے۔ ضخامت ...۵ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

نجم السّحر

پانچ ہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراجِ کمال پر تھی تو رب عمون کی بیٹی ملکہ ”نجم السحر“ نے سربفلک محلوں میں آنکھیں کھولیں پروان چڑھی، جوان ہوئی اور پھر اُسکی داستانِ عشق شروع ہوئی۔ جو حد درجہ المناک ہے۔ ساحرۂ آشتی کا جادو، ثوران کے مظالم، کیفر کی پُراسرار ہستی، آمعون نجم کی سحرآفرینی غرض اُس زمانے کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ اسکے دورانِ مطالعہ میں آپکو معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش فلم آپ چال کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ضخامت ..۴ صفحات۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی

لندن میں اُردو

مجھے انگلستان پہونچے مشکل سے چار مہینے ہوتے ہیں اور ابھی تک لندن جیسے بڑے شہر کو پوری طرح دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا اسلئے مَیں لندن میں اُردو کے متعلق بہت زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ تاہم خوش قسمتی سے مجھے جن جن صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے اُن کے ذکر سے اپنے ہموطنوں کو محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ جنگ کی وجہ سے میرا جہاز سوئیز کے راستے کی بجائے جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر آیا۔ اس راستہ بدلنے سے مجھے اور میرے عزیزوں کو جو تکلیف ہوئی اس کا نعم البدل یہ ملا کہ جنوبی افریقہ کے سب سے مشہور شہر کیپ ٹاؤن کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہاں مجھے سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھکر ہوئی کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہماری زبان اس علاقے میں بھی پہونچ گئی۔ جنوبی افریقہ میں ہرچند کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردانہ اور برابر کا سلوک نہیں ہوتا لیکن اِن مشکلات کے باوجود بہت سے ہندوستانی وہاں کے کاروبار میں نمایاں ہیں اور ان کی سب حلقوں میں نہایت عزّت کی جاتی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے آئے ہیں لیکن آپس میں اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ اور خوشی اس بات کی ہے کہ اِن کی اولاد افریقہ میں تربیت پانے کے باوجود ہندوستان کی زبان نہیں بھولی۔ جنوبی افریقہ کے علاوہ مجھے مغربی افریقہ میں فری ٹاؤن کی بندرگاہ پر اُترنے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہاں بھی بہت سے ہندوستانی تاجروں کے ساتھ اُردو زبان پہونچ گئی ہے۔

انگلستان پہونچنے کے بعد مجھے یقین تھا کہ چند روز تک غالباً مجھے اُردو زبان سُننے کا موقع نہیں ملے گا۔ کیونکہ لندن یونیورسٹی بند تھی اور میرے شاگرد چھٹیوں سے واپس نہیں آئے تھے۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ ۱۷ اکتوبر کو صبح سات بجے جب میری ٹرین لندن پہونچی اور میں اسٹیشن سے سیدھا ایک ہوٹل گیا تو ہوٹل کے ملاقات والے کمرے میں ایک بزرگ عبا پہنے تسبیح ہاتھ میں لئے ٹہلتے نظر آئے۔ صبح کی روشنی میں اور ذرا غور سے دیکھا تو اِن کے سر پر چھوٹی سی ترکی ٹوپی اور مُنہ پر ڈاڑھی بھی نظر آئی۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ہوٹل کے مُلازم ابھی سب سو رہے تھے۔ اور کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ اس لئے مجھے اور بھی شبہ ہوا۔ ابھی مَیں اِن بزرگ کی شخصیت کے متعلق فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ انہوں نے نہایت مدّھم آواز میں گڈ مارننگ کہا۔ اب میں زیادہ تاب نہیں لاسکا۔ بے صبری سے کہا کہ "قبلہ مَیں ہندوستانی ہوں، آپ بھی ہندوستانی ہیں۔ مجھ سے اُردو میں بات کیجئے"۔ پھر تو وُہ بزرگ بیحد خوش ہوتے۔ اب جو میں نے اور قریب بڑھکر مصافحہ کیا تو صورت آشنا نظر آئے۔ لیکن ذہن نے نام بتانے میں مدد نہ دی۔ آخر اُنہوں نے خود فرمایا کہ "میرا نام حسرت موہانی ہے"۔

اللہ اللہ ہندوستان کے لیڈر، اور اُردو کے مشہور شاعر حسرت موہانی تھے کہ جن سے میں باتیں کر رہا تھا۔ میری خوش قسمتی دیکھئے کہ لندن میں سب سے پہلے ملاقات بھی ہوئی تو اُردو کے اس جلیل القدر ادیب سے۔ خیر یہ تو ایک ضمناً واقعہ تھا۔ مَیں لندن سے سیدھا کیمبرج چلا آیا۔ کیونکہ لندن یونیورسٹی اُٹھکر اِن دنوں مستقل طور پر کیمبرج چلی آئی ہے۔ کیمبرج میں ہندوستانی طلبا کو دیکھا لیکن انگریزیت کے اثر میں۔ حد یہ ہے کہ ہمارا کالج بھی اگرچہ مشرق کے علوم کا گہوارہ ہے لیکن اُردو پڑھانے کے علاوہ کوئی اور اُردو کی صورت نظر نہ آئی۔ آخر میں نے چند ادب شناسوں کو ایک جگہ جمع کر کے یکم دسمبر سنہ۳۹ء کی شام کو ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں ہندوستانیوں کے علاوہ بہت سے انگریز بھی آئے تھے۔ یہ سب اُردو سمجھتے تھے اور بول بھی سکتے تھے۔ اس کی صدارت مسٹر اکرام اللہ آئی۔ سی۔ ایس نے کی۔ شروع میں مَیں نے جلسہ کے اغراض مقاصد بیان کئے اور پھر اُردو شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ بعد میں قرار پایا کہ کیمبرج میں اُردو زبان کی ترویج کے لئے ایک انجمن قائم کی جائے۔ چنانچہ اب تک اس انجمن کے دو جلسے ہو چکے ہیں۔ اور اب کرسمس کی چھٹیوں کے بعد پھر جلسے ہونے لگیں گے۔

کرسمس کے موقع پر مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سر عبدالقادر مدظلہٗ نے ایک ہندوستانی یونین کی بنیاد رکھی تھی۔ جسکے معرکۃ الآرا جلسوں کی یاد اب تک سب کے دل میں باقی ہے۔ اِسی یونین کے جلسوں میں حفیظ جالندھری کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ جن کی دھوم ہم تک ہندوستان میں بھی پہونچ چکی ہے۔ اب اِسی انجمن کے صدر آنریبل سر حسان سہروردی ہیں۔ سر حسان نے ہندوستانی یونین کے

ممبروں کو ۱۲ر دسمبر کو نہایت شاندار دعوت دی۔ اس دعوت میں بہت سی نظمیں اور غزلیں پڑھی گئیں۔ چونکہ یونین کے سکریٹری دیوان شرر صاحب ہندوستان چلے گئے ہیں اس لئے مجھے سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ہندوستانی یونین کا دوسرا جلسہ ۱۳ر دسمبر کی شام کو اورسیز لیگ کے ہال میں ہوا۔ یونین کی پُرزور ممبر بیگم اکرام اللہ صاحبہ ہندوستان تشریف لے جارہی تھیں، ان کے اعزاز میں پروفیسر ڈی۔ ورما نے دعوت دی۔ بیگم صاحبہ کا تعارف اس قدر کافی ہے کہ لندن یونیورسٹی میں اُردو ناول نگاروں پر محققانہ مقالہ لکھ رہی ہیں اور اُردو ادب کی مدّاح ہیں۔ ہندوستانی یونین کی تو بس انہیں جان سمجھنا چاہیئے۔
اِس موقع پر محسن میرزا صاحب دہلوی نے فی البدیہہ چند شعر بیگم اکرام اللہ کے متعلق سُنائے جو نقل کرتا ہوں:۔

اکرام کی بیگم ہیں جو یہ بول رہی ہیں
غنچہ کی طرح باغ میں مُنہ کھول رہی ہیں
ہم بولنے والوں میں یہ انمول رہی ہیں
آمادۂ پرواز ہیں پَر تول رہی ہیں
آراستہ کرنے کے لئے بزمِ سخن کو
بنگالہ کی مَینا ہیں جو جاتی ہیں چمن کو

اسی جلسہ میں سرحسان سہروردی نے حضرت اکبر کے چند غیرمطبوعہ اشعار بھی سُنائے جو اکبر الہ آبادی نے سرحسان کے متعلق کہے تھے۔ یونین کے ان دونوں جلسوں میں بہت سے ہندوستانی شریک ہوئے اور ان کے ساتھ متعدد انگریز مرد اور خواتین بھی آئیں جنہیں اردو سے دلی دلچسپی ہے اور اُردو سیکھ رہی ہیں۔ ہندوستانی یونین کا آئندہ جلسہ ۲۸ جنوری کو لندن میں ہونا قرار پایا ہے۔

ہندوستانی یونین کے علاوہ لندن میں ایک حلقۂ ادب بھی ہے۔ مجھے اس میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا لیکن سُنا ہے اُس کے جلسے بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔

لندن میں اُردو کا تذکرہ اُس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر گراہم بیلی کا ذکر نہ کروں۔ ہندوستان میں ڈاکٹر بیلی کو بہت سے لوگ اُردو زبان کی انگریزی میں تاریخ کے مصنّف کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن اِن سے ملنے کا بہت کم ہندوستانیوں کو اتفاق ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر بیلی اُردو اس قدر فصاحت اور روانی سے بولتے ہیں کہ اگر انہیں پردے کے پیچھے بٹھا دیا جائے تو کوئی تمیز نہیں کرسکتا کہ یہ انگریز ہیں۔ پھر ان کی زبان بیحد صحیح اور بامحاورہ ہے۔ تلفظ کی صحت کا بہت خیال ہے۔ اُردو کے علاوہ ڈاکٹر بیلی پنجابی بھی بہت عمدہ بولتے ہیں۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ یہ اُردو بہتر بولتے ہیں یا پنجابی۔

اِسی سلسلہ میں غالباً یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک روز سی۔پی کے سابق گورنر اور وزیراعظم ڈاکٹر رگھو وندرا راؤ جو آج کل لندن میں وزیرِ ہند کے مشیر ہیں مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ ان کے کمرے میں سب سے پہلے میری نظر اُردو کے قاعدے پر پڑی۔ میں نے تعجب سے پوچھا یہ کیا۔ جواب دیا اُردو کا شوق ہے آجکل پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا تو پھر بسم اللہ۔ چنانچہ بارہ روز کے اندر اب ڈاکٹر راؤ اُردو رسم الخط لکھنے اور پڑھنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ اور اگر یہ شوق اسی طرح قائم رہی تو چند روز میں کتابیں آسانی سے پڑھ سکیں گے۔ اب بھی یہ کہنا ظلم ہے کہ اُردو سیکھنا دشوار ہے۔

اِن چند سطروں سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سمندر پار کے ملکوں میں بھی اُردو کی دھوم ہے۔ اور اقبال نے یہ بالکل درست کہا ہے کہ ؎

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہاں ہی دل ہو جہاں ہمارا

آغا محمد اشرف۔ ایم۔ اے۔

دس طبقوں کی دہشتناک سیر۔ گناہگاروں کی لرزہ خیز سزائیں۔ نارِ جہنم میں موت کی لپٹی ہوئی تمثیل۔ دانتے کی آتش بیانی اور مولانا عنایت اللہ کی معنی آفرینی عجیب وغریب چیز ہے۔ قیمت صرف ۱۲ آنے محصول ڈاک مع رجسٹری ۴ر ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

مُصیبت اکیلی کبھی نہیں آتی

گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور میں نے گرمی کی چھٹیاں ہندوستان کے کافی گرم شہر لاہور میں اپنے بہترین دوست کے ساتھ گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ لاہور میں ہم دونوں نے ملکر خوب آم کھائے۔ کاٹنے والے، چوسنے والے، آئسکریم میں ملے ہوئے، قُلفیوں میں پڑے ہوئے، برف میں دبے ہوئے، نہر کے ٹھنڈے پانی میں رکھے ہوئے۔ غرضکہ آموں کو ہر ممکن طریقہ سے کھایا اور خوب مزے لیکر کھایا۔

آموں کو اِس طرح دن رات کھانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مَیں مہینہ ختم ہونے سے پیشتر ہی کنگال ہوگیا۔ حالت یہ تھی کہ الف لیلے کے چور کی طرح اگر میرے کوڑے بھی لگائے جاتے تو کوڑی نہ نکلتی۔ خدا خدا کرکے مہینہ ختم ہوا اور دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو میری تنخواہ کا چک میرے نام کا آگیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ میرا حساب کتاب لاہور کے کسی بینک سے نہ تھا اِس لئے میرے دوست نے چک کی رقم وصول کرنے کا ذمّہ لیا۔ اُن سے یہ چک اُن کے ایک اور دوست نے جو اِن معاملوں میں کافی تجربہ رکھتے تھے یہ کہکر لے لیا کہ "رقم میں وصول کر دونگا تم خواہ مخواہ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہو"۔ اِن صاحب کا اسمِ گرامی مسٹر رائے تھا۔ مجھے ابھی پیسوں کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ میرے دوست میرے ساتھ ہوتے اور مجھے خرچ کرنیکی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

یہ تو کہنا مَیں بھول ہی گیا کہ نئے مہینے کی پہلی تاریخ کو میرے دوست نے میرے مجبور کرنے پر مکان بدل لیا۔ ہمارا نیا مکان ابھی نیا نیا ہی بنا تھا۔ بلکہ ابھی بن ہی رہا تھا کہ ہم اس میں آدھمکے۔ پہلے مالک مکان کو نوٹس دے دیا تھا اس لئے پہلی تاریخ کو مکان خالی کرنا ضروری تھا۔

پہلی تاریخ کو ہفتہ کا دن تھا۔ چنانچہ ہفتہ کو ہی ہم نے مکان بدلا۔ ہفتہ کو میرے دوست نے اپنے دوست مسٹر رائے کو میری تنخواہ کا چک روپے لانے کو دیا اور ہفتہ کو ہی ہم دونوں ایک دن کے لئے جمّوں چلے گئے۔ ہم نے سوچا کہ سوموار کو واپس آجائیں گے۔ تب تک نوکر مکان میں سامان وغیرہ آراستہ کر رکھیں گے اور ہم آکر نئے مکان میں آرام سے ٹِک جائیں گے۔

آموں کا اثر ریل گاڑی میں میرے دوست پر ہونا شروع ہوا۔ اُن کی ران پر پہلے تو معمولی سُوجن سی معلوم ہوئی مگر رفتہ رفتہ یہ اُبھار بڑھنا شروع ہوگیا اور جب جمّوں پہونچے تو اُس نے ایک بہت چھوٹے سے پکے ہوئے آم کی شکل اور خطرناک رنگت اختیار کرلی تھی۔ جُوں تُوں کرکے میرے دوست لنگڑاتے ہوئے تانگہ تک پہونچے اور میرے سہارے سے اُچک کر اُس میں بیٹھ گئے۔ بڑی مشکل سے مَیں اُن کو اُس مکان تک لے گیا جہاں ہمیں ٹھہرنا تھا۔ یہ حضرت تو وہاں پہونچکر ایک خالی چارپائی دیکھکر اُس پر لیٹ گئے۔ اب رات ہوگئی تھی اسلئے ہم دونوں کھانا کھاکر (جس میں آم شامل تھے مگر میرے دوست نے اُنکو نہیں کھایا!) اپنے میزبان کے ساتھ پڑکر سو رہے۔

صبح اُٹھکر خیال تھا کہ جمّوں کی سیر کریں گے۔ اُمید تھی کہ رات کی رات میں میرے دوست کا پھوڑا یا تو پھُوٹ جائے گا یا الہ دین کے بھُوتوں کی طرح غائب ہو جائے گا۔ مگر صبح کیا آئی میرے دوست کیلئے مُصیبت آگئی۔ اُن کی ران کا پھوڑا نہ تو پھُوٹا اور نہ ہی غائب ہوا بلکہ رات کی رات میں اور بڑھ گیا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ میں نے اور ہمارے میزبان نے ایک اُستاد جرّاح کو بُلایا کہ وہ اس پھوڑے کا کچھ کرے۔ جرّاح نے ران دیکھکر کہا کہ "معمولی "گَدّ" ہے۔ ایک رات میں صاف کر دونگا"۔ چنانچہ اُس نے یہ کہکر اپنے نشتر وغیرہ تیز کئے اور میرے دوست کی ران والے "ملغوبہ آم" کو نہایت آرام سے چیرا اور پھاہا لگاکر پٹّی باندھ دی اور جاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ "کل صبح تک اگر آپ اسی ٹانگ سے بھاگنے کے قابل نہ ہوجائیں تو اپنی مونچھیں منڈوا ڈالوں گا"۔

جمّوں کی سیر کیا خاک کرتے۔ مَیں اور ہمارا میزبان دونوں "گدّ" کی تیمارداری میں لگے رہے۔ میرے دوست کو معمولی سا بخار بھی ہوگیا تھا اس لئے دوسرے دن صبح کو جب ہمیں لاہور واپس آنا تھا، میرے دوست نے تو اُسی دن آنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مَیں اُنکو اُن کے میزبان کے سپُرد کرکے خود لاہور واپس آگیا۔ کیونکہ مجھے کو اُسی دن اپنی ران (جس کا اندرونی muscle پھسل کر گر پڑنے سے پھٹ گیا تھا۔) کا برقی علاج کروانا تھا۔ آتے وقت مجھکو میرے دوست نے احتیاطاً پچیس روپے نقد دیدیے تاکہ میں سوموار کو ڈاکٹر صاحب

کی سولہ روپے فیس ادا کرسکوں۔ میرے دوست کا منگل کو لاہور پہونچ جانے کا خیال تھا۔

گاڑی جموں سے صبح کے چار بج کر پچپن منٹ پر چھوٹی اور ساتھ ہی میری مصیبتوں کا آغاز ہوگیا۔ میں نے سیالکوٹ کے اسٹیشن پر چاء پی اور اپنے سکنڈ کلاس کے ڈبے میں اکیلا ہی آکر بیٹھ گیا۔ سگرٹ جیب میں موجود تھے، میں نے سگرٹ سلگایا اور اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔

گاڑی سیالکوٹ کے اسٹیشن سے نکلی ہی تھی کہ مجھے سخت حاجت ہوئی میں سیدھا بیت الخلا کی طرف لپکا۔ مگر جب صفائی کے لئے نل دبایا تو ٹونٹی میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے اسوقت ان ریل والوں کو کتنی اور کس کس قسم کی وزن دار گالیاں دی تھیں افسوس صرف اتنا ہے کہ ان کو میں یہاں جگہ نہیں دے سکتا۔ خیر میں بڑی احتیاط سے اٹھا اور کسی شکاری کی طرح جو جھاڑیوں میں سو اپنے مارے ہوئے شکار کو نکال رہا ہو آدھا جھکا ہوا ایک ہاتھ میں ازار بند تھامے نکلا اور صبح کا خریدا ہوا اخبار اوپر والی نشست سے اتارا پھر اسی بے پانی کے کمرے کی طرف اسی احتیاط سے گیا اور انگریزی طریقہ سے صفائی کرکے باہر نکلا اور ایک کونے میں مار کھائے ہوئے کتے کی طرح دبک کر بیٹھ گیا۔

وزیر آباد کے اسٹیشن پر میں نے جلدی سے نل پر منہ ہاتھ دھویا اور بک اسٹال کی طرف بھاگا تاکہ ساقی کا سالنامہ خریدوں جس میں میری ایک کہانی بھی شائع ہونے والی تھی۔ ساقی کا سالنامہ بڑی شان سے بک اسٹال پر پڑا ہوا تھا میں نے جھٹ سے خرید لیا۔ اب جو فہرستِ مضامین دیکھتا ہوں تو میری کہانی کا کہیں نام ونشان نہیں بہت مایوسی ہوئی۔ بہرحال اب میں ایک روپیہ چار آنے ساقی پر خرچ کرکے جو اس پلیٹ فارم پر پہونچا جہاں اپنی منحوس گاڑی کو چھوڑ آیا تھا تو وہاں بقول جوش ملیح آبادی:۔

"گاڑی چلی گئی پٹری چمک رہی تھی"

میرے منہ سے بے اختیار نکلا:۔

اے جوش یہ سزا ہے اچھوں کو چاہنے کی

وہ دن وزیر آباد کے اسٹیشن پر بری طرح گذرا۔ میرا تولیہ، حجامت کا سامان، دانتوں کا منجن، برش، سر کی کنگھی اور برش اور صبح کی کارروائی سے بچا ہوا اخبار اور صابن بھی گاڑی ہی میں چلے گئے تھے، مگر ساقی سے بہت کچھ مدد ملی۔ دن پڑھتے پڑھتے گزر گیا۔ آخر بری حالت میں رات کے وقت لاہور پہونچا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت گزر چکا تھا۔ گھر پہونچا تو میرے اور میرے دوست صاحب کے نوکر دونوں گھر کو تالا لگا کر کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں رات کے بارہ بجے تک باہر سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا قسمت کو کوستا رہا۔ اتنے میں دونوں نوکر پان کھائے ہوئے اور سگریٹ پیتے ہوئے واپس آئے۔ مجھے دیکھکر سنبھلے اور جھٹ سے چھت پر پلنگ وغیرہ ڈال دیا۔ میں اس بری حالت میں تھا کہ ان مسخروں کو راتوں کو سینما جانے کے خلاف بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پلنگ پر لیٹا اور تارے گنتا ہوا نہ معلوم کس وقت سو گیا۔

صبح اٹھا تو پہلے حجامت وغیرہ کرنے کا سب نیا سامان منگوایا۔ پھر ضروریات وغیرہ سے فارغ ہوکر ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کیا اور وعدہ خلافی کے لئے معذرت پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نہ معلوم کیوں بگڑے بیٹھے تھے۔ کہنے لگے "آپ کی وجہ سے میرا بہت ہرج ہوا۔ میں آپ کا انتظار بہت دیر تک کرتا رہا تھا"

میں نے کہا "تو جناب ہرجانہ یعنی وقت ضائع کرنے کی فیس مجھ سے لے لیں"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "شرافت تو یہی ہے ورنہ میں آپ کو مجبور نہیں کرنے کا"

خیر میں نے بدھ کے دن ساڑھے پانچ بجے پھر ملاقات کا وقت مقرر کرلیا اور وعدہ کیا کہ سوموار کی فیس بھی ادا کر دونگا"

منگل کو میں نے اپنے دوست کا انتظار کیا مگر وہ نہیں آئے۔ میرے پاس اب صرف اٹھارہ روپے باقی تھے اور کل ڈاکٹر صاحب کو بتیس روپے فیس کے (شرافت کا دعویٰ کرتے ہوئے) ادا کرنے تھے۔ میں سیدھا رائے صاحب کے دفتر گیا اور ان سے ملا۔ بہت دیر تک تو وہ ایک فائیل کو دیکھتے رہے۔ پھر جب گردن اٹھائی تو آہستہ آہستہ کہنے لگے کہ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کو روپوں کی جلدی تھی۔ اس لئے میں نے خود جلدی نہیں کی۔ خیر کل آپ تشریف لائیے تو میں آپ کو روپے دیدونگا"

میں نے شکریہ ادا کیا اور گھر واپس آیا۔ تانگے پر آٹھ آنے ضائع ہوچکے تھے۔ نوکروں نے سبزی ترکاری اور دودھ وغیرہ کے لئے آٹھ آنے خرچ کر ڈالے تھے۔ غرضکہ بدھ کی صبح کو جب میں اٹھا تو میرے پاس فقط سترہ روپے تھے۔ صبح کو میں نے محسوس کیا کہ گرمی بہت زور کی تھی۔ پارہ تقریباً ایک سو دس ڈگری تک پرواز کرگیا ہوگا۔ میں نے اپنے دوست کا آج بھی بےچینی سے انتظار کیا مگر وہ آج بھی نہ آئے۔ اتنے میں نوکر خرچ کیلئے پیسے مانگنے آگیا۔ میں نے اسے صاف صاف بتادیا کہ۔

"بھئی آج کل ذرا پیسوں کی تنگی ہے۔ سنبھل کر خرچ کرنا" یہ کہکر میں نے چار آنے اس کو دیدئے۔

ساڑھے گیارہ کے قریب میں پھر رکنے صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو گیا۔ اُنہوں نے اپنے زرد دانت دکھلاتے ہوئے اپنی جیب میں سے چک نکالکر میز پر رکھا اور کہنے لگے:۔ "اجی صاحب مجھے سخت افسوس ہے کہ جن صاحب نے روپیہ وصول کرنے کا وعدہ فرمایا تھا وہ یہ کام کرنا بالکل ہی بھول گئے تھے۔ اب مَیں خود ہی کل تک آپکو روپے لا دونگا"۔

میرا جی چاہتا تھا کہ رکنے صاحب کے ایک چانٹا لگاؤں۔ مجھ روپوں کی آج ضرورت تھی اور وہ کل کی اُمید دلا رہے تھے۔ خیر، مَیں آگ بگولا ہو کر وہاں سے چُپ چاپ نکل آیا اور تانگے پر جو اس اُمید پر گھنٹہ بھر کے لئے کرایہ پر لے لیا تھا کہ روپے تو مل ہی جائیں گے، سوار ہو کر گھر واپس آ گیا۔ آٹھ آنے کرایہ کے دیدئے۔ اب میرے پاس فقط سولہ روپے چار آنے باقی رہ گئے تھے۔

دوپہر کو میں نے کھانا زہر مار کیا اور پنکھے کے سامنے لیٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا مکان کوئی تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ تانگے کے لئے کرایہ نہیں تھا اس لئے ساڑھے چار کے قریب پانی کے دو تین گلاس پی کر گھر سے نکل پڑا اور تین میل طے کر کے ڈاکٹر صاحب کے ہاں وقت پر پہونچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ برقی آلوں کے میری ران مالش کی اور جب میں نے علاج کے بعد صرف سولہ روپے میز پر رکھے تو ڈاکٹر صاحب نے میری طرف اُسی طرح دیکھا جس طرح میں نے ساقی کی فہرستِ مضامین وزیر آباد کے اسٹیشن پر دیکھی تھی۔ مگر میں نے جلدی ہی واضح کیا کہ کسی وجہ سے باقی کے سولہ روپے نہیں لا سکا۔ آئندہ مرتبہ ضرور لے آؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے "بہت بہتر" کہہ کر ہاتھ ملایا اور میں پھر گھر کی طرف کڑکتی دھوپ میں واپس چل پڑا۔ آخر جب سوا سات بجے کے قریب ٹھوس چھ میل کی مسافت طے کر کے میں گھر آیا تو گرمی اور پسینہ نے میری حالت بُری کر رکھی تھی۔

آتے ہی پنکھے کو پوری رفتار سے کھول کر جب میں نے پلنگ رکھایا تو اُس کی پنکھڑیاں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ میں نے سمجھا شاید بجلی بند ہو گی۔ مگر جب بجلی کے سیوچ کو دبایا تو قمقمے میں روشنی ہو گئی۔ اتنے میں میرے دوست کا نوکر ایک تار لیکر آیا اور یہ جتلا یا نہ پنکھا اُسی دوپہر کو اُس کے ہاتھ سے گر کر خراب ہو گیا تھا۔

پسینے میں شرابور میں نے نوکر کو نہانے کے لئے پانی رکھنے کو کہا اور خود لفافہ چاک کر کے تار پڑھا۔ میرے دوست نے لکھا تھا کہ ایکے ایک اور "گڈ" نکل آیا تھا اور وہ ایک ہفتے تک نہ آ سکتے تھے۔

اتنے میں نوکر نے آکر اطلاع دی کہ نلوں میں پانی بند ہو گیا ہے۔ میری عجیب حالت تھی۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ اُس پر پنکھا بگڑا ہوا۔ نل میں پانی ندارد۔ جیب میں صرف چار آنے۔ میں نے نوکر کو گولڈ فلیک کے سگریٹ کی ایک ڈبیہ لانے کو کہا اور آخری چار آنے بھی دیدئے اور خود پلنگ پر اوندھے مُنہ پڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں ایک آواز آئی کہ "صاحب ذرا چارپائی ہٹا لیجئے تاکہ کھڑکیوں میں شیشے لگا دوں"۔

مَیں کافی تکلیفیں اور نا اُمیدیاں برداشت کر چکا تھا۔ خاموش چارپائی پر سے اُٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ میں نے وہ کونسا گناہِ عظیم کیا تھا جس کا بدلہ مجھکو اس طرح مل رہا تھا۔ اتنے میں ناک پر جیسے کسی نے بھالا مار دیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ ناک پر گیا۔ میری اُنگلیوں میں سے بھیں بھیں کرتی ہوئی شہد کی ایک مکھی اُڑتی ہوئی نکل گئی۔

میری ناک مارے درد کے بھن بھن کرنے لگی اور جلد ہی میرے دوست کے "گڈ" کی طرح پھولنی بھی شروع ہو گئی۔ اب جبکہ مَیں یہ لکھ رہا ہوں تو بجائے کاغذ کے مجھکو اپنی پھولی ہوئی ناک نظر آ رہی ہے۔

بھارت چند کھنہ۔ ایم۔ اے؛

ریزۂ مینا

ساقی کے دس سال کا نادر انتخاب۔ جس میں پچاس مشہور انشا پردازوں کے بے مثل افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ اپنے رنگ میں مُنفرد ہے۔ ایسے اعلیٰ درجے کے پچاس افسانے کہیں بھی آپ کو یکجا نہیں مل سکتے۔ کتابت، طباعت، کاغذ نہایت عمدہ۔ ضخامت چھ سو صفحے۔ جلد کپڑے کی مضبوط۔ خوشنما ٹھپّہ والی۔ یہ کتاب ہر لائبریری کی زینت بن سکتی ہے۔ ضخامت (۶۰۰) صفحات۔ قیمت صرف تین روپے؛

ساقی کے مُستقل خریداروں کیلئے صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک۔ آرڈر کے ساتھ نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔ ورنہ یہ عایت نہیں کیجائیگی۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی؛

سماجی انقلاب کی چوتھی مجلس۔

کھیر

پچھلے منظر سے دس برس بعد ۱۹۵۰ء۔ ایک گاؤں میں "امن آشرم" کا سالانہ جلسہ۔ ایک جماعت گلے ملا کر گاتی ہے۔

اور رام نام والو سُن لو کتھا ہماری
ہم بھی اُسی پیا کی صورت کے ہیں پجاری
بیراگ لیکے اُس کا آئے ہیں گیانیوں میں
چھوڑا ہے دیس اپنا پیتم کے ہیں بھکاری
مکے میں اُس کے جلوئی کا نشی میں اسکا درشن
گوکل میں چھب اُسی کی تیرتھ ہیں جسکے بھاری

آنکھوں میں جوت اُسکی من میں اُسی کی مایا
سب روپ ہیں اُسی کے جس کا ہر جگ چایا
نفرت سے دیکھنا مت جگ میں کسی کو پیارے
کہتے ہیں گیان والے "ہر میں ہے ہر سمایا"
جھگڑا نہ کر کسی سے سب پنتھ ہیں اُسی کے
دھنوان ہو وہ گیانی جس نے یہ گیان پایا

ایک منڈلی کے ہو تم سارے یہ پریم بھائی
آئے ہو جس نگر سے ہوگا وہیں پہ ڈیرا
مل کر کرو تم اپنا ہر ایک کام پیارو
اِس بے گتی میں بپتا ڈالے نہ آکے گھیرا
ہیں سب اُسی کی پرجا گورے ہوں یا ہوں کالے
آنکھوں پہ کیوں تمہاری چھایا ہے یہ اندھیرا

کیا تھا بچن تمہارا اور ڈھنگ کیا دکھائے؟
اس پرتھوی پہ آکر کیوں بن گئے پرائے؟
سنتے ہے تم تو دیکھو کیا ہو رہی ہے درگت
روٹھے ہوئے ہیں بھائی، ملتے نہیں منائے
لیکن پریم والو آنند ہے اسی میں جھگڑوں سے جی کسی کا کوئی نہ یاں دکھائے

دو دن یہاں پہ رہ کر بھولو نہ ریت اپنی
دھن ہے یہی، نہ چھوڑو پیار و پریت اپنی
(حمید میرٹھی)

(بابو موہن لال ورما کی تقریر)

صاحب صدر، پیارے بھائیو اور بہنو۔ آج ہم امن آشرم کی شاخ تعلیم استھان میں خوشی سے آپ کا خیر مقدم کرتے ہوئے وہ دن یاد کرتے ہیں جب قوم نے ہماری منڈلی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ ہماری ہجویں کی جاتی تھیں۔ علماء اور پنڈتوں نے ہمیں کافر، ناستک، ادھرمی قرار دیا تھا، ہمیں جاتیوں اور برادریوں سے باہر کیا گیا، ہم سے سماجی تعلقات تک توڑ ڈالے گئے تھے۔ ہماری زندگی اجیرن اور حرام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ ہم نے ہمت نہ چھوڑی، سب کشٹ سہے، جانوں کو دکھ تھا، پر آتما کو سکھ اور آنند۔ ہم سنتوکھ سے سماج سدھار کے کام کئے گئے۔ کٹر ہندو مسلمان ہمارے خلاف تھے تو کیا ہوا، پرماتما اور سچے ہمارے ساتھ تھے۔ سماج کا انیائے سہنے والے دُکھی، بے تھاہ، بے پناہ ہمارے ساتھ تھے۔ ہماری پکار سچے کی پکار تھی۔ پیٹ بھروں نے ناک منہ چڑھائے، بھوکے بھاگ بھاگ کر آئے اور ہمارے آشرم میں بھرتی ہوتے رہے۔ آج ہم بھگوان کی کرپا سے چھ تعلیم استھان چلا رہے ہیں۔ تین کنیاؤں کے اور تین بالکوں اور رجوانوں کے۔ ہم یہاں ان کو صرف پستکوں کی سکشا نہیں دیتے بلکہ آدمی بناتے اور آدمی بنانا سکھاتے ہیں یہی ہمارا دھرم ہے، یہی سیاست، یہی معاشرت اس سے جدا ہمارے ہاں کوئی مذہب، سیاست یا کلچر نہیں۔ ہم ہندو مسلمان نہیں جانتے۔ ہندوستان باسی کی حیثیت سے ہر شخص ہندی ہے اور منش کے سیوک، سلامتی کے پرچارک اور امن کے ایڈیٹک کی حیثیت سے ہر فرد مُسلم ہے۔ ہمارے ہاں جات پات اور چھوت چھات کا بچار نہیں شادی بیاہ تک میں ہم آزاد ہیں۔ استری اور پرش میں جو جس طرح چاہے پوجا پاٹ کرے یا نہ کرے، کیول بھگوان کو مانے۔ اس کو چھوڑ کسی طاقت کے آگے سر نہ جھکائے۔ ہماری سب سے بڑی اور اصلی عبادت منش کی سیوا ہے اور یہی پرماتما کی پوجا۔ ہمارے بالک فرقے اور جتھے، پارٹیاں اور جاتیاں نہیں جانتے۔ ہمارے ہاں گائے باجہ اور اُردو ہندی کے جھگڑے نہیں۔

ہمارے اس کھچڑی کلچر اور آدمیت کے اونچے تخیل کا نتیجہ

یہ ہے کہ ہماری نو آبادی میں نہ مذہبی تفرقہ ہے نہ کلچر کی لڑائی۔ ہماری مشترک تعلیم، کلچر، معاشرت اور مشترک ضروریات نے گورنمنٹ کا کام بھی آسان کر دیا ہے۔ یہ سب ہم نے کسی ڈائرکٹ ایکشن، تشدد، ہنسن کے بنتھوں نہیں پایا۔ شروع میں چھوت توڑنے، ہندو مسلم عیسائی برادری قائم کرنے اور مخلوط بواہ جاری کرنے میں ہمیں طرح طرح کے دکھ اٹھانے پڑے۔ مثالیں قائم کرنے کے بعد ہماری کوشش ذہنیتوں کی تعلیم و تربیت اور پروپگنڈوں پر مجتمع رہیں۔ ہمارے رسالے، پستکیں، سبھائیں قوم میں صلح و امن کا چپکا پرچار کرتی رہیں۔ تعلیم گاہیں بالکوں اور کنیاؤں کو قوم کے سچے سیوک سپاہی بناتی رہیں۔ محنت و مشقت کی عزت دلوں میں بٹھا کر اور سادہ زندگی کا خوگر بنا کر ساتھ ساتھ روٹی کا سوال بھی حل کرتی رہیں۔ ہم غریب ہیں، پھر بھی پیٹ کی مار اور بیکاری کی چیخ پکار نہیں۔ جھونپڑوں میں موٹا پہن کر اور سادہ کھا کر آنند سے پرماتما کی سیوا کرتے ہیں۔ آج ہم بھگوان کی کرپا سے اس لائق ہیں کہ ایک نئے تعلیم استھان کے افتتاح کی رسم کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ جس میں کاشتکاری، کان کنی، مویشی خانوں اور چراگاہوں کی شاخوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پارچہ بافی، شیشہ گری، بڑھئی خانے لُہار خانے کھل چکے ہیں۔ نئے کاروبار کے لئے رام نگر کے بابو جے نرائن سنگھ اور موہن پور کے زمیندار شیخ مولا بخش صاحب نے اپنے جنگلات اور ٹانڈ اراضی کے دو دو سو ایکڑ دس دس برس کے پٹے پر مفت ہمارے حوالے کئے ہیں۔ اور ضرورت ہوئی تو اور زمینداروں نے اور اراضی دینے کے بچن دئے ہیں۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اِن کارخانوں کیلئے یوریپین طریقوں پر بڑی بڑی عمارتیں اُٹھائیں گے، ہوسٹلوں کو آراستہ کریں گے، آپ چلکر دیکھ لیں، ہمارے طالب علم اور برہمچاری چٹائیوں پر سوتے، باری باری اپنے اور ساتھیوں کے کھانے آپ پکاتے، جھاڑو آپ دیتے، کپڑے آپ دھوتے ہیں۔ یہی زندگی اب بھی رہیگی۔ نئے جھونپڑوں میں صرف وسعت کا اضافہ ہوگا۔ تجربہ گاہوں کے لئے آلات پر ہمیں کافی رقم صرف کرنی پڑے گی۔ جس کے لئے گورنمنٹ نے پچھتر ہزار کی مدد پیش کی ہے۔ مگر گورنمنٹ، خواہ کوئی ہو اور کیسی ہو، ہم اس کا دخل منظور نہیں کرتے۔ ہمارے کاموں کو سراہنے والے آدھاران رئیسوں میں بھی موجود ہیں جو پبلک میں زبان سے ہمارے خلاف اور دل سے ساتھ ہیں۔ ان کی دلی ہمدردی سے اپنے کاموں میں ہمیں مالی دشواری نہ ہوگی۔

معزز حضرات، ہم کسی رسم اور تکلف کے قائل نہیں۔ آپکو صرف اس لئے جمع کیا ہے کہ ہمارے کاموں اور منصوبوں سے واقف ہوں اور جان لیں کہ ہمارا مذہب اور عبادت کیا ہے۔ اس رسم کیلئے ہم نے کسی وزیر، امیر، سرمایہ دار، مولانا یا مہاتما کو نہیں چنا۔ بلکہ بیک وقت چار غریبوں، ایک اچھوت، ایک مسلمان، ایک شدر ہندو، ایک دیسی عیسائی کے ہاتھوں یہ رسم انجام پائے گی۔ یہ ہندوستان کی مخلوط قومیت، تمدن، تہذیب اور آزادی کا سنگِ بنیاد ہوگا۔ ہماری آشا ہے کہ یہ ہندوستان میں صلح و امن کی فضا قائم کر کے غیر ملکوں میں بھی شانتی پیدا کرے گا۔ اب تک ہمارے پرچارک یورپ اور امریکہ میں اس سوسائٹی کی چار شاخیں قائم کر چکے ہیں۔ وہاں کی عام پبلک نے جس جوش اور خلوص سے ہمارے اُپدیش کا خیر مقدم کیا ہے اور جس رفتار سے ممبر ہو رہے ہیں ہمیں اُمید ہے کہ بہت جلد دُنیا کی مظلوم اور کمزور آبادی کو اپنا ہم خیال بنا کر ظالموں کو جھکنے پر مجبور کریں گے اور شانتی اور نیائے پھیلا سکیں گے۔ یہ سچ ہے کہ انیائے کا مقابلہ ہم ابھی ہتھیاروں سے نہیں کر سکتے، پر ایک زبردست بیدار سماج کی روحانی شکتی پر ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ بہت جلد ہماری سوسائٹی ہر ظلم کا مقابلہ کر لے گی۔ اور پرماتما کا ایک جھنڈا ایک دھرم سنسار میں لہرائیگا۔ پرمیشور کا وہ بچن جو اُس نے اپنے پیغمبروں کو دے رکھا ہے پورا ہو کر رہیگا۔

وہ کیا ہے صغیر بھائی؟

صغیر:- خدا کہتا ہے "آج میں نے تم پر اپنا دین مکمل اور اپنی نعمت سمپورن کر دی اور شانتی کو تمہارا دھرم بنایا"

یہ آگیا ایک بار حضرت محمدؐ کے ذریعے پوری ہوتے ہوتے رہ گئی خدا نے دُنیا کو ایک نمونہ دکھا دیا۔ شاید اس کی مرضی ہے کہ وہ نمونہ ارتقا کے درجوں سے گذر کر ایک خاص وقت پر یا مختلف وقتوں میں کمال کو پہونچے۔ خدا کرے اس جنگ میں ہمارے ہاتھوں کو یہ عزت نصیب ہو۔

سب:- آمین! آمین! آمین!

(مسز احمد (شانتا دیوی) کھڑی ہوتی ہیں)

سبھاپتی، بھائیو بہنو! مجھے کوئی تقریر کرنا نہیں۔ مَیں اپنی بہنوں کی طرف سے آپ کی اور خاص کر کے بہنوں کی خدمت میں یہ بتانے اور جتانے کھڑی ہوئی ہوں کہ مَردوں نے جن سے ناواجب لابھ اُٹھائے بوڑھے اپاہج جاہل ناکارے مَردوں نے جات نسل مذہب، ہڈیوں کے بدلے بھاری بھاری تلک دان جہیز وصول کئے اور استریوں کی

رکشا کے بدلے اُن کو کچلا، پیسا اور زندگی موت سے بدتر بنا دی اُصلی یا بے اصل، بھاری یا ہلکی بھول چُوک پر گھروں سے دھتکار دیا، نہ مارے مریں نہ اپنی موت سے، اُن نراسوں کو آج پناہ ملی ہے اس پریم آشرم میں۔ یہاں سنتو کھ ملا ہے اُن بے گناہوں کو جو مالک کی مرضی سے رانڈ ہو گئیں اور برادری نے ابھاگی، جلی بختی ٹھہرا کر ٹھکرا دیا۔ ان گنہگاروں کو بھی جن کو زیادہ تر بپتا اور بے چارگی نے کامنا کے بھُوت کے پنجے میں پھنسا کر سیدھے ڈگر سے ڈگا دیا۔ اور اُن مردوں کے آگے جو آپ کھُلے خزانے وہی پاپ کرتے پھریں، ان بے چاریوں کی کوئی پراشچیت بس نہ تھی۔ نہ کوئی سزا کافی، نہ چکلوں کے سوا کہیں پناہ، اُن دیویوں کو بھی جو غربت کے کارن بر نہ ملنے سے اپنی ما[illegible]پ پر بوجھ تھیں ان معصوموں کو بھی جو اپنے جنمانے والوں کے پاپ کی سزا میں محبت اور عزّت دونوں سے محروم تھیں۔ ان سب کو پناہ ملی اور بلا شرط و قید۔ یہ نہیں کہ پہلے کوئی خاص دین یا دھرم قبول کر لیں۔ ہمارا دھرم جیسا کہ موہن [illegible]ائی آپ کو بتا چکے منش کی سیوا اور قربا[illegible]ہے۔

[illegible] اتی اور مذہب میں بیاہ [illegible] دھرم کو دُور سے ہمارے سات سلام۔ جو ہمیں یوں دُکھی، بے پناہ، نراس بنائے رکھے۔ دھرم نام [illegible] پریم اور شانتی کا۔ اور پریم منش منش میں فرق نہیں کرتا، دو الگ الگ گھروں میں پیدا ہونے سے سچائی دو نہیں ہو جاتی۔ ہمارے دھرم میں [illegible] دھرتی پر جنم لیتا ہے چاہے برہمن والدین سے ہو، شُدر سے ہو، مسلمان سے ہو، عیسائی سے ہو یا حرامی ہو، ایک ہی فطرت لیکر آتا ہے اور وہ شُدھ اور پوتر ہوتی ہے۔ آدمیوں میں اگر فرق ہے تو جنم سے نہیں کرنی سے ہے۔ اگر دُنیا یہ سکشا سیکھ جاتے تو جیون بہت کچھ سُکھی ہو جائے ہم اپنے بس بھر ایسی ہی نسل تیار کر رہے ہیں۔ مالک ہماری محنت ٹھکانے لگائے اور یہ سیوا قبول کرے۔

سنگ بنیاد کی رسم ادا ہوتی ہے۔ ایک ٹاٹ پر پتھر رکھا جاتا ہے جس کے چاروں کونے ایک اچھوت مرد، ایک مسلمان مرد، ایک شُدر ہندو عورت، ایک دیسی عیسائی عورت کے ہاتھوں میں ہیں۔

(جماعت ملکر گاتی ہے)

تو دین دھرم کے گیت نہ گا، گر بھید تجھے معلوم نہیں
سنسار کا دھرمی سیوک ہے، پر ایک کا بھی محکوم نہیں
مسکیں سہی، محتاج نہیں۔ کمزور سہی مظلوم نہیں
دھن مال سے ہو محروم تو ہو، عزّت سے مگر محروم نہیں
ایمان ہے سچ کا زور، جسے ہاتھ آئے یہ دھن منعم ہے وہی
بُدھ، ہندو، مسیحی، پارسی، سکھ، مل جائے جسے مُسلم [illegible]
اک سب سے بڑی شکتی ہے وہ ذات گُن ان گنت اسکے نام نہیں
یزداں بھی ہے، یہوا بھی وہی، اک رب ہی نہیں اک رام نہیں
گن گیان دیا کی سکشا سیکھ اور نام سے کوئی کام نہیں
جپ تپ کی نمائش دھرم نہیں ایمان نہیں اسلام نہیں
جو حرص و ہوا کے بُت پوجے توحید کا دعویٰ کیوں وہ کرے
مُسلم وہ نہیں، مشرک ہے اگر باطل سے دبے طاقت سے ڈرے
دھرمی ہے وہ ست کا سیوک ہے جسکو نہ تن اور جان کا غم
تڑپائے جسے انساں کی تڑپ، بے چین رکھے ایمان کا غم
ہو بھوک سے بڑھکر بھیک میں دُکھ، حا[illegible] سوا احسان کا غم
ہے ہنس پریم کے ساگر کا، کیا مینہ کا ڈر طوفان کا غم
بُدھ ہندو مسیحی پارسی سکھ جس رنگ میں ہو جس بھیس میں ہو
مُسلم ہے پُجاری نیائے کا وہ جس روپ ہو جس دیس میں ہو
یہ آرتی پوجا پاٹھ بھجن تسبیح و تلاوت صوم و صلوٰۃ
بھگوان کو کچھ درکار نہیں، ہے حمد و ثنا سے پاک وہ ذات
دوزخ کا وحشتناک سماں، جنّت کی ہوسنا کانہ صفات
سب مولوی پنڈت کی ہے کتھا پر مجھ سے بھی سُن لے گُر کی یہ بات
سب اس ہوس کے بھوکے ہیں پر بندہ باری کوئی نہیں
سب جپتے ہیں مالا اِشور کی، پر حق کا پُجاری کوئی نہیں
کیا ترک ملیچھ کیا کافر دُشٹ، کیا فرق زبان و نسل و وطن
ہے سب کی رگوں میں ایک لہو، اک آتما، اک جیو ایک بدن
گو پھول ہیں لاکھوں رنگ برنگ پر ایک ہی بھومی ایک چمن
بن میگھ دیا کا سب پہ برس، بستی ہو کہ ریگستان کہ بن
سب دھرموں کا بابا ایک ہے گُر، انسان بن اور انسان بنا
انسان نہ بنا تو شیخ سوامی جو بھی بنا شیطان بنا

(ختم شد)

محمد مُسلم

یاد

یاد آتا ہے کبھی تجھ سے محبت تھی مجھے
یاد آتا ہے کبھی حاصل مسرت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی دل کامیابِ عشق تھا
یاد آتا ہے کبھی ہنسنے پہ قدرت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی راحت اثر تھا دردِ دل
یاد آتا ہے کبھی جینے کی حسرت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی تیرے ستم تھے دلفریب
یاد آتا ہے کبھی رونے سے نفرت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی وعدے وفا ہوتے نہ تھے
یاد آتا ہے کبھی تجھ سے شکایت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی صدمے تھے پیغامِ سکوں
یاد آتا ہے کبھی فرقت میں راحت تھی مجھے

یاد آتا ہے تصور تھا کبھی معجز نما
یاد آتا ہے کبھی فرصت ہی فرصت تھی مجھے

یاد آتا ہے "کبھی ملنا تو گھبرائے ہوئے"
یاد آتا ہے کبھی تاکیدِ الفت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی تھا عفتِ الفت پہ عہد
یاد آتا ہے کبھی محدود ہمت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی زیبا نہ تھا "بوس و کنار"
یاد آتا ہے کبھی "جائز" اجازت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی آتی تھی وہ "پنجوں کے بل"
یاد آتا ہے کبھی چھپنے کی عادت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی رہتے تھے یکجا رات بھر
یاد آتا ہے کبھی "محتاط" جرأت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی "کیرم" پہ بد جاتی تھی شرط
یاد آتا ہے کبھی ہر "جیت" نعمت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی پہونچا وہاں کس کس طرح
یاد آتا ہے کبھی اپنے پہ حیرت تھی مجھے

یاد آتا ہے کبھی آتے تھے "چھوٹے نامہ بر"
یاد آتا ہے کبھی کھنچنے سے رغبت تھی مجھے

"یاد آتا ہے" سے یہ مطلب، وہ ابتک یاد ہے
"دوسرے جلووں میں" نظریں محو۔ دل ناشاد ہے

شاد عارفی

صبح کا ناشتہ

گُذشتہ اتوار کی رات کو عجیب واقعات گُذرے۔

کھانے کے بعد میں اور میری سہیلی شوشوئی سمندر کے کنارے چہل قدمی کو نکلیں۔ رات نہایت سرد اور تاریک تھی۔ بادلوں نے موسم کو رنگین بنادیا تھا۔ دُور ساحل پر "اژدرک" (مشہور رسٹوران) کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا آج وہاں کوئی آدھی رات کا جلسۂ رقص ہے۔ اُس وقت تک کسی قسم کا کوئی واقعہ نہ گذرا۔

سامنے ساحل پر ایک نوجوان شب کے کھانے کی سیاہ جاکٹ میں تیز گامی سے اژدرک کی طرف جاتا ہوا ملا۔

شوشوئی نے سرگوشی کی "بغدادی معلوم ہوتا ہے! اگر.... اگر.... اگر اس کے چہرے پر چھوٹی سی سُرخ ڈاڑھی ہوتی.... اور لمبا سا سیاہ لبادہ ہوتا.... تو اس رات کے اندھیرے میں یہ ہارون الرشید معلوم ہوتا.. جو بغداد کی گلیوں میں.... "

پھر بھی کوئی واقعہ نہ گذرا۔ اور نوجوان رات کے اندھیرے اور اژدرک کی روشنیوں کے درمیان کہیں غائب ہوگیا۔

جب سردی بہت بڑھ گئی اور بادل گرجنے لگے تو ہم دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے، کانپتے ہوئے گھر لوٹے۔ کمرۂ ملاقات میں بیٹھے موسیقی سُنتے رہے۔ پھر ساڑھے دس بجے کے قریب ریڈیو کا بٹن بند کر کے اپنی خوابگاہ میں آگئے۔

بس! اسی وقت سے واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اب ہوائیں وحشی راگ الاپنے لگی تھیں۔ سمندر کی موجیں زور سے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور بالکل طوفانی رات معلوم ہو رہی تھی۔

آتشدان میں صنوبر کی لکڑیاں چٹخ رہی تھیں اور شعلوں کا عکس دیواروں پر ناچ رہا تھا۔

میں تو اندر آتے ہی "ابن بطوطہ" ہاتھ میں لیکر فوراً بستر میں لیٹ گئی۔ سرہانے شمع جھلملا رہی تھی۔ کیونکہ میں ہمیشہ سفرنامے اور سیاحت نامے مومی شمع کی خواب ناک روشنی میں پڑھنے کی عادی ہوں، برقی روشنی میں نہیں۔ میں تھوڑی ہی دیر میں "ابن بطوطہ" کے صفحوں میں غرق ہوگئی۔

اِدھر شوشوئی قدآدم آئینے کے آگے کھڑی بالوں کو گھونگریالے کرنے والی پنیں اپنے تمام سر میں لگا رہی تھی۔ تاکہ صبح کو بال سنورے ہوئے تیار ملیں۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ایک گلابی ساٹن کے شب خوابی کے لباس میں کھڑی کانپ رہی تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟" اُس نے کنپٹی کے قریب ایک پن لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ابن بطوطہ" میں نے بے توجہی سے کہا۔

"تُف" اُس نے حقارت سے کہا "ایسی سحرانگیز بادلوں والی رات میں ابن بطوطہ؟ الف لیلہ کا کوئی رومان پڑھو۔ یہ رات رومان کے خواب دیکھنے کے قابل ہے.... وہ.... وہ! اژدرک کا بینڈ سُنا؟"

میں کتاب کا ورق اُلٹتے ہوئے بولی "سُن رہی ہوں"

وہ بولی "کاش! اس کاجل سی رات میں کوئی مُسافر ہمارے ہاں پناہ مانگنے آجاتا!"

میں نے بے توجہی سے کہا "پھر کیا ہوتا؟"

اُس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لئے اور تصوّر میں دُور کا منظر دیکھکر مُسکرانے لگی۔ آنکھوں میں شوخی چمک رہی تھی۔ بولی "پھر کیا ہوتا؟ — یہ ہوتا کہ گھر کے پچھلے دروازے پر ایشیائی انداز میں دستک کی آواز سُنکر میں جلدی جلدی باغ کے زینے پر اُترتی اور پوچھتی کون ہے؟ اور جب وہ کہتا کہ ایک پردیسی! جو طوفانِ بادوباراں سے رات کی رات پناہ مانگنے آیا ہے تو میں چرچراتا ہوا دروازہ آہستہ سے کھول دیتی۔ اور جب وہ قدم اندر دھرتا تو اندھیرے میں اس کے سرگوشی میں کہتی "لیکن خاموش! بات کوئی نہیں! نہ کوئی کھڑکا! چُپ چاپ چلے آؤ۔ مگر اس پُراسرار مکان میں جو کچھ دیکھو یا سُنو اسکے متعلق سوال کا ایک لفظ زبان پر نہ آئے یہ شرط منظور ہے؟"

میری نظریں "ابن بطوطہ" کے صفحوں پر سے اُٹھ چکی تھیں میں نے پوچھا "اور اسکے بعد شوشوئی؟"

وہ بولی "دسترخوان! جس پر کانچ کے ظروف میں شہد اور پنیر اور صحرائی کھجوریں! صراحیوں میں رنگین شربت! اور پس منظر میں ریڈیو کی عربی موسیقی! مصر کی وہ کیف آور شہنائیاں سُنکر

یہ معلوم ہوتا ہے کہ نخلستانوں میں کوئی ناگ بل کھا کھا کر جھوم رہا ہے۔"

میں نے ابنِ بطوطہ بند کر دی، ایکدفعہ آتشدان کے بے قرار شعلوں کی طرف دیکھا اور پھر اشتیاق سے پوچھا: "اسکے بعد شوشوئی؟"

اُس نے کہا: "دسترخوان کے ایک طرف مہمان حیران ششدر سہما ہوا! دوسری طرف میں چپ چاپ ––– کریب کا ایک پُر اسرار نقاب ناک تک باندھے مضطرب نگاہوں سے ادھر اُدھر تکتی ہوئی! گویا بھاری بھاری پردوں میں سے کوئی آنکھ نہ گھور رہی ہو، سنگین دیواروں کے ساتھ کوئی کان نہ لگا ہو ......"

میں نے جملہ مسکرا کر ختم کیا: "اور پھر تم حکم دیتیں کہ کالی کنیا کو لے آؤ۔ اور کالی کنیا اندر داخل ہوتی ––– "

یکایک دروازہ کھلا اور شوشوئی کی نئی کالی خادمہ اندر داخل ہوئی اور بولی: "خاتون شوشوئی! باغ کے زینے پر کوئی کھڑا ہے اور آپ سے ......"

شوشوئی پل بھر کو ششدر سی رہ گئی۔ اس کی نگاہیں مجھ سے ملیں اور فی الفور اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

چلّا کر اُس نے فقرہ ختم کیا: "اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟"

"جی"

"کوئی خاتون یا مرد؟"

"شاید مرد۔ ہاں ہاں مرد ––– " خادمہ نے کہا پھر بولی "کہتا تھا بیگم صاحبہ کو خبر کر دو۔ میں یہاں کھڑا ہوں"

"باغ کے زینے پر؟ پچھلے دروازے کی طرف؟" شوشوئی کے مُنہ سے الفاظ پھسلے جا رہے تھے۔

"جی ہاں!"

شوشوئی کے چہرے پر مسرت کا ایک سیلاب آ گیا۔ اُس نے بیخودی کے عالم میں کہا: "جاؤ۔ بھاگو۔ اسے ٹھہراؤ۔ ابھی آئی میں"

اتنا کہہ کر یکلخت وہ میری طرف مُڑی۔ فخریہ مسکرا کر بولی۔

"دیکھا؟ کوئی شاعر نوجوان اندھیری رات میں پناہ مانگنے آگیا ہے۔ آہ ..... میرے خوابوں کی تعبیر!! ––– افسوس میں نے تو لباس بھی تبدیل کر لیا .... اُونہہ .... کیا ہوا! جلدی سے پہن لونگی"

یہ کہکر اُس نے لمحوں میں بالوں کی پنیں نکال دیں۔ اور بال سنوار لئے۔ شب خوابی کا لباس نکال پھینکا۔ دوڑتی ہوئی الماری کے پاس گئی اور ایک نہایت پُر تکلف گہرے سبز رنگ کا ریشمین لباس نکال کر پہن لیا۔ پھر وہاں سے تیزی سے بھاگتی ہوئی زیورات کے صندوقچے کی طرف لپکی۔ زمرد کا گلوبند نکال کر گلے میں باندھا۔

پھر اُسی عجلت اور تیزی سے ٹک ٹک کرتی آئینے کی طرف بھاگی۔ ساتھ ہی ساتھ شوخی سے مجھ پر ایک نگاہ غلط انداز بھی ڈالتی جاتی تھی۔ اور سیٹی تو برابر بجاتی رہی۔ کبھی گاتی۔ ع۔

"قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے"

میں حیران تھی کہ یہ لمحے بھر میں کیا سے کیا ہو گیا! وہ ایسی تیزی اور عجلت سے کام کر رہی تھی جیسے کوئی برقی بٹن اُس سے لگا دیا گیا ہو۔

"آخر وہ کون نوجوان ہوگا شوشوئی؟" میں بستر پر سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"تم لیٹو۔ تم لیٹو" اُس نے غصے سے مجھے بستر پر دھکیلتے ہوئے کہا: "تم کیوں اُٹھتی ہو؟ بس میں جاؤنگی۔ وہ یقیناً شاعر ہے جبھی تو باغ کے زینے پر کھڑا ہے"

یہ کہتے کہتے بجلی کی سی تیزی سے عطر کی شیشی کھول کر لباس پر اُنڈیل لی۔ اور جب سُرمہ کی باری آئی تو میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر سرمہ دانی سنگھار میز پر سے غائب کر دی۔

"ارے! یہ سُرمہ دانی کہاں گئی؟ اُونہہ! جلدی میں ملتی نہیں ہے ہے تم نے اٹھالی؟ بڑی کم عقل ہو۔ ایسے موقع پر مذاق؟ لعنت ہے تم پر! دو جلدی"

میں نے غصے سے سرمہ دانی میز پر پھینک دی۔

اُس نے جھپٹ کر اُٹھائی اور آنکھوں میں دو سلائیاں اِدھر اُدھر کھینچیں اور پھر دروازے کی طرف بھاگی۔ گویا وادیِ عشق میں قدم رکھا۔

اِدھر مجھے چین کہاں ––– ! چنانچہ وہ ابھی دروازے تک بھی نہ چلی تھی کہ میں اُٹھی اور دبے پاؤں اس کا تعاقب کیا۔

جھانک کر دیکھا تو باغ کے زینے پر واقعی ایک دراز قد انسان کا سایہ متحرک نظر آیا۔

شوشوئی کی آواز مارے اشتیاق کے لرز رہی تھی: "آپ .... آپ .... اندھیرے میں .... چپ چاپ اندر چلے آئیے ... لیکن خاموش ...."

"جی میں تو صرف اتنا پوچھتا تھا صبح کے ناشتے پر تلا ہوا انڈا چاہیئے یا ہاف بائلڈ حضور؟"

(بقیہ بر صفحہ ۵۲)

بھولا فسانہ

کوئی جب ساز چھیڑیگا، کوئی جب گیت گائے گا یکایک تار کوئی تھرتھرا کر ٹوٹ جائے گا

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

بہاروں کی حسیں، نکھری ہوئی سرشار راتوں میں محبت پر کبھی جب بحث آجائے گی باتوں میں

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

کبھی ہنگامِ زینت کچھ کہے گا تم سے آئینا نظر آنے لگے گا دفعتاً جب عکس دھندلا سا

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

اگر بھولے سے کوئی شعر ایسا گنگناؤ گی کہ پھر اک بار ملنے کی تمنا جس میں پاؤ گی

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

اگر تھک کر کسی ناول کا کونہ موڑتی ہو گی اگر شغلاً کسی کے خط کے پُرزے جوڑتی ہوگی

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

کبھی جب ریل میں گزرو گی فردوسِ علی گڑھ سے تمہیں محسوس ہو گا رہ چکی ہو تم یہاں جیسے

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

اگر بے کیف لمحے انکھڑیوں کی نیند لوٹیں گے فضا میں دفعتاً جب دو ستارے ساتھ ٹوٹیں گے

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

کبھی گر کوئی مبہم خواب پچھلے سے جگا دے گا سحر کے دوش پر جب چاند اپنا سر جھکا دے گا

تمہیں اُس وقت اک بھولا فسانہ یاد آئے گا

جاں نثار اختر (علیگ)

انسان

کیا وہ انسان تھا؟

نہ معلوم کیوں یہ مہمل سا سوال میرے دماغ میں گھس آیا تھا۔ میں کب کبھی اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہمیشہ اس کا جواب نفی میں پاتا۔ وہ انسان کیسے کہا جاسکتا؟ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہوتی کہ اسکا ایسا متعفن اور مکروہ شخص بھی انسانوں کے زمرے میں شامل کیا جاتے۔

اگر وہ انسان تھا تو پھر مرغی اور بندر بھی انسان تھے۔ محض دو ہاتھ پیروں سے تھوڑے کوئی انسان ہوجاتا ہے۔ اس کی نہ شکل وشباہت انسانوں کی سی تھی اور نہ فطرت وخصلت بلکہ فطرت اور خصلت میں اسکی بہ نسبت کتے اور چھچھوندر انسانیت سے زیادہ قریب تھے۔

اُس کے توے جیسے سیاہ چہرے پر آنکھوں کے وجود ہی کا پتہ مشکل سے چلتا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی دھنسی اور چپڑی آنکھوں سے ہر وقت کیچڑ کا ایک لامتناہی دریا اُس کے رخساروں پر بہا کرتا۔ اسکی ناک بہت چپٹی اور چھوٹی تھی اور چہرے کی زیادہ تر سیاہی اُسی کے حصہ میں آتی تھی۔ اُس کے موٹے موٹے بدصورت ہونٹھ ہر وقت کھلے رہتے۔ کیونکہ اُس کے سامنے کے چار دانت اُس کے منہ سے باہر تھے۔ اُس کے زرد دانتوں سے بدبو کی لپٹیں نکلتیں جس کی وجہ سے کوئی شخص بھی اُس کے قریب کھڑے ہونے کا متحمل نہ ہوسکتا۔ اس کے سر پر وحشی اور گھناؤنے بالوں کا ایک بادل منڈلاتا رہتا اور اُسکی ڈاڑھی کوئی خاردار گھنی جھاڑی معلوم ہوتی جو ہمیشہ اُس کے منہ کی غلیظ رال سے شرابور رہتی۔

اُس کے جسم میں کوڑھ تھا اور دور ہی سے کیڑے نظر آتے۔ اُس کا بایاں ہاتھ سڑ کر گرچکا تھا۔ اُس کے دوسرے اعضا کی مناسبت سے اُس کی ٹانگیں بہت پتلی تھیں۔ وہ کھڑا ہوتا تو وہ کپکپاتیں چلتے وقت وہ ڈگمگاتا ہوا چلتا۔ اور جب قدم اُٹھاتا تو زمین پر پڑنے سے قبل اُس کا پیر پہلے ہوا میں نصف دائرہ بناتا۔

اُس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھکر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ انسان ہے اور جانداروں کے اس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، جس میں لمبے چوڑے، موٹے تازے اور سرخ وسفید انسان ہوتے ہیں۔

اس کے جاننے والے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی سے ایسا تھا۔ جوانی اور بڑھاپے نے قریب قریب اس میں کوئی فرق نہیں پیدا کیا۔ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ چند سال پیشتر وہ کہیں سے ایک عورت بھگا لایا تھا جو خاصی جوان تھی اور جو بہت دنوں تک اسکے ساتھ رہی اور پھر اُس کے تمام امراضِ خبیثہ سے فیضیاب ہوکر اُسی کے ہاتھوں مر بھی گئی۔ اگر واقعی اس نے ایسا کیا تھا تو اس کے اس معجزے کے سامنے تمام پیغمبروں کے سنے سنائے معجزے ہیچ تھے۔ وہ اور کوئی عورت بھگا لاتے؟ یا کوئی عورت اُس کے ساتھ بھاگ آتے؟ اسکا یہ کارنامہ بھی غیر انسانی تھا اور میرے اس دعوے کی زبردست تائید کرتا کہ وہ انسان نہ تھا۔

کیا وہ انسان تھا؟ وہی انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے؟ اس کے عادات واطوار تو ایک غلیظ کیڑے کو بھی شرماتے۔ وہ دن بھر بھیک مانگتا اور شام کو بہت سا سڑا گلا کھانا لیکر میرے مکان کے سامنے نالی کے قریب آ بیٹھتا اور پھر آدھی رات تک اپنا کھانا ہی کھایا کرتا۔ مجھے نہیں علم کہ وہ کب سوتا۔

بھیجا پلپلا کردینے والی گرمی اور تمازتِ آفتاب میں وہ تارکول کی دہکتی ہوئی سڑکوں پر اطمینان سے ننگے پیر ادھر اُدھر گھوما کرتا۔ شدید سے شدید سردی کی راتوں میں جب کہ ایک اُنگلی بھی لحاف سے باہر نہ نکالی جاسکتی وہ اپنے برہنہ جسم پر جس پر سوائے ایک آدھ گز کی لنگوٹی کے اور کچھ نہ تھا وہ ایک تاگے کا بھی اضافہ نہ کرتا۔ موسمی تغیرات سے وہ بالکل ہی غیر مانوس تھا۔ معلوم ہوتا جیسے وہ انکا مذاق اُڑا رہا ہو۔

اگر وہ انسان تھا تو اُس کو کسی عجائب خانہ میں رکھنا چاہیئے تھا اور اس کے کٹہرے کے سامنے وکیلوں کا ایسا سائن بورڈ لگانا چاہیئے تھا۔ "انسانیت کو اس حد تک ذلیل کیا جاسکتا ہے" یا "ہماری سماج اپنے افراد سے اس حد تک غیر متعلق ہے" یا موجودہ سرمایہ دارانہ سماج کی فتوحات کیلئے اس کا وجود ایک جیتا جاگتا تمغہ یا شیلڈ تھا۔

۔ نہ معلوم کیوں وہ بھک منگوں کی ٹولی میں بہت زیادہ مقبول تھا۔ شاید اُن کے فن میں وہ کامل یا سرکردہ گروہ کی حیثیت رکھتا۔ اگر بھک منگوں کو ووٹ دینے اور اپنا نمائندہ منتخب کرنے کا حق حاصل ہوتا تو وہ ضرور اس کو اسمبلی یا کونسل کا ممبر بنا دیتے۔ ہمیشہ ایک نہ ایک فقیر اُس کی مصاحبت میں حاضر رہتا۔ وہ اُن سے بڑے تحکمانہ اور بزرگانہ لہجہ میں گفتگو کرتا۔ اسکی آواز میں منمناہٹ کا ایک ایسا ہارمونیم بجتا کہ بہت کم ہی لوگ اُس کی بات سمجھ پاتے۔

ایک روز شام کو مَیں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور خیالات کی کشمکش اور تنہائی کی وجہ سے کچھ مکدر سا ہو گیا تھا۔ میرے کوٹھے کے بالکل سامنے "وہ انسان" چند فقیروں کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا۔ وہ ہنستا کبھی نہ تھا صرف ہنسنے کے موقع پر اپنا غلیظ مُنہ پھاڑ دیتا۔ مجھے نہ معلوم کیوں اُس پر غصہ آرہا تھا اور اس سے ایک غیرارادی حسد معلوم ہوتا۔ اس چھین جھپٹ کے سماج میں جہاں ہر شخص کا مفاد دوسرے شخص کے منافی ہے اور جہاں کشمکشِ حیات میں ہمیشہ نفسی ہی نفسی پڑی رہتی ہے اس قسم کا جذبہ چنداں تعجب انگیز نہیں۔

مجھے آپ ہی آپ اس کو چھیڑنے کو جی چاہا۔ کئی روز پیشتر میری ایک گھڑی کھو گئی تھی۔ میں نیچے اُتر کر اُس کے پاس گیا اور اس سے ڈپٹ کر کہا: "تم میری گھڑی چُرا لائے ہو؟"

بالکل خلافِ توقع اُس نے عجیب نفرت و حقارت سے مجھے دیکھا اور پھر اپنا مُنہ پھیر لیا، جیسے مَیں کوئی پاگل ہوں۔ اُسکی آنکھوں کی چمک سے مَیں دنگ رہ گیا ——— غربت، بیکسی اور لاچارگی کے منوں راکھ کے ڈھیر میں خودداری کی ایک چنگاری سُلگ رہی تھی!!

"وہ بھی انسان ہے، وہ بھی انسان ہے" مَیں بڑبڑاتا ہوا اپنے کوٹھے پر بھاگا۔

کاش کہ وہ چنگاری چیخ کر ایک شعلہ ہو جاتی جو سارے عالم کو محیط کر لیتا۔

وجاہت سندیلوی
بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔

تجلّیات

ماناکہ تیرے حُسن سے ہر ذرّہ طُور تھا
کیا مجھکو اعترافِ تجلّی ضرور تھا؟

شاید مری وفا پہ یقینِ وفا نہیں
عُذرِ ستم تو اُن کی عنایت سے دُور تھا

ذوقِ نظر کو دیدۂ موسیٰ بھی ہو نصیب!!
یوں تو ہر ایک جلوہ ترا برقِ طُور تھا

ناکردگیٔ جُرم سے محرومِ عفو ہوں
مَیں بے قصور تھا یہی میرا قصور تھا

صد شکر بے دلی ہوئی انجامِ آرزو
دل ورنہ ابتدا سے بہت ناصبور تھا

کم مائیگیٔ شوق پہ اللہ رے کرم
میرے نیازِ عشق پہ تجھکو غرور تھا

ہر داغ ہے چراغِ سرِ طور آج بھی
دل کے حریمِ شوق میں کس کا ظہور تھا؟

دونوں کو تیرا عکس ہوا جلوۂ آفریں
بس اتنا فرق ہے کہ یہ دل ہو وہ طُور تھا

تابشؔ مری نگاہ نہ تھی درخورِ حجاب
وہ جلوہ پھر بھی ذوقِ تماشا سے دُور تھا

تابش دہلوی

بھورہ

چمپا اب بوڑھی ہو گئی تھی۔ اُس کا بُڈھا مدت ہوئی بیکنٹ سدھار چکا تھا۔ گاؤں کے شکستہ کچے گھر میں اب صرف دو متنفس تھے بوڑھی چمپا اور اُس کی لاڈلی بھورے کی ماں جس کو اُس نے چھٹپن سے مثل اولاد کے پالا تھا بھورے کی ماں اب جوان ہو گئی تھی۔ موٹی تازی فربہ، چکنی چپڑی، مگر کالی کلوٹی۔ کٹورے سے دو پھٹے پھٹے دیدے۔ خُوب لمبی چوڑی چکلی، جیسے دیونی۔ مگر نہایت خوبصورت حسین۔ بہت کھانے والی کم بولنے والی۔ بھورا پیٹ میں تھا اس کی ماں اب پورے دنوں تھی۔ اسی لئے چمپا نے اُس کا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ شب و روز وہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں محدود کر دی گئی تھی جس کا فرش علاوہ کچا ہونیکے سیل گیل اور غلاظت سے ملوث تھا۔ عام طور پر ایسے زمانے میں غذا تھک جایا کرتی ہے مگر بھورے کی ماں کی بھوک اس بلا کی تھی کہ کسی طرح اس کا پیٹ بھرتا ہی نہ تھا اسکو صرف ایک ہی کام تھا جس میں وہ ہر وقت مشغول رہتی تھی، کھانا، ہر وقت نگلنا اور اَور کھانے کے لئے جگہ کرنا۔ سوہضمی، کھٹی ڈکاریں، چھاتی کا جلنا، بھوک کا نہ لگنا، اختلاجِ قلب، یہ صرف ان ماماؤں کا حصہ ہے جو عیش و عشرت میں پلی بڑھیں۔ جسمانی مشقت سے قطعی بیگانہ۔ ناز و نعمت کی مصنوعی زندگی سے قوتِ ہاضمہ کھو بیٹھی ہوں۔ بھورے کی ماں کی زندگی ہمیشہ سے عین فطرت کے مطابق رہی تھی۔ بھلا دیہات کی پیداوار جس نے سپنے میں بھی شہر نہ دیکھا ہو اس کو ان امراضِ عیش سے کیا واسطہ بھلا ہے ایک چھوڑ دو بچے پیٹ میں ہوں۔

بوڑھی چمپا اس ڈائن کا تنورِ شکم جھونکتے جھونکتے ہار ہار جاتی تھی مگر اس کی انتڑی اس غضب کی پھٹی ہوئی تھی کہ الٰہی توبہ۔ ایک دن چمپا جل ہی تو گئی۔ "ہے تجھے آتے ڈھائی گھڑی کی" ٹھائیں دو لٹھ بھورے کی ماں کے آہنی جسم پر چمپا نے رسید کرتے ہوئے کہا "نخصمی، اُتی، ابھی دھڑی بھر کھانے کو دیا ہے۔ ہے لے کھا پی کر پھر بھوک کی بھوک تِلملا رہی ہے۔"

بھورے کی ماں نے دو عدد ضربِ شدید کا صرف اتنا اثر لیا کہ ذراسی کِھسک کر پرے کونے میں ہو گئی۔ کٹورے سے دو بڑے بڑے دیدے گھما کر بڑھیا کی طرف دخترانہ شفقت سے دیکھا۔ پھنکار کی قسم کا ایک بے معنی ٹھنڈا سانس بھرا اور گھوم کر جو کچھ برتن میں لگا رہ گیا تھا چاٹنے میں مشغول ہو گئی۔

"ایسا بھی کیا نل پھٹ گیا۔ پہلے ہی کال پڑ رہا ہے۔ بچہ دینے کے نام ٹس سے مس نہیں ہوتی" بوڑھی چمپا بڑبڑاتی رہی۔ بھورے کی ماں نے گویا سُنا ہی نہیں۔ اِدھر اُدھر جو گر پڑا تھا وہ اُس کو نیگ لگا رہی تھی۔

رات کے دو بجے ہوں گے۔ بھورے کی ماں درد سے بیچین تھی۔ گھڑی اٹھتی گھڑی بیٹھتی۔ کبھی اِس کروٹ کبھی اُس کروٹ۔ باوجود اس کرب اور بیچینی کے موقع ملنے پر وہ ایک آدھ لقمہ اُڑا ہی جاتی۔ یونہی سا مُنہ چلایا اور نگل گئی۔ درد بڑھتا گیا۔ اور وہ چیخی چلائی۔ بُڑھیا کو بلانا چاہتی تھی مگر وہ ایک اور کوٹھری میں دن بھر کی تھکی ہاری، جاڑے پالے سے بچی ہوئی اپنی گدڑی میں گٹھری بنی لپٹی لپٹائی پڑی تھی۔ بھورے کی ماں کی آواز اُسکے بوڑھے کان نہیں سُن سکتے تھے۔ درد کی شدت سے بیچین ہو کر زچہ نے باہر جانے کی کوشش کی مگر دروازے بند تھے۔ اُسنے گھوم پھر کر اِدھر اُدھر اپنا سر دے دے مارا۔ بُڑھیا کے بیدار نہ ہونے سے قدرت کیوں مفلوج ہوتی۔ آخر کار اس تنگ و تاریک کوٹھری میں بغیر کسی مدد کے زچہ خیر سے فارغ ہوئی۔ یعنی میاں بھورے نازل ہوئے۔ پہلی دفعہ جو آنکھ کھول کر دیکھا تو اس متعفن اندھیرے میں پہاڑ سی ماں جیسے رات سمٹ کر یکجا ہو گئی ہو، ان کو ماما سے بیقرار ہو کر اپنی زبان میں لپیٹے لے رہی تھی۔ بھورے کا جسم نڈھال اَور درد سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ اُس کی امی جان نے ازراہِ شفقتِ مادرانہ جبکہ نہلانے سے وہ مجبور تھی اور مالش کرنے سے لاچار۔ اس کو چاٹ چاٹ کر ساؤ نتا کر لیا۔ آخر بھورے اپنی ماں کے پُوت تھے۔ اُسی ماں کے پُوت جس کا قول تھا ایک مُنہ چلے ستر بلا ٹلے۔ آخر بھوک سے کیوں محروم الارث رہتے۔ دودھ پینے پر جو تُلے تو ایک قطرہ نہ چھوڑا ماں کو اس بُری طرح چچوڑا کہ آخر اس کو دھکا دیتے بنی۔

بھورے میاں، میاں ویاں کچھ نہیں تھے بلکہ محض بھورے تھے صرف بھورے۔ ان کو بھورے میاں کہنا تو بنی نوعِ انسان کی توہین ہے۔ یہ دراصل ایک بھینس کا ہونہار پوت اور زمانے کا لاچار سپوت ہے۔ زمانہ جس پر تہذیب و تمدن اثر انداز ہے اور جو جانوروں کو پشتہا پشت سے اپنے رنگ میں رنگ کر اُن کی فطرت میں تصرف کر رہا ہے۔ قدرت نے بہت سے بیش بہا عطیئے جو فیاضانہ طور پر جانوروں کو ودیعت کئے گئے

تھے حضرتِ انسان نے اِن جانوروں کو رام کر کے اور اپنی جیسی مصنوعی زندگی کا عادی بنا کر اُن کو انقدر عطیات سے ایک حد تک محروم کر دیا ہے۔

چمپا حسب عادت بہت تڑکے اٹھی۔ سب سے پہلا خیال جس نے اُس کے دماغ پر تفکرانہ وار کیا وہ اس کی گیابن بھینس کا تھا۔ وہ دعائیں مانگتی تھی کہ "خدا کا حکم" جلدی ہو جائے تو اُس کے گھر میں دودھ کی ریل پیل ہو جائے۔ اس کو بنئے کے روپے بھی تو دودھ کی شکل میں ادا کرنے تھے۔ روپے کا تو یہ پکا دودھ اور ہاں بڑھاپے کی طرح بڑھتا ہوا سود نہ صرف بھینس کا تمام دودھ سونت لے گا بلکہ شاید بڑھیا کا خون بھی۔ چمپا کی آہٹ پاکر بھینس نے رھنکنا شروع کر دیا۔ "بھوکی ہے بھوکی!" چمپا بھینس سے باتیں کرنے لگی۔ آواز سُنکر بھینس اور بھی زیادہ رھنکنے لگی۔

"اچھا اچھا لاؤں ہوں! لاؤں ہوں! ٹھہری رہ۔ ہاں ہاں لاؤں ہوں" بڑھیا نے پُولی کاٹنی شروع کی بھینس رہنکتی رہی بڑھیا پولی کاٹتی گئی اور ہر رہنک کا جواب دیتی گئی۔

دروازہ کھولتے ہی جب اُس نے دیکھا کہ بھینس کے دو ہو گئے ہیں تو وہ خوشی سے پھاند پڑی۔ پوپلے مُنہ کی باچھیں پھٹ کر کانوں سے جا ملیں! "انار کلی! ہے انارو!!" اُس نے دیوار سے سر نکالتے ہوئے پڑوسن کے گھر میں جھانکتے ہوئے آواز دی "اری دیکھ تو بھینس رات بیائے بری" انار کلی چکّی پیستے پیستے چلی اور اپنی پڑوسن کو چیخ کر آواز دی "اری ہر دئی۔ اری گھر لبی چل تو چمپا کی بھینس بیائے پری"

انار کلی، ہر دئی اور دوسری پڑوسنیں چمپا کی خوشی میں شریک ہو گئیں۔ گویا چمپا کی نہیں اُنہی کی بھینس بیاہی تھی "اری بہنا! میں یوں پوچھوں ہوں اُک کٹرہ ڈالا کہ کٹری" رمّو نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"دِکھا نا ابھی تو" چمپا نے جواب دیا اور انارو سے کہا "اری گھر گئی اُٹھاکے دیکھے نہ ہے، آنا کٹرہ ہے کٹری"

"بھورا ہے بھورا" انارو نے نومولود کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہے تیرا ناس جائے" انارو بولی "کٹرہ ڈالا ہے نخصمی نے کٹرہ" اس اعلان نے چمپا کی خوشی میں کمی کر دی۔ کیونکہ کٹیا کی قیمت بہ نسبت کٹرہ کے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر زچہ پر اس ریمارک کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"اری چمپا او بہری پٹ" انارو نے بڑھیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "اری سُنے نہ ہے، اری مو کا برتن لا پیوسی نکالدوں۔ ہم تو باٹ دیکھ رہے تھے کہ تیری بھینس بیائے پرے تو ہم پیوسی کھائیں"

"ہا مجھے بھی دیجو" ہر دئی نے چیخ کر کہا۔

"ہے گھر گئی مجھے نہ دیگی تنک سی" رمّو نے پُکار کر کہا۔

اتنے میں گاؤں کے بنئے کا بیٹا موتی بڑی سی لُٹیا لئے داخل ہوا "ہے بڑی! او بہری!! بابو نے کہا ہے مہورت نہ بگاڑیو۔ سب سے پہلے ہمیں پیوسی دیجو"

بڑھیا کا بشاش چہرہ بنئے کے خیال سے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

بھینس کے دودھ کی حیات افروز اور جاں بخش دھاروں کا اثر بھورے پر کم ہوا اور سبر جو بنئے پر زیادہ۔ بھورے کو دودھ ہی کتنا ملتا تھا، گنتی کی دھاریں، اگر وہ کٹیا ہوتا تو شاید امید فروا پر بڑھیا اُسکو اپنی ماں کے تھنوں سے پندرہ بیس رُوح فزا دھاریں اور پی لینے دیتی مگر بھورے کا سب سے بڑا جُرم یہ تھا کہ قدرت نے اُسے نر پیدا کیا تھا اور ایسے نروں کی سماج کو بہت کم ضرورت تھی۔ تاہم بھورا کچھ تو ماں کے دودھ سے اور کچھ محض اس کی آس اُمید میں پلتا بڑھتا رہا۔ پلتا کُٹتا رہا اور خوب گھسیٹا جاتا، ایک کہ گلا گھٹ کر رہ جاتا۔ اس کے سپرد بس ایک ہی خدمت تھی ـــــ صبح شام اپنی ماں کو ہونک مار مار کے اور دُم ہلا ہلا کر پوا سنا۔ اور جب ماں پواسی جاتی تو اُس کو کھینچکر، گھسیٹ کر کھُونٹے سے باندھ دیا جاتا۔ کیسا ظلم ہے، وہ دودھ جو اُس کی پرورش کے لئے قدرت نے پیدا کیا تھا انسان غصب کر لیتا۔ یہ ظلم، یہ حق تلفی، کچھ کٹروں ہی کیلئے مخصوص نہ تھی بلکہ ان کے چچا زاد بھائی بچھڑے، جن کا درجہ سماج میں ان سے بڑھا ہوا ہے، اُن کے ساتھ بھی یہ ظلم اور حق تلفی زمین کے چپے چپے پر ہوا کرتی ہے۔ ٹھنڈے دل سے ذرا اس مسئلہ پر غور کیجئے کہ انسان کا ایک ضعیف مخلوق کے ناتواں بچے کی ایسی حق تلفی کرنا اخلاقی طور پر کہاں تک جائز ہے۔

ہاں! میں کہہ رہا تھا۔ بھورے کو کھونٹے سے باندھ دیا جاتا۔ یہ بہت تلملاتا زور لگاتا اور دیکھا کرتا کہ دودھ کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا۔ دودھ نکال لینے کے بعد اس لغو خیال کے ماتحت کہ ماں بچے کیلئے دودھ چڑھا کر اور چرا کر کسی خاص جگہ بچا رکھتی ہے، بھورے کو ایک دفعہ پھر چھوڑ دیا جاتا۔ مگر اب ان خالی چار سونتے ہوئے تھنوں کو خواہ مخواہ چھوڑنا ماں کو ناگوار گذرتا اور وہ لات مار کر اپنے جائیتے کو ہٹا دیتی۔ بھورے کو ماں کی آغوش سے کھینچکر دُور کھونٹے سے باندھ دیا جاتا جہاں وہ نہایت مایوسی سے نڈھال پڑا دوسرے وقت کا انتظار کرتا رہتا۔

کسی مسخرے نے کٹرے کو ایسی ہی مایوسی میں پڑا دیکھکر پوچھا کہ "کہو میاں کٹرے کیا حال ہے؟" کٹرے نے اپنی چیپڑ بھری آنکھوں کی

لمبے لمبے کانوں سے مکھیاں اُڑاتے ہوئے کہا "بھیا ہم فاقہ کشوں کا کیا حال پوچھتے ہے۔ ہم بُھوک کے ماروں کا بس اتنا فسانہ ہے، ہم اسکی بھینس پوا سے ہیں وہ ہمیں پولی میں پڑا رہنے دے ہے" دراصل اِس نادان کو معلوم ہی نہ تھا کہ بھینس کو پوا سنا اور پولی میں پڑا رہنا اُس کی زندگی کا بہترین دَور ہے۔ کھونٹے کی بندش سے لاچار اور بُھوک کی حالت میں پولی جیسی محفوظ جگہ میں مایوسانہ طور پر اپنی ماں کے دودھ بھرے نرم نرم گداز اور چکنے تھنوں کو تکتے رہنا آئندہ آنے والی مُصیبتوں کے مقابلے میں واقعی زندگی کا زرّیں دَور ہے۔

کانگریسی وزارت کے ایک اعلیٰ رکن نشہ حکومت سے چور، پرماتما جانے کیوں جیو ہتیا سوجھی۔ سینکڑوں برس کی مسلسل غلامی کے بعد عنانِ حکومت ہاتھ میں آجانے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ حکومت کے اجزائے ترکیبی کا ایک اہم جُزو شکار بھی ہے۔ ان کی ادنیٰ جُنبشِ قلم اور آنکھ کے خفیف اشارے سے انہی جیسے انسان محض افلاس کے جُرم میں لقمۂ اجل بنا دیے جاتے تھے، تو پھر شیر جو محض ایک جانور ہے اس کا شکار کرنا کون سی بڑی بات تھی۔ حکم کی دیر تھی اور سب کام حسب پروگرام ہو رہے تھے۔ کٹڑوں کی فراہمی داروغہ جی کے سُپرد تھی جنہوں نے منی لال سپاہی کو اس کام پر چھوڑ رکھا تھا کہ برائے نام قیمت پر کم سے کم آٹھ کٹڑے فراہم کرے۔ یہ بھی تاکید تھی کہ ایک کٹڑہ غیر معمولی طور پر چھوٹا ہو تاکہ جنگل میں باندھنے سے خُوب رہینکے اور شیر اُس کی آواز پر لپک کر پڑے۔ منی لال کو سات عدد کٹڑے ڈیڑھ دو سال کی عُمر کے مل گئے۔ مگر کم عُمر کٹڑے کو حاصل کرنے میں اُس کی دھونس ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جویندہ یابندہ آخرکار منی لال ڈھونڈتے بھالتے عیسیٰ پور بھی جا نکلے، جہاں بوڑھی چمپا کی لاڈلی بھینس کا اکلوتا بھورا اپنی ماں کے سایۂ عاطفت میں پل رہا تھا۔ عیسیٰ پور یوں بھی افلاس زدہ قصبہ تھا اور پچھڑا وارث چمپا کی حمایت کرکے کون مُفت میں پولس کے مگرمچھ سے بیر باندھتا۔ البتہ چمپا کو روتے اور پچھاڑیں کھاتا دیکھکر سب ہی دل کُڑھ رہے تھے۔ منی لال نے ایک پرچے پر بھورے کا حُلیہ لکھا۔ "ایک کٹڑہ نام بھورا ولد بجو ذات بھینس عمر سات ماہ پیشہ پولی میں کھڑا رہنا۔ ساکن قصبہ عیسیٰ پور علاقہ ہذا بقیمت مبلغ پانچ روپے مسماۃ چمپا بیوہ کھچیڑو نے بدست منی لال نانک فروخت کیا۔ قیمت وصول پائی" بڑھیا کا نشان انگوٹھا لیا، گانٹھ سے تین روپے اور مُنہ سے دس گالیاں نکال کر بڑھیا کو دے بھورے کو کھول کھال مارتا پیٹتا ہانک چلا۔ بڑھیا پر آفت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ بہتیرا ردئی پیٹی کہ بھینس دودھ نہ دیگی مگر کمزور کی کون سُنتا ہے۔ کٹڑے نے ماں کی جُدائی سے رہنکنا شروع کیا۔ ماں کو نالہ ہائے فراق سُنکر تاب نہ رہی۔ یہ بھی لمبے لمبے سانسوں سے رہنکی اور آخرکار رسّا تڑا کر بھاگی اور کٹڑے سے جا ملی۔ سر پیٹتی اور چھاتی کوٹتی بُڑھیا بھی دوڑی "ہے رام۔ ارے دیا۔ ارے میرے بھورے ۔۔۔ ہے میری میّا ۔۔۔ ابھی تو بنئے کا کرج بھی نہ اترا ۔۔۔ ارے کیا جلم آگیا رے"

فطرۃً "تحفظ اولاد" کے جذبے سے برافروختہ ہو کر بھینس کو چاہئے تھا کہ دُشمن پر اپنے بچے کو آزاد کرنے کے لئے مدافعانہ حملہ کرتی۔ مگر انسان نے تو جانوروں کو رام کرکے اُن کی فطرت میں تصرّف کر لیا ہے۔ چنانچہ "تحفظ اولاد" کا جذبہ اس پالتو بھینس میں گھُٹ کر صرف اتنا رہ گیا تھا کہ وہ بچے کے ساتھ ساتھ ہولے اور بس۔ اسی کی ہمجولی جنگلی بھینس جو انسانی تصرّفات اور غلامانہ زندگی سے آزاد ہے، کیا اپنے "لختِ جگر" کو یوں جاتا گوارا کر لیتی۔ توبہ! توبہ! ہرگز نہیں۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر دُشمن کو زمین کا پیوند بنا دیتی اور بچے کو آزاد کر کے رہتی۔ اور اس غلام بھینس کو ملاحظہ کر لیجئے کہ ہولی ساتھ ساتھ۔ منی لال نے کٹڑے کو تو دیا باندھ اور بھینس کی وہ کُٹائی کی کہ ممتا کا جذبہ تھوڑی دیر کے لئے جاتا رہا۔ گاؤں والوں نے منی لال کی ڈانٹ سے بھینس پکڑ لی۔ مارتے کوٹتے لے گئے اور جا باندھا ٹھکانے پر۔ ماں باوجود لاٹھیوں سے پیٹی جانے کے ماں رہتی ہے۔ زور لگا لگا کر اُس نے آہنی زنجیر سے اپنی گردن زخمی کر لی۔ کُھروں سے تمام زمین اُدھڑ گئی۔ رہنک رہنک کر گاؤں اُٹھا لیا۔ چمپا جس کی آنکھوں میں دُنیا اندھیر ہو رہی تھی، بے بسی اور بیکسی کی حالت میں پڑی پیٹ رہی تھی۔ کس کس طرح بلک بلک کر اُس نے بھورے کو یاد کیا ہے اور پولیس کو سا ہے کہ سُننے والوں کے دل پھٹے جاتے تھے۔ قصّہ مختصر بھینس نے کسی چیز پر مُنہ نہ ڈالا۔ دودھ نکالنے کے نام وہ لات مارتی۔ اور بچے کا یہاں تک ہُڑکا کیا کہ ہتھنی سی بھینس گھُل کر نرا ہڈیوں کا ڈھانچ رہ گیا۔ بُڑھیا کے دل پر بھینس کے گھُلنے کا اور بنئے کے بڑھتے ہوئے سُود کی قرقی کا جس میں بھینس قرق کر لی گئی تھی کچھ ایسا دھکا ہوا کہ دل کی حرکت بند ہو جانے سے مسلسل نصف صدی کی صعوبتوں کا خاتمہ ہوا۔ بہت جلد اُس کی لاڈلی بھی جس کو اُس نے مثل اولاد کے پالا تھا بڑھیا سے ایک اور ہی دُنیا میں جا ملی۔ ایسی دُنیا میں جہاں نہ جور و استبداد کی منسٹری تھی، نہ ظالم پولس کی دھونس اور نہ برچھو بنئے جیسے خوں آشام و چلیٹرین ([illegible]) درندے۔

منی لال نے پگڈنڈی پر آگے آگے کٹڑہ دھر لیا کچھ ہزار [illegible]

اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ذرا کٹڑے نے دائیں بائیں مُڑنے کا ارادہ کیا اور اسنے بڑھکر تھوتنی پر ایسی دی کہ بھورا آنکھ مچکا کر رہ جاتا۔ ذرا قدم سُست ہوا کہ شائیں سے ٹانگوں پر ایسی کہ کھال اُڑ گئی۔ بیچارے کو آگے آگے بھاگتے ہی بن پڑی۔ بھورے پر ایسی اُفتاد بھلا پہلے کیوں پڑی تھی۔ لے دے کے مُصیبت تھی تو صرف اتنی کہ دودھ برائے نام ملتا تھا۔ اب جو چار چوٹ کی مار پڑی اور بھاگم بھاگ منزل طے کرنی پڑی تو چھٹی کا دودھ پتلے گوبر کی صورت میں بار بار خارج ہونے لگا۔ کونچیں اور رانوں کا پچھلا حصّہ مع کولوں کے دُم کی جُنبش سے گوبر میں سنا ہوا، زبان نکلی ہوئی سر جھکا ہوا اندھا اور بے حال۔ پٹتے کُٹتے آخر تھانے کے میدان میں داخل ہوئے جہاں اُسکے ہم جنس مگر قدو قامت میں بڑے سات عدد اور زمین پر مُنہ مار رہے تھے۔ تین جوٹیں پہلے ہی بندھی ہوئی تھیں۔ ساتویں کٹڑے سے بھورے کی جوٹ لگا دی گئی جو بھورے کو سارے میں کھینچا کھینچا پڑا پھرا۔

کانگرسی "صاحب بہادر" ایسا بہادر جو چار دیواری کے جنگل میں میز کرسی کا مچان باندھے۔ میدانِ قرطاس میں الفاظ کے ہانکے کے ذریعہ قلم جیسے خطرناک ہتیار سے اقلیت کے شیروں پر میلوں پرے سے ایسی قادر اندازی سے فائر کرنے والا کہ گولی کھانے کے بعد شیر کو اپنے کاری زخم سے جانبر ہونے پر آواز نکالنے کا بھی مقدور نہ ہو۔ مورگھٹی بلاک میں اب شیر کے شکار کو آرہا تھا۔ پروگرام بھیجدیا گیا۔ اٹھارہ کی صبح "میں"، بجنور کار سے آرہے تھے۔ صبح کی چائے پنڈت ہری رام کے ہاں۔ نو بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک کانگریس مین سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات۔ بارہ بجے لالہ رگھوناتھ توندل صدر پراونشل کانگریس کمیٹی کے ہاں لنچ۔ دو بجے دن کو کار سے مورگھٹی روانگی۔ شام کو کل یعنی مار پر بیٹھنا۔ چونکہ صاحب اٹھارہ کی شام "میں" مورگھٹی پہونچ رہے تھے، سولہ کی صبح چار جوٹیں یعنی آٹھ عدد کٹڑے قمرو شکاری، فتیا اور جیتا چمار کی نگرانی میں تھانہ جلال آباد سے روانہ کردئے تھے۔ قمرو نے اپنے لئے کئی وقت کے ٹکڑ جھولے میں بھر لئے تھے۔ یہ جھولا کیا تھا عمرو عیار کی زنبیل تھی۔ ایک جوڑا کپڑوں کا، حقّہ، کوئلے، تمباکو، بیڑی، ٹوٹے ہوئے بٹن، کھنڈی سوئی، میلا تاگا، ڈولچی ڈور، چمٹی، نمک چٹیا، دو ایک دوائیں اور خبر نہیں کیا کیا اس مختصر جھولے میں بھرے پڑے تھے۔ جیتا اور فتیا نے چبینا باندھ لیا تھا مگر غریب کٹڑوں کی بھوک کا سوال کبھی کے ذہن میں نہ آیا۔ یہ لوگ کٹڑوں کو اندھیرے ہی سے ہانک چلے تھے۔ فتیا اور جیتا کے ہاتھ میں لاٹھیاں اور قمرو کے پاس کلہاڑا تھا۔ غنیمت ہے کہ قمرو نے صرف کلہاڑے کا دستہ ہی استعمال کیا۔ ورنہ منزل پر کٹڑوں کا قیمہ ہی پہونچتا۔

بھینس بہت ہی سُست اور ٹھس جانور ہو گیا ہے۔ جنگلی بھینسوں کی سی فوں فاں اور دوڑ بھاگ اس میں رہی ہی نہیں۔ اب اس کی چال صرف اس لئے باقی رہ گئی ہے کہ چرنے کے لئے اپنے تئیں اِدھر اُدھر گھسیٹ لیا کرے۔ اور جو کھونٹے پر کھانے کو مل جائے تو مہینوں چلنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو بھوک پیاس سے ہی مجبور ہو کر قدم اُٹھانے کی تکلیف گوارہ کرتی ہے ورنہ دیکھ لیجئے کیا مجال جو گوبر سے دو قدم پرے ہو کر بیٹھ جائے۔ تو آخر یہ کٹڑے بھی بھینس کے پوت تھے۔ بہت جلد تھک گئے اور لگے بغلیں جھانکنے، اور کچھ اِلو پہلو کا سبزہ بھی اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مگر جیتا اور فتیا دائیں بائیں فرشتوں کی طرح تعینات تھے بڑھکر تھوبڑے پر ایسا لٹھ دیتے کہ مُنہ پھر جاتا۔ یوں بھی اچھے خاصے چلتے چلاتوں کی خواہ مخواہ پٹائی ہوتی جارہی تھی صرف اس لئے کہ وہ تیزگام نہ تھے۔ اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور۔ ان کی قدرتی رفتار ہی یہ تھی۔ انسان اگر لمبے سفر میں آہستہ چلے تو جلد تھک جاتاہے۔ اس تمام مار دھاڑ کا مقصد ہی یہ تھا کہ کٹڑے کم از کم آدمی کے برابر مُستقل قدم اُٹھائیں جو قطعی ناممکن ہے۔ مگر ان جاہل ہانکنے والوں کو اتنی سوجھ بوجھ کہاں۔ کٹڑوں کو مار مار کر اُنہوں نے سچ مچ کھال اُڑادی۔ سب سے زیادہ مار غریب بھورے پر پڑی کیونکہ ان سب میں یہی چھوٹا تھا اور بہت چھوٹا، اس لئے اس کا قدم بھی چھوٹا تھا اور سب سے پیچھے پٹنے کے لئے رہ رہ جاتا تھا۔ ٹھائیں سے کولہے کی ہڈی پر لکڑی پڑی۔ لپ جھپ دو چار قدم تیزی سے چلا اور پھر پیچھے کا پیچھے۔ دوپہر کو ان لوگوں نے کنوئیں کے سہارے کھا پی کر گھنٹہ بھر آرام کیا۔ مگر کٹڑوں کو تنورِ شکم کیلئے ایندھن تلاش کرنا تھا، وہ بھی اس طرح کہ دُور نہ جانے پائیں۔ چارے کی قِسم میں سے وہاں تھا ہی کیا۔ سخت گھاس کے چرے ہوئے اور مٹے ہوئے نشانوں پر یہ بھوک کے مارے مُنہ مارتے پھرے۔ بھورے نے چاہا بھی کہ پڑ رہے مگر اُس کی جوٹ نے اُسے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ تو یہ بہت غنیمت ہوا کہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جو کبھی گرمی ہوتی تو یہ سفر بہت جلد آخری منزل پر پہونچا دیتا۔ تقریباً گھنٹہ بھر بعد پھر کٹڑوں کی کُٹائی شروع ہو گئی۔ مکھیوں نے کھال میں چٹیں پڑ جانے سے دُم کی بیقراری میں اضافہ کر دیا تھا۔ الغرض گالیاں کھاتے، پٹتے کُٹتے، گرتے پڑتے، خاک پھانکتے، کنڈی کنڈی چلتے چلتے دن مُندے بگ نلے کے قریب ایک چھوٹی سی آبادی میں پہونچ گئے۔ یہاں فتیا چمار کی رشتہ داری تھی۔ کٹڑوں کو ایک گھیر میں دھانس دیا۔ ان کے چارے کا سوال بلکہ خیال اب بھی پیدا نہیں ہوا۔ خوش قسمتی سے اس گھیر میں تھوڑی سی پرال روندی روندائی جسے کسی

ڈھورے نے قبول نہیں کی تھی، پڑی ہوئی تھی۔ کٹڑوں نے اُسی پر مُنہ مارا اور بہت جلد جھاڑو سی دیدی۔ تھوڑی دیر چارے کے انتظار میں رہے آخرکار مایوس سا نہ پڑ رہے اور چارے کی یاد میں خالی جبڑا چلا کے دانت پیس لئے۔ فتیا اور جیتا کے مزے آگئے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی یہاں تک کہ بگڑ کی روٹی اور مٹھا ملا۔ پینے کو حقہ اور اوڑھنے کو گدڑی بھی۔ ترلوکا نے قمرو سے بہتیرا کہا۔ "مکا کھا نساب جی کھابھی لو پرے کو کوئی ڈر تھوڑا ہی ہے" نقیا اور جیتا نے بھی پُرزور الفاظ میں تائید کی۔ مگر خانصاحب نے انکے کنوئیں کے پانی سے اپنی گڑگڑی بھی تازی نہ کی تھی۔ وہ غریب تھے تو کیا آخر کو تھے تو پٹھان اور پٹھان بھی کیری۔

"نہ نہ نہ۔ کوئی نہ میں تمہارے ہاتھ کا نہ کھتا۔ تم کھاؤ ہو بدجناور"۔ خانصاحب نے گڑگڑی بجاتے ہوئے کہا۔ "کوئی پرہیز تھوڑا ہی ہے۔ ہاں آگ بیٹنگ میں لے سکوں تمہارے چلمے سے"۔ سٹرسٹر۔ سٹرڑ۔۔۔ڑ۔۔۔ڑ۔۔۔ سٹرڑ۔۔۔ڑ۔۔۔ڑ۔ قمرو کی ہکڑی باجتی رہی۔

بہت تڑکے کچھ رات رہے یہ لوگ پھر کٹڑوں کو ہانک چلے۔ رات بھر کی سردی کے مارے ہوئے کٹڑے اکڑ گئے تھے اور چلا ہی نہ جاتا تھا مگر ڈنڈے کے زور سے بہت جلد ان میں گرمی پہونچا دی گئی۔ آج اُن کا قدم کل سے بھی سُست تھا۔ بھوک کی شدت سے اُن کی کوکھیں دھنس گئی تھیں اور کمزوری غالب آرہی تھی۔ اب اُن کے قدم اُٹھتے نہ تھے بلکہ اُٹھائے جارہے تھے۔

دامنِ کوہ میں کنڈی اژدہے کی طرح بل کھاتی ستے سر کا لاگڈھ بلکہ اس سے بھی اوپر لہراتی چلی گئی تھی۔ بائیں جانب ہمالیہ کا سرسبز و شاداب پہاڑ قدرت کے شاہکار نظاروں کو سینے میں لئے بے پناہ وسعت میں مع اپنی برف پوش اور فلک بوس چوٹیوں کے پھیلا پڑا تھا۔ بائیں جانب دیس کی زرخیز زمین ہتیلی کی طرح سپاٹ ایک اور ہی دُنیا معلوم ہوتی تھی اسی کنڈی کے کچھ اور میل اِن آٹھ کٹڑوں کو شام سے قبل طے کر کے مورگھٹی پہونچنا تھا اور رات سے پہلے شیروں سے مارے جانے کیلئے بندھنا تھا۔ آج معرکہ ہونا ضروری تھا کیونکہ کل اٹھارہ ہیں صاحب کل پر بیٹھیں گے۔ مورگھٹی بلاک کی حد میں داخل ہوتے ہی ایک کٹرہ ڈھول کنڈ سوت میں اندر جا باندھا اور پھر آگے چلکر ایک موگڈی میں۔ بھورے کو جان کر بچایا کیونکہ یہ تو زندہ باندھ کر بیٹھنے کا تھا۔۔۔۔ مورگھٹی بنگلے میں حکام جنگلات نے پورا انتظام کر دیا تھا۔ بڑھ کے درخت کے نیچے دو ہاتھی بھی صاحب کے انتظار میں جھوم رہے تھے۔ بس کٹڑوں کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہوگئی۔ قمرو نے پہونچتے ہی قلی کور کا شمار کیا اور ان کو پانچ ٹھکانے کٹڑے باندھنے کو بتاکر چلتا کیا۔ کیمپ میں صرف بھورا ہی رہ گیا تھا جو بیلوں کے ساتھ پرال کھاتا رہا۔

آج یعنی اٹھارہ میں، صاحب بہادر۔ کپتان صاحب، اور ڈی۔ آف۔ او صاحب حسب پروگرام پہونچتے تھے اور کم از کم دو مچان ماروں پر بندھنے تھے۔ قمرو نے دس بجے تک سب کٹڑوں کی رپورٹ مانگی تھی۔ قمرو کے باندھے ہوئے دونوں کٹڑے مار دیے گئے تھے اور باقی پانچ میں سے تین کی طرف تو شیر چلا ہی نہیں باقی دو کو دیکھکر شیر لوٹ گئے تھے۔ یہ سب کچھ چماروں نے کھوج بٹیر دیکھکر رپورٹ دی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیروں کا کٹڑے کو دیکھکر لوٹ جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان چماروں کو کٹرہ باندھنے کا فن نہیں آتا تھا۔ ان اناڑیوں نے کٹڑوں کو گردن کی رسّی سے باندھ دیا تھا۔ شیر بھلا پھر انہیں کیوں مارنے لگا۔ اُن دو ماروں پر جو ڈھول کنڈ سوت اور موگڈی میں ہوئی تھیں، قمرو نے مچان باندھ دئے اور صاحب لوگوں کو خوش خبری سُنانے کے لئے خوش خوش کنڈی پر منتظر تھا۔ رات ہوگئی مگر صاحب لوگوں میں سے کوئی نہ آیا۔ آخرکار مایوس ہوکر قمرو بہت ہی رنجیدہ لوٹا۔ واپسی میں اُس نے سردی کھائی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

انیس میں صاحب لوگ آئے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں شیعہ سنّی فساد کا بیچ بے وقت پھوٹ پڑا اور صاحب کو ایک دن کی دیر ہوگئی۔ سترہ کی شب میں جو کٹڑے مارے گئے تھے وہ اٹھارہ کی شب میں کھائے جا چکے تھے۔ اٹھارہ کی شب میں کوئی مار ہوئی نہیں اس لئے رینجر صاحب نے ہتھنی سوت میں جہاں دو سوت آکر مل رہے تھے اور شیر بدھا ہوا چل رہا تھا، مچان بندھوایا۔ دوپہر سے ایک ہاتھی، دو چمار اور بھورے کو ہتھنی سوت چلتا کر دیا۔ شام کو چائے سے فارغ ہوکر بڑے صاحب اور رینجر صاحب موٹر میں بیٹھکر ہتھنی سوت روانہ ہوتے۔ موٹر کنڈی پر جہاں ہتھنی سوت ملتا ہے چھوڑ دیا اور وہاں سے ہاتھی پر بیٹھکر مچان پر پہونچے۔

جب یہ لوگ مچان پر خاموش بیٹھ گئے تو ایک قُلی بھورے کو کھینچتا اور دوسرا کولوں پر سنٹیاں اُڑاتا لایا۔ مچان کے سامنے درخت کی جڑ سے کٹڑے کا اگلا پیر باندھ دیا اور دونوں چمار رینجر صاحب کا اشارہ پاکر چلدئے۔ تنہا رہجانے پر بھورے نے بھاگنا چاہا اور گرا جو ہے تو تھوتنی اس زور سے پتھر پر لگی کہ مُنہ میں دانت ہوتے تو قطعی ٹوٹ گئے ہوتے۔ اس کو معلوم ہی نہ تھا کہ گردن کے علاوہ پیر بھی باندھ دیا جاتا ہے۔ تنہائی سے گھبرا کر اُس نے وحشت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اپنی بساط سے زیادہ زور لگایا۔ گھومنے سے رسّا بل کھا کر اور بھی چھوٹا ہوگیا۔ بھورے کو پہلی بار

قیب تنہائی ہوتی تھی۔ ریوڑ کی جبلت نے عود کرکے اُس کی وحشت میں اور اضافہ کر دیا۔ اس کو ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کوئی درندہ اس کو پھاڑ ڈالے گا۔ بلکہ ایک خاص جبلت کے تحت اُسے وحشت ہو رہی تھی۔ جس طرف چمار چلے گئے تھے اُسی طرف یہ بھی جانا چاہتا تھا۔ اُسی طرف مُنہ اُٹھا کر اور کان تھوتنی کی طرف بڑھا کر رہنکنا شروع کیا اور جواب کا متوقع بھی رہا۔ اتنے میں بڑے صاحب جو رینجر صاحب کے ساتھ دم بخود بیٹھے تھے کھانسی کو ضبط نہ کر سکے۔ بس پھر کیا تھا کٹڑے نے مچان پر آدمیوں کو دیکھ لیا۔ اسکی وحشت دُور ہوگئی اور رہنکنا بند کر دیا۔ رینجر صاحب کو بڑے صاحب پر نہیں بلکہ کٹڑے کی خاموشی پر بہت غصہ آیا۔ اُنہوں نے سیٹی دی۔ چماروں کے آنے پر اُن کو حکم دیا کہ "کٹڑے کا کان چاقو سے پھاڑ دو اور اس میں مرچ بھر دو۔ یہ کمبخت رہنکتا نہیں۔"

حکم پورا کیا گیا۔ ترکیب لاجواب تھی، بھورا پوری طرح ڈکرایا اور مسلسل ڈکراتا رہا۔ شیر نے دُور پہاڑ پر سے بھورے کی آواز سُنی اور لپکا۔ راستہ میں جو جانور ملتا جنگل کے بادشاہ کو سلامی دیتا۔ پہلے دُور اُوپر پہاڑ میں سانبھر ٹونکا۔ پھر کاکڑ بھونکے۔ چینل ٹونکے۔ لنگور پھپکارے، بندر خنخیائے۔ رینجر صاحب بڑے صاحب کو ان آوازوں کی بنا پر بتاتے رہے کہ آ رہے ہیں مہاتما جی لپکے ہوئے۔ اندھیرا ہو گیا تھا بلا کا سناٹا اور پھر جنگلی جانوروں کا دہشتناک آوازوں سے فضا کو ڈراؤنا بنانا۔ بڑے صاحب تو کھیل گئے۔ سانس چلنے لگا اور کپکپی چھوٹ گئی۔ رینجر صاحب کانا پھوسی سے بہتیری تسلّی دیتے ہیں مگر صاحب کی حالت غیر ہوتی گئی۔ مچان سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دو سانبھروں نے بڑے زور سے ٹونکنا شروع کیا۔ کٹڑے کو از خود خطرے کا احساس ہوا اُس نے باوجود تکلیف کے رہنکنا بند کر دیا اور جس سمت سانبھر بول رہے تھے ڈر اور سہم کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ شیر نے کٹڑے کو ایک پتھر کی آڑ میں سے دیکھا اور نہایت آہستہ آہستہ کمال احتیاط سے داؤں کرنا شروع کیا۔ دبتا دباتا، ہر آہٹ سے بچتا، بڑھتا ٹھہرتا، جھجکتا، پُھونک پُھونک کر قدم رکھتا کٹڑے کی طرف بڑھا۔ ادھر صاحب بہادر کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ وہ بار بار اِدھر اُدھر گھوم گھوم کر دیکھتے کہ کہیں شیر اُن پر نہ کُود پڑے اور کانا پھوسی ہو رہی تھی کہ "دو سیٹی اور بُلاؤ ہاتھی۔ پیٹ کا حال غیر ہے، جلد بُلاؤ ورنہ ایسا ویسا کام ہو جائے گا۔" اُن کی کپکپی سے درخت بھی ہلنے لگا۔

شیر کی تمام قوتوں میں سُننے کی قوت تعجب خیز حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ حالانکہ شیر کی پوری توجہ کٹڑے کی طرف تھی مگر اس کانا پھوسی نے شیر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شیر نے مزید اطمینان کیلئے اس غیر معمولی آواز کی طرف دھیان دیا اور بہت جلد معلوم کر لیا کہ ایک نہیں دو دو حضرات تشریف فرما ہیں۔ بس پھر شیر کہاں، یہ جا وہ جا۔ سلامی ہوتی چلی گئی۔ رینجر صاحب سمجھ گئے کہ بڑے صاحب کی وجہ سے شیر لَوٹ گیا۔ ہاتھی بُلا لیا گیا۔ بڑے صاحب کی جان میں جان آئی۔ طبیعت بشاش ہوگئی کیونکہ عرصے کا قبض ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد سے صاحب بہادر نے عہد کر لیا تھا کہ دن چُھپنے کے بعد کبھی نہ بیٹھیں گے۔

بہت سے پڑھنے والوں کو اس بات کا یقین نہیں آئے گا کہ شیر جیسا خونخوار اور بہادر درندہ انسان کو دیکھکر دُم دبا کر بھاگ گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ زخمی ہونے سے پہلے شیر شیر نہیں ہوتا اور جس قدر انسان شیر سے خائف ہوتا ہے اُس سے کہیں زیادہ شیر انسان سے ڈرتا ہے۔ انسان کو دیکھنا تو بڑی بات ہے محض اُس کی آہٹ پاکر یا بو پاکر جگہ چھوڑ بھاگتا ہے۔ یہ اور بات ہے بعض آدمیوں کی طرح بعض شیر بھی کمینہ فطرت ہوتے ہیں اور خواہ مخواہ انسان سے آڑتے ہیں ورنہ عام طور پر شیر انسان سے اس قدر بچ کر رہتا ہے کہ باوجود کوشش کے مہینوں نظر بھی نہیں آتا۔ بلکہ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ محکمہ جنگلات میں لوگوں کی عمر گذر گئی، دست بوسی تو درکنار زیارت سے بھی مشرف نہ ہو سکے۔ یہ دراصل شرافت ہے کہ حتی الامکان جھگڑے سے گریز کرتا ہے اور جب جان پر ہی آن بنتی ہے تو کمال بہادری سے دُشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کی ڈانٹ اس قدر مہیب ہے کہ بڑے بڑے پُرانے شکاری ہاتھی تھرا جاتے ہیں اور اس بُری طرح بھاگتے ہیں کہ انکس کے روکے بھی نہیں رُکتے۔

ہاں تو صاحب بہادر تو فارغ ہو کر بنگلے چلدئے جہاں سردی سے حفاظت کے لئے دھڑیوں لکڑی جل رہی تھی۔ مگر بھورہ۔ اُف! غریب بھورے تو وہیں بندھا رہنے دیا گیا کہ شیر مار لے تاکہ دوسرے دن پھر دیکھا جائیگا۔ آدمیوں کے آنے سے بھورے کی اُمید بندھ گئی تھی کہ تنہائی کی مُصیبت تو ختم ہوئی۔ صرف کان کی تکلیف باقی ہے جو اِس تنہائی کی مُصیبت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اُمید کا بندھ کر ٹوٹنا بھی کس قدر افسوسناک ہے۔ ہتھنی سوت میں دونوں طرف اُونچے اُونچے پہاڑ، دیو آسا سال کے درخت لئے کھڑے ہیں۔ بلا کا اندھیرا غضب کی سردی۔ درندوں کی دل ہلا دینے والی خوفناک دھاڑیں اور چرندوں کی وحشتناک ٹوں، پوں سے گھبرا کر پہاڑ میں دوڑنا اور اپنے پیچھے پتھر لُڑھکانا، بھورے کے لئے کس قدر سوہان رُوح تھا۔ مگر بنگلے میں محفوظ پیٹ بھرے صاحب بہادروں کو جو گیس کی روشنی میں گپیں لڑا لڑا کر فلک شگاف قہقہے لگا رہے تھے ان غریب بے گناہ

کٹڑوں کی مُصیبتوں کا احساس تو بڑی چیز ہے خیال تک نہ تھا۔

صبح سویرے چمار دوڑ گئے کہ دیکھیں کونسا کٹڑہ مارا گیا اور کونسا باقی ہے۔ آخر قمرو نے جو شیرنی کالو شہید کے مزار پر چڑھائی تھی خالی تھوڑی جانے والی تھی۔ اُس کی منّت صرف اتنی تھی کہ کٹڑے مارے جائیں۔ کیونکہ پیشہ ور شکاری کا صرف اتنا ہی کام ہے کہ وہ گارا کروا دے اور پھر اُس پر مچان باندھ دے۔ رہا شیر کا مرنا نہ مرنا سو یہ صاحب لوگوں کی تقدیر۔ قمرو نے صاحب لوگوں سے بھی درخواست کی کہ "کالو شہید کے مزار پر حاضری دیدیں اور گُڑ کی بھیلی چڑھائیں۔ سرڈکیم اسٹیمپ نے کالا گڈھ سے جتنے شیر مارے سب کالو شہید کے فیض کا نتیجہ تھا اور سرڈکیم جب کبھی کالا گڈھ بغرض شکار آتے آپ کے مزارِ مبارک پر برائے فاتحہ حاضر ہوتے اور گُڑ کی بھیلی یا کوئی اور مٹھائی چڑھاتے"۔ مگر ان صاحب لوگوں میں سے ایک نے بھی اُس کی بات نہ مانی بلکہ اُلٹی ہنسی اُڑائی۔ آخر چوتھے دن قمرو نے پورے یقین کے ساتھ کہہ ہی دیا کہ "دیکھیں جب تک صاحب لوگ مزار پر شیرنی نہ چڑھائیں گے، شیر مار تو لیں"۔

کالا گڈھ ڈویژن اور اُس کے آس پاس کے باشندوں کا اعتقاد کالو شہید پر بہت زیادہ ہے۔ اس علاقہ کا کوئی پہاڑی ایسا نہیں جو آپکی مدد نہ مانگتا ہو۔ واپسی میں انہی صاحب بہادر کی موٹر پاک روسوت کے ریت میں پھنس گئی تھی۔ بہتیرا زور لگایا مگر ٹس سے مس نہ ہوتی۔ آخر دھکیلنے کیلئے پہاڑی بُلائے گئے۔ پہاڑیوں نے زور لگایا اور ایک بان ہو کر بولے "بولو۔ بولو۔ کالو شہید کی مدد" اور موٹر وہ گئی۔

خیر۔ ایک اور کٹرہ بنگلہ سوت میں مارا گیا۔ بھورے زندہ تھے مگر مُردوں سے بدتر۔ چار بجے رات سے جو دھاند و چلا تو بھورے کی ماںے سردی کے گٹھری بنادی۔ آنکھوں سے چیپڑ ڈھلکے پڑتے تھے۔ ہاتھ پیر اس درجہ اکڑ گئے تھے کہ چماروں نے اُٹھانے کی بہتیری کوشش کی اور خود کٹڑے نے بھی مگر ہاتھ پیروں میں سکت ہی باقی نہ تھی۔ رات بھر کی بھوک شدید سردی، ڈر، خوف اور کان کی تکلیف سے بھورا آدھا رہ گیا۔ چماروں کا مشورہ یہی ہوا کہ چونکہ گذشتہ شب شیر ادھر سے نہیں نکلا اس لئے آج رات ضرور آئے گا۔ اور بھورے کو یہاں ہی بندھا رہنے دو۔ آج ضرور مارے گا۔ ایک چمار کو رحم آیا اُس نے کٹڑے کو اور اس کی سات پشتوں کو گالیاں دیں۔ اور اس کے حق میں دُعا خیر کی کہ "آج رات شیر تجھے کھا جائے"! اور تھوڑے سے روہنی کے پتے توڑ کر اس کے آگے ڈالدئے۔ رات کو زور کرنے کی وجہ سے بھورے کا اگلا پیر بہت سُوجھ گیا تھا اور اس شدّت کا درد تھا کہ اُس کی جان نکلی جاتی تھی۔ اپنی ماں کی آغوش اور پولی کے امن کو یاد کر کے وہ کس بُری طرح رو رہا تھا مگر چشم ظاہر سے نہیں۔ اس کی آثار رو رہی تھی۔ مگر انسان جو ظواہر سے نتائج مرتب کرتا ہے اُس کے نزدیک کٹڑے کو کوئی خاص تکلیف ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب شکاری پر ظلم اور استبداد کی فردِ جرم لگائی جاتی ہے تو وہ اپنی صفائی میں اپنی بنائی ہوئی نفسیاتِ حیوانی پیش کرتا ہے کہ جانور میں آنیوالے خطرات کا احساس نہیں ہوتا۔ کٹرہ اس بات کا متوقع نہیں ہوتا کہ اب شیر یا کوئی اور بلا اُس پر جھپٹ پڑیگی۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ آرام سے بیٹھا جُگالی کرتا رہتا ہے"۔ بظاہر یہ تاویل کسی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مگر جگالی ایک فطری تقاضہ ہے جسے جانور بہت دیر تک نہیں روک سکتا۔ جس طرح غیر ارادی طور پر ڈھور ڈنگروں کا گوبر اور پیشاب خارج ہوتا رہتا ہے اسی طرح جبلّت کے تحت جگالی بھی جاری ہوجاتی ہے۔ ہم نے تو کبھی نہیں سُنا کہ کسی مجرم نے جسکو پھانسی کا حکم سُنا دیا گیا ہو بقیہ زندگی کھڑے رہ کر اور بھوکا رہ کر گذاری ہو۔

بنگلہ سوت میں جو کل ہوا تھا اس پر بڑے صاحب اور کپتان صاحب دو بجے دن سے جا بیٹھے۔ کیونکہ پہاڑی جنگل میں اور سردی کے موسم میں شیر جلدی ہی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ان دونوں صاحبوں کی عمر کسی اور ہی شکار میں گذری تھی۔ جس طرح آدم خور شیر پولی کا شکار مارتے مارتے آرام طلب ہوجاتا ہے اسی طرح ان شکاریوں میں بھی جفاکشی کا مادّہ نہ تھا۔ آدھ گھنٹے ہی میں تھک گئے اور لگے پینترے بدلنے۔ بڑے صاحب زردے کے بہت عادی تھے اور کپتان صاحب سگرٹ کے۔ پچر پچر پیکیں تھوکی جارہی تھیں، بھقا بھق دھوئیں اُڑ رہے تھے۔ کھٹ، پٹ، چٹ، پانوں کی ڈبیا اور سگریٹ کیس کُھلتے اور بند ہوتے رہے۔ کٹر کٹر چھالیہ چبائی جارہی تھی۔ قل قل قل۔ غٹ۔ غٹ۔ تھرماس سے چائے اُنڈیلی اور پی جارہی تھی۔ چُپکے چُپکے تبادلۂ خیالات اور اشارے کنائے بھی ہورہے تھے۔ شیر کوئی چرخ تو تھا نہیں جو باوجود اس اناڑی پن کے لاش پر آکھڑا ہوتا۔ اُس نے دُور سے ہی سگرٹ کے دھوئیں کی بو لے لی تھی اور لوٹ گیا تھا۔

بھورہ تو تھتنی سوت میں بندھا ہی پڑا تھا۔ باقی چار کٹڑے بھی بلاک کے متفرق سوتوں میں لگادئے گئے تھے۔ کلاوَلی سوت، نیبوسوت، موگڑی اور دھول کنڈ سوت چاروں گھیرے گئے تھے۔ کیونکہ ڈی۔ آف۔ او۔ صاحب عملہ پر ناراض ہورہے تھے کہ قاعدے کا کل (گارا) ابھی تک نہیں ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُسی رات چاروں کل قاعدے کے ہوگئے۔ اور کیمپ میں بڑی خوشی منائی جارہی تھی۔ مچان ردانہ ہورہے تھے، ہدایتیں

دی جا رہی تھیں کہ گورنر صاحب کا تار بڑے صاحب کو، جو اِس برات کے دولھا تھے، کے نام آیا کہ "لکھنؤ میں شیعہ سنّی شدید فساد ہو گیا فوراً ملو" کہاں کا شکار اور کس کا شیر گورنر صاحب کے تار سے کھلبلی پڑ گئی۔ شکار بند، کیمپ توڑ دیا گیا۔

بھورہ بھی اسی شب اپنے ساتھیوں کا ہمسفر ہو گیا۔ دوپہر کی دھوپ سے اس میں جان سی پڑ گئی تھی۔ ایک کروٹ پڑے پڑے پتھر اس کے جسم میں گڑ گئے تھے۔ وہ اُس مریض کی طرح اُٹھا جو مرنے سے چند گھنٹے قبل سنبھالا لیتا ہے۔ پیاس سے بیچین، آنکھوں کے سامنے ترنّم سے بہنے والا پانی اُس کی پیاس کو اور بھی بھڑکا رہا تھا۔

کٹڑے نے اپنے متورم پیر سے جو پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا ناحق زور کر کے اپنے دُکھ میں اضافہ کیا اور آخر کار مایوس ہو کر ردّی کے پتوں پر حسرت و یاس کے عالم میں دھڑ سے گر پڑا۔

آفتاب انسانی جور و ظلم پر خون کے آنسو رو چکا تھا۔ جنگلی مرغ پیڑوں میں پہونچکر اپنے پر پھٹ پھٹا کر رات کا خیرِ مقدم کر رہے تھے۔ چھپکے جو دن کی روشنی کے مارے چھپے پڑے تھے، اب جنگل میں اپنی کھٹ، کھٹ مسلسل کھٹ، کھٹ سے جنگل میں کٹان سا کر رہے تھے۔ طاؤس درختوں کی پھننگ پر بڑھتی ہوئی رات کو اونچے سروں میں لبیک کہہ رہے تھے۔ لنگور اور بندر رات کی سردی کے خیال سے آپس میں گتھے جا رہے تھے۔

جھانک، چیتل، سانبھر، کاکڑ اور چوسنگے، پہاڑ کے گھنے کو چھوڑ کر کھلے کھلے حصّوں میں پہونچ رہے تھے۔ کچھ شیر تو درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں سایہ کی طرح شکار کی گھات میں کھسک رہے تھے اور کچھ شکار کردہ لاشوں پر طعام شب اُڑا رہے تھے۔ اندھیرا اُمنڈ گھمنڈ کر چھا رہا تھا۔ تاریکی بلا کی بھیانک تاریکی۔ ایسی تاریکی جس میں کائنات جذب ہو کر رہ گئی ہو۔ مع اپنے ہولناک اثرات کے مسلّط اور کار فرما تھی۔ اس تاریکی سے رات کا سانس پھول رہا تھا اور سائیں سائیں کر رہی تھی۔ جنگل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کبھی کبھی مینڈک کے غڑپ اور سنگریزوں کا گنگناتے ہوئے چشمہ میں ترنّم پیدا کرنا رات کے سیاہ سناٹے میں لہر سی پیدا کر دیتا۔ وہ اندھیرا۔ جس نے نور کا تخت غصب کر کے ایک اور ہی تاریک دُنیا پیدا کر دی تھی۔ اور بے پناہ طاقت والے شیروں کی ایسی دھڑکنے جس سے جنگل کا دل ہل جاتا تھا اور پہاڑ گونج اُٹھتے تھے۔ فضا کو بہت ہی رُوح فرسا بنا دیا تھا۔ دہشت زدہ چرندوں کی وحشت بھری ٹونک اور کاکڑ کے لرزتے ہوئے کلیجہ کی نکلی ہوئی ڈراونی بھونک سے کائنات سہمی جا رہی تھی۔

اس خوفناک ماحول میں پابستہ بھورا اب بھی زندہ تھا مگر اس کے ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔ شیر اس کے پاس سے گذرا۔ بھورے کی بو نے شیر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ شیر نے دیکھا کہ سوکھا سہما، بھوکا پیاسا جاڑے پالے کا مارا، ہڈیوں کی پوٹ بہت ہی بے بسی اور بے کسی کی حالت میں دم توڑ رہا ہے۔ وہ کٹڑے کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ گیا۔ یکایک کٹڑے میں جنبش ہوئی۔ اکڑے ہوئے ہاتھ پیر از خود پھیل گئے۔ گردن کھنچ گئی۔ مُنہ میں کف بھر گئے۔ خفیف سی ڈکرانے کی آواز نکلی۔ جسم کے بال کھڑے ہوئے اور پھر پڑ گئے۔ روئیں روئیں کی جان نکل گئی۔

شیر بھورے کی لاش کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا۔ "یہ بیسویں صدی کا تعلیم یافتہ، متمدن، مہذب اشرف المخلوقات بھی کس قدر خود غرض، سفّاک، ظالم اور وحشی ہے!!! اس کا فلسفہ بھی عجیب ہے۔ کیا (— sportsmanship) صحیح جذبۂ شکار یہی ہے کہ پہلے کٹڑہ باندھ کر مجھے دعوت دیتا ہے۔ جب میں گارا کے اُس کی دعوت قبول کر لیتا ہوں اور پھر مہمان کی حیثیت سے اُس کی دعوت کھانے آتا ہوں تو یہ انسانیت کا دعویدار جانور اپنے معزز مہمان کی تواضع جان لیوا گولی سے کرتا ہے!!!"

سراج الدین احمد دہلوی

صبح کا ناشتہ

(بسلسلہ صفحہ ۱۴)

باغ کے زینے پر شوشوئی کا کشمیری خانساماں کھڑا صبح کے ناشتے کے متعلق ہدایات مانگ رہا تھا۔

"گناہگار ظالم بدنصیب احمق واہیات آدمی!" شوشوئی کے مُنہ سے غصّے اور نفرت کی شدّت میں گالیاں نکل رہی تھیں، "تم یہاں کیوں آئے؟ — آج سے تم برخاست کئے جاتے ہو۔ میں صبح کا ناشتہ نہیں کروں گی — نہیں!"

حجاب امتیاز علی

دورِ حاضر کا مایۂ ناز کارٹون ساز

ترقی نتیجہ ہے تعمیری اور تخریبی افعال کے اجتماعِ اضداد کا۔ مفید اشیاء کا حصول اور غیر مفید اشیاء کا ترک حیاتِ انسانی کی ارتقا کے دو ضروری پہیے ہیں۔ ہر شے کو مکمل صورت میں حاصل کرنے کی خواہش فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ محض اسی خواہش کے باعث کارزارِ ہستی گرم تر ہے۔

اپنی کوتاہیوں کی واقفیت عُروج و کمال کا پہلا زینہ ہے۔ اور اس واقفیت کے بہم پہونچانے کے لئے ایک نکتہ چیں کا وجود نہایت ضروری چیز ہے۔ طبّی زبان میں تحسین کو اگر نہایت لذیذ اور مقوی جوہر مان لیا جائے تو تنقیص کو تلخ ترین تریاق فرض کیا جاسکتا ہے۔ اوّل الذکر سے وجودِ انسانی میں عزم و حوصلہ اور قوّتِ کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے تو ثانی الذکر سے حیاتِ انسانی کو گھن کی طرح کھوکھلا کرنے والا زہریلا مادّہ زائل ہوتا ہے۔ اور حقیقی معنوں میں صحتِ کامل حاصل ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ عُروج و ترقی کے لئے اپنے معائب و محاسن کی مکمّل ترین تصویر کو پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ نظریہ جس طرح انفرادی زندگی پر منطبق ہے اُسی طرح قومی اور سیاسی زندگی پر حاوی ہے۔ انفرادی زندگی کی طرح سیاسی اور قومی زندگی بھی تشنۂ تکمیل ہے۔ راج اور سماج میں خوبیوں کے پہلو بہ پہلو کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس لئے راج اور سماج کی اصلاح کیلئے نکتہ چینی نہایت ضروری ہے۔

تلخ تنقیدوں کے بغیر ان کی اصلاح ممکن نہیں۔ اسی لئے مغربی دُنیا میں راج اور سماج میں سیاسی اور معاشرتی اصول و قوانین کی بالغ نظری کی تکمیل کے لئے کارٹون کو طنزیہ ادب کا ایک مؤثر ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے مصوّری کے شعبۂ کارٹون سازی کو ایک اہم مرتبہ دیا گیا ہے۔ مغربی ممالک میں اس فن کی ترقی اور مقبولیت حیرت انگیز رفتار سے ہو رہی ہے۔ ان ممالک کے کسی رسالے یا اخبار کو اُٹھا کر دیکھئے اُس میں عالمانہ اور محققانہ مضامین مُصوّری کے اعلیٰ شاہکاروں کے برابر برابر ماہرانہ کارٹونوں کی مقدار بھی نظر آتے گی۔ وہاں جرنلسٹ اور آرٹسٹ کی طرح کارٹونسٹ بھی معقول معاوضہ پاتے ہیں۔ وہاں قابل کارٹون ساز سیاسی و اقتصادی تحریکوں میں جان پیدا کرکے زبردست خدمت بجا لاتے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں اب تک اس فنِ لطیف پر کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے اور کارٹون ساز کے طلسمی نقوش کے اثرات سے ہندوستان ناواقف ہے اس لئے لندن کے مشہور کارٹون ساز مسٹر ڈیوڈ لو کی سوانح حیات ہم ہندوستانیوں کیلئے نہایت درجہ سبق آموز ہوسکتی ہے۔

گذشتہ "ایسٹر" کے موقع پر جبکہ ہر انگریز اپنی اِس عید کو نہایت مسرت و اہتمام سے منانے کی تیاری میں تھا، ایک حادثہ وقوع پذیر ہوا جس کی وجہ سے رنج و تفکر کی ایک خاموش فضا سارے انگلستان پر طاری ہوگئی۔ اِس واقعہ سے میری مُراد البانیہ پر اٹلی کے قبضہ سے ہے۔ ٹھیک "ایسٹر" کے دن یورپ کی سب سے چھوٹی مگر بے گُناہ سلطنت البانیہ پر اٹلی کے آمر مسولینی نے اچانک بے وجہ چڑھائی کردی اور اس غیر مسلح مُلک کو نگل کر اپنی ہوسِ شہنشاہیت کی پیاس بُجھائی۔ مسولینی کے اس وحشیانہ اور غیر انسانی دھماکے سے سارا یورپ دہل گیا۔ برطانیہ اور اٹلی کے حالیہ معاہدہ کی رُو سے یہ قبضہ بالکل ناجائز تھا۔ برطانوی کابینہ اس حادثہ سے متعلق کیا طریقہ کار رکھتی ہے اس کی جانب سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ اور وزراء کا خاص اجلاس اس خصوص میں اپنی پالیسی طے کر رہا تھا کہ انگلستان کے اخبار "ایوننگ اسٹنڈرڈ" میں مسٹر لو کا ایک کارٹون شائع ہوا۔ اس کارٹون میں "ایک باغ میں ٹوٹی ہوئی بنچ (جس کو سلطنتِ البانیہ سے تعبیر کیا گیا) پر مسٹر چمبرلین اپنے ہاتھ میں معاہدوں کا فائل لیکر بیٹھے ہیں اور ان کے بشرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ واقعی مسولینی کو ہم سے محبت ہے یا نہیں۔ تھوڑی دُور ایک جھاڑی کے آڑ میں مسولینی نسوانی لباس میں ہٹلر سے ہم آغوش ہے اور ہٹلر اس بھاری بھرکم عورت سے بڑی گرمجوشی سے معانقہ کر رہے ہیں۔" اِس کارٹون میں مسٹر لو نے اپنی پیش قیاسی ظاہر کی کہ انگلستان کی رائے عامّہ کی بےچینی کو محسوس کرنے کے باوجود مسٹر چمبرلین گو البانیہ کے قبضہ پر سطحی طور پر اظہارِ ناراضگی کر رہے ہیں تاہم معاہدۂ اٹلی و برطانیہ کو قائم و برقرار رکھیں گے۔ اور ان کی اس خوشامدانہ طرزِ عمل سے جرمنی اور اٹلی کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہوجائے گی۔ دوسرے دن برطانوی کابینہ نے اپنی پالیسی کا اعلان کیا جس میں قبضۂ البانیہ پر رسمی طور پر اظہارِ ناراضگی

رکے یہ ظاہر کیا کہ معاہدۂ اٹلی و برطانیہ میں اِس قبضہ سے کوئی رخنہ نہیں پڑے گا۔

مسٹر لو، ایک ابھی اور پیدائشی کارٹون ساز ہیں۔ دُنیا کے اکثر مدبراُن سے سہمے ہوئے رہتے ہیں۔ وہ کسی کی رورعایت نہیں کرتے۔ وہ انگلستان کے عام شہریوں کے عادات واطوار کی تصویر جس بے خوبی سے بناتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز پیرائے میں ہٹلر، مسولینی اور چیمبرلین کے افعال وکردار کو مصوّر کرتے ہیں۔ جب وزیرِ اعظم برطانیہ نے مزدور پارٹی سے بیوفائی کر کے قدامت پسند و لبرل پارٹی سے اتحاد کیا اور قومی حکومت کے نام سے مخلوط کابینہ بنائی تو "دو مُنہ والا گدھا" کے عنوان سے مسٹر لو، نے طنزیہ تصویر شائع کی۔ اس ایک مثال سے مسٹر لو، کی جسارت، صاف گوئی اور حق پرستی کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے۔

مسٹر لو، عمومیت پسند ہیں۔ فاشسزم اور نازیت کے خلاف اُن کے کارٹون برابر شائع ہورہے تھے۔ آمرینِ جرمنی و اٹلی کو اپنی اِن مُضحک تصاویر کو دیکھ کر جو رنج و غصہ ہوتا ہوگا ظاہر ہے۔ غالباً مذکورۂ بالا آمرین کے ایماء سے یا ان کی مزاجداری کے خیال سے اور برطانوی کابینہ کی مشہور پالیسی کے مدنظر برطانوی وزارت خارجہ کی جانب سے مسٹر لو کے نام یہ ہدایت جاری کی گئی کہ ہٹلر اور مسولینی کی اشتعال انگیز تصاویر کچھ مدّت کے لئے بند کی جائیں۔ اس نوٹس کی تعمیل کے دوسرے ہی دن اُنہوں نے مسٹر لُر نامی مُضحک تصاویر کا سلسلہ جاری کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ رائے عامّہ کی آزادی کا جھنڈا بلند کرنے والی برٹش کابینہ کس طرح فاحسٹی آمرین کی رائے عامّہ کا گلا دبوچنے والی پالیسی اختیار کر کے شخصی آزادی کو معدوم کر رہی ہے۔ اس کارٹون کی اشاعت کے بند کرانے سے حکومت کی پالیسی کے خلاف رائے عامّہ اور قوی ہوگئی اور مجبوراً حکومت کو حکم امتناعی اُٹھالینا پڑا۔

مسٹر لو، نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ نامی شہر میں ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ نامساعد حالات میں محض ذاتی سعی و کوشش سے شہرتِ دوام حاصل کرنے والے دوسرے قائدین کی طرح یہ بھی ایک غریب کاشتکار کے گھر پیدا ہوئے۔ اپنے خاندان کی گذر بسر کے لئے مسٹر لو، کے والد کو دن بھر محنت و مشقت کرنی پڑتی تھی۔ لو کی مصوّری اُن کو مطلق پسند نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ باکمال لوگوں کو دُنیا میں کوئی عزت اور مرتبہ نہیں ملتا۔ اُن کی زندگی ہمیشہ افکار و آلام سے بسر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ننھے ڈیوڈ کی مصوّری کی دُھن برابر جاری رہی۔ اور گیارہ سال کی عُمر میں اپنے شہر کے ایک معمولی اخبار کو مسٹر لو نے اپنا ایک کارٹون دیا جس کا معاوضہ اُس کو صرف ڈھائی شلنگ ملا۔ یہ سمندِ ناز پر ایک تازیانہ ہوا۔ لو، کا حوصلہ بلند ہوا۔ اُنہوں نے آخرکار باکمال مصوّر بن جانے کا عزم کر لیا۔ جب لو، کے باپ نے لڑکے کا شغل ناداری کسی طرح کم ہوتے نہ دیکھا تو مذہبی تعلیم دلانے کے لئے ایک مذہبی کالج میں شریک کرا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ سماج میں مذہبی واعظین کا بڑا درجہ ہے اور جلب زر کے معاملہ میں بھی یہ ہمیشہ اچھا ہے۔

سترہ سال کی عمر تک مذہبی اسکول کی خشک فضا میں مسٹر لو، کو رہنا پڑا۔ آخر تنگ آکر اپنے والد کو اپنے طبعی رجحانات سے آگاہ کر کے درس گاہ سے علیحدہ ہونے کی اجازت طلب کرلی اور ایک ہفتہ وار اخبار "اسکیچر" کے دفتر میں مصوّر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ البتہ اِس مذہبی اسکول میں اُن کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تاریخ و ادب پر کافی عبور حاصل ہوا۔ کچھ دنوں تک "کنٹربری اسکول آف آرٹ" میں تجارتی تصاویر تیار کرنے کی تعلیم حاصل کی، مگر انہیں اس میں بھی لطف نہ آیا۔ کیونکہ ان کو کارٹون سازی سے گہری دلچسپی تھی۔ لہذا وہ اپنے طور پر اس فن میں کمال حاصل کرنے کی دُھن میں لگے رہے۔ تھوڑے عرصے میں ان کے کارٹون نیوزی لینڈ کے مشہور اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ سیاسیات اور معاشیات سے متعلق ان کے کارٹون اُن کی گہری توجہ اور غائر فکر و نظر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اب اُن کی شہرت دُور دُور کے ممالک میں پہونچی۔ لندن کے اخبار "دی اسٹار" نے گراں قدر مشاہرہ پر مسٹر لو، کی خدمات حاصل کیں۔ ۱۹۱۹ء میں وہ لندن آگئے اور اب تک وہیں مقیم ہیں۔ مسٹر لو کے کارٹون سیاسیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس لئے بہت جلد اُنہیں بین الاقوامی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی بین الاقوامی سیاسیات پر اُن کی تصاویر کو ہر جگہ غائر نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اُن کی عمیق سیاسی معلومات اور مشہور مدبرین عالم کے متعلق اُنکے صحیح خیالات متعدد سیاسی تحریکوں پر اُن کی بے لاگ اور صحیح تنقید یر مغربی دُنیا کے ایک معمولی شخص سے لیکر بڑے سے بڑے قائد تک کی نظروں میں جچنے لگیں۔ ۱۹۲۷ء میں "ایوننگ اسٹنڈرڈ" جیسے مشہور اخبار نے ان کی خدمات حاصل کیں اور تاحال وہ اسی اخبار کے دفتر میں ملازم ہیں۔ اس وقت دُنیا بھر کے کارٹون سازوں پر سب سے زیادہ محنتانہ مسٹر لو کو مل رہا ہے۔ اور اس وقت اپنے موقلم کے شہ کاروں سے فہم عامّہ کو ترقی دینے والے سب سے زبردست

آرٹسٹ مسٹر لو ہیں۔

دیگر اعلیٰ اخلاقی صفات کے لحاظ سے بھی مسٹر لو خاص درجہ کے مالک ہیں۔ "ایوننگ اسٹنڈرڈ" انگلستان کی مشہور قدامت پسند جماعت کا اخبار ہے۔ اس اخبار کا مالک "لارڈ بیوربروک" سرمایہ داری اور شہنشاہ پرستی کا زبردست مؤید ہے۔ اس کے برعکس مسٹر لو کا طبعی رجحان سوشلزم کی طرف ہے، وہ جمہوری اصولوں کے کٹّر معتقد ہیں۔ سرمایہ داروں کی خود غرضانہ غربا نوازی اور مکّارانہ حکمت عملی سے سخت متنفر ہیں اور مزدور پیشہ جماعتوں کے پُرجوش ہمدرد۔ ایک مرتبہ جب ان سے ان کے سیاسی عقائد دریافت کئے گئے، تو جواب دیا "مجھے اس خصوص میں لارڈ بیوربروک کی پوری ضد سمجھ لو"

اخبار کے مالک کے بالکل برعکس عقائد رکھنے والا کارٹون ساز گذشتہ بارہ سال سے اپنے کارٹون متواتر ہر روز اسی اخبار میں شائع کرسکتا ہے، یہی مسٹر لو کے امتیازی خصائص کا بیّن ثبوت ہے۔ یہی ایک تنہا کارٹون ساز ہیں جن کی تصاویر میں ترمیم و تبدیلی کا عام حق مُدیر و مالک اخبار کیلئے محفوظ نہیں ہے اور یہ شرط مسٹر لو کے اقرار نامۂ ملازمت میں نہایت واضح طور پر قلمبند ہے۔

مسٹر لو نے عام انسانی خصائص اور نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لندن کے ایک اوسط درجے کے سرمایہ دار اور سرکار پرست شہری خصائص "کرنل بلمپ" نامی ایک مشہور کارٹون کے ذریعہ بے نقاب کئے ہیں۔ ہر سنیچر کے اخبار میں افکار حوادث کے عنوان سے سلسلۂ تصاویر میں "کرنل بلمپ" کے اس احمقانہ دعوے کو واضح کیا جاتا ہے کہ ہر شے خواہ اچھی ہو یا بُری برطانیہ کے نام سے مشہور ہو تو وہ اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ کرنل کا یہ خبط کبھی دُور نہیں ہوتا۔ یہ تصاویر پبلک میں اس قدر مقبول ہوگئی ہیں کہ انگریزی زبان کی لغت میں "بلمپ" کا ایک لفظ بڑھا دیا گیا ہے۔

مسٹر لو نے اپنی خودداری، جرأت، خود اعتمادی اور مُفید عام فن کاری کی بدولت کارٹون سازی کو حُسن کاریٔ ادب کا اہم ترین شعبہ بنا دیا ہے۔ ایڈیسن کے اثر انگیز مقالوں نے جو کام کیا ہے مسٹر لو نے اپنے کارٹون کی بدولت اس سے کچھ زیادہ ہی اثرات قائم کئے ہیں۔ مسٹر لو نے ثابت کر دکھایا ہے کہ دیگر پیشہ وروں کی طرح مصوّروں کو بھی سماج میں اعلیٰ مقام مل سکتا ہے۔ وہ بھی سماج اور راج کا کوئی اہم فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ اقتصادی غلامی سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ معاشرت اور سیاسیات میں اُن کی آواز کو بھی خاص اہمیت ہے۔ رائے عامّہ میں وہ بھی انقلاب پیدا کرسکتے ہیں۔

ان کے شہ کاروں سے ان کے جن اعلیٰ اخلاق اور صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ معمولی کاروبار زندگی اور مشاغل روزمرہ میں مسٹر لو، کو ہم ان ہی اعلیٰ صفات کا حامل پاتے ہیں۔

صبح آٹھ بجے نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ مختلف اخبارات کو بڑی توجہ سے پڑھتے ہیں۔ واقعاتِ عالم کو وہ سیاسیاتِ عالم، اقتصادیاتِ عالم۔ برطانوی سیاست اور برطانوی اقتصادیات ان چار عنوانوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے اہم ترین مسئلہ کو اپنے کارٹون کیلئے منتخب کرلیتے ہیں۔ اس وقت ناشتہ کی میز پر مسٹر لو کے خاندان کے لوگ جمع ہو کر ان کے مُنتظر رہتے ہیں۔ ان کے پہونچتے ہی واقعاتِ عالم پر مسٹر لو سے تبادلۂ خیالات شروع ہوتا ہے۔ ان کی بیوی کو سیاسیات میں قابلِ لحاظ دسترس حاصل ہے۔ یہ اپنی دونوں بیٹیوں سے بھی مشورہ کرتے ہیں۔ گویا یہ ایک چھوٹی سی سیاسی کانفرنس ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے کارٹون کا موضوع اور خاکہ طے کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے گھر کے باہر کے میدان میں تیراندازی کی مشق کرتے ہیں۔ مسٹر لو بیان کرتے ہیں کہ تیراندازی سے قوتِ توجّہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مشغلہ کے ختم پر وہ سیدھے اپنے اسٹوڈیو میں چلے جاتے ہیں اور کام میں لگ جاتے ہیں۔ شروع کی ہوئی تصویر کو ختم کئے بغیر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہلتے۔ اس وقت کسی کو ملاقات کا موقع نہیں دیتے۔ یکسوئی خیال میں خلل انداز ہونے والی ہر چیز کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کمرے میں خود ان کی بیوی کو بھی آنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی کارٹون مگر نقائص سے مبرّا تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دَوران میں کئی مرتبہ سوچتے ہیں اور کئی مرتبہ یہ دیکھا گیا کہ انہوں نے تصویر نصف تک تیار کرلی اور پھر پسند نہ آنے پر پھینک دی۔ یوں تو وہ دُنیا کے عقلمند ترین اور چابکدست مصوّر ہیں۔ مگر اپنے دل کو پورا اطمینان ہوئے بغیر وہ اپنی تصویر پر سے ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ نہایت اہم اور دلچسپ مضمون ایک چھوٹے سے کارٹون کے ذریعے معمولی آدمی کی بھی سمجھ میں آسانی سے آجائے اس نقطۂ نظر سے وہ اپنی تصاویر کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ اُن کا خیال ہے کہ جو تصویر اس قدر محنت اور انتھک کوشش کے بعد تیار ہوتی ہو وہ یقیناً کامیاب ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ اپنا وقت مختلف سیاسی و سماجی تحریکوں کے

مُطالعہ میں گزارتے ہیں۔ عوام کے تصورات و تخیلات کا رُخ کس جانب ہے۔ اس کا مُطالعہ ایک سیاسی کارٹون ساز کیلئے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں۔

مسٹر لو پیدائشی مصوّر ہیں۔ اس کا ثبوت کسی دعوت کے وقت ضرور ملتا ہے۔ بالخصوص جبکہ اِس دعوت میں کوئی مشہور شخصیت شریک ہو تو مسٹر لو کسی غیر معمولی کاغذ (متعدد مرتبہ فہرستِ طعام پر) پر سب کی بے خبری کے عالم میں اپنے ناخن سے اُس کی تصویر کھینچے بغیر نہیں رہتے۔ مشہور شخصیتوں سے مُلاقات کے وقت بھی "رُخ بہ یار، دست بہ کار" رہتے ہیں۔ مشاہیر کی تصاویر اُن کی بغیر اطلاع ان کے فطری خدوخال میں کھینچنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اس لئے وہ ریل میں، ہوٹلوں میں، اور راستوں پر مسلسل تعاقب کرکے حقیقی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

القصہ مسٹر لو مغرب کے طنزیہ ادب کے ممتاز ماہر اور یورپ کی سیاست کے معمار ہیں۔

مترجمہ۔ محمد عبدالقادر فاروقی

فاؤسٹ

"فاؤسٹ" اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم اور مسحُر کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ فاؤسٹ وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے شہرۂ آفاق شاعرِ المانیہ گوئٹے نے دُنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سُہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ قیمت ۱۲؎ علاوہ محصولڈاک۔

محبت اور نفرت

تہدیہ محبت — نفرت کے نام

اُردو کے سب سے جدت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ جس میں دکھایا گیا ہے کہ محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کے لئے اور نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے۔

قیمت ۱۲؎ علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

قطعات:-

چاندنی راتیں

لوگ کہتے ہیں چاندنی راتیں
بخشتی ہیں سُکون اور آرام
ہائے پھر کیوں یہ سیلِ نُورانی
اور مری رُوحِ کُشتۂ آلام

(۲)

چاندنی کی لطیف راتوں میں
مُسکراتے ہیں چرخ پر تارے
گویا لاکر کے دُور سے پیغام
مجھکو پہونچا رہے ہیں یہ سارے

(۳)

لُٹ رہی ہے نشاط کی خیرات
چاندنی ہے فضا میں خُنکی ہے
کیسے ہو جاؤں اس سے بہرہ ور
میری قسمت میں یاد اُن کی ہے

(۴)

چاندنی میں کہیں گڈریا جب
درد آگیں سُروں میں گاتا ہے
مجھکو محسوس ہوتا ہے گویا!
میرا قصہ مجھے سُناتا ہے!

عبدالجلیل دہلوی

ذکرِ میر

فقیر مدت سے پڑا سُنتا تھا کہ ریختہ کے اُستادوں میں کوئی بُزرگ دِلّی کے میر محمد تقی میرؔ تخلص، یگانۂ آفاق ہیں۔ جو واقف کار دلّی سے آتا ان کی باتیں سُناتا۔ اور اکثر اہلِ دل اُن کے تازہ اشعار اور غزلیں بھی لاتے، اور فقیر کی آتشِ شوق کو بھڑکاتے۔ بارہا دل میں خیال اُٹھا کہ کسی سبب شاہجہاں آباد کو جانا ہو تو اُن کے نیاز حاصل ہوں۔ لیکن جب یہ سُنتا کہ وہ ٹھہرے سیلانی آدمی، آج متھرا، کل اجمیر تو پرسوں آگرہ، نہ معلوم میرے جانے پر دلّی میں تشریف رکھتے ہوں یا کہیں باہر چلے گئے ہوں، تو کمرِ ہمت کھول دیتا۔ البتہ اُن کے سیلانی طبع ہونے سے یہ تسلّی ضرور ہوتی کہ دیکھو رمتے رمتے شاید کبھی لکھنؤ بھی آنکلیں۔

اِن ہی دنوں میں میری مُلاقات میر حسن دہلوی سے ہوئی۔ خوبصورت خوش اطوار اور نہایت جامہ زیب آدمی تھے۔ طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی، باتیں کرنے میں پھول جھڑتے تھے۔ فقیر نے ان سے میرؔ صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ فرمانے لگے "واہ میاں، خوب یاد دلایا ابھی رات ہی دلّی سے ایک صاحب اُن کی تازہ غزل لاتے ہیں، غزل کیا ہے اعجاز ہے، اور مقطع تو بے مثل ہے میں نے تو اُس کو قطعہ بند بھی کر دیا۔۔۔!" اور یہ کہکر یہ قطعہ پڑھا۔

دلّی سے رات آئی تھی اک میرؔ کی غزل
جس کا یہ شعر ہوش سے بیہوش کر چلا
"یہ چھیڑ دیکھ، ہنس کے رُخِ زرد پر مرے
کہتے ہیں، میرؔ! رنگ تو اَب کچھ نکھر چلا"

میں نے جی کھول کر مقطع اور اُن کے قطعہ کی تعریف کی خصوصًا قطعہ کی بندش کچھ ایسی پیاری آپڑی تھی کہ مقطع کے درد و اثر کے ساتھ مل کر عجیب کیفیت پیدا کرتی تھی، جب پڑھتا تھا کلیجہ اُلٹ اُلٹ جاتا تھا۔

اس واقعہ کو کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ سُنا کہ نواب وزیر الممالک کے ایما سے وزیر اعظم کے خالو سالار جنگ بہادر نے میرؔ صاحب کو لکھنؤ بلا بھیجا ہے، جب سے یہ خبر کان میں پڑی تب سے فقیر کا پاؤں زمین پر نہ ٹکتا تھا، سارا دن اِسی دھیان میں گزرتا کہ دیکھیں کب اِس شاعرِ بے مثل کی زیارت نصیب ہوتی ہے، قدرت بھی کمال ستم ظریف ہے، ایسے عجیب طریقے سے اُن سے مُلاقات کرائی کہ نہ دید نہ شنید!!۔

واقعہ یوں ہوا کہ امین آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ تقریبًا سارے اُستاد حصّہ لے رہے تھے، مرزا صاحب[۱] نے بھی غزل بھیجی تھی کہ خود کسی سبب تشریف نہ لا سکے تھے۔ محفل میں پوری گھما گھمی تھی، فقیر بھی ریختہ کے شائقین کی صف میں گھُسا بیٹھا تھا۔ مشاعرہ شروع ہی ہوا چاہتا تھا کہ اتنے میں ایک ساٹھ باسٹھ سال کے بُزرگ، میانہ[۲] قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ایک عجیب انداز سے ایک طرف سے آتے نظر پڑے، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا۔ رومال پٹری دار تہ کیا ہوا اُس میں آویزاں مشروع کا پیجامہ، عرض کے پائنچے، ناگ پھنی کی انی دار جوتی، کمر میں ایک طرف سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب، انہیں اس ہیئت کذائی سے آتا دیکھکر اہلِ محفل کی باچھیں کھِل گئیں، یار لوگ حیران کہ یہ کون سی پُرانی وضع کا ملبوس ہے؟ ایک آدھ نوجوان نے تو دو ایک پھبتیاں بھی کسیں، اور مجمع کشتِ زعفران ہوا ہی چاہتا تھا کہ مشاعرے کے شروع ہونے کے سبب سب دم بخود ہو گئے۔ اور یہ بزرگ کمال متانت سے شاعروں کی صف میں متمکن ہو گئے۔ بیٹھتے ہی جیب سے کاغذ پنسل نکال کر چند حروف کھینچے[۳]، اور اسکو علیحدہ رکھکر ایک عالمِ محویت میں ڈوب گئے، نہ کسی کو داد دی نہ تحسین، البتہ کبھی کبھی کسی چبھتے ہوئے شعر پر گویا خود سے چونک اُٹھتے، وگرنہ وہی بے خودی اور محویت کا عالم طاری رہتا۔ جب شمع اِن کے

---

[۱] مرزا محمد رفیع السودا، اُردو کے نامور اور باکمال شاعر۔ [۲] میر صاحب کا حُلیۂ مبارک اور آپکے ملبوسات کی تفصیلات آبحیات (آزاد) سے ماخوذ ہیں۔ بقولِ مولانا آزاد یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۰ھ کا ہے۔ بقولِ لطف سنہ ۱۱۹۲ھ کا اور میر حسن دہلوی اپنے تذکرے میں رقمطراز ہیں کہ سنہ ۱۱۹۴ھ میں میر صاحب دلّی میں موجود تھے؛ [۳] غزل طرحی میں قطعہ فی البدیہہ شامل کیا تھا" (آبحیات)۔

سامنے آئی تو آنکھیں کھول مجمع پر کچھ اس انداز سے نظریں پھریں گویا کوئی عمل پڑھکر چھو کر رہے ہیں۔ پھر بڑی حلیمی سے اجازت طلب فرمائی اور سب کے "ضرور ضرور" کہنے پر وہی کاغذ اٹھا ایک طرحی غزل دھیمی آواز میں تحت اللفظ پڑھ دی، غزل کے ایک ایک شعر پر صفیں اُلٹ اُلٹ گئیں اور اکثر چوٹیلے دل تو نیم قد اُٹھ اُٹھ کھڑے[1] ہوئے۔ تمام کے تمام شعر صاف، سادہ، فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے اور درد و اثر سے مملو تھے۔ دل کشی اور زور تو گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ تمام غزل میں ایک خاص کیفیت تھی جسے سحر یا طلسم کہہ سکتے ہیں۔ بیان ایسا پاکیزہ اور دلآویز، جیسے باتیں کر رہے ہوں۔ آپ اُردو کے سعدی سمجھ لیں، ــــ زبان کی سادگی میں ایسا انداز تھا کہ فکر کو بجائے کاہش کے لذت اور تسکین ہوتی تھی۔ گو طبیعت میں بلاغت کا فقدان معلوم ہوتا تھا لیکن سامعین کی نگاہِ تنقید کو خورشیدِ فصاحت کی چمک کہیں جمنے نہ دیتی تھی، حزن و ملال، حسرت و مایوسی شعروں کے ساتھ ساتھ اُن کے چہرے سے بھی مترشح تھی۔ اور یہی نا اُمیدی اور بیکسی غزل میں ایک خاص اثر پیدا کرتی تھی ــــ تمام مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، غزل پڑھتے پڑھتے جب اِس قطعہ پر پہونچے:-

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہمکو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اسکو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے!

تو میرِ مشاعرہ نے تمام اہلِ لکھنؤ کی طرف سے معذرت چاہی اور کہا کہ "چند نوجوانوں سے کچھ گستاخی سرزد ہوئی ہے تو محض ناواقفیت کے سبب ورنہ اہلِ لکھنؤ تو اُن کے قدم مبارک کے نیچے آنکھیں بچھانے کو تیار ہیں"

میر صاحب نے جواب میں صرف تسلیمات بجا لانے پر اکتفا کی اور بیٹھ گئے، ان کے بعد کافی غزلیں ہوئیں، لیکن سب پھیکی ــــ سچ تو یہ ہے کہ اُن کی غزل نے کسی کا رنگ جمنے نہ دیا۔ مشاعرہ ختم ہوا تو ہر ایک کی زبان پر میر صاحب کا نام تھا۔ ہر شخص کو یہی کہتے سُنا کہ "اعجاز ہی اعجاز" اور فی الحقیقت اُنکی غزل حاصلِ مشاعرہ ٹھہری۔ پُرانے پُرانے اُستاد کہتے تھے کہ "خدا کی دین ہے!!"

(۲)

چوک بازار کے پاس ہی ہر منگل اور جمعے[2] کو مُرغوں کا بڑا معرکہ ہوتا تھا، بڑے بڑے آدمی آیا کرتے۔ فقیر بھی بلاناغہ ہر پالی میں شریک ہوتا، چنانچہ حسب عادت اِس یادگار مشاعرے کے اگلے منگل صبح صبح ہی ایک اصیل مُرغا بغل میں داب فقیر نے چوک کی راہ لی۔ راہ میں ہر طرف سے لوگ مُرغ در آغوش[3] جاتے ملے، گلیوں میں روزِ حشر[4] کا سا ہجوم تھا، میدان میں پہونچا تو مُرغبازوں کی عجب بہار تھی، بڑے بڑے آدمی[5] مُرغ بغل میں مارے پھر رہے تھے، چند شوقین مُرغ باز حیدرآباد[6] سے بھی پہونچے ہوئے تھے، طرح طرح کے گرم پرخاش[7] مُرغ دیکھنے میں آئے، سب کے پر پُرزے[8] دُرست و یکساں، ایک اک مُرغ ایسا دلیر کہ ؎

لات کی گھات کو جو مُڑ جاوے
تو سرِ طائر کا رنگ اُڑ جاوے

اور حواصل و کرگسِ[9] شُتر دل اُن کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ کریں۔ اس کے خطرے سے ققنس کا زہرہ آب[10] اور اس کے ہراس سے سرخاب تمام شب[11] آنکھ نہ جھپک سکے، سُرخا، سبزوار، اور ٹینی کے ایسے ایسے نمونے کہ حریف کو پَر نہ ہلانے دیں[12] اور کھا جائیں۔ فقیر سب طرح کے مرغوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا گھوم رہا تھا لیکن یہ یقین تھا کہ اِن سب مرغوں میں سے کسی مُرغ کا انڈا تو کجا ایک پَر بھی ملنا ناممکن ہے، پچھلے جمعہ کی پالی میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا تھا کہ مرغباز جان دیدیں لیکن مُرغ نہ دیں[13]۔ واقعہ یوں ہوا کہ سالار جنگ بہادر کو ایک مُرغ بہت پسند آیا، مرغباز سے کہا کہ مُنہ مانگے دام لیلے اور مُرغ حوالے کر دے، لیکن وہ کسی قیمت پر مُرغ دینے کو تیار نہ ہوا۔ نواب صاحب نے بھی ساز کیا، درِ[14] الطاف بھی باز کر دیکھا، چند ایک لوگوں سے سفارش بھی ڈلوائی۔ لیکن مرغباز نے مرغ کا ایک پَر بھی[15] نہ دیا۔ فقیر اپنی

---

[1] ع:- "نیم قد اُٹھ اُٹھ کے بھی سُننے لگے" میرؔ۔ متذکرہ ذیل حواشی "مثنوی در بیانِ مُرغبازاں" از میرؔ مرحوم سے ماخوذ ہیں:-
[2] جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم۔ [3] جس کو دیکھو سو مرغ در آغوش۔ [4] گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم۔ [5] آدمی جو بڑے کہاتے ہیں، مُرغ مارے بغل میں آتے ہیں۔ [6] حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم۔ [7] گرم پرخاش مرغ یاں پائے۔ [8] پر و پُرزا دُرست یکساں ہے۔ [9] حوصلہ کسقدر حواصل کا، ذکر کیا کرگسِ شُتر دل کا۔ [10] و [11] زہرہ ققنس کا اس خطرے سے آب، شب نہ سو وے ہراس سے سُرخاب۔ [12] یعنی اپنا حریف جب پاوے، پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے۔ [13] جان دے کوئی مرغ نہ دیں۔ [14] مرغبازوں سے ساز کر دیکھا، درِ الطاف باز کر دیکھا۔ [15] ایک پَر مُرغ کا نہ آیا ہاتھ۔

خیالات میں غلطاں ادھر اُدھر پھر رہا تھا کہ سامنے سے سالار جنگ بہادر تشریف لاتے نظر پڑے، فقیر تسلیمات بجا لا کر ذرا ایک طرف کو ہو گیا، ان کے ساتھ میر صاحب بھی تھے، ایک مرغباز نے میر صاحب سے پوچھا کہ "صاحب آپ اپنا مُرغ ساتھ کیوں نہیں لائے؟" فرمانے لگے "کیا پوچھتے ہو مُرغ تو کب کا بہشت نصیب ہوا ــــ" اور پھر اس کے وصف گنوانے شروع کئے، فرمایا کہ "وہ تو خروسِ عرش کی اولاد[۵۱] سے تھا۔ دونوں وقت اذان دینے کا ایسا پابند کہ اگر اسے مرغ مصلّے[۵۲] کہیں تو بجا ہے۔" میں بھی پاس کھڑا ہوا سن رہا تھا۔ بعد میں اور لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ واقعی کیا نگس نسل کا بے نظیر مُرغ تھا، کافی پالیاں مار چکا تھا، بدقسمتی سے ایک مادہ سگ پر حملہ آور ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک[۵۳] کہہ بیٹھا، یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پہلی جوڑی چھوڑی گئی، سب لوگ بلا گفتگو تہ کر کے پالی کی طرف لپکے، فقیر بھی اُدھر ہی کو جُھکا، برابر کی بازی تھی، دونوں مُرغ آنکھیں لال کئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے، چند لاتوں کے بعد ایک مُرغا ذرا سُست ہوا اور دونوں بازوؤں کے پر پھیلا کر تھیلا[۵۴] بن گیا، مالک نے اُٹھا کر چونچ مُنہ میں لی، دم دیا اور تعبیہ[۵۵] کر کے رکھ لیا۔ تو ہر طرف سے شور اُٹھا کہ "ہو چکا، ہو چکا[۵۶]!" ــ پھر دوسری جوڑی چھوڑی گئی، معلوم ہوا کہ اس جوڑی پر بہت سی شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ دونوں مُرغے پورے تیار تھے تین تین پالی لڑانے کی شرط تھی، اور دونوں مُرغ کسی دھات کے خار چڑھائے بغیر لڑ رہے تھے، ایک مُرغا تو بہت گرم تھا، لیکن دوسرا مُرغ جلد ہی سُست ہو گیا۔ کچھ تو اس کے پر بہت تھوڑے تھے، اور کچھ گرمی کے معاملہ میں وہ ذرا نیاز مند ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مالک نے دوسری پالی کے آغاز میں اُسکے بازو کے پروں سے چند موٹے موٹے پر باندھ دئے تاکہ وہ اچھی طرح اُڑ سکے۔ اور ساتھ ہی اُسے اُبلا ہوا انڈا زعفران ملا کر سونے کے ورق کے ساتھ کھلا دیا۔ اسکے دوسرے مرغ کی چونچ کا بالائی حصہ ٹوٹ گیا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ اب بازی ختم سمجھو کیونکہ جب چونچ ہی نہ رہی تو مقابلہ کیسا؟ لیکن اس کا مالک بھی پُرانا گھاگ تھا، اُس نے جیب سے مُردہ مُرغ کی چونچ کا بالائی حصہ نکالا اور کمال صفائی سے موم وغیرہ لگا کر ریشمی سُتلی سے اس طور باندھا کہ مُرغ کی چونچ کا بالائی حصہ آگے سے بھی زیادہ طاقتور معلوم ہونے لگا۔ ساتھ ہی مُرغ کو طباشیر الاچی، اور مربہ آملہ چاندی کے ورق میں لپیٹ کر دیا تاکہ ضرورت سے زیادہ گرم نہ رہے۔ اور اسے جلدی دم نہ چڑھ جائے، تیسری پالی میں اِس مُرغ نے وہ لاتیں نکالیں کہ ہر طرف سے شاباش کا ڈونگرا برس گیا۔ وقت سے کافی پہلے دوسرا مُرغ جی ہار بیٹھا، اور اُٹھا لینے سے پہلے تو اُس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ حریف کے پاؤں پر سر دھرے چُپ کا پڑا مار کھاتا تھا لیکن سر نہ اُٹھاتا تھا[۵۷]، غرض بارہ بجے تک یہی عالم رہا۔ مرغباز مرغوں کے ساتھ پینترے بدلتے، اور مُرغوں کی ایک ایک لات پر لوٹ پوٹ ہو جاتے، کسی مُرغ کا ایک پر گرا اور اس پر سو رنگ سے بولی ٹھولی کا زور[۵۸] ہوا، گیارہ بجے کے قریب اتفاقاً نواب وزیر الممالک بہادر بھی مُرغوں کی دو دو چونچیں دیکھنے تشریف لائے، اور سالار جنگ بہادر نے میر صاحب کو دیکھا تو محض فراست سے دریافت فرمایا کہ "آپ میر محمد تقی میر ہیں؟" جواب باصواب ملنے پر نہایت لطف وعنایت سے بغلگیر ہوئے، اور اپنے ساتھ نشست کے مقام پر لے گئے۔ اور اپنے اشعار میر صاحب کو مخاطب کر کے سنائے، اور اس کے بعد ان سے فرمائش کی، انہوں نے بھی ایک غزل کے چند اشعار عرض کئے، رخصت کے وقت سالار جنگ بہادر نے عرض کی کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہیں، حضور بندگانِ عالی مختار ہیں۔ انہیں کوئی جگہ عنایت فرمائی جائے، جب مرضی مبارک ہو، یاد فرمائیں۔" فرمایا "میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع دونگا۔" بعد میں سُنا کہ دو تین روز بعد یاد فرمایا تھا۔ یہ حاضر ہوئے تھے اور جو قصیدہ مدح میں کہا تھا پڑھا، تو بغور سماعت فرما کر دو صد روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔

(۳)

مشاعرہ کے واقعہ کے چند ماہ بعد

دلّی سے آکر میر صاحب سالار جنگ بہادر کے ہاں اُترے

مندرجہ ذیل حواشی "مرثیۂ خروس کہ درخانۂ فقیر بود" از میر مرحوم سے ماخوذ ہیں۔

[۵۱] خروسِ عرش کی اولاد سے دلے افسوس۔ [۵۲] بجا ہے مُرغ مصلّے رکھیں گر اس کا نام۔

حواشی مذکورہ ذیل مرثیۂ خروس سے متعلق ہیں۔

[۵۳] ملاحظہ ہو مرثیے کا تیرھواں چودھواں تا سترھواں شعر ــــ حواشی پھر "مثنوی دربیانِ مرغبازاں" از میر مرحوم سے منقول ہیں۔

[۵۴] اور جو سُست ہو تو ہوا تھیلا۔ دونوں بازو کے پر دئے پھیلا۔ [۵۵] کچھ جو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے۔ تعبیہ کر کے رکھ لیا اُن نے۔ [۵۶] ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور۔

[۵۷] یہ تفصیلات ایک پُرانے گھاگ لکھنوی مرغباز کی زبانی ماخوذ ہیں۔ [۵۸] مُرغ کی ایک پرفشانی ہے۔ اُنکی صد رنگ بدزبانی ہے۔ واشعارِ متعلقہ۔

ہوئے تھے، لیکن نواب صاحب کی سرکار میں منسلک ہونیکے کے بعد اُن کے محل سے شہر میں اُٹھ آئے، سالارِ جنگ کے محل تک تو فقیر کی رسائی نہ تھی لیکن جب سُنا کہ میر صاحب نے زنبور خانے میں مکان لیا ہے تو فقیر اس ٹوہ میں پھرنے لگا کہ کوئی بہانہ بنے تو ان سے دو بدو ملاقات ہو جائے۔ خُدا مسبب الاسباب ہے، چند دن بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو میر محمد حسین کلیم دہلوی کے رشتہ کے بھائی تھے، اب کیا تھا، ہم اگلے ہی دن دونوں میر صاحب کے نیاز حاصل کرنے کی نیت سے چل کھڑے ہوئے، پتہ لگاتے لگاتے ایک تنگ و تاریک کوچہ میں اُنکا مکان ملا، گلی کے نکڑ پر ایک عطار کی دُکان تھی۔ دُکان پر ایک نوجوان لڑکا بناؤ سنگار کئے، پُڑیاں باندھ باندھ کر دے رہا تھا، اُس نے سر کے اشارے سے مکان کا پتہ بتلایا۔ گھر کیا تھا اچھا خاصا زندان[1] معلوم ہوتا تھا۔ دیوار جگہ جگہ سے جھکی ہوئی، لون لگ لگ کے مٹی جھڑتی تھی، ٹپکوں کی وجہ سے زمین میں جگہ جگہ گڑھے پڑ رہے تھے، جن کو راکھ سے بھر رکھا تھا۔ دیواریں اِس قدر کمزور ہو گئی تھیں کہ تُند ہوا کے جھونکوں میں بھنبھیری کی طرح کانپنے لگتی تھیں۔ طوطا مینا کی تو ایک بات ہے اگر پودنا بھی دیوار پر آ پُھدکے تو قیامت آ جاتی تھی۔ اگر کوئی کوّا یا چیل کسی دیوار پر آ بیٹھے تو لوگ اس طرح شور مچاتے کہ جیسے دیوار پر کالا پہاڑ آ گرا ہے، دروازے کے سامنے اینٹ مٹی کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا اور منڈیر کی مٹی آہستہ آہستہ گِر رہی تھی۔ سامنے کے کواڑ ٹوٹے ہوئے اور زلفی زنجیر پُرانی اور زنگ آلودہ تھی، خیر ــــ پتہ ملا کہ میر صاحب اندر تشریف رکھتے ہیں، ہم اندر داخل ہوئے لیکن ڈرتے ڈرتے، خوف تھا کہ چھت ہم پر ہی نہ آ پڑے۔ ڈیوڑھی کی چھت میں سے آسمان دکھائی دیتا تھا۔ شہتیریں خم ہو کر کمان بن رہی تھیں۔ جگہ جگہ سے چڑیاں گھونسلوں کے لئے تنکے گھسیٹ رہی تھیں۔ اس قدر اڑواڑیں دی گئیں تھیں کہ مکان چہل ستون نظر آتا تھا۔ ڈیوڑھی میں سے مچھروں اور جھینگروں کے الاپ سُنتے ہوئے ہم ایک ایوان میں پہونچے۔ یہاں بھی وہی کھنڈرات کا نقشہ تھا۔ کڑیاں دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے تختوں پر ہزار پائے اور دیگر حشرات الارض محوِ خرام تھے، ایوان کے ساتھ ہی ایک حجرہ تھا جس میں میر صاحب ایک بوریے پر پانچ سات آدمیوں کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے، سلام سلام ہوئی، میرے ساتھی

تو میر صاحب سے میر کلیم کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اور فقیر نے کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اگرچہ یہ کمرہ باقی مکان کی نسبت کافی اچھا تھا لیکن پھر بھی "شکستہ تر ز دلِ عاشق" تھا۔ چھت میں جا بجا سُوراخ تھے، دیواروں سے جھڑ جھڑ کر مٹی کے ڈھیر لگ رہے تھے، ہر کونے میں چوہوں اور چھچھوندروں کی حکومت تھی، مچھروں کے شور اور جھینگروں کی تیز آواز سے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ طاق ٹوٹے پھوٹے اور اینٹ پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہوئے تھے، ایک کونہ میں ایک خستہ حال چارپائی پڑی تھی۔ اتنے میں ایک صاحب (بعد میں معلوم ہوا کہ میر صاحب کے بھائی ہیں) فقیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "اماں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اگر برسات میں اس مکان کا رنگ ڈھنگ دیکھو تو البتہ اور بات ہے، تب تو اس حجرہ میں کہیں بھی چارپائی رکھو بدرنگ پانی کے گرنے سے کیڑے ضرور افشانی ہو جائیں گے، بوریا بچھانے کا تو ذکر ہی کیا۔ ٹپکا لگے، تو سرک کے کبھی اس طرف ہو رہے کبھی اس طرف، صحنک، پیالہ، ہانڈی غرض گھر کے سب برتن جھانکوں کے نیچے رکھ دئے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہمارے کپڑے ہولی کا سماں یاد دلاتے ہیں۔ پچھلی بارش میں ایک طرف کی دیوار گری تو ہمسائے ہم خانہ بن گئے۔ گھر راستہ بن گیا۔ اور کتے ہر وقت ستانے لگے، میر صاحب انہیں دہتکارتے دھتکارتے بیزار ہو جاتے تھے۔ صحن میں ہر طرف پانی پھرتا تھا۔ چھپّر کے آگے کی ٹٹیاں صحن میں بہتی پھرتی تھیں، یہ خانہ ویرانی دیکھکر چھت بھی بے اختیار روتی تھی۔ آخر کار ایک دن تمام مکان گر پڑا۔ اور ایک لڑکا بھی اس میں دب گیا۔ وہ تو لوگوں کی مستعدی کو شاباش کہو کہ زندہ نکل آیا ورنہ اُس کے مر رہنے میں کوئی کسر باقی نہ رہی تھی، اُسدن بھی عجیب قیامت تھی، ہر ایک نے ایک ایک چیز اُٹھا کر گھر کو خیرباد کہا، میر صاحب کا کاندھا کپڑوں کی گٹھڑی سے زنگار تھا، بندہ کے سر پر چارپائی تھی[2]۔ کوئی چھاج کی اوٹ لئے جا رہا تھا۔ کسی نے سِرکی کا گھوگھا کیا، کسی نے بوریا گرد لپیٹ لیا۔ بہزار خرابی ہم سب یہاں سے ایسے نکلے ع:- جیسے کنجر کہیں کو چلتے ہیں! ـ اور ایک واقف کے گھر سر چھپایا۔ چوہوں کی گلو خلاصی کرانے کی نیت سے ایکدفعہ دو بلیاں بھی پالی تھیں لیکن دوست احباب وہ بھی مانگ کر لے گئے" ــ میر صاحب کے بھائی یہ باتیں

---

[1] "اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے" مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بسبب شدتِ باراں خراب شدہ بود" از میر مرحوم ـــ اور میر صاحب کے مکان کی باقی تفصیلات انکی مندرجہ ذیل مثنویات سے ماخوذ ہیں:- (۱) مثنوی در مذمتِ برشگال - (۲) مثنوی در ہجو خانۂ خود جس کا ذکر اوپر آ گیا ہے۔ (۳) مثنوی در تذکرہ خانۂ خود۔ وغیرہ وغیرہ ـــ از کلیاتِ میر۔ [2] سر پہ بھائی کے چارپائی تھی۔

کر رہے تھے کہ میر صاحب بولے "بھئی ایک مصیبت ہو کہیں۔ دن تو کسی نہ کسی طرح گزار ہی لیتے ہیں۔ البتہ رات کو بچھو سے بچھاتے ہیں۔ ع، سر بہ روز سیاہ لاتا ہوں !! کھٹمل رات کو کسی پہلو آنکھ نہیں لگنے دیتے۔ ملتے ملتے ناخن لال ہو جاتے ہیں، پوریں گھس گئی ہیں سو سو علاج کئے ہیں۔ کھاٹوں کی چولیں نکلوائی ہیں۔ گرم پانی ڈلوایا ہے۔ لیکن کھٹمل کسی طرح کم نہیں ہوتے !"

میر صاحب[1] نے یہ بیان ختم نہ کیا تھا کہ دروازہ پر دستک ہوئی اور آواز کے تھوڑی دیر بعد چند عمائدین و اراکینِ شہر اندر تشریف لائے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد سبھی بورئے پر بیٹھ میر صاحب کے پرانے گگڑے کے کش لگانے لگے۔ نوواردوں میں سے چند نے فرمائشِ اشعار کی۔ میر صاحب نے اوّل تو کچھ ٹالا پھر صاف جواب دیا کہ "صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے"۔ اگرچہ ناگوار ہوا مگر بنظرِ آداب و اخلاق انہوں نے اپنی نارسائی کا اقرار کیا اور پھر درخواست کی۔ میر صاحب نے پھر انکار کیا۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا "کہ حضرت انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے؟" میر صاحب نے کہا کہ "یہ درست! مگر ان کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میری کلام کیلئے فقط محاورۂ خواص ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں ــ اور اس سے آپ محروم!" یہ کہکر ایک شعر پڑھا۔

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا
دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا کہ "آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ی کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ ی تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اسکے سوائے جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے !!"

یہ لوگ تھوڑی دیر بیٹھ اجازت کے طالب ہوئے مگر جاتے جاتے میر صاحب کو آتشِ زیر پا کر گئے۔ اب میر صاحب آئیں تو جائیں کہاں فرمانے لگے "یہ امیر لڑکے نیزہ بازی سے شغل کریں، تیر اندازی فرمائیں، پٹہ کے ہاتھ نکالیں، شہسواری کی مشق کریں لیکن شاعری کو الٹی چھری سے حلال نہ ہی کریں تو عنایت ہو۔ شاعری دلخراشی اور جگر کاوی کا کام ہے۔ ان کی طباع اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ اسکے درپے نہ ہوں تو اچھا ہے۔ جب صحبتیں تھیں، اشراف میں شاعری کا چرچا تھا اُستادانِ فن ناکسوں سے سخن تک نہ کرتے تھے تب شاعر بھی انصاف کو درمیاں رکھتے تھے، لیکن اب تو شاعر لوگ اپنی قدر و منزلت مدح و قدح کے دو پیالوں میں ڈبو بیٹھے ہیں جس دن سے یار لوگوں نے شاگردی کی قیدیں اٹھا دی ہیں، اُسی دن سے عروسِ شعر کے جی جان کا خدا ہی ہے۔ جب سے اجلاف نے اُسے اپنے گھر ڈال لیا ہے اُس دن سے جھوٹ اور مبالغہ کے سوا اِس بیچاری کے پاس رکھا ہی کیا ہے؟ ــ اور سُنو آجکل کے برخود غلط شاعروں نے عجیب وطیرہ پکڑ رکھا ہے۔ بیچارے اُستاد کہلوانے کے شوق میں مرے جاتے ہیں۔ کن کن حیلوں اور بہانوں سے اُستاد بنتے ہیں۔ کسی نوخیز لمڈے کو چند اشعار جوڑ کر دیدیتے ہیں۔ اور پھر ہر بزم میں اِسے اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ موقع دیکھا تو اُسے اشارہ کیا کہ گرمِ سخن ہو۔ اور وہ انکے ایما سے وہی رٹے ہوئے اشعار پڑھکر صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا۔ اور دعویِٔ طبعِ لطیف کرے تو سوائے یہ کہنے کے کیا چارہ ہے کہ ع،

آفریں شاگرد و رحمت اوستاد[2] !"

میر صاحب[3] کے یہ تیور دیکھکر اور امیرزادوں کے اِس حشر پر فقیر کو تو یارائے دم زدن نہ تھا۔ البتہ فقیر کے ہمراہی نے میر صاحب سے پرانی واقفیت کی بنا پر کچھ جرأت پکڑی اور یوں گویا ہوئے کہ "حضرت قبلہ آخر اتنے بزرگوں میں ایک آدھ تو ضرور ایسا ہوگا جو حقیقی شاعری کی میزان میں پورا اُترے۔ اور اتنے نام نہاد اُستادوں میں چند کاملینِ فن ضرور ایسے ہونگے جو ریختہ کیلئے مایۂ افتخار ہوں، آپکی اس میں کیا رائے ہے؟ اور آپکے خیال میں آجکل شاعر کون کون ہے؟" ــ میر صاحب نے کچھ تامل کرکے فرمایا کہ "ایک تو یہ خاکسار دوسرے سودا" اور کچھ سوچ کر کہا "آدھے میر درد"۔ کوئی شخص حاضرین میں سے بولا کہ "حضرت اور میر سوز صاحب؟" چین بجبیں ہو کر فرمایا کہ "میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟" انہوں نے کہا "آخر اُستاد نواب آصف الدولہ کے ہیں"! کہا کہ "خیر یہ ہے تو پونے تین سہی ــ مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے نہیں سُنے !"

کافی دن ڈھلے تک میر صاحب کی پاکیزہ باتوں اور نورانی صورت سے آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک کا عالم رہا۔ فقیر پر تو یہ کیفیت طاری تھی کہ معلوم بھی نہ ہوا کہ بیٹھے بیٹھے اتنا وقت آچکا ہے۔ اتنی طویل ملاقات کے باوجود فقیر کی طبیعت گو ابھی سیر نہ ہوتی تھی۔ لیکن اپنے ہمراہی کے ساتھ اُٹھنا پڑا، کیونکہ انہیں دکان پر جانے کی جلدی تھی۔ خیر دل پر پتھر رکھکر اجازت کے طالب ہوئے۔ اور میر صاحب کی باتیں یاد کرتے گھر کی راہ لی۔ بعد میں اکثر ملاقاتیں رہیں۔ اور انکی یاد اب بھی فقیر کے حافظہ میں تازہ اور محفوظ ہے۔ مگر مضمون کی طوالت کے خوف سے باقی کسی آئندہ صحبت پر اُٹھا رکھا جاتا ہے۔

انور مختار صدیقی

---

[1] ملاحظہ ہو آبحیات، [2] مثنوی مسمیٰ تنبیہ الجہال، [3] ملاحظہ ہو آب حیات۔

گزرے اُردو کے ہرایک عہد میں صدہا شاعر
مختلف قسم پہ ہے یہ بھی جماعت تقسیم
چند اقسام پہ اور ان کی ہے ممکن تقسیم
ہیں جو انسان تو ہیں عیب زدہ بھی بے مثل
ذوق ہر اک کا جُدا، لطف جدا، طرز جُدا
محفلِ شعر میں غولِ شعرا کیا۔ دیکھا
بعض کی وضع سے ظاہر تھا پھٹیچر ہونا
بعض "فی احسن تقویم" کے پُتلے یعنی
خوشنوائی کا سرِ بزم یہ عالم دیکھا
لحنِ داؤد بھی بعضوں کو دیا قدرت نے
درد اور لطف سے اشعار ہوں خالی جس کے
جس کے اشعار کہے جا سکیں اچھے نہ بُرے
صرف موزوں ہو کوئی بات نہ نکلے جس میں
کر سکے جو نہ رجز اور رمل میں تمیز
بعض بحروں میں طبیعت ہو رواں بعض میں ٹھس
جو سرِ بزم غزل اپنی سُناتے شرمائے
جو غزل اور کی سُنکر نہ غزل اپنی سُنائے
غزلیں برجستہ سُناتا ہو جو طفلِ مکتب
جو سُنانے میں غزل شعر کی صورت بن جائے
گا کے محفل میں جو دار اپنے سخن کی چاہے
زہد اور تقوے سے لبریز ہوں جس کے اشعار
شوق شاگردوں سے ہو جس کو اور اصلاح کی دھت
جس کے ممدوح بکثرت ہوں قصیدے ارزاں
جس کے اشعار میں ہو حُسنِ طلب کی کثرت
لیکے دیوان نہ خود دیکھ لو۔ کیا پوچھتے ہو
ہم بتائیں گے تو وہ رائے ہماری ہوگی
جتنے شاعر ہیں یہاں اُتنی ہی طرزیں اُن کی
جرأت و سوز کوئی مصحفی و میر کوئی
جرأت و مصحفی و سوز ہر اک میں اک بات
سیل و طوفان و غریو طبلِ جنگ کہو

شہر و دیہات میں قصبات میں ہر جا شاعر
کوئی ادنےٰ کوئی اوسط کوئی اعلیٰ شاعر
کوئی کچّا کوئی پکّا کوئی کورا شاعر
کوئی لنگڑا کوئی کانا کوئی اندھا شاعر
کوئی روکھا کوئی پھیکا کوئی میٹھا شاعر
کوئی ٹیڑھا کوئی بانکا کوئی بونگا شاعر
کوئی گدڑا کوئی چتھڑا کوئی اُدھڑا شاعر
کوئی پھپّس، کوئی لمبو، کوئی بونا شاعر
کوئی گونجا، کوئی گرجا، کوئی سینکا شاعر
کوئی بلبل، کوئی طوطی، کوئی مینا شاعر
کیا کلام اُس میں جو کہتے اُسے سُوکھا شاعر
بے مزہ اُس کا کلام اور وہ پھیکا شاعر
اور کیا کہیے جو نہ کہیے اُسے کورا شاعر
شاعروں میں وہ بلا شبہ ہے اندھا شاعر
اک طرف سے اُسے کہہ سکتے ہیں کانا شاعر
مَردُوا ہو کے وہ بنتا ہے زنانا شاعر
گو جگہ سے نہ ہلے پر ہے بھگوڑا شاعر
اس کو بے ساختہ کہہ دیجے طمنچا شاعر
نقلِ محفل ہے وہ آپ اپنا تماشا شاعر
کیا خبر ہے وہ سخنور کہ گویّا شاعر
زیب دیتا ہے لقب اُس کا ہو مُلّا شاعر
کام شاعر پھرے آواز لگاتا شاعر
بھیک کیوں مانگے نہ وہ لیکے طنبورا شاعر
شعر کہتا ہے وہ یا بیٹ بجاتا شاعر
کون اچھا تھا یہاں کون بُرا تھا شاعر
کیا خبر کون ہو مرغوب تمہارا شاعر
ایک سے ایک مُشابہ نہیں پورا شاعر
کوئی چرکین و زٹلی اور کوئی انشا شاعر
کوئی پوّا، کوئی ادھا، کوئی پونا شاعر
سید انشا تھا غرض زور بلا کا شاعر

درؔد میں درد و تصوّف کا مزا ملتا ہے
اور مومنؔ کو بھی سب کہتے ہیں اچھا شاعر

پختہ سوؔدا تھا ہوا ذوقؔ بھی کامل فن میں
مانتے جس کو مخالف بھی ہیں پورا شاعر

میر جعفر کی زٹل میں بھی ہے جدّت موجود
گو کہ چرکینؔ بھی موجد تھا۔ یہ گندا شاعر

جانؔ صاحب نے کہا ناک پہ اُنگلی رکھکر
نوج رنگینؔ سا ہو کوئی نگوڑا شاعر

کہہ سکے کون مگر ناسخؔ و آتشؔ کیا تھے
ایک کو ایک نے خود ہی نہیں مانا شاعر

آتشِ لکھنوی دلّی ہی کی چنگاری تھا
لکھنؤ والوں میں نکلا وہی بانکا شاعر

داد امانتؔ کی نہ دیں گے تو خیانت ہوگی
لکھ سکا نظم میں کوئی نہ ڈرا ما شاعر

ایک اقلیم کے دو شہ تھے انیسؔ اور دبیرؔ
تھے وہ شبیرؓ کے مدّاح نہ کہنا شاعر

مرثیہ قوم کا حالیؔ نے بھی اچھا لکھا
بن گیا قوم کا ممدوح وہ بگڑا شاعر

سادگی، لطفِ زباں طرزِ ادا کی شوخی
اِن سے تسلیم ہوا داغؔ بھی یکتا شاعر

پختہ شاعر تھے امیر احمد مینائیؔ بھی
کہنہ مشّاق مگر قافیہ پیما شاعر

جو دوغزلے سے بھی بڑھ جائے سہ غزلہ لکھے
شعر کہتا نہیں ہے جانؔ کو آتا شاعر

شاعری چیزے دگر، چیزے دگر اُستادی
شعر و فن دونوں میں کامل تو ہے عنقا شاعر

ہاں مگر میرؔ کہ شاعر بھی ہے اُستاد بھی ہے
جس کو ہر عہد کے اُستاد نے مانا شاعر

آج بھی جس نے کلام اُس کا پڑھا بول اُٹھا
میرؔ تھا میر تقی میر تھا تنہا شاعر

غالبؔ و میرؔ و نظیرؔ اکبر آبادی تینوں
آج اِنہیں مانتا ہے سارا زمانا شاعر

ہے مگر یہ بھی مُسلّم نہیں محتاجِ ثبوت
ان کو دلّی ہی کی گلیوں نے بنایا شاعر

گرچہ سچّا تھا مگر کچّا تھا افسوس نظیرؔ
اور غالبؔ۔ وہ تصنّع سے بھرا تھا شاعر

طرزِ غالبؔ بھی مگر دیتی ہے غالبؔ ہی کو زیب
جو ہے غالبؔ ہی کی اب طرز پہ جاتا شاعر

چیستاں طرزِ سخن معنی و مطلب مجہول
جو اشاروں میں کہے بات وہ گونگا شاعر

چٹ ہی کر جاتا ہے مطلب کو۔ سمجھتے رہیئے
دے اضافت پہ اضافت ہے لگاتا شاعر

جس کو تعقید و غلو اور اضافت کا مرض
نہیں شاعر وہ حقیقت میں ہے بنتا شاعر

اُونچا اُڑتا ہے وہ غالبؔ سے بھی گہرا جاتا
ہنس کی چال ہے چل چل کے دکھاتا شاعر

مور کے پر وہ لگا لیتا ہے اپنی دُم میں
لفظ و ترکیب جو غالبؔ کی ہے لاتا شاعر

کون سمجھائے کہ شاعر نہیں نقّال ہے تو
غالبؔ خستہ کا کیوں مُنہ ہے چڑاتا شاعر

کون سمجھائے کہ شاعر نہیں بننے سے بنا
فطرتاً اس کو ہے اللہ بناتا شاعر

صاحبِ طرز ہو خود اس میں دکھا طرفہ کمال
اندھی گلیوں میں ہے کیوں ٹھوکریں کھاتا شاعر

شاعرِ عہد ہے وہ رودکیؔ وقت ہے وہ
اپنی بنسی پہ جو راگ اپنا ہے گاتا شاعر

داغؔ و حالیؔ بھی پڑے ماند وہ چمکا اقبالؔ
اب نگاہوں میں نہیں کوئی سماتا شاعر

مست ہو جاتا ہے ہر گبر و مسلماں سُنکر
جب وہ جلسوں میں سُناتا ہے ترانا شاعر

شاعری میں یہ نئی راہ نکالی اُس نے
ولولا تا ہے وہ قوموں کو اُٹھاتا شاعر

پیشرو اُس کے نہ گر شاعرِ ماضی ہوتے
کب یہ اسٹیج پر اقبالؔ سا آتا شاعر

آپ بھی مان لیں اب شاعری بیکار نہیں؟
شعر دولت ہے بڑے کام ہے آتا شاعر

احتشام الدین

پھانسی

چھٹا باب

وقت اُڑ رہا ہے

اُس گڑھی پر، جہاں دہشت پسند مجرم قید تھے، ایک چھوٹا سا مینار تھا، جس میں ایک پُرانی وضع کا گھنٹہ لگا ہوا تھا۔ ہر گھنٹے، ہر آدھ گھنٹے اور ہر پاؤ گھنٹے پر اِس گھنٹے کی باج سُنائی دیتی تھی۔ اسکی آواز غمناک اور دیر تک گونجتی تھی اور آہستہ آہستہ ہوا میں اِس طرح گھُل مل جاتی تھی جیسے کوئی دُور جاتے ہوئے پرندے کی دردناک چہکار۔ دن کے وقت یہ عجیب اور غمناک موسیقی شہر کے شور و غل میں محو ہو جاتی تھی کیونکہ شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور یہ بازار گڑھی سے ملے ہوتے تھے۔ موٹریں بھنبھناتی ہوئی گُزرتیں، پکّی سڑکوں پر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور، گاڑیوں کے ہارن اور گاڑی بانوں کی چیخ پکار، دیہاتیوں کا شور اور اُن کے ٹٹوؤں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی سُریلی آوازیں، سب ہوا میں مل کر عجیب طرح کا شور پیدا کرتی تھیں۔ میلے کا موقع تھا اس لئے شہر میں بڑی چہل پہل تھی۔ اور اِن سب آوازوں پر مستزاد برف باری، سبزہ زاروں کے گدلے چشمے اور چوراہوں کے درخت جو ایک دم سے سیاہ فام ہو گئے تھے۔ سمندر کے رُخ سے گرم ہوا کے نم جھونکے آ رہے تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ننھّے ننھّے تازہ ذرّات ہوا کے ساتھ اُڑ کر لامحدود فضا میں تحلیل ہوتے نظر آ رہے ہیں —— بلکہ ان کی ہنسی کی آواز بھی سُنائی دے رہی ہے۔

رات کے وقت بازار خاموش ہو جاتے۔ صرف بجلی کی روشنی جگمگاتی رہتی۔ اب یہ گڑھی جس میں روشنی نام کو بھی نہیں تھی، شہر سے الگ تھلگ بجائے خود ایک وجود اختیار کر لیتی۔ خاموشی، سکوت اور تاریکی کی ایک دیوار زندہ جاوید شہر اور اُس کے درمیان حائل ہو جاتی، یہ وہ وقت ہوتا تھا جب گھنٹے کی ضربیں صاف سُنائی دیتی تھیں۔ ایک عجیب موسیقی، جو اِس دُنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتی تھی، آہستہ آہستہ غمناکی سے پیدا ہوتی اور بلند ہو کر مر جاتی۔ پھر پیدا ہوتی، کانوں کو دھوکا دیتی، غم میں ڈوبی ہوئی ملائم آواز سُنائی دیتی —— ختم ہو جاتی —— اور پھر گونجنے لگتی۔ بڑے بڑے، شفاف شیشے جیسے چمکدار قطروں کی طرح، گھنٹے اور منٹ نامعلوم بلندی سے گھڑیال میں اُترتے رہتے تاکہ اُس کی ملائم گونج میں مدغم ہو جائیں۔

صرف یہی آواز تھی جو، دن ہو یا رات، اُن قیدیوں کی کوٹھڑیوں میں پہونچتی رہتی جنہیں یہاں قیدِ تنہائی کی سزا ملی تھی۔ چھت میں سے، موٹی موٹی سنگین دیواروں میں سے، یہ آواز پار ہو جاتی، خاموشی کو مُنتشر کرتی اور پھر غیر محسوس طور ہی پر واپس بھی لَوٹ آتی۔ بعض دفعہ قیدی اِس آواز کی آس لگائے انتظار کرتے رہتے اور خاموشی سے اُن کا دم گھٹنے لگتا۔ صرف نہایت اہم مجُرم یہاں بھیجے جاتے تھے۔ یہاں خاص خاص قوانین تھے، سخت، بھیانک اور شدید، اس کی دیواروں کی طرح۔ اور اگر سنگدلی میں شرافت کا جُزو بھی ہے تو یہاں وہ اجیرن مُردہ خاموشی طاری رہتی تھی جس پر سانس تک کی آواز صاف سُنائی دے۔ اس مکمّل خاموشی کی شرافت میں کیسے شُبہ ہو سکتا ہے۔

اور اس سنّاٹے میں جس میں کبھی کبھی گزرتی ہوئی ساعتوں کی دُکھ بھری آواز سُنائی دے جاتی تھی، ہر زندہ شے سے علیحدہ، پانچ انسان، دو عورتیں اور تین مرد، رات گزُرنے، صبح ہونے اور قتل ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ پانچوں اپنے اپنے طریقے پر موت کا استقبال کرنے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔

ساتواں باب

موت کوئی چیز نہیں ہے۔

تانیا نے ساری زندگی اوروں کے خیال میں گزُاری تھی۔ کبھی اپنا خیال کیا ہی نہیں تھا۔ اب بھی وہ کرب و صعب میں مُبتلا تھی۔ اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کے لئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت صرف اُنہی کو آنے والی ہے۔ گویا سرجے گولُ دن اور مُسیا اور دوسروں ہی کو پھانسی کا خیال ستا رہا ہوگا۔ رہی وہ خود تو موت کا تعلق اُسکی ذات سے کچھ بھی نہیں تھا۔

کمرۂ عدالت میں جس مضبوطی اور ضبط سے اُس نے کام لیا تھا اُس کا ردِّ عمل یوں ہوا کہ اپنی کوٹھڑی میں بند ہونے کے بعد وہ گھنٹوں روتی رہی۔ بڑھیوں کی طرح جنہوں نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی ہوں۔ یا بیحد ہمدرد اور نرم دل جوانوں کی طرح جو دلسوزی سے روسکیں۔ اور اِس خوف سے کہ شاید سرپوژا کے پاس تمبا کو نہیں ہوگا، یا ورنر کو حسب عادت چاۓ نہیں ملتی ہوگی، اس پر مُستزاد یہ حقیقت کہ اُنہیں مرنا ہے، تانیا کو اتنی تکلیف پہونچتی تھی کہ موت کا تصوّر بھی اُس کے آگے گرد تھا۔ موت تو ایک ایسی چیز تھی جو ٹالی نہیں جاسکتی، جو اس لائق بھی نہیں کہ اس پر غور کیا جائے۔ لیکن اُس شخص کا خیال جو قتل کئے جانے سے پہلے قید ہو اور اُس کے پاس تمباکو نہ ہو ــــ یہ تو قطعی ناقابل برداشت خیال تھا۔ تانیا نے قید ہونے سے پہلے ان کے ساتھ جو خوشگوار زندگی گزاری تھی اُسکی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ پھر جب اُسے خیال آیا کہ ماں باپ سے ملنے میں سرجے پر کیا گزری ہوگی تو وہ مارے خوف کے بیہوش ہونے لگی۔

مُسیا کے لئے اُس کا دل بہت دُکھتا تھا۔ کافی عرصے سے اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مُسیا ورنر سے محبت کرتی ہے۔ گویا واقعہ دراصل یہ نہیں تھا پھر بھی تانیا اِن دونوں کے لئے اچھے اور روشن مُستقبل کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ گرفتار ہونے سے پہلے مُسیا کے ہاتھ میں چاندی کی ایک انگوٹھی تھی۔ اِس انگوٹھی پر ایک کھوپری، دو ہڈیاں اور ایک کانٹوں کا تاج بنا ہوا تھا۔ تانیا نے اِس انگوٹھی کو ہمیشہ شہادت کی علامت سمجھا۔ اس لئے کبھی مذاق سے اور کبھی سنجیدگی سے اُسے اُتار دینے کو کہتی رہتی۔ ایک دفعہ یہ کہکر بھی انگوٹھی مانگی تھی کہ "اپنی یادگار بطور مجھے یہ انگوٹھی دے دو"۔ مگر مُسیا نے صاف جواب دیدیا تھا: "نہیں تانیا میں تمہیں یہ انگوٹھی نہیں دوں گی۔ لیکن شاید کوئی اور انگوٹھی بہت جلدی تمہارے ہاتھ میں ہوگی"۔

کسی نہ کسی وجہ سے اِن سب کا یہی خیال تھا کہ تانیا بہت جلد شادی کرنے والی ہے۔ مگر تانیا اس سے ناراض ہوتی تھی کیونکہ اُسے شوہر کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اب جو مُسیا کی ہنسی مذاق کی باتوں کا خیال آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آتی تھی کہ اُسے پھانسی کا حکم مل چکا ہے تو تانیا کا دل مامتا سے بھر آتا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ گھڑیال کی آواز جب اُسکے کان میں پہونچتی تھی تو وہ اپنی آنسو بھری آنکھیں اُٹھاتی اور سُننے لگتی۔ خُدا جانے وہ اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں موت کی اِس ٹھنڈی آواز کو سُنکر کیا کر رہے ہونگے؟

لیکن مُسیا خوش تھی۔

کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے وہ کوٹھڑی میں متواتر اور بے تکان گھومے جاتی تھی۔ قیدیوں کا لباس اُس کے بدن پر بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اِسے پہنے ہوئے وہ مرد نظر آتی تھی ــــ جیسے کسی لڑکے نے مرد کے کپڑے پہن لئے ہوں۔ کوٹ کی آستینیں بہت لمبی تھیں۔ اُس نے اِنہیں اُلٹ لیا تھا اور اُس کے دُبلے پتلے بچوّں جیسے ہاتھ اِن میں سے اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے کوئی خوشنما پھول مٹی کے بھدّے گملے میں سے باہر نکلا ہوا ہو۔ کوٹ کا کھُردرا کپڑا اُس کی دُبلی سفید گردن سے رگڑ کھا رہا تھا اور کبھی کبھی دونوں ہاتھوں سے مُسیا اپنے گلے کو کالر سے الگ کرتی اور بڑی احتیاط سے اُس جگہ کو ٹٹولتی جہاں سے کھال چھلکر جھلجھلاہٹ ہونے لگتی۔

مُسیا اپنی کوٹھڑی میں ٹہلتی رہی۔ گھبراہٹ میں اُس کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو رہا تھا۔ خیال ہی خیال میں وہ لوگوں کے سامنے خود کو حق بجانب ثابت کر رہی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میں اتنی کم عمر، اتنی بے حقیقت ہوں، اور میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اتنا حقیر ہے کہ میں ہرگز ہیروئن کہلانے کی مستحق نہیں ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اُسی باعزّت اور خوبصورت موت کا حکم سُنایا گیا ہے جو سچّے ہیروز اور شہیدوں کو نصیب ہوئی۔ میرا کوئی کارنامہ ایسا نہیں ہے کہ مجھے اس طرح نوازا جائے۔ انسانی ہمدردی پر غیر متزلزل اعتقاد، لوگوں کا ترس کھانا، اُن کی محبت، کا خیال کر کے کہ میری وجہ سے لوگ کس قدر پریشان ہونگے، ہراساں ہونگے، بے بس ہو کر ترس کھا رہے ہونگے، مُسیا کو ایسی شرم آرہی تھی کہ اس کا چہرہ سُرخ ہوا جاتا تھا۔ گویا پھانسی پاکر اُس نے کوئی بہت بڑی، بہت بڑی غلطی کی ہے۔

اپنے وکیل سے جب اُس کی آخری مُلاقات ہوئی تو مُسیا نے اُس سے کہا تھا کہ "مجھے زہر لادو"۔ مگر پھر ایکا ایکی اُس کا ارادہ بدل گیا۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وکیل اور دوسرے لوگ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ میں نے زہر محض اس لئے کھایا ہے کہ پھانسی پر لٹکنے کے بجائے شاندار موت مروں تاکہ لوگ واہ واہ کریں یا مارے ڈر کے میں نے خودکشی کر لی۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے وکیل کو منع کر دیا۔

اب اُس کی صرف ایک آرزو تھی ـــــ کسی طرح لوگوں کو بتادے اُن پر ثابت کر دے، کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ نہیں کیا ہے۔ انہیں اس بات کا ذرا بھی شُبہ نہ ہو کہ مَیں مَوت سے خائف ہوں۔ وہ مجھ پر ترس نہ کھائیں اور میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ مَیں اتنی کم سِن ہوں اور مجھے شہادت کا درجہ ملنے والا ہے۔ میرے لئے اُن کا دل نہ کُڑھے۔

مُسیا اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ میں نے ایک جُرم کیا ہے اور مجھے سزا ٹھیک ملی ہے۔ اس میں آخر کونسی عزت وسعادت ہے؟ بیشک میں کمسِن ہوں اور ابھی بہت دِنوں تک زندہ رہتی۔ لیکن ـــــ

اور جس طرح سُورج کے سامنے چراغ اپنی روشنی زائل کر دیتا ہے اسی طرح اُس کی جوانی اور زندگی اُس تیز نور کے مقابلے میں ماند پڑ گئی جو اُس کے ننھے سے سر کے گرد ہالہ بن کر چمکنے والا تھا۔ مگر یہ بات اُسکے دل کو نہیں لگی: "مَیں اسکی مستحق نہیں ہوں"

لیکن شاید وہ عجیب وغریب چیز جو اُس کی رُوح میں گھُلی ہوئی تھی ـــــ بے انتہا محبت، بڑے بڑے کام کرنے کی بے انتہا خواہش، اپنی ذات سے بے انتہا نفرت، ـــــ بجائے خود ایک استحقاق تھا۔ اگر اُن کاموں سے، جنہیں وہ انجام دے سکتی تھی اور انجام دینا چاہتی تھی، وہ روک دی گئی تھی تو اس میں اس کا کوئی اپنا تصور نہیں تھا۔ اُسے تو دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا۔

لیکن اگر قاعدہ یہ ہے کہ کسی کی قدر و وقعت صرف اُس کے کارناموں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اُس کے ارادوں کی وجہ سے بھی کی جاتی ہے، تو پھر ـــــ تو پھر تاجِ شہادت کی وہ بھی مستحق تھی۔

مُسیا کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا: "کیا یہ ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ میں اُس کی مستحق ہوں؟ کہ لوگ میرے لئے روئیں، میری قسمت پر اپنا دل دُکھائیں؟ اتنی چھوٹی اور حقیر لڑکی پر!

اس خیال کے آتے ہی اُس کے دل کا کنول کھِل گیا۔ اب کوئی شُبہ نہیں تھا، کوئی تذبذب نہیں تھا ـــــ وہ اُن کی صف میں داخل ہو گئی تھی ـــــ اُن عظیم المرتبت ہستیوں کی صف میں جو تکالیف و مصائب، آگ اور خون کے راستے جنت کو سدھارتی ہیں۔ سکون کے نور، لامحدود طمانیت اور ابدی راحت میں پہونچ جاتی ہیں۔ مُسیا کو ایسا معلوم ہوا کہ اِس دُنیائے کثیف سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ اور صداقت وحیات کے منبع نور سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ ایک لطیف شے کی طرح اس ابدی نور میں پرواز کر رہی ہے۔

مُسیا فورِ مسرّت سے بے حال ہوئی جارہی تھی: "اچھا تو یہ ہے۔ مَوت؟ یہ تو نہیں ہے ـــــ مَوت!"

ساری دُنیا کے سائنسداں، فلسفی اور جلاد بھی اگر اسکی کوٹھری میں آکر اپنی کتابیں، اوزار اور پھانسی کے پھندے دکھا کر موت کا وجود اس کے سامنے ثابت کرتے، یہ دکھاتے کہ انسان مرجاتا ہے اور مار ڈالا جاتا ہے، ابدی زندگی کوئی چیز نہیں، تب بھی مُسیا اُن کا یقین نہ کرتی بلکہ صرف استعجاب سے اُن کی طرف دیکھتی۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ بے موت کی زندگی نہ ہو؟ کیونکہ وہ خود ایسی زندگی بسر کر رہی تھی جو موت انجام نہیں تھی۔ بے موت کی اور کونسی زندگی ہو سکتی ہے؟ اور کون سی مَوت ہو سکتی ہے؟ وہ تو خود مر کے لافانی ہو گئی تھی۔ مَوت میں اُسے زندگی مل گئی تھی جس طرح زندگی میں اُسے موت مل گئی تھی۔

اگر کفن میں لپٹی ہوئی مُسیا کی گلی سڑی لاش بھی اُسکی کوٹھری میں لائی جاتی اور کہا جاتا: "دیکھ۔ یہ ہے تُو!"

تب بھی وہ دیکھکر یہی کہتی: "نہیں۔ یہ مَیں نہیں ہوں"

اگر اس سڑتی لاش کا بھیانک منظر دکھا کر مُسیا کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی کہ یہ تُو ہی ہے، تب بھی وہ مُسکرا کر کہتی: "نہیں، تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ مَیں ہوں۔ لیکن ایسا نہیں۔ میں تو وہ ہوں جس سے تم باتیں کر رہے ہو۔ مَیں بھلا یہ کیسے ہو سکتی ہوں؟"

"لیکن تم مر جاؤ گی اور ایسی ہو جاؤ گی"

"نہیں، مَیں نہیں مرونگی"

"تمہیں پھانسی دی جائیگی۔ دیکھو یہ پھندا ہے"

"ہاں مجھے پھانسی دی جائیگی لیکن مَیں مرونگی نہیں۔ میں کیسے مر سکتی ہوں جب ـــــ جب میں غیر فانی ہوں؟"

اور یہ سُنکر سائنسداں، فلسفی اور جلاد لرزتے کانپتے پیچھے ہٹ جائیں گے اور کہیں گے: "یہ جگہ مقدس ہے۔ اِسے اپنے وجود سے ہمیں نجس نہیں کرنا چاہیئے"

مُسیا اس کے علاوہ اور کیا سوچ رہی تھی؟ وہ کئی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کے نزدیک رشتۂ حیات موت سے منقطع نہیں ہوتا تھا بلکہ سکون و ہمواری سے پھیلتا چلا جاتا تھا۔ اُسے اپنے ساتھیوں کا خیال آرہا تھا جو بہت دُور درد و غم کی زندگی گزار رہے تھے۔ اور اُنکا خیال آرہا تھا جو قریب ہی تھے اور خود اس کے ساتھ پھانسی پانے والے تھے۔ ویسلی پر اُسے تعجب آرہا تھا ـــــ وہ اس قدر پریشان کیوں تھا ـــــ وہ تو بڑا بہادر اور موت کا مذاق اُڑاتا تھا۔ ابھی منگل کی صبح ہی

کا تو ذکر ہے کہ جب سب نے پھٹنے والے گولے اپنی اپنی پیٹیوں میں لٹکائے تھے تو تانیا کے ہاتھ خوف سے کانپنے لگے تھے۔ اس لئے مُسے گھر چھوڑ دیا تھا۔ اس موقع پر دلیسلی مذاق اُڑا رہا تھا اور خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا بلکہ اس قدر اُچھل کُود رہا تھا کہ ورنر نے سختی سے اُسے ٹوک کر کہا تھا۔ "موت سے زیادہ بے تکلف ہونا ٹھیک نہیں۔"

اب اُسے کس بات کا خوف کھائے جا رہا تھا؟ لیکن یہ ناقابلِ فہم خوف مُسیا کی رُوح سے اس قدر بیگانہ تھا کہ اُس نے اِس کا سبب تلاش کرنا ہی چھوڑ دیا ـــــ اور ایک دفعہ ہی اُس کے دل میں یہ پُرزور خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گول دن کے قریب ہو اور اُس کے ساتھ قہقہے لگائے۔ کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی، پھر اس سے بھی زیادہ شدید خواہش ورنر سے ملنے کی پیدا ہوئی تاکہ اُسے کسی بات کا قائل کرے۔ پھر آپ ہی آپ یہ سوچ کر کہ ورنر برابر والے کمرے میں اپنے جچے ہوئے قدموں سے ٹہل رہا ہے۔ مُسیا نے گویا اُس سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔

"نہیں ورنر۔ میرے پیارے۔ یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تم مار ڈالے جاؤ گے یا نہیں۔ تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم شطرنج کھیل رہے ہو کہ ایک ایک کر کے سارے مہرے مارنے کے بعد بازی جیت جاؤ گے۔ سب سے ضروری بات تو یہ ہے کہ ہم خود مرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟ اور لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ یہی نا کہ موت سے زیادہ اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہوتی۔ اُنہوں نے خود ہی مَوت ایجاد کی ہے، خود ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ اور ہمیں بھی اُس سے ڈرانا چاہتے ہیں۔ سُنو۔ میں کیا کرنا چاہتی ہوں ـــــ ایک فوج کی فوج سامنے کھڑی ہو اور مَیں اکیلی اُس کے مقابلے میں جاؤں اور اُس پر اپنے طمنچے سے گولیاں چلاؤں۔ کوئی مضائقہ نہیں کہ مَیں اکیلی اور وہ ہزاروں ہوں۔ چاہے اُن میں سے ایک کو بھی مَیں نہ مار سکوں۔ لیکن اصل بات جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہزاروں ہیں۔ جب ہزاروں مل کر ایک کو مار لیں تو اسکے معنی یہ ہوتے کہ اُس ایک کی فتح ہوئی۔ یہ سچ ہے ورنر، میرے پیارے ...."

لیکن یہ بھی اُس کے لئے اتنا واضح ہو گیا کہ اُس پر بحث کرنیکی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ـــــ ورنر کو یہ باتیں خود کہنی چاہئیں۔ شاید اس کا دل کسی ایک خیال پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جیسے کوئی چڑیا آسانی سے فضا میں بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ لامحدود فضا اُس کے چاروں طرف پھیلی ہو اور اُس کی ساری گہرائی اور بلندی اُس کی پرواز میں ہو۔ گھڑیال کی مسلسل آوازنے گہری خاموشی کو منتشر کر دیا۔ اور اس شریلی، دُور سے آنے والی خوبصورت آواز میں سُننے والوں کے خیالات بہنے لگے۔ مُسیا کے خیالات بھی گونجنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ سرکنے والے سائے موسیقی ہی مُدغم ہو گئے۔ مُسیا کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی سُنسان اندھیری رات میں ایک کشادہ و ہموار سڑک پر سفر کر رہی ہے۔ گاڑی ہلکے ہلکے ہچکولے کھاتی چلی جا رہی ہے اور ننھی ننھی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ خوف و پریشانی دُور ہو چکی تھی۔ تھکا ماندہ جسم اندھیرے میں گھل مل گیا تھا، اور اُس کا مسرت سے تھکا ہوا دماغ سکون حاصل کر کے چمکدار پرچھائیاں بنا رہا تھا۔ مُسیا ان پرچھائیوں کی آب و تاب اور پُرسکون راحت میں کھوئی جا رہی تھی۔ مُسیا کو اپنے اُن تین ساتھیوں کا خیال آیا جو کچھ عرصہ پہلے پھانسی پا چکے تھے۔ اُن کے چہرے چمک رہے تھے اور وہ خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ چہرے اتنے قریب آ گئے تھے کہ زندگی میں بھی کبھی مُسیا کے اتنے قریب نہیں آئے تھے۔ اُس شخص کی طرح جو صبح کو یہ سوچ کر خوش ہو کہ شام کو اُسے اپنے دوستوں کے گھر جانا ہے مُسیا کے لبوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ نمایاں ہوئی۔

مُسیا ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی۔ آہستہ سے اپنی کھٹیا پر پڑ گئی اور آنکھیں بند کئے یہی خواب دیکھتی رہی۔ گھڑیال کی آواز آ رہی تھی۔ خاموشی منتشر ہو رہی تھی۔ چمکدار، گاتی ہوئی پرچھائیاں اُس کی آنکھوں کے آگے تیرتی پھر رہی تھیں۔ مُسیا سوچ رہی تھی:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ یہی موت ہو؟ یا اللہ! کس قدر حسین ہے یہ! یا یہ زندگی ہے؟ مَیں نہیں جانتی۔ مَیں نہیں جانتی۔ میں بس دیکھتی رہونگی اور سُنتی رہوں گی!"

مُسیا کا سامعہ کبھی کا تخیّل کی نذر ہو چکا تھا ـــــ اُسی لمحے سے جبکہ وہ قید کی گئی تھی۔ خاموشی میں اُس کی سماعت تیز اور موسیقانہ ہو گئی تھی۔ خاموشی کے اس پس منظر پر، برآمدہ میں ٹہلنے والے محافظوں کے قدموں کی آواز، گھڑیال کے بجنے کی صدا، لوہے کی چھت پر ہوا کا سناٹا، لالٹینوں کے ہلنے کی چرچراہٹ ـــــ ان سب ذرا ذرا سی باتوں کی پوری پوری موسیقانہ تصویریں مُتشکل ہو جاتی تھیں۔ شروع شروع میں مُسیا ان سے ڈری اور ان سے اپنا خیال ہٹانے کی کوشش کرتی اور انہیں سمجھتی کہ بیمار متخیلہ کی تخلیق ہیں۔ لیکن بعد میں اُسکی سمجھ میں آ گیا کہ مَیں تو تندرست ہوں اور یہ کوئی فریبِ تخیل نہیں ہے۔ جب یہ اطمینان ہو گیا تو ان خوابوں کو وہ اکثر دیکھنے لگی۔

بیٹھے بیٹھے اُسے ایک دم سے ایسا معلوم ہوتا کہ فوجی باجہ بج رہا ہے اور ایک ایک سُر اُسے صاف سُنائی دے رہا ہے۔ تعجب سے اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں، سر اُٹھایا ـــ کھڑکی کے باہر اندھیری رات تھی اور گھڑیال بج رہا تھا۔ مُنیا نے مطمئن ہو کر کہا "پھر" اور آنکھیں بند کر لیں۔ بند کرتے ہی پھر فوجی باجے کی آواز گونجی۔ اُسے صاف سُنائی دے رہا تھا کہ فوج، پوری ایک پلٹن گڑھی کے دائیں سرے سے مُڑ کر آرہی ہے اور اب اُس کی کھڑکی کے نیچے سے گذر رہی ہے۔ برف جمی ہوئی زمین پر اُن کے ملے ہوئے قدم ایک ساتھ پڑ رہے تھے۔ ایک دو! ایک دو! مُنیا کو کبھی کبھی کسی کے جوتے کی چرچراہٹ بھی سُنائی دے جاتی تھی۔ کبھی کسی کے پاؤں پھسلنے اور پھر سنبھلنے کی آواز سُنائی دیتی۔ اور فوجی باجے کی آواز نزدیک ہوتی گئی ـــ کوچ کا باجہ بج رہا تھا جیسا کسی تہوار پر بجا کرتا ہے۔ مُنیا نے سوچا شاید گڑھی میں کوئی تہوار منایا جا رہا ہے۔

اب باجہ اُس کی کھڑکی کے نیچے آگیا اور اس کی کوٹھڑی خوشی کے نغموں سے بھر گئی۔ ایک بڑا بے سُرا پیتل کا ساز سب سے الگ گدھے کی طرح رہنک رہا تھا ـــ مُنیا سازندے تک کو دیکھ سکتی تھی جو اپنی دانست میں بہت اچھا بجا رہا تھا ـــ اُس کی مضحکہ خیز صورت دیکھ کر مُنیا ہنس پڑی۔

پھر ہر چیز وہاں سے آگے بڑھنی شروع ہوئی۔ قدموں کی آواز دُور ہوتی گئی ـــ ایک دو! ایک دو! دُور سے باجہ اور اچھا معلوم ہونے لگا۔ بے سُرا پیتل کا ساز رہنک رہا تھا ـــ اور پھر ہر چیز آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ گھڑیال کی آواز پھر سُنائی دی، مدھم، غمناک، اتنی ہلکی کہ خاموشی زائل نہ ہو سکی۔

مُنیا نے افسُردہ ہو کر کہا "چلے گئے!" ان آوازوں میں کتنی خوشی اور کتنی ہنسی تھی! پلٹن کے فوجیوں کے چلے جانے پر وہ افسُردہ تھی کیونکہ یہ اُن فوجیوں سے بالکل الگ تھے جن پر وہ طمنچے سے گولیاں چلانا چاہتی تھی۔

مُنیا نے بڑی لجاجت سے کہا "پھر آجاؤ" اور پرچھائیاں زیادہ تعداد میں لوٹ آئیں۔ اس پر جُھک کر اُسے ایک شفاف بادل میں لپیٹ لیا اور مُنیا کو اُوپر اُٹھانے لگیں۔ اُوپر فضا میں جہاں چڑیاں اُڑ رہی تھیں اور نقیبوں کی طرح چیخ رہی تھیں۔ دائیں طرف، بائیں طرف، اُوپر نیچے، ہر طرف چڑیاں نقیبوں کی طرح چیخ رہی تھیں، دُور سے اپنی پرواز کی صدا لگا رہی تھیں، وہ اپنے پر پھیلائے ہوئے تھیں گویا تاریکی نے اُنہیں ہوا میں سہارا دے رکھا ہے۔ جیسے روشنی اُنہیں سہارے رہتی تھی۔ اور اُن کے تنے ہوئے سینوں پر دُور نیچے شہر کی روشنی نیلی شعاعیں بن کر اُڑ رہی تھی۔ مُنیا کا دل سکون سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کا سانس اب پھولا ہوا نہیں تھا۔ اُسے نیند آرہی تھی۔ چہرہ تھکا ہوا اور زرد نظر آرہا تھا۔ آنکھوں میں سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، بچیوں جیسے پتلے پتلے ہاتھ اور بھی سُوکھے نظر آرہے تھے ـــ لیکن اُس کے لبوں پر تبسّم تھا۔ کل، سورج نکلتے، یہ انسانی چہرہ ایک غیر انسانی تمسخر سے مسخ ہو جائے گا۔ اُس کا دماغ خُون سے بھر جائے گا۔ آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئیں گی اور شیشے کی بنی ہوئی دکھائی دیں گی ـــ لیکن اب وہ سُکون سے محوِ خواب تھی، اور اُس کے لبوں پر تبسّم تھا۔

مُنیا سو رہی تھی۔

قید خانے کی زندگی جاری رہی۔ بہری اور حسّاس، اندھی اور تیز نظر، بجائے خود ایک مسلسل ہیجان۔ کہیں لوگ چل پھر رہے تھے۔ کہیں لوگ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ ایک بندوق کی جھنکار سُنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے چیخ ماری۔ شاید کوئی نہیں چیخا تھا ـــ شاید خاموشی کی وجہ سے یہ ایک فریبِ گوش ہی تھا۔

دروازے میں جو ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی وہ آہستہ سے کھلی۔ اس میں سے ایک سیاہ مونچھوں والا چہرہ جھانکا ـــ دیر تک یہ چہرہ مُنیا کو تعجب سے گھورتا رہا ـــ اور پھر اتنی ہی خاموشی سے غائب ہو گیا۔

گھنٹیاں بجیں اور دیر تک دردناک گیت گاتی رہیں ـــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھکی ہوئی ساعتیں آدھی رات کو اُونچے پہاڑ پر چڑھ رہی ہیں اور چڑھائی مُشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ساعتیں گریں، پھسلیں، چیختی چلّاتی لُڑھکتی چلی گئیں۔ اور پھر اُنہوں نے درد و کرب سے اندھیری چوٹی کی جانب چڑھائی شروع کر دی۔

کہیں لوگ چل پھر رہے تھے، کہیں لوگ کانا پھوسی کر رہے تھے۔ اور بے روشنی کی شب رنگ گاڑی میں گھوڑے جوتے جا رہے تھے ـــ

(مُنیا کے اور ساتھی کیا سوچ رہے تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ وہ بھی پھانسی کا حکم سُن چکے تھے۔ اُن پر کیا گزر رہی تھی؟ آئندہ قسط میں دیکھئے۔)

شاہد

نقد و تبصرہ

مُطالعہ حافظ۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت (۱۶۰) صفحے۔ کتابت وطباعت پاکیزہ۔ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ علم وادب۔ اُردو بازار دہلی۔

مولوی محمد احتشام الدین حقی دہلوی۔ ایم۔ اے (علیگ) حافظِ شیراز کی چھ سو غزلوں کا ہم قافیہ وہم آہنگ اُردو ترجمہ "ترجمان الغیب" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ اب آپنے ایک اور کتاب "مطالعہ حافظ" کے نام سے چھاپی ہے۔ اس میں آپنے یہ بتایا ہے کہ کلامِ حافظ کا جب مُطالعہ کیا جائے تو کن کن اُمور کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے ورنہ پوری طرح لُطف اندوز ہونا ناممکن ہے مُصنف نے یہ کتاب ایک اختصاصی (اسپیشلسٹ) کی حیثیت سے لکھی ہے۔ اور اس میں شک نہیں مولوی صاحب نے ایسی ایسی گُر کی باتیں بتائی ہیں کہ اس سے پہلے کم از کم ہم نے تو سُنی نہیں۔ کلامِ حافظ "لطیف و دلکش، مؤثر وحسین ہوتا ہے" اس کے ساتھ ہی ہر شعر "رنگ برنگ لُطف در لُطف دکھاتا ہے"۔ مختصراً یوں سمجھیئے کہ حافظ کے اشعار کے ایک تو ظاہری معنی ہوتے ہیں اور ایک یا ایک سے زیادہ باطنی۔ مثلاً ؎

بُتے چوں ماہ زانو زدے چوں لعل پیش آورد
تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر

اس کے ظاہری معنی اگر لئے جائیں تو نہایت گمراہ کُن اور رندانہ مشورے کا شعر ہے"۔ باطنی معنی جو نہایت غور وخوض کے بعد ہی سمجھ میں آسکتے ہیں مولوی صاحب کی زبانی یہ ہیں:۔

"بُتے چوں ماہ۔ ایک ایسا مجموعۂ اوصاف وخوبی رسول جو سلسلۂ انبیا میں چاند بن کر چمکا۔ زانو زد۔ نہایت تواضع اور اخلاق کے ساتھ رُوبرو ہوا۔ مے چوں لعل۔ ایک نہایت لاجواب پُرکیف ومعنی تعلیم وہدایت جس نے دُنیا کے دماغ پلٹ دئے اور تختوں کے تختے اُلٹ دئے۔ پیش آورد۔ پیش کی؛ تو گوئی تائبم حافظ۔ اور تو حافظ یہی کہے جاتا ہے بقول غالب۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ز ساقی شرم دار آخر۔ خدا کی نہیں تو رسول کی شرم ضرور چاہیئے"۔

غرض کلامِ حافظ کی یہ کتنی بڑی خوبی ہے کہ صوفیہ اپنے رنگ کے معانی اس میں سے نکال لیتے ہیں۔ علماء اپنے قرینے کے۔ رِند اور دُنیا دار اپنے ڈھب کے۔ گویا ایک آئینہ ہے کہ ہر شخص اس میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔ اِس شعر کے ؎

ساقی مگر وظیفۂ حافظ زیادہ داد
کآشفتہ گشت طرّۂ دستار مولوی

احتشام الدین صاحب نے آٹھ معنی لکھے ہیں۔ اور غالباً کلامِ حافظ کی اِسی خوبی نے کہ جس شعر سے جی چاہے جو معانی نکال لو، دیوانِ حافظ کو فالنامہ کا مرتبہ دیدیا۔

مولوی احتشام الدین صاحب نے یہ کتاب ایسی لکھی ہے کہ اسکے پڑھے بغیر کلامِ حافظ سے کماحقہ مستفیض ہونا ممکن نہیں۔ لسان الغیب[1] کے اسرار شعری سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ترجمان الغیب[2] کا وسیلہ اختیار کیا جائے۔

"ش"

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو خیریت آباد حیدرآباد دکن کی کتابیں

مکتوباتِ شاد۔ سید علی محمد شاد عظیم آبادی اب سے تقریباً سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ کچھ اُوپر اسّی برس کی عمر پائی۔ اس عرصۂ حیات میں لاکھوں شعر کہے۔ علم وادب کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر مرحوم نے تحقیقی مقالے یا مُستقل کتابیں نہ لکھی ہوں۔ اُردو اور فارسی دونوں میں یگانۂ روزگار تھے۔ غزل گوئی میں میر کا جواب تھے اور مرثیہ گوئی میں، میر نفیس مرحوم نے بھرے مجمع میں کہا تھا: "نظم مرثیہ میں یہ صاحبِ کمال میرے والد (میر انیس) سے کسی طرح کم نہیں بلکہ عمدگیِ خیالات میں زیادہ اور اصنافِ نظم پر جس قدر اِن کو قدرت ہے بخدا میرے والد کو بھی نہ تھی"۔ اِس سے زیادہ شاد مرحوم کی اور کیا تعریف ہوسکتی ہے۔ افسوس اِس کا ہے کہ زمانے نے اُن کی قدر نہیں کی تنگدستی اور مالی پریشانیوں میں ساری عمر گزری۔

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی مجموعہ ہے (۶۸) خطوط کا جو ۱۸۹۶ء سے ۱۹۲۶ء تک سید ہمایوں مرزا مرحوم اور اُن کی رفیقۂ حیات صغریٰ بیگم صاحبہ کے نام شاد مرحوم نے لکھے۔ ہمایوں میرزا مرحوم حضرت فریاد کے صاحبزادے یعنی شاد کے اُستاد زادے تھے۔ ان خطوط میں دل کھول کر شاد مرحوم نے باتیں کی ہیں۔ بہت سی خانگی باتوں کا بھی مذکور ہے۔ اِس لئے

[1] حافظ شیراز۔ [2] مولوی احتشام الدین حقی۔

بعض باتیں پڑھنے والوں کو ناگوار گزریں گی۔ مثلاً داغ، اقبال، سرعلی امام، خیال، اور چند اور اکابر کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے حد درجہ لائق اعتراض ہوسکتا ہے۔

یہ خط تیس سال کے عرصے پر محیط ہیں۔ آخری خط انتقال سے دو ہفتے پہلے کا ہے۔ پہلے خط سے لیکر آخری خط تک شاد کی دو بڑی آرزوئیں تقریباً ہر خط میں درج ہیں۔ حیدرآباد جانے کی آرزو اور اپنے استاد کی سوانح عمری کی تکمیل۔ تیس سال تک شاد سر پٹختے رہے مگر انہیں حیدرآباد آنے سے ہمیشہ باز رکھا گیا۔ دوسری حسرت بھی دل کی دل ہی میں رہی۔ "حیاتِ فریاد" انکے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

ڈاکٹر زور نے ان خطوط کو مرتب کر کے چھاپا ہے۔ شاد کے متعلق ان میں بیش بہا معلومات یکجا ہے۔ اس لئے قابلِ قدر ہے۔ ضخامت (۳۰۰) صفحات۔ قیمت عہ۔

"ش"

سائنس کے کرشمے

میر حسن صاحب ایم۔ اے۔ نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس میں آٹھ مضمون شامل ہیں:- (۱) سائنس کیا ہے؟ (۲) ہوا۔ (۳) پانی۔ (۴) بجلی۔ (۵) ہوا بازی (۶) ٹیلی وژن، (۷) کیمیائی جنگ۔ (۸) ربر۔ یہ سب مضامین لائق پروفیسروں کے لکھے ہوئے ہیں اور عام معلومات کیلئے ان کا مطالعہ ضروری اور بہت مفید ثابت ہوگا۔ زبان آسان اور پیرایۂ بیان عام فہم ہے۔ ایسی علمی کتابوں کی ہماری زبان میں کمی ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے کی اور کتابیں شائع کر کے ادارۂ ادبیاتِ اردو اپنے لئے امتیازِ خاص حاصل کریگا۔ ضخامت (۱۱۲) صفحے۔ قیمت عہ

"ش"

سوتیلی ماں

رابعہ بیگم صاحبہ نے اس چھوٹی سی کتاب میں دکھایا ہے کہ سوتیلی ماں جب کسی خاندان میں داخل ہوتی ہے تو ناگوار صورتیں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور ان کا تدارک کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ کتاب مفید اور لائقِ مطالعہ ہے۔ قیمت ۴ر

"ش"

محبت کی چھاؤں

مرزا ظفر الحسن صاحب بی۔ اے۔ کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانے معمولی اور بعض غیر دلچسپ ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ "یہ افسانے عمداً لکھے نہیں بلکہ جبراً لکھوائے گئے ہیں" مصنف کو خود اس امر کا اعتراف ہے اور وہ ایسا پر خوش بھی ہیں! ضخامت ۱۳۲ صفحے۔ قیمت عہ بہت زیادہ ہے۔

"ش"

مغربی تصانیف کے اردو تراجم

میر حسن صاحب ایم۔ اے کی تصنیف ہے۔ مگر مطالعہ کے دوران میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے سجاد مرزا بیگ کی "الفہرست" اور آج کل کے صرف چند کتب خانوں کی فہرستوں سے استفادہ کیا ہے اور بس۔ مثلاً اِنڈین پینل کوڈ کا معرکۃ الآرا ترجمہ جو ڈاکٹر نذیر احمد نے کیا تھا اور جو اَب تک رائج ہے اُس کا ساری کتاب میں کہیں مذکور نہیں۔ عہدِ حاضر میں مولوی عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد) کے صرف دو ترجموں کا ذکر ہے۔ زلفی اور تائیس۔ حالانکہ مولانا اب تک شیکسپیر کے دس ڈراموں کا ترجمہ شائع کرا چکے ہیں۔ ان کے علاوہ فلابیئر کی سلامبو۔ ڈاکٹر جانسن کی رسیلاس۔ ہیگرڈ کی نجم السحر۔ اور دانتے کا "جہنم" وغیرہ ایسے روشن کارنامے ہیں جن سے کسی طرح نظر نہیں چرائی جاسکتی۔ آرنلڈ کی "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ جو مولانا نے سرسید مرحوم کی فرمائش پر کیا تھا اُس کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ اس کے برعکس تیرتھ رام فیروزپوری کے غیر ضروری تراجم کی پوری فہرست کئی صفحوں میں درج کی گئی ہے۔ کتاب کا عہدِ حاضر، یعنی ۱۹۱۷ء کے بعد سے ابتک، یکسر ناقص ہے اور اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ قیمت عہ بہت زیادہ ہے۔

"ش"

ارمغانِ جذب

راگھوندر راؤ صاحب جذب کی سو رباعیاں کا مجموعہ ہے۔ اِن رباعیوں میں عام توجہات کو جذب کرنیکی صلاحیت ہمیں نظر نہیں آتی۔ ضخامت ۱۱۶ صفحے۔ قیمت ۱۲ر "ش"

بربطِ ناہید

محترمہ جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم۔ اے سے ناظرینِ ساقی واقف ہیں۔ ان کے افسانے اور تخیلی مضامین مقبول و مشہور ہو چکے ہیں۔ "بربطِ ناہید" انہیں کی مرتب کی ہوئی کتاب ہے جس میں خطوط کے پیرائے میں نہایت دلکش خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ناہید ایک فرضی خاتون ہیں جنہوں نے اپنی سہیلیوں کو وقتاً فوقتاً خطوط لکھے ہیں۔ انہی خطوط کا مجموعہ "بربطِ ناہید" ہے۔ اِس بربط سے ہر قسم کے نغمے نکلے ہیں۔ کہیں خوشی کے راگ ہیں، کہیں افسردگی کے بول۔ کہیں دیپک کی اگنی ہے، کہیں میگھ کی برکھا۔ کہیں زندگی کا اُتار چڑھاؤ رسیلے سُروں میں ڈھل گیا ہے، کہیں دل کا دُکھ درد ٹوٹے ہوئے تار کی جھنکار بن گیا ہے۔ غرض ؎

اِس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک اُٹھتا ہے آواز تو دیکھو

ساری کتاب شاعرانہ اور فلسفیانہ خیالات سے آراستہ ہے۔ سرورق رنگین، ضخامت ۱۶۴ صفحے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر شہاب۔ حیدرآباد۔ دکن!

"ش"

مردم دیدہ:- چراغ حسن صاحب حسرت کی تصنیف ہے جس میں ساٹھ مشاہیر کے متعلق دلچسپ مضامین درج ہیں۔ مصنف کو ان مشاہیر سے ذاتی تعلق رہا ہے۔ ان مضامین میں حسرت صاحب نے ذاتی تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ موید الاسلام۔ خیال عظیم آبادی۔ آغا حشر۔ شفاء الملک فقیر محمد چشتی۔ علامہ اقبال۔ ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی جلیل القدر ہستیوں کے ناموں اور کاموں سے شاید ہی کوئی معقول آدمی ناواقف ہو لیکن حسرت صاحب نے ان میں سے ہر محترم بزرگ کی زندگی اور کردار کی ایسی دلکش جھلکیاں دکھائی ہیں کہ بقول دیباچہ نگار "ان مشاہیر کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے" ظرافت کی چاشنی نے طرز بیان کو اور بھی دل آویز بنا دیا ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے۔ قیمت ۱۵ر ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت پنجاب۔ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

"ش"

تحفے:- مشہور انشاپرداز خاتون محترمہ حجاب امتیاز علی کے دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں:-

(۱) تحفے۔ (۲) بچپن۔ (۳) الف لیلہ کی دو راتیں۔ (۴) پک نک۔ (۵) دلہن۔ (۶) اُس کی موت کی وجہ۔ (۷) اس کے معنی کیا؟ (۸) تبادلہ۔ (۹) ماہرین فن۔ اور (۱۰) سالگرہ۔

افسانوی ادب میں محترمہ موصوفہ نے اپنے تخیلات لطیف اور اچھوتے طرز تحریر سے ایک نئی شاہراہ کا آغاز کیا ہے۔ انکے افسانوں کے پلاٹ دلکش اور انداز بیان غایت درجہ دل آویز ہوتا ہے۔ موصوفہ نے سب سے الگ اپنے لئے خیال کی ایک دنیا بسائی ہے جس میں چچا لوث۔ مرجان۔ ریحانی۔ چچا جعفر۔ ڈاکٹر گار۔ ڈاکٹر سوالی۔ ہارلی۔ روحی صوفی۔ زلفی۔ لبریزی۔ بہری جلشن زوناش۔ کپتان زہدی۔ دادی زبیدہ وغیرہ کوہ شوری، اودا پہاڑ۔ شوراک۔ اور کوہ زیتون جیسے دلفریب مقامات میں بستے ہیں۔" جہاں گلاب کے سرخ پھول سنہری دھوپ میں دن بھر قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ اور جہاں سبز طوطوں کی خمیدہ چونچوں میں لال چیری نظر آتی ہے۔ بید مجنوں کی شاخوں پر سبز چشم فاختہ رات بھر آہیں بھرتی ہے۔ شمشاد کی ٹہنیوں پر سنہرے پروں والی ننھی بلبل دن بھر بیٹھی درد دل سنایا کرتی ہے۔" جب ہم حجاب امتیاز علی کا کوئی افسانہ پڑھتے ہیں تو اس رنگین بستی میں سانس لینے لگتے ہیں اور اپنی مادی دنیا کی پریشانیوں اور الجھنوں سے تھوڑی دیر کیلئے ہمیں نجات مل جاتی ہے۔

پیش نظر دلکش افسانوں کی ایک اور خصوصیت بہت نمایاں ہے۔ ہر افسانے میں خوش مذاقی اور سنجیدہ ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ اور بھی قابل قدر ہے۔ ضخامت ۲۹۶ صفحے۔ کتابت طباعت عمدہ۔ کتاب مجلد اور گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت عـ۲ر۔ ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت پنجاب۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

"ش"

مسولینی کی آپ بیتی:- مترجمہ سید بادشاہ حسین حیدر آبادی۔ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد۔ قیمت عـ۲ر

مسولینی کی خود نوشت سوانح عمری کا دنیا کی تقریباً ساری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اردو میں بھی اس کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن زیر نظر ترجمہ ہمارے نزدیک اور ترجموں سے بہتر ہے۔ نہ صرف سلاست زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ مترجم نے صاحب سوانح کی شخصیت کو اس کے اصلی رنگ میں دکھانے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کی سیاسی تعلیمات پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں لائق مترجم نے یورپ کی موجودہ سیاست پر بھی مختصر سا تبصرہ کر دیا ہے جس سے مسولینی کی موجودہ سیاسی پالیسی کے سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ بہرحال ترجمہ کامیاب اور کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے۔ "م۔م"

تاریخ جنوبی ہند:- محمود خاں صاحب محمود "سلطنت خداداد" کے مصنف کی حیثیت سے بہت مشہور ہو چکے ہیں۔ "تاریخ جنوبی ہند" انہیں کا دوسرا کارنامہ ہے۔ محمود خاں صاحب جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اور تاریخ کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ جنوبی ہند کی تاریخ اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی تھی۔ محمود صاحب نے اس فرض کو نہایت ذمہ داری اور بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ اس تاریخ کا لب لباب یہ ہے:-

"ہندو مدت تک اس ملک پر حکمران رہے۔ جب ان میں آپس میں نااتفاقیاں پھیل گئیں تو انہوں نے مسلمانوں کو حملہ کرنے کی دعوت دی۔ مسلمان اس ملک میں آگئے۔ اس کے بعد ہندو ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اور وہ پھر متحد ہو کر مسلمانوں کو ملک سے نکالنے پر آمادہ ہوگئے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور مسلمانوں کا مستقل قبضہ ہوگیا۔ ...... مسلمانوں میں نااتفاقی پھیل گئی۔ ملک ان کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا اور انگریز مسلط ہوگئے۔

"...... دونوں قومیں غلام بن کر رہ گئیں۔ عرصے کی غلامی کے بعد اب حصولِ آزادی کا احساس پیدا ہو رہا ہے لیکن اس آزادی کے راستے میں ہندو مسلم مسئلہ حائل ہے۔ یہی مسئلہ جنوبی ہند میں سوا چھ سو سال پیشتر بھی موجود تھا.... آخر تلوار نے فیصلہ کر دیا کہ ملک کس کا ہے..... آخر کار دونوں قوموں کے ہاتھوں سے تلوار چھین لی گئی اور دونوں ایک تیسری قوم کی غلام بن گئیں۔

تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے۔ اب پھر وہی واقعات رُونما ہو رہے ہیں جو چھ سو سال پیشتر رونما ہوئے تھے۔ مورخ نے سارے تاریخی شواہد پیش کر دئے ہیں۔ اربابِ نظر ہندو مسلم مسئلہ کا حل اِن شواہد کی روشنی میں سوچ سکتے ہیں۔

محمود خاں صاحب محمود کا یہ تاریخی کارنامہ بہت قابلِ قدر ہے۔ اس کا مُطالعہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو بغور کرنا چاہیئے۔ ضخامت (۲۰۴) صفحات۔ قیمت تین روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الدین بُک سیلر۔ ڈکنسن روڈ۔ بنگلور۔ "ش"

گُلِ نغمہ:۔ پروفیسر عظیم الدین کا مجموعۂ کلام اِس نام سے شائع ہوا ہے۔ نظمیں فرسودہ خیالات اور عامیانہ جذبات سے پاک ہیں۔ شاعر نے پہلے خود محسوس کیا ہے، اس کے بعد اس کا احساس شعر کے قالب میں ڈھل گیا ہے۔ شاعری زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ اِس مقولے کے ثبوت میں "گُلِ نغمہ" پیش کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے بے رنگ خاکوں میں شاعر نے تصوّرات کے رنگ بھرے ہیں۔ اِس لئے یہ شعری تصویریں دلکش اور ولولہ انگیز بن گئی ہیں۔ جدید بحروں کے ساتھ ساتھ الفاظ کے انتخاب میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اشعار کی روانی میں موسیقیت کا جُزو بھی شامل ہو گیا ہے۔ خیالات میں مغربی شعراء سے استفادہ کیا گیا ہے جس سے لُطف دوبالا ہو گیا ہے۔ شروع میں کلیم الدین احمد صاحب کا پُر مغز مقدمہ ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ۔ کاغذ ولایتی کتابوں جیسا۔ ضخامت (۱۴۰) صفحات۔ بانگ دراسائز۔

ملنے کا پتہ:۔ پی۔ ڈی۔ گھٹا۔ داناپور۔ پٹنہ۔

"ش"

خریدارانِ ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر کیا کریں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ (مینیجر)

مُصوّرِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی کتابیں

خانم:۔ دیورانی جٹھانی کی پُر لطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلّد سُنہری ٹھپہ۔ قیمت للعہ

کولتار:۔ تمی تو بچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھ دیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات رُونما ہوئے ہیں کہ۔ قیمت عہ

ومپائر:۔ زانی مرد خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس عصمت مآب خاتون پر جھپٹتا ہے۔ اس کی زندگی برباد کرتا ہے مگر۔ قیمت عہ

شریر بیوی:۔ اس قدر شریر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اِس شریر بیوی نے! قیمت عہ

رُوحِ ظرافت:۔ "انگوٹھی کی مُصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اُس نے اپنے اُوپر ظلم کیا۔ قیمت عہ

کمزوری:۔ عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اُس کی زندگی برباد کر دی۔ قیمت عہ

چمکی:۔ عورت کی فطرت! جان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت اور شرافت کی مُنہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے۔ قیمت عہ

رُوحِ لطافت:۔ "مہارانی کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک فسانہ آپنے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش۔ قیمت عہ

جنّت کا بھوت:۔ بی جنّت بھی شرارت کی پتلی تھیں۔ بھوت صاحب کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر کچھ ایسی صورت پیدا ہوتی کہ۔ قیمت ۱۲ر

دیکھا جائیگا:۔ ایک لڑکی پر تین مردوئے عاشق ہو گئے تو "دیکھا جائیگا صاحب" کچھ فیصلہ نہ کر سکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ۔ قیمت عہ

ملفوظاتِ حاجی:۔ کتے، مرغے مرغیاں اور گھریلو جانور انسانی زبان بولنے لگے۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے! قیمت ۱۲ر

تفویض:۔ بی۔ اے پاس لڑکی کی شادی مسجد کے مُلّا سے ہو گئی۔ بس یہ سمجھئے کہ زمین آسمان ایک ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ۔ قیمت ۵ر

قرض:۔ محبت کو کاٹنے والی قینچی کا نام قرض ہے۔ آپنے بہت کہانیاں پڑھی ہونگی مگر ذرا اس کو بھی پڑھکر دیکھئے۔ قیمت ۵ر

فرزندِ سرحد:۔ سرحد کے باشندے عزت کی خاطر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ انہی غیرت مند لوگوں میں سے چند کا ذکر ہے کہ۔ قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک، فی پرچہ ۸
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص
نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل
خریداروں سے ان کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی

جلد (۲۱) ساقی دھلی۔ بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء نمبر (۵)

ساقی بک ڈپو سے ہر قسم کی کتابیں طلب کی جاسکتی ہیں۔ آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو ساقی بکڈپو سے طلب فرمائیں۔ سب کتابیں نہایت احتیاط سے بھیجی جاتی ہیں۔ مختلف اداروں سے کتابیں طلب کرنیکے بجائے ہم سے کتابیں منگائیے تاکہ محصول ڈاک کی آپ کو کفایت رہے۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیے،

مہتمم۔ رسالہ ساقی دھلی،

قیمت فی پرچہ چھ آنے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کے افسانہ نمبر کے لئے اعلیٰ درجے کے افسانے جمع کئے جا رہے ہیں۔ پندرہ افسانے اب تک منتخب ہو چکے ہیں۔ جون کے ساقی میں اُمید ہے کہ ہم مکمل فہرست پیش کر سکیں گے۔ افسانہ نمبر میں صرف وہی افسانے شامل ہو سکیں گے جو ۱۰ رمئی تک موصول ہونگے۔

آل انڈیا ریڈیو اور ہارمونیم کے متعلق متعدد مضامین موصول ہوئے ہیں۔ اِس اشاعت میں ایک محترم بزرگ کی کھلی چھٹی اسی موضوع پر شائع ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے موتسس اور کنٹرولر مسٹر فیلڈن، ہارمونیم کو نکالنے کے مہینے بھر کے اندر ہی اندر اپنے جلیل القدر عہدے کو کھو بیٹھے۔ اب دیکھنا ہے کہ موجودہ کنٹرولر مسٹر اے۔ ایس۔ بخاری، جو ہندوستانی موسیقی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں، اس ناانصافی کا کیا تدارک کرتے ہیں۔

"شاہد"

ناشرانِ کُتب دہلی کا متفقہ فیصلہ

قرارداد نمبر۱۔ دہلی کے ناشرانِ کُتب کا یہ جلسہ بالاتفاق یہ طے کرتا ہے کہ آج کی تاریخ سے اپنی مطبوعات پر مکتبہ جامعہ قرولباغ یا اسکی شاخوں کو صرف اس شرط کے ماتحت پچیس ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائے کہ مکتبہ جامعہ یا اُس کی کوئی شاخ خوردہ فروشی ([illegible]) میں ہماری کسی کتاب کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر فروخت نہ کرے۔

پچیس ۲۵ فی صدی کمیشن مکتبہ جامعہ اور اُس کی شاخوں کیلئے مقررہ کمیشن ہوگا۔ اس سے زیادہ کمیشن مکتبہ جامعہ اور اُسکی شاخوں کو کسی حالت اور صورت میں نہیں دیا جائے گا۔ خواہ وہ ایک روپے کی کتاب خریدے خواہ ایک ہزار یا زیادہ کی خریدنا چاہے۔

قرارداد نمبر۲۔ سکول لائبریریوں یا تعلیم بالغان کی اسکیم کے ماتحت اگر کسی صوبے کی حکومت میں ہماری کتابیں منظور ہونگی تو ہم مکتبہ جامعہ کی معرفت اپنی مطبوعات ارسال نہ کریں گے۔ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اپنی مطبوعات کی ہم خود براہِ راست ترسیل کا انتظام کرینگے۔ لیکن اگر کوئی صوبے کی حکومت ہمارا یہ فیصلہ نہ مانے اور مکتبہ جامعہ ہی کے ذریعے فراہمی کتب پر زور دے تو ایسی صورت میں ہم مکتبہ جامعہ کو اپنی مطبوعات پر اُسی صوبے کی منظور کردہ کمیشن سے زیادہ کمیشن کسی حالت میں نہ دینگے۔

〃 نمبر۳۔ ہم ناشرانِ کتب آپس کے اس فیصلہ کے سختی سے پابند رہینگے۔ جو ناشر ہم میں سے اس فیصلہ کی خلاف ورزی کریگا ہم اُس کا تجارتی مقاطعہ کر دینگے۔

〃 نمبر۴۔ ناشرانِ کتب کا یہ فیصلہ طبع کر کے شائع کر دیا جائے۔ اس کی ایک ایک کاپی اخبارات کو بغرض اشاعت اور مکتبہ جامعہ اور صوبوں کی حکومتوں کو برائے اطلاع بھیجدی جائے۔

〃 نمبر۵۔ آج بتاریخ ۲۴ر اپریل ۱۹۴۰ء سے ہم ناشرانِ کتب دہلی کا یہ فیصلہ ناطق سمجھا جائے گا۔

۱۔ (رشید احمد۔ ایم۔ اے) منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی؛ ۲۔ (صلاح الدین قریشی) ایوانِ ادب، اُردو بازار دہلی؛ ۳۔ (اشتیاق احمد چشتی) مولوی بشیر الدین احمد اینڈ سنز کھاری باؤلی دہلی؛ ۴۔ (عزیز حسن بقائی) پیشوا بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۵۔ (سید یوسف بخاری) مکتبہ جہاں نما، اُردو بازار دہلی ۶۔ (منشی قربان علی بسمل) چمن اُردو بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۷۔ (اظہر عباس بی۔ اے) حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر اُردو بازار دہلی؛ ۸۔ (محمد مرزا) دائرۂ ادبیہ، دریا گنج دہلی؛ ۹۔ (انوار ہاشمی) دینِ دُنیا پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی؛ ۱۰۔ (محمد عبد المعید) کتب خانہ رشیدیہ، اُردو بازار دہلی۔ ۱۱۔ (سید محمد اشفاق علی) رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۱۲۔ (شاہد احمد۔ بی۔ اے، آنرز) مالک ساقی بکڈپو، دہلی؛ ۱۳۔ (رازق الخیری) مالک عصمت بکڈپو، دریا گنج دہلی؛ ۱۴ (سید وصی اشرف) کتب خانہ علم و ادب اُردو بازار دہلی؛ ۱۵ (محمد عبد الحق) محشر خیال بک ڈپو اُردو بازار دہلی۔ ۱۶ (عبد الحمید) مولوی بک ڈپو، کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

لیگ اور کانگریس ہیں تو ایک ہی دیس کی دو سبھائیں۔ پر آپس میں ایک نہ ہونے سے دونوں کا راج سے مانگنا بھی الگ الگ ہے۔ کانگریس پورے ہندوستان کی آر پٹرے کے اسی گھڑی میں سب کچھ لینے کیلئے مچل رہی ہے۔ لیگ کہتی ہے راج سے اب تک جو کہا جاچکا اور جو گتھیاں سلجھا کے دکھائی جاچکیں۔ راج اُسے مان کے بچن دیدے۔ دینا دلانا پھر ہوتا رہے گا۔ راج کوئی انیلا نہیں، لاکھوں کروڑوں کو بھگتے ہوئے ہے۔ وہ جانتا ہے یہاں والے کتنے پانی میں ہیں اور اسی لئے وہ چاہتا ہے،۔ جوں توں کرکے جیسے بھی بنے لڑائی بھڑائی کی یہ بُری گھڑی ٹل جائے اور اس سے چھٹکارا مل جائے پھر جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہے گا۔ پر مانگنے والوں سے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تو چاہیئے۔ اس لئے وہ ہاکے پکارے کہتا ہے۔ جو مانگنا ہے وہ سب مل کے مانگو اور سب ایک ہوکے راج سے جو چاہو لیلو۔ یہاں ملنا اور ایک ہونا کیسا۔ ولیتی مین تیرہ بارہ باٹ ہوکے رہ گئے ہیں۔

یہ لے یونہی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اسی سمجھوتے کیلئے ہزاکسلنسی وائسرائے کے پاس مسٹر جناح اور گاندھی جی کے اب تک کئی پھیرے ہوچکے اور نجانے ابھی اور ایسے پھیرے کرتے ہونگے۔ مسٹر جناح اور وائسرائے میں جو چٹھیاں آئی گئیں وہ بھی اب سب کی سب چھپ چھپاکے سامنے آگئیں۔ یہ بھی نئی بات دیکھی۔ مسٹر جناح جب ہزاکسلنسی سے ملے اور مل کے لوٹے تو اُن میں کوئی اُل بل نہ دکھائی دیا۔ جیسے ملنے سے پہلے ویسے ہی ملنے سے پیچھے۔ یہ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے، ان کا ایک ہی سا رنگ رہا پر گاندھی جی مل کے جو پلٹے،۔ تو مُنہ بنائے ہوئے، تیوری چڑھاتے ہوئے۔ جو باتیں مُنہ سے نکلیں وہ سب آس توڑنے والی۔ جیسے جو بھی ہونا تھا وہ ہوچکا اس لئے اب اُن کی آس ٹوٹ گئی۔ پر کچھ دنوں پیچھے وائسرائے کی آس توڑتے والی باتوں ہی میں اُنہیں ایسی جھلک کھائی دینے لگی جس سے پھر آس بندھ بندھا گئی اور یہ کہنے لگے ابھی سمجھوتے کے کواڑ بھڑے نہیں کھلے ہوئے ہیں۔

راج ابھی تو کچھ دیتا دلاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا وہ تو تیل اور تیل کی دھار دیکھنے میں لگا ہوا ہے۔ گاندھی جی یہ سب دیکھتے ہوئے بھی اب نہ مرن برت رکھ سکتے ہیں اور نہ ستیا گرا کرنے کو کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیوں؟ دیس کی پھوٹ اور آپا دھاپی ان کے سامنے ہے۔ انہی کے ماننے والے انہی کی باتوں میں نئی نئی مین میکھ نکال رہے ہیں۔ چرخا پرچار گاندھی جی کی کوئی نئی بات نہیں۔ اس دوڑ دھوپ کے اسٹیج پر جب سے یہ آئے ہیں جبھی سے چرخا اُن کے ساتھ ہے اور دیس سدھار کیلئے اس کے پرچار میں اب تک اُنہوں نے اپنی پوری سکت لگادی۔ پہلے جو بھی ہوا وہ ہوچکا۔ پر۔ اب چرخے کی رُوں رُوں کسی کو اچھی نہیں لگتی اور تو کو نہ موکو، لے چرخے میں جھونکو کے جتن کئے جارہے ہیں۔ چرخے کی "چرخ چوں" پر ناک بھوں چڑھانا کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ پر ابھی کچھ دن ادھر کلکتے کے اسٹیشن پر جو سماں آنکھوں نے دیکھا اُس کے سامنے چرخے کا ٹھکرانا کچھ بھی نہیں رہتا۔ گالی گلوج، جُوتم جاتا، یہ اُن لوگوں کے ہتھیار ہیں جو پڑھے لکھے نہیں اور یونہی سی بات پر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ پڑھے لکھوں کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ بنگالی پارٹی کی گاندھی جی سے اَن بن سہی پر اس کے لئے اُن کی باتوں کا نہ ماننا ہی بہت کچھ تھا۔ "فارورڈ بلاک" والے کہہ سکتے ہیں،۔ وہ ہماری کوئی بات چلنے نہیں دیتے اور ہماری چلتی ہوئی گاڑی میں روڑے اٹکاتے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ پر اس کا یہ توڑ تو نہ تھا جو دن دہاڑے بھرے اسٹیشن پر گاندھی جی پہ جوتا پھینکا گیا۔ سنسار کدھر جارہا ہے؟ دیس کے ایک بڑے پریمی کی اُسی کے ماننے والوں کے ہاتھوں یہ گت؟

یہ بھی سچ ہے،۔ جوتا پھینکنے میں اس پوری پارٹی کی ملی بھگت نہیں۔ پر ایک دو جو بھی ہوں ہیں تو اسی تھما کے۔ کیا ایک آدھ نے اور نام اُچھلا پوری پارٹی کا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا، اب مار پیچھے پکار ہوا کرے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جو بھی ہوا وہ بہت بُرا ہوا۔ یہی وہ باتیں جو گاندھی جی کو اُلجھاوے میں اُلجھائے ہوتے ہیں اور دیس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کے سمجھ چکے ہیں۔ اب نہ "مرن برت" سے بیڑا پار ہوسکتا ہے اور نہ ستیا گرا سے۔ "مرن برت" رکھا جائے تو کوئی پاس تک نہ پھٹکے۔ ستیا گرا کی جائے تو کانگریس سے چھٹکارا منانے والے جیتے الگ کھڑے ہوئے مُنہ دیکھتے رہیں اور کانگریس کے گنے چنے چوٹی کے لوگ دھر لئے جائیں۔

اب کی راجندر بابو کے ہٹتے ہی مولنا آزاد کانگریس کے پنچ بنائے گئے۔ کانگریس آڑ میں یہ جتانا چاہتی ہے وہ کسی کو نیچا اُونچا نہیں سمجھتی اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھتی ہے۔ پہلے ہندوؤں کا نمبر تھا اس لئے ایک کے پیچھے ایک ہندو پنچ بنا اب "مولنا" ہی رہ گئے تھے ان کا نمبر آتے ہی

انہیں پنچ بنا دیا گیا۔ کسی نے ایک ہنسوڑ سے پوچھا۔ کیوں آپ نے بھی کچھ سنا؟ "مولنا" کانگریس کے پنچ بن گئے۔ کہنے لگے تو نئی بات کونسی ہوئی۔ یہ نہ سہی وہ سہی یہ سنئے پنچ جی! "گاندھی کی پالسی کا عربی ترجمہ ہیں"۔ اس سے پہلے گاندھی جی کے ہتھکنڈوں کا روپ ہندی تھا اور اب عربی۔ روپ الگ الگ سہی پر ان دونوں کی کوک تو ایک ہی ہے۔

آپ کہتے ہوں گے بھلا اُردو، ہندی بات چیت کا لیگ اور کانگریس کے جھگڑے سے کیا لگاؤ؟ ٹھیک تو ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ پر آپنے دیکھا ہوگا رات دن کے ساتھ رہنے سہنے والوں میں کسی بات پر جب اَن بن ہوتی ہے تو پہلے بھاری بھرکم سوجھ بوجھ والے جانے دو، رہنے دو، الگ کرو، کہہ کے اُسے ٹالتے اور دبا دینا چاہتے ہیں۔ پر جب اس پر بھی وہ نہیں دبتی اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو پھر ایسی چھڑتی ہے جس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی اور اگلی پچھلی باتیں کرید کرید اور کھود کھود کے نکالی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں ٹھوکریں لگ چکی ہیں ایک ایک کر کے وہ سب جگہیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور ان کا پورا پورا اتا پتا دے کر نئے پرانے ہتھکنڈوں کی بکھان کی جاتی اور پترے کھولے جاتے ہیں۔ دکھانا یہی ہوتا ہے۔ ایک یہی بات نہیں اور سینکڑوں باتوں میں تم ہٹ دھرمی کی ٹھوکریں کھا چکے اور کھا رہے ہو۔ اس تو تو میں میں سے جی کی بھڑاس تو نکلتی ہی ہے پر یہ آس بھی ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے۔ سننے والا سب سن سنا کے ہو سکتا ہے پچھتاتے، لجاتے اور اِدھر ہی چلا آئے۔ اُردو، ہندی جھگڑا کانگریس ہی کا اُٹھایا ہوا ہے۔ اس لئے ٹھیٹ لٹریچر کی لپیٹ میں اسکی یونہی سی دو چار باتوں کا آجانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بے جوڑ اور اچنبھے کی بات تب ہوسکتی تھی جب اس بکھیڑے سے کانگریس الگ تھلگ رہتی اور پھر اُسے آلا اپنا دیا جاتا اور نکو بنایا جاتا۔

یہاں کی کونسی بولی دیس بھاشا بننے کی پوری سکت رکھتی ہے؟ اس پر اب تک نہ جانے کتنی دھواں دھار اسپیچیں ہو چکیں۔ کتنے گلے پھاڑ پھاڑ کے جی کی بھڑاس نکال چکے۔ کتنوں نے اپنے اپنے ڈھب پر اس کی ہندی کی چندی کی۔ جیسے کانگریس نے بڑی چھان بین کر کے "ہندوستانی" کو دکھاوے کے لئے دیس بھاشا مانا۔ گاندھی جی جو اُٹھے تو انہوں نے ہندوستانی کے ساتھ ہندی کا بے جوڑ سا جوڑ ملا کے "ہندی ہندوستانی" کر دیا۔ یہ سب ہو چکنے پر بھی ابھی تک دیس بھاشا کی ڈھونڈ ڈھانڈ چلی جا رہی ہے۔ اُردو، ہندی جھگڑا دیکھ کر دیس کے الگ الگ ٹکڑوں کی چھوٹی چھوٹی سی بولیوں نے بھی کروٹ لی ہے اور اب وہ بھی اپنی بڑائی جتانے کی انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۴۷ء کے "کانفرنس گزٹ" سے یہ باتیں سنیئے:۔

"ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ"۔ گزشتہ ہفتے میں دار الحکومت دہلی میں "ہندی ہفتہ" منایا گیا۔ جس میں ایک روز اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ کون سی زبان ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے؟ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نمائندوں نے اس جلسے میں تقریریں کیں اور اپنی اپنی زبان کی فضیلت جتائی، ان تقریروں کا ماحصل جو ہندو اخبارات میں شائع ہوا ہے حسب ذیل ہے:۔

گجراتی زبان کی طرف سے مسٹر امبالال نرسنگھ بھائی پٹیل وشارہ نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ گجراتی زبان ہندی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے اور گجراتی کے حروف بھی ہندی سے بہت مشابہ ہیں۔ آپ نے کہا کہ گجراتی میں ۸۰ فی صدی الفاظ ہندی کے ہیں اور کاٹھیاواڑ میں بھی گجراتی ہی زبان بولی جاتی ہے۔ گجرات میں کبیر اور نانک وغیرہ کے بھجن خوب گائے جاتے ہیں۔ سلسلۂ تقریر میں آپ نے گجرات کی جغرافیائی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اس کی بدولت اس زبان میں بہت وسعت اور صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔

مرہٹی زبان کے متعلق مسٹر آر بی پنڈھارکر نے تقریر کی۔ آپ نے بتایا کہ مرہٹی زبان ہندی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ صرف ایک حرف مرہٹی زبان میں زیادہ ہے جو عام طور پر ہندی زبان والے ادا نہیں کر سکتے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو مرہٹی میں ہندی سے صورت بدل کر آئے ہیں۔

ملیالم زبان کے متعلق مسٹر بی ایس نائر نے انگریزی میں تقریر کی۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے کہ تمام زبانوں کو ملا کر ایک زبان بنائی جائے جو ہندوستانی یا ہندی کہی جاسکتی ہے۔ ہندی کے کچھ الفاظ "ملیالم" میں بھی پائے جاتے ہیں۔ آپ نے ملیالم کی کچھ مثالیں پیش کر کے کہا کہ تلفظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہوگیا ہے۔ مدراس میں کچھ آوازیں ناک سے ادا ہوتی ہیں۔ آپ نے یہ اُمید ظاہر کی کہ مدراس میں دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کامیاب ثابت ہوگی۔

ہندوستانی زبان کے متعلق مسٹر گوپی ناتھ صاحب نے کہا کہ اسی کے ذریعے سے ہندی اُردو کا جھگڑا دُور ہو سکتا ہے۔ آپ نے ہندستانی زبان کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے ہندی اُردو بولنے والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی زبان کو زیادہ سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں۔

اُردو زبان کی طرف سے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی تقریر میں اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ صاحب صدر ہندی اور اُردو زبانوں کے ماہر و شاعر ہیں۔ آپ نے کہا کہ زبان کی دُشواری اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ سنسکرت داں ہندی والے بن گئے اور عربی، فارسی داں اُردو والے حالانکہ یہ زبانیں الگ الگ ہیں۔

آپ نے کہا کہ اُردو زبان میں اکیس ہزار چھ سو الفاظ ہندی کے، سترہ ہزار پانچ سو پانچ الفاظ خالص اُردو کے، سات ہزار پانچسو چوراسی الفاظ عربی کے، چھ ہزار اکتالیس الفاظ فارسی کے، پانسو چوّن الفاظ سنسکرت کے، ایک سو اکیاسی الفاظ دوسری زبانوں کے، اور پانسو الفاظ انگریزی کے ہیں۔ اس تشریح کے بعد آپنے کہا کہ اُردو نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی سمجھی جاتی ہے۔

حاضرین کے اصرار پر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں آپنے بتایا کہ کوئی صوبجاتی زبان ہندوستان کی زبان نہیں بن سکتی، زبان کا تعلق ذات، مذہب، وطن وغیرہ سے نہیں ہے۔ آپ نے ہالینڈ اور فرانس کے متعلق ایک مزاحیہ قطعہ سُنایا جو "وشال بھارت" میں درج تھا کہ اُردو وہاں تک سمجھی جاتی ہے اور ۱۸۰۲ء میں بیری صاحب نے ہندوستان کی زبان کا جو نمونہ شائع کیا وہ اس زبان سے کہیں مشکل ہے جو کیفی صاحب نے بولی۔

ہندی زبان کی طرف سے پنڈت چتر سین شاستری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ کوئی صوبجاتی زبان ہندوستان کی زبان نہیں ہو سکتی۔ اب اُردو، ہندی کا معاملہ رہا۔ آپ نے کہا کہ اُردو میں قومی زبان بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسکے بھاو ملکی نہیں بلکہ غیر ملکی ہیں۔ اس کا رسم الخط ایسا ہے جو بیشتر صوبجاتی زبانوں سے مختلف ہے۔ جبکہ ہندی رسم الخط اُن کے مطابق ہے۔

آپنے زبان کے یہ تین معیار بتائے کہ عوام اس کو سمجھتے ہوں۔ ملکی حالات کے مطابق ہو اور اس میں ترقی کی صلاحیت ہو۔ آپ نے کہا کہ ہندی ان سب معیاروں پر پوری اُترتی ہے ...."

ہندی اٹھوارا منانے میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اُردو کا جو بجٹ بنا کے سب کے سامنے ڈال دیا وہ دیکھنے کا ہے۔ یوں تو اُس کی ایک ایک پائی الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ پر پتا نہیں لگتا یہ بجٹ بنایا کیسے اور کہاں سے۔ پُرانے کبیشروں (شاعروں) کے چھندوں، دوہوں کے ڈھیروں سے پائی پائی جوڑی گئی ہے تو اس میں سے سنسکرت اور انگریزی کی پونجی نکال دینا پڑے گی۔ کیوں؟ یہ کبیشروں کے گُن کی نہیں اس لئے اس کے نکال ڈالنے سے ٹوٹل گھٹ گھٹا کے رہ جائے گا اور جواب کے پورے یہی کھاتوں سے اس بجٹ کا بھرت پورا کیا گیا ہے تو جب بھی ٹوٹل یہ نہیں رہ سکتا، اسے بڑھانا پڑے گا۔ ایک بات، دوسری بات یہ ہے۔ اُردو میں جن بولیوں کی مٹھاس گھُل مل چکی اُن کی مٹھاسوں کو الگ الگ کیا جائے تو عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، ترکی، پشتو، انگریزی اور دوسری اور دو ایک بولیاں نکلیں گی۔ انہی سب مٹھاسوں سے گھُل مل کے اُردو کی بیچ میل مٹھائی بنی اور پورے دیس میں پھیل گئی۔ پنڈت کیفی نے عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور کچھ اور الگ الگ بولیوں کے بولوں کی گنتی گن گنا کر "خالص اُردو" کے سترہ ہزار پانچ سو پانچ بول جو گنوائے ہیں۔ اُن کی یہ گنتی سمجھ میں نہیں آئی۔ جیسے اور دوسری بولیاں الگ الگ پہچانی جاتی ہیں ایسے ہی کیا "خالص اُردو" بھی کوئی ایسی الگ بولی ہے جس کے سترہ ہزار پانسو پانچ بول اُردو میں مل ملا گئے ہیں۔ اسے کچھ تو پھیلا کے اور کھول کر لکھنا چاہیئے تھا۔

اِسی ہندی اٹھوارے کی سبھا میں پنڈت چترسین شاستری نے اپنے ڈھائی چاول الگ گلائے اور جی کھول کے ہندی کی بڑائی جتائی۔ وہ اپنے دھیان میں اس سے بڑھکر ہندی کو سراہ سکتے ہیں کیونکہ؟ جب تک نری ہندی ہی کی بات چیت رہے۔ پر اُنہوں نے جانچ پرتال کے گھسے ہوئے باٹوں سے اُردو اور ہندی کے تولنے میں ڈنڈی مار کے ہندی کا پلڑا بھاری دکھانے کے جتن کئے۔ ایک تو گھسے گھساتے پُرانے باٹ پھر اُس پر پورا نہ تولنا اور

ڈنڈی مارنا یہ تو ٹھیک نہیں۔ یہ ڈگریوں نہیں نپا کرتی، اس کے لئے اُردو، ہندی کو آمنے سامنے رکھکر ان دونوں کی جوڑان، چکلان اور پھیلاؤ کو پہلے ناپنا چاہیئے تھا۔ اس ناپ تول سے کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی چھپی نہ رہتی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگتا۔ پر بے جانچے ہوئے تو ہندی کا راگ الاپنا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ یوں تو مُنہ کہنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ جو جس کا جی چاہے کہے۔ پر۔ سُوجھ بُوجھ والے "کہنا" اسے کہتے ہیں جسے سُنتے ہی دوسرا کچھ نہ کہہ سکے اور بے مانے چھٹکارا نہ پاسکے۔ پنڈت جی نے اپنی بات کی پچ میں جن تین کسوٹیوں پر ہندی کا ٹھیک اُترنا مان لیا ہے وہ ٹھیک نہیں ٹہیر ٹھنڈے جی سے سوچنا چاہیئے۔ آج پورے دیس کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے اکیلی اُردو ہی ایک ایسی بولی ہے جو اِن تینوں کسوٹیوں پر ٹھیکم ٹھیک اور ایسی پوری اُترتی ہے جس میں بال بھر بھی کہیں ال بل نہیں۔ اسی لکھت میں کہیں پہلے کچھ پھیلاؤ سے اس پر لکھا جاچکا ہے اس لئے اب پھر کہی ہوئی باتوں کا دُہرانا اور انہی چبائے ہوئے نوالوں کا پھر چبانا اچھا نہیں لگتا۔

پیچھے مڑکر بھی دیکھتے چلئے:۔ سب سے پہلے اُردو، ہندی کی نیو ۱۸۰۲ء میں کھُدی۔ ڈاکٹر گلگرسٹ نے للوجی لال، للولال جی نام جو بھی ہو پہلے پہل اُن سے "پریم ساگر" لکھوا کر یہ بِس بویا۔ اس کے لکھنے کا ڈھب ناگری رکھا اور اس میں فارسی بولوں کی بہتات اور ریل پیل نہ ہونے دی۔ یہی وہ پہلی لکھت ہے جو اُردو کی بڑھوتری کو روکنے کے لئے اس کے سامنے لاکے ڈال دی گئی۔ گنتی کے کچھ ہندوؤں کو چھوڑ کر اور کسی کو بھی اس لکھت کا ڈھچر اچھا نہ لگا۔ انگریزوں کا راج پاٹ بڑھا تو "فورٹ ولیم" کے کھلاڑیوں نے اپنے پھُولنے پھلنے کیلئے آنے والی باتوں کو بھانپکے اس اُٹھلی نیو کو کھود کھود کے گہرا کر دیا۔ بولی کا ایکا آگے بڑھکر اس کے بولنے والوں میں بھی کہیں پورا ایکا نہ کر دے۔ اس لئے "ہندی" اور "ہندوستانی" نام رکھ کے ایک ہی بولی کے دو ٹکڑے کر دئے اور ان دونوں کی سیوا کیلئے الگ الگ پنڈت اور "مولوی" رکھے گئے۔ انہوں نے چاندی کے پھولوں کی للک میں الگ الگ لکھ لکھا کے لکھتوں کا ڈھیر لگا دیا اور اس ڈھنگ سے اُردو، ہندی کے دو پُتلے جب بن بنا چکے تو اِن کھلاڑیوں نے انہیں لڑنے کے لئے دیس کے اکھاڑے میں چھوڑ دیا۔ اس پر بھی بہت دن تک یہ آگ یونہی دبی دبائی پڑی رہی اور بہت سے ہندو مسلمانوں کے ساتھ اُردو کو آگے بڑھانے اور اسکی سیوا کرنے میں دن رات لگے رہے۔

۱۸۶۸ء میں مہاراجہ بنارس کا "چیمبر انسائیکلوپیڈیا" کو اُردو کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے دس ہزار کی نچھاور کرنا اور راجہ بر بلبھ نرائن سنگھ کا بھاگلپور میں انگریزی اور اُردو کی پڑھائی کے لئے ایک پڑھائی گھر کھُلوانا یہ ان باتوں میں سے ڈھائی باتیں بھی نہیں جو ہندوؤں نے اس پھلواری کی سینچنے کیلئے لگاتار کیں۔ ۱۸۳۹ء میں فارسی کو کچہریوں سے نکال باہر کر کے اُردو اس کی جگہ آگئی اور جگہ جگہ یہی دکھائی دینے لگی۔ ۱۸۶۷ء میں "برٹش انڈین ایسوسیشن" نے جب ایک "یونیورسٹی" کھولنے کے لئے دوڑ دھوپ کی تو اس "ایسوسیشن" میں الگ الگ دھرم والے سبھی تھے۔ ابھی یہ بات پوری ہونے نہیں پائی تھی جو الہ آباد کے بابو سرودھا پرشاد منڈل اپنی ٹولی کو لیکر اُٹھے اور دبی ہوئی آگ کو پھونک پھونک کے سُلگانے لگے۔ بنارس سے ہندی پرچار کی پکار ہوئی اور ہندوؤں کو اُردو کی سیوا کرنے پر جی کھول کے بُرا بھلا کہا جانے لگا۔ یہ ہو ہی رہا تھا جو دیانند سرسوتی آگے بڑھے اور اُنہوں نے اِس سُلگتی ہوئی آگ پہ تیل ڈال کے اُسے بھڑکا دیا۔ سنسکرت کو پھر جلاتے اور اُس کو پھیلاتے، آگے بڑھانے میں اپنی پوری سکت لگا دی۔ یہ آگ یونہی بھڑکتی رہی۔ ہوتے ہوتے ۱۸۷۱ء میں ہندی پرچار کا دھارا بنگال میں بہنے لگا۔ جس سے ۱۸۷۲ء میں نربدا اور جبل پور ڈویژن میں فارسی کی جگہ دیوناگری لکھنے کا ڈھب پھیل گیا اور اس سے جی کی چونپ اتنی آگے بڑھی جس سے دیس کے اور ٹکڑوں میں بھی اِسی ڈھچر کے پھیلانے کے جتن کئے جانے لگے۔ سر سید نے یہ آپا دھاپی دیکھ کر اپنی پوری سکت اس کے دبانے میں لگا دی۔ الہ آباد میں بڑی سبھا جمی۔ جس میں ایک سنٹرل کمیٹی بنی اور جگہ جگہ لوکل کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اِدھر اُدھر چٹھیوں پہ چٹھیاں بھیجیں جن میں ناگری پرچار کی چھتاڑ کی گئی تھی۔

اِن باتوں نے اُس بڑھتی ہوئی لے کو دبا تو دیا جو آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ پر بھاشا پرچار کے لئے جو سبھائیں بن چکی تھیں وہ چُپکے چُپکے اپنے توڑ جوڑ میں ویسی ہی لگی رہیں اور علی گڈھ کی "سائنٹفک سوسائٹی" کے سامنے ہی ایک "بھاشا سمردھن سبھا" بن بنا گئی۔ جس نے ۱۸۸۲ء میں "رائل ایجوکیشنل کمیشن" کے آگے ایک سانس میں وہ سب کہہ ڈالا جو وہ چاہتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں اسی جھگڑے پر سر سید نے اپنی ایک رپورٹ میں یہ لکھا:۔

> "تیس برس کے عرصے سے مجھے مُلک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کے کاموں میں کوشش کریں۔ لیکن جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اُردو زبان و فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی شہنشاہیِ ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے،

مٹادی جائے' اُس وقت سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اب ہندو اور مسلمان مُلک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ مَیں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا اُس کی ابتدا اِسی سے ہوئی۔ گو اس کے بعد اور بھی اسباب ہوتے اور اس کے سبب سے اس نفاق کو سوائے ان پُرانے ہندو مسلمانوں کے جو بڈھے اور اگلے زمانے کے ہیں یا دُور اندیش اور سمجھدار ہیں اور دل سے ہندو، مسلمانوں میں اتفاق چاہتے ہیں روز بہ روز ترقی ہے جس کی حد مقرر کرنے کے لئے کوئی پیشین گوئی نہیں ہوسکتی۔ علی گڈھ ہندو، مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لئے مشہور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسے مقدس شہر میں بھی یہ سبھا جو بنیاد باہمی نفاق کی ہے قائم ہے۔"

سرسید کے آڑے آجانے سے کچھ دنوں کے لئے یہ بات دب دباگئی اور ان کے سامنے اسے آگے بڑھانے کے لئے کسی کا ہواؤ نہ پڑسکا۔ جب یہ دلیس سے بچھڑ چکے تو اس کے دو ہی برس پیچھے ۱۹۰۰ء میں سرانٹونی میکڈانلڈ نے ہندوؤں کی من مانی باتیں مان کر مسلمانوں کو آپے سے باہر کردیا۔ یہ بہت بگڑے، بہت بپھرے، بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سرسید کے پیچھے نواب محسن الملک نے اُردو کے بچاؤ کا بیڑا اُٹھایا اور لکھنؤ میں اسی کے لئے ایک بڑی بھاری سبھا جمی۔ جس میں عیسائی، ہندو، کشمیری پنڈت بھی مسلمانوں کے ساتھ بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ بھرے پنڈال میں محسن الملک مرحوم نے اپنی دھواں دھار اسپیچ سے ہلچل ڈالدی۔ اُنہوں نے لفٹنٹ گورنر سے بھی اسی جھگڑے پر بے جھجک کھلم کھلا بات چیت کی اور اُنہیں یہ جتلایا اور تو اور دلیس کے اس ٹکڑے کے رہنے والے بنگالی بھی "ہندی" پر اُدھار کھائے ہوئے ہیں اور اس کا پرچار نہیں چاہتے۔ ادھر یہ ہورہا تھا اُدھر پنجاب اور سندھ میں بھی اسی ہندی کے پرچار پر بڑا اودھم مچا۔ اور لوگوں نے بہت پیر پھیلائے۔ پر یہ ہانڈی کا سا اُبال آگے نہ بڑھ سکا اور کچھ دنوں میں دب دبا کے رہ گیا۔

ان سب باتوں نے مسلمانوں کی آنکھیں کھولدیں اور اُنہوں نے آپس میں کانا پھوسی کرکے ۱۹۰۷ء میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کی نیو رکھدی۔ اُردو کا بچاؤ اور پھیلاؤ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" اور "انجمن ترقی اُردو" کے ہاتھ ہی میں نہیں "مسلم لیگ" بھی اس کی پوری دیکھ بھال کرتی رہی۔ ۱۹۱۱ء میں لیگ اور کانگریس میں سمجھوتے کے لئے جو بات چیت چھڑی تھی اُس میں اُردو کا بھی ایک نمبر رکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۱۶ء کے "سیف گارڈ" (تحفظات) میں بھی اس کے لئے پوری جگہ نکالی گئی تھی۔ ان سب اگلی پچھلی باتوں کی کڑیاں ملاکر دیکھئے تو یہی پایئے گا۔ ہندو اُردو کا ستیاناس کرکے اور اُسے مٹا کے ہندی ہی کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کی دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں۔ پر۔ انہی میں ایسے بھاری بھرکم لوگ بھی ہیں جو یہ لکھ رہے ہیں:۔

"۱۹۔ البرٹ روڈ۔ الہ آباد ۲۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

مخدومی مکرمی ڈاکٹر عبدالحق صاحب!

تسلیم و نیاز۔ اگرچہ میری بڑی خواہش تھی کہ مَیں اس موقع پر جلسے میں شریک ہوں لیکن پچھلے تین چار روز سے میری طبیعت پھر ناساز ہوگئی ہے اور مجھے خوف ہے کہ ریل کے سفر سے زیادہ خراب نہ ہوجائے۔ لہذا بحالت مجبوری میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ کل شب کو ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ میں نے اُن سے زبانی بھی عرض کردیا ہے کہ وہ میری طرف سے معذرت کردیں۔

اگرچہ میں جلسے میں موجود نہ ہوں گا لیکن مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں آپکے مقاصد و اغراض سے بہمہ وجوہ وابستہ ہوں اور پوری ہمدردی رکھتا ہوں۔ آپ کا ہمنوا اور ہم آہنگ ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنے مقاصد میں پورے طور پر کامیاب ہونگے۔ مَیں اس مسئلۂ زبان کو کسی فرقہ وارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو تنازع اس وقت زبان کے مسئلے کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہوگیا ہے۔ اس کی اہمیت اور تنازعات سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو مسلمان دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ تباہ ہوگئی تو وہ تہذیب اور طرزِ زندگی بھی جس کا یہ ظاہری لباس ہے تباہ ہوجائے گی اور کم از کم شمالی ہندوستان میں تو ہم کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک مورخ نے راجہ ٹوڈرمل کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ اُنہیں کے حکم سے حساباتِ سلطنت فارسی میں لکھے جانے لگے اور ہندوؤں نے عام طور پر فارسی کا پڑھنا شروع کیا جس کا آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان میں ایک نئی زبان یعنی اُردو پیدا ہوئی جس کو اگر ہندو قبول نہ کرتے تو ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ غیر ممکن تھا کہ اس زمانے میں تمام ہندو فارسی پڑھ جاتے اور یہ بھی اسی قدر غیر ممکن تھا کہ اس زمانے میں تمام مسلمان ہندی پڑھ جاتے۔ چونکہ دونوں کو اسی ملک میں رہنا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ دُنیا کے کاروبار لازمی تھے۔ لہٰذا ضروریات وقت نے دونوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ ایک ایسی زبان مشترکہ پیدا کی جائے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی وقعت اور احترام کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی اس قدر آمیزش ہے۔ رفتہ رفتہ اسی زبان کے اُستادوں نے اس زبان کو اس خوبی سے مانجھا کہ اس کو بذات خود ایک مشترکہ زبان ہونے کا وقار حاصل ہو گیا اور اس کو مشترکہ زبان کہنے میں نہ ہندو اور نہ مسلمان اپنی بےعزتی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمارے مُلک میں ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کم از کم شہروں میں تو تبادلۂ خیالات میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دہلی، آگرہ، روہیلکھنڈ اور پنجاب کے اطراف میں تو اس زبان کو دیہات میں بھی دخل ہو گیا اور دیہاتی زبان میں بھی ہزارہا الفاظ داخل ہو گئے۔ جن کو ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے مُلک کے الفاظ ہیں۔ مگر اب دھارا دوسری طرف بہہ رہا ہے اور اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ چُن چُن کر وہ الفاظ جو مقبول عام ہو چکے ہیں ہماری زبان سے خارج کئے جائیں اور ایک نئی زبان پیدا کی جائے جو کہ تمام مُلک پر حاوی ہو۔ مَیں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوشش کیوں اس وقت کی جا رہی ہے۔ ایسی کونسی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اس زبان کو جو کہ دو ڈھائی سو برس سے شمالی ہندوستان میں رائج ہو گئی ہے اس طریقے سے ختم کریں اور اس زبان کے ساتھ اس تہذیب کو بھی ختم کریں جس میں یگانگت کے خیالات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ مَیں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ حامیانِ اُردو، ہندی یا کسی اور زبان پر حملہ کریں۔ مگر مَیں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی اُردو پر حملہ نہ کریں۔ اُردو اس وقت میرے خیال میں معرض خطر میں ہے اور اس وقت خطرہ زیادہ اس وجہ سے ہے کہ آپس کی جنگ وجدل کی وجہ سے ہندو بھی اُسے بگاڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی۔

اگر ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ فارسی یا عربی کے جو ہماری زبان میں جذب ہو گئے ہیں نکال لئے جائیں تو مسلمانوں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ بجائے ہندی کے معمولی الفاظ کے مشکل سے مشکل الفاظ عربی یا فارسی کے جو عام فہم نہیں ہیں استعمال کئے جائیں۔ اُردو کے ساتھ اس سے زیادہ بُرا سلوک اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ انجمن ترقیِ اُردو اس معاملے میں پیش قدمی کرے اور ایک معیار زبان کا قائم کر کے اس بات پر اصرار کرے کہ جو کتابیں یا مُراسلے یا اخبارات اُردو میں لکھے جائیں وہ ایسی زبان میں ہوں جو عام فہم ہو۔ تاکہ اس زبان کی روزافزوں ترقی ہو اور اس کو وسعت حاصل ہو۔ یہ ضرور ہے کہ اصلاحی الفاظ کا ذخیرہ ہمارے یہاں کافی نہیں ہے اور ہم کو دیگر زبانوں سے جس میں کہ مَیں انگریزی کو بھی شامل کرتا ہوں ایسے الفاظ لینے پڑینگے۔

ادب کا دائرہ اب نہایت وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں ہماری انجمن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسی کتابیں مُستند اُردو زبان میں شائع کرے کہ جن کی بدولت ہمارے نوجوانوں کی تعلیم شروع سے آخر تک کافی طور پر ہو جائے۔ مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ہمارے ادیب ہر حصہ تاریخ ہندوستان کے اُوپر ہندو زمانے سے لیکر انگریزی زمانے تک عالمانہ کتاب نہ لکھیں۔ ادب میں تنگ نظری اور تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب کو کسی ذاتی اعتقاد یا تعصب سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ادیب، ادیب نہیں جس میں منصف مزاجی نہ ہو۔ لہٰذا نہایت ادب کے ساتھ مَیں یہ عرض کرونگا کہ انجمن ترقیِ اُردو کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرے اور جس انجمن کا رُوح رواں ایسا شخص ہو جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق، اس سے ایسی اُمید کرنا ہمارے لئے بیجا نہ ہوگا۔ آخر میں، مَیں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کا جلسہ کامیاب ہو اور آپ ایسی تجاویز منظور فرمائیں کہ جو عملی طور پر مُفید ثابت ہوں۔"

نیاز مند، تیج بہادر سپرو۔

(ادبِ لطیف، لاہور۔ جنوری ۱۹۴۶ء)

کیا کہا، کس ڈھنگ سے کہا، اور کس نے کہا اس چٹھی کی یہ سب باتیں یوں نہیں، سوجھ بچار کی آنکھوں سے دیکھنے کی ہیں۔ شہد ساگر میں ڈبکی لگانے والوں کے کیول، تتھا، ادھک، اہو دا جیسے کڈھب بولوں کا نہ کہیں اس میں پتا ہے اور نہ کسی اور بولی کے بوجھل بولوں کا۔ پوری چٹھی میں سے آپ ایک آدھ بول بھی ایسا نہیں نکال سکتے جسے بھولا بسرا کہا جا سکے۔ کتنا ہی جانچیے پرکھیے ایک ایک بول گنا چنا اور گھلا ملا ہی پائیے گا۔ پھر جو کچھ کہا وہ ایسا چھانٹا، ہٹ دھرمی اور بات کی پیچ نہ کی جاتے تو اسے مانتے ہی بنے اور بے مانے چھٹکارا نہ مل سکے۔ یہ دکھڑا کب تک اور کہاں تک۔ سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہونگے۔ اچھا، اسے چھوڑیے اور کچھ اور باتیں سنیئے۔

یہاں تک جس اردو نگر کو آپ دیکھتے بھالتے ہوئے چلے آئے، اس کی نیو سب سے پہلے سید انشا رکھ چکے ہیں۔ کب؟ جب دلی اجڑ کے لکھنؤ بس رہا تھا۔ سید انشا بڑے پہونچے ہوئے لوگوں میں سے تھے۔ ان کے گیان دھیان کی اونچان مانی ہوئی ہے۔ کبیشر نہ بنتے اور اپنے لئے کوئی اور ڈگر نکالتے تو وہ برسوں انہی کی کہلاتی۔ بیتاب نے ان کے لئے جو کہا وہ سچ کہا۔ سید انشا کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علیخاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔ یہ بڑے ہنس مکھ، بات میں سے بات نکالنے والے، جہاں بیٹھ گئے پوری سبھا پر چھا گئے۔ کسی کا ہوا تو نہ پڑتا جو انہیں ٹوک کے ان کے سامنے کچھ چیں پٹاخ کر سکے۔ بہتے ہوئے دھارے کے آگے گھاس پھونس ہے کیا۔ سب کا سب اسی کے ساتھ بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑتے جھاڑ کا کانٹا ہو کے چمٹتے اور اسے پیچھا چھڑانا دوبھر ہو جاتا۔ لٹکے اور منتر سے بڑھ کے ان کی باتیں تھیں۔ روتے ہوؤں کو ہنسا دینا تو ایک کھیل تھا۔ شیخ قلندر بخش جرأت پر سرمنڈی نگوڑی گجراتن والی پھبتی آج بھی کوئی بڑا بوڑھا سید کی اور اور باتوں کے ساتھ کہنے بیٹھے تو آپ کھلکھلا کے ہنس پڑینگے۔ بے ہنسی کے تو یہ ٹکڑا ہی نہیں توڑتے تھے۔ دن رات ہنسنا ہنسانا ہی رہتا تھا۔ ہنسی کی پونجی بڑے اللے تللے سے اڑائی اور ایسی لٹائی جو کھکھ ہو کے رہ گئے۔ دوسروں کا ہنسانا تو بڑی بات رہی۔ کچھ دنوں میں پھر آپ ہی کبھی نہ ہنس سکے اور مرتے مرتے روتے ہی کٹی۔

چھٹ پنے ہی سے نئی سوجھتی تھی۔ لڑکپن میں جب "کافیہ" پڑھتے اور رٹتے تھے تو ستار کے بھی بڑے رسیا تھے۔ "کافیہ" رٹنے کی کڑ اور ستار بجانے کا لپکا دونوں کا ساتھ کیسے نبھ سکتا تھا۔ ستار اٹھاتے تو رٹنا چھوٹتا، رٹتے تو ستار چھو نہ سکتے۔ ان کی نئی اپج رٹنے اور بجانے کا جوڑ ملانے کے لئے "کافیے" کے عربی بولوں کی گتیں بنا بنا کے ستار پر بجانے لگی۔ لیجیے نہ رٹنا چھوٹا نہ ستار، دو انمل باتوں کو اکھٹا کر کے ہی چھوڑا۔

دلی راج کی دھوپ جب ڈھلتی چلی جا رہی تھی تو راج کمار مرزا سلیمان شکوہ دلی چھوڑ لکھنؤ آ رہے۔ ان کی ڈیوڑھی دلی والوں کا ٹھکانا سمجھی جاتی تھی۔ ادھر سے جو ادھر آتا پہلے وہ یہیں ٹھہرتا۔ پہلے پہل جب سید انشا بھی لکھنؤ چھوڑ دلی آئے تو پہلے اسی ٹھکانے پہ آ کے ٹکے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے انہیں اپنے ہی پاس رکھ لیا اور یہیں رہنے سہنے لگے۔ لکھنؤ میں اشنان کا میلا ہونے والا تھا۔ یہ بھنک پہلے ہی سے ان کے کان میں پڑ چکی تھی۔ اشنان کا دن آتے ہی سویرے منہ اندھیرے سے گوگل، سیندور، تلسی، دھوپ، چندن اور نجانے کیا کیا لئے ہوئے سب سے پہلے گھاٹ پہ پہنچ، آلتی پالتی مار ایک مہنت دھرم مورت بن کے بیٹھ گئے اور لگے مالا جپنے اور پکار پکار کے اشلوک پڑھنے۔ جو دیکھتا کشمیری پنڈت سمجھتا۔ دن چڑھا، اشنان والوں کا تانتا بندھا، دھکم دھکا، بھیڑ بھاڑ اور چیخ پکار بڑھنے لگی۔ جو آتا انہیں گورا چٹا، ہٹا کٹا، اونچا پورا، بھاری بھرکم دیکھ کر انہی کے سامنے جھکتا۔ یہ اسے پوجا کرانے، اشلوک سناتے اور تلک لگاتے۔ ملنے والوں نے جو انہیں اس روپ میں دیکھا تو انہی میں سے کسی نے جھٹ سے مرزا سلیمان شکوہ سے بھی جا کے کہہ دیا۔ ان کی ڈیوڑھی گھاٹ کے پاس تو تھی ہی۔ سنتے ہی اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں یہ بہروپ دیکھنے نکل آئے۔ سید انشا کے آگے آٹا، اناج، پیسوں، کوڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوتے دیکھے اور وہ بھی سب سے بڑھ کے۔ یہ سب ہنسی ہی ہنسی تھی۔ پر اسی آڑ میں یہ بھی دکھانا تھا۔ میں نرا کوی، کبیشر ہی نہیں۔ جدھر نکل جاؤں گا سب سے بڑھ کر نکلوں گا۔

یہ جدھر کی سیدھ باندھتے پھر نہ رکتے اور اس پھرتی سے بڑھتے جیسے آندھی پھیلتی اور بجلی کوندتی ہے۔ جی میں جو ٹھان لی وہ ٹھان لی۔ دھیان میں جو آ گئی وہ آ گئی۔ دیس کی بولیاں تو ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ ہندی، مرہٹی، پوربی، پنجابی، کشمیری، پشتو، ان سب میں انہوں نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ نئی ڈگر نکالنے کی لوہ میں لگے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے جو لہر آئی تو ایک ایسی کہانی لکھ لکھا ڈالی جس میں عربی، فارسی کا ایک آدھ بول بھی نہ آنے دیا اور پھر وہی چوچلے اور چہلیں رہیں۔ اس نئے ڈھچر کی کہانی لکھنے سے پہلے اپنے کسی ملنے والے سے باتوں باتوں میں انہوں نے کہیں یہ بات بھی کہدی۔ سنتے ہی اس نے انہی کے منہ پہ وہیں تڑ سے کہدیا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سید انشا اس پر بہت اونٹے اور بہت جھلائے۔ ان کا اونٹنا اور جھلانا دیکھنا ہو تو اس کیلئے انہی کی لکھت کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

سید انشاؔ کی رانی کیتکی

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی، کوئی کہانی ایسی کہیئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے رُوپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے، پُرانے دھرانے ٹھاگ، بڑے ڈھاگ یہ کھٹراگ لاتے۔ سر ہلا کر، مُنہ تھتھا کر، ناک بھوں چڑھا کر، گلا پھلا کر، لال لال آنکھیں پتھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹھس جاتے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں، جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔

میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سُری بے ٹھکانے کی الجھی سلجھی تانیں سنے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا مُنہ سے کیوں نکالتا۔ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سُناتا ہے۔ اپنا ہاتھ مُنہ پر پھیر کر موچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند، اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے۔ دیکھتے ہی ہرن کے رُوپ اپنی چوکڑی بھرے یہ

"گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں"

یہ اسی کہانی کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا ہے جسے "رانی کیتکی" کے نام سے سید انشا لکھ چکے ہیں۔ نجانے کیا بپتا پڑی جو یہ رانی کسی کونے کھدرے میں مُنہ چھپائے برسوں پڑی رہی۔ کئی برس ہوتے جو "انجمن ترقی اردو" کی ڈھونڈ ڈھانڈ نے کھوج لگا کے اُسے باہر نکالا۔ باہر نکلی تو دُھول میں اَٹی ہوتی تھی۔ نہلا دُھلا کے چھاپے کے چھپے چھپائے اُسے نئے نئے کپڑے پہنائے۔ برسوں سے ایک جگہ پڑا رہنا اجیرن ہو گیا تھا۔ اب جو نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن چکی تو لگی گھر گھر پھرنے اور ادھر اُدھر سپاٹے بھرنے۔

کہانی چھپ چھپا تو گئی۔ پر ٹھیک نہ چھپ سکی۔ کہیں بول اپنی جگہ سے ہٹے ہوتے، کہیں کے بول بگڑ کے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اور کہیں ایک جگہ کے بول دوسرے بولوں کی جگہ جھین کے آگے والے پیچھے اور پیچھے والے آگے بڑھ گئے۔ پھر اسی میں اکا دکا ہی سہی فارسی بول بھی گھسے ہوتے ہیں۔ سید انشا جنہوں نے عربی، فارسی کو چھوا تک نہیں اور پوری کہانی لکھ لکھا ڈالی۔ وہ بھلا کسی دوسری بولی کے گنتی کے کچھ بول کیسے لکھ جاتے اور پوری سوئیاں نکال چکنے پر آنکھوں کی سوئیاں کیسے چھوڑ دیتے۔ یہ سب کیا دھرا اناڑی لکھنے والوں ہی کا ہے۔ جنھوں نے اس لکھت کے پورا کرنے کی دُھن میں بے سوچے سمجھے اوٹ پٹانگ جو چاہا لکھ لکھا دیا۔ ان لوگوں میں کسی بولی وولی کے لٹریچر کی چھان بین اور اس کی جانچ پرتال کی سکت کہاں ـــــ "رانی کیتکی" کا جو ٹکڑا اُوپر لکھا جا چکا ہے اُسے "انجمن ترقی اردو" کی چھپی ہوئی کہانی کے اسی ٹکڑے سے ملا کے دیکھئے تو جو کچھ ال بل اور جتنی گھٹ بڑھ ہے وہ سب سامنے آ جائے گی۔ "آبِ حیات" کا وہ اڈیشن جو آزاد مرحوم کے سامنے چھپ چھپا چکا تھا اسی سے یہ ٹکڑا لیکر یہاں لکھا گیا ہے اور یہ اس سے بھی ملتا جلتا ہے جسے بیس برس ادھر لٹریچر کے ایک بڑے پریمی کے پاس اسی کہانی میں آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔

فیض آباد کے رہنے والے منشی نعیم الحق اچھے لٹریچر کے پجاریوں میں سے تھے۔ ایک ملنے والے کے ساتھ اُن کے یہاں اُس دن جانا ہوا جو "رانی کیتکی" کے درشن کا دن تھا۔ وہاں اس کے وہ ٹھاٹ دیکھے جنہیں دیکھ چکنے پر بھی پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کہانی کسی اچھے لکھنے والے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، جن پتروں پہ لکھی گئی تھی اُن پر یہاں سے لیکر وہاں تک سونے کا ہلکا ہلکا سا چھڑکاؤ اور جگہ جگہ نت نئے رنگ کے پھول بوٹے۔ اردو کے کسی بڑے جوگی نے اُسے لٹریچر کے مندر کی دیوی بنا دیا تھا اور یہ ٹھیک نہ ہو تو پھر یہ کہیئے۔ "رانی کیتکی" سولہ سنگار سے بنی سنوری چوتھی کی دُلھن بن گئی تھی۔ اس کی مُنہ دکھائی کا سماں آج تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ منشی نعیم اسے بہت سینت سینت کے رکھتے اور جو کوئی دیکھنا چاہتا تو ٹال جاتے۔ ٹالنا اور گدگداتا تھا۔ دیکھنے والے بھلا کہیں ٹالے سے ٹلتے ہیں۔ جتنا ٹالتے اُتنا ہی اُن کا اور پیچھا کیا جاتا۔ کب تک بچتے اور کہاں تک

ٹالم ٹول کرتے۔ ہوتے ہوتے وہی ہارے اور دیکھنے والے دیکھ کے ہی رہے۔ اس بات کو بیس برس ہو چکے اور "رانی کیتکی" کی گھوڑا گھاری اب اک دھندلا سا سماں بن کے رہ گئی۔

سید انشا اس سنسار کی سبھا سے کب کے اُٹھ چکے۔ اُنہوں نے جو کچھ چھوڑا وہ اب آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ جلائیے بہائیے جو جی چاہے کیجے۔ وہ جہاں ہیں وہاں سے روکنے ٹوکنے کیلئے تو آنے سے رہے۔ پر یہ دھیان رہے آج نہیں تو کل ہمیں بھی اسی ڈگر پہ چپ چاپ چلنا ہے۔ وہ بچھڑے ہوئے بڑے بوڑھے جو اب کچھ کہہ سُن نہیں سکتے اُن کا ایک ایک بول انمول سمجھ کے پورے سوچ بچار کر چکنے پر اُن کی اس پونجی کو ہاتھ لگانا چاہیئے جس کے اکٹھا کرنے کی دُھن میں وہ رات دن لگے رہے اور اپنی پوری سکت اسی میں لگا دی تھی۔ اس کہانی کے پہلے اڈیشن میں جہاں جہاں بھول چُوک ہوئی اور جو جو باتیں رہ گئیں ان سب باتوں سے بچ بچا کے پورے دھیان سے "انجمن ترقی اُردو" چاہے تو دوسرا اڈیشن اچھے سے اچھا نکال سکتی ہے۔

تو سید انشا نے اپنا جی بہلانے اور اپنی سکت دکھانے کے لئے پہلے پہل نئے ڈھنگ سے "رانی کیتکی" کی کہانی لکھی اور مجھے اسی ڈگر پر اُردو، ہندی کے بڑھتے ہوئے جھگڑے کو دبانے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بُجھانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ سید انشا نے جس ڈھب سے کہانی کہی اسی ڈھچر پر میں نے جو باتیں ہو چکی ہیں اُنہیں جوں کا توں دُہرایا۔ اِن دونوں میں بڑا اُل بل ہے۔ کہانی کے لئے کوئی روک ٹوک ہی نہیں۔ یہ دھیان کے ساتھ ساتھ دوڑ لگاتی ہے۔ وہ جدھر لے چلا چلی اور وہ جہاں تھما یہ بھی رُک گئی۔ کہیں اونچ نیچ دیکھی تو دھیان اس سے کترا گیا اور کہیں کوئی بیہڑ ڈگر دکھائی دی تو جھٹ سے وہ پھلانگ کے نکل گیا۔ پر۔ وہ باتیں جو ہو چکیں ان میں یوں ہی سی گھٹ بڑھ کی بھی اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ سنسار کے ہاتھ نے انہیں جون سے سانچے میں ڈھالا ویسے ہی وہ ڈھل گئیں۔ اِدھر اُدھر سے گھری ہوئی اگھتائی میں اس پوری بھیڑ کو ساتھ لئے دوڑ پر دَوڑ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کٹورا بھر پانی میں سمندر کا سما جانا۔ یہ سب سید انشا ہی کا کیا دھرا ہے۔ وہ یہ ڈھرا نہ نکالتے تو بھولے سے بھی کبھی اس پگڈنڈی کا دھیان تک نہ آتا۔ اس لئے اس لکھت کو انہی کی لکھت سمجھنا چاہیئے۔

اپنا دھیان۔ پہلے پہل جب اُردو، ہندی کی ہم ہچ سُنی تو دھیان آیا۔ ایک جگہ رکھے ہوئے برتن باسن تک کبھی نہ کبھی آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ تو بڑے بھلے مانسوں کے دُو جھتے ٹھیرے۔ اب تک جو بھی ہوا وہ ایسا نہیں جو آگے بڑھے اور بہت پھیلے۔ آج نہیں تو کل یہ ہانڈی کا سا اُبال آپ ہی آپ دب دبا کے رہ جائے گا۔ پر یہ چلتی ہوئی آندھی اور بڑھتا ہوا جھگڑا رہ رہ کے جب اور بڑھنے لگا تو پھر چُپ نہ رہا گیا اور سوچ بچار سے اسے دبانے اور مٹانے کے جتن ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔

ہندوؤں کو دیکھا تو وہ عربی، فارسی کے گھُلے ملے بولوں پہ اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور ہندی کے کڈھب بولوں کی بھرمار اور اُن کے پرچار پہ اڑے ہوئے ہیں۔ ملے جُلے عربی، فارسی بولوں کی کاٹ چھانٹ کرنا اور اُن کی جگہ ہندی کے بھدے بولوں کو لا لا کے اکھٹا کرنا یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر جھگڑا چکانے کے لئے گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، تارا چند جی کو جتنی چھٹیاں لکھیں اِن سب کے لکھنے کا ڈھنگ ایسا رکھا جن میں نہ عربی، فارسی کا کوئی بول آنے پایا اور نہ ہندی کا کوئی بھولا بسرا بول اور یہ جو بھی کیا گیا وہ سب ہندوؤں ہی کے منانے اور اُنکے ملانے کیلئے۔ ہندی کی یہ کہاوت آپنے سُنی ہوگی۔ "پھٹے کو سئے نہیں اور روٹھے کو منائے نہیں" تو یہاں کا دھندا کیسے چلے۔

اپنا دھیان تھا ہندوؤں کو لاگ اور بَیر جو بھی ہے وہ عربی، فارسی بولوں سے اور نئی ہندی کے بولوں کی ٹھولس ٹھانس اُن کی جگہ بھرنے کے لئے کی جارہی ہے۔ تو لکھنے کا ایسا ڈھچر جس میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں اور اس پر بھی لکھنے کا ڈھب اُردو ہی کا ہے۔ عربی، فارسی کے پُرانے اور نئی ہندی کے نئے بولوں کو چھوڑ کے اُردو لکھنے کا نیا ڈھنگ ہندوؤں کو دکھایا جائے تو وہ نئی بولی بنانے کی کھکیڑ سے بچ بچا کے ادھر ہی آجائیں گے اور اسی کو برتنے لگیں گے جس سے یہ بڑھتا ہوا جھگڑا دب دبا جائیگا۔

سوچا کچھ اور ہوا کچھ۔ پر یہ نرا دھیان ہی دھیان نکلا۔ اس ڈھنگ پر لکھنے لکھانے سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور وہی ٹر پھس رہی۔ ایسی تو تو میں میں کو دبانا اور بیچ بچاؤ کرانا جبھی ہو سکتا ہے جب جھگڑنے والے کان دھر کے اسے سُن تو سکیں جو کہا جا رہا ہے۔ کسی بات کو ٹھنڈے جی سے سُن لینا بڑی بات ہے۔ اسی سے آگے بڑھ کر سوچ سمجھ دھیان کی اس بُرائی کو ڈھونڈ نکالتی ہے جو چھپی چھپائی بس کی گانٹھ بنی من کے کسی کونے کھترے میں پڑی ہوتی ہے۔ اسے نکالتے ہی دھاندلی اور ہٹ دھرمی کی پٹی آنکھوں پر سے ہٹنے لگتی ہے۔ پر جب پہلے ہی سے لوگ نہ سُننے اور نہ ماننے پر اڑ جائیں تو پھر ان کے جی میں جی کوئی کیسے ڈالے اور کس ڈھب سے منائے اور کیسے سمجھائے۔ روٹھے ہوؤں کو منانے

کیلئے لکھت پڑھت کا جو ڈھچر رکھا گیا۔ جانچنے والے اسی سے پتا لگا سکتے ہیں مسلمان میل جول کے کتنے رسیا اور ملاپ کے لئے کیسی دوڑ دھوپ کیا کرتے ہیں اور ایکا کرنے کی دُھن میں وہ کتنا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ملنے والوں کی ناک بھوں چڑھانا۔ یہ سب دیکھ کر ملنے والوں نے تیوری چڑھا کے کہا کوئی بہلانے، منانے پر بھی روٹھتا ہی رہے تو پھر اُسے یونہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ بھاری پتھر جب لاکھ لاکھ اُٹھانے کے جتن کرنے پر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکتا تو اُسے چوم کے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ ہندو اپنے بڑے بوڑھوں کی بنائی ہوئی بولی کا ستیاناس کر دینا چاہتے ہیں تو کر لینے دیجے۔ مسلمان اپنے بڑوں کا کِیا کرایا اکارت نہیں کر سکتے۔ نئی ہندی کے ان گھڑ بول اُردو میں جیسے اُدھر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ ادھر سے بھی عربی، فارسی کے نئے نئے بولوں کا گہنا پاتا اُردو کو پنھا کر اس کی سندر مورت میں اور چار چاند لگا دئے جائیں۔

جب سے آئے دن رکچھا، شکشا، آشا، دشا، سمپتی، کلاہل، ادھک، تتھا، ھودا جیسے کڈھب اور بھدے بولوں کی بھرمار سے ہندو چاہتے ہیں اُردو کے سیتلا نکل آتے۔ تو سیتلا نکلنے سے پہلے ہی اُردو کو سیتلا کا ٹیکا کیوں نہ دیدیا جائے۔ جہاں سے جہاں تک ہو سکے عربی، فارسی کے نئے نئے پھولوں کی بدھیاں اور گجرے گوندھ گوندھ کے جتنے پنھائیں جا سکیں اسے پنھائیں جائیں۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بولیاں الگ الگ ہو جائیں گی اور پھر یہ گڈ مڈ ہونا جاتا رہیگا۔

میں نے اچنبھے سے انہیں دیکھا اور مُسکرا کے کہا۔ بھئی ایسا تھا؟ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کیوں گھبراتے ہو۔ دیکھ لینا ان ہی تلوں سے تیل نکلے گا۔ ہندو نہیں مانتے نہ مانیں۔ کب تک نہ مانیں گے۔ آج نہیں مانتے تو کل مانیں گے۔ پھر ہندوؤں ہی میں سے ان سوجھ بوجھ والوں کو بھی تو دیکھئے جو اس ہٹ میں نہیں اور اُردو کو ویسے ہی مان رہے ہیں جیسے اُن کے بڑے بوڑھے مانتے تھے۔ ایسی باتوں میں جھپاکا بنا بنایا کھیل بگاڑتا اور دھیما پن سدھارتا ہے اور جو اس کا دھیان نہ رکھا جائے تو شیخ سعدی کی یہ ڈانٹ سُننا پڑیگی۔

"دو گر در ہر دو جانب جاہلانند — اگر زنجیر باشد بگسلانند"

اور اِدھر اُدھر دونوں کے دونوں اُجڈ ہی اُجڈ اور اکھڑ ہی اکھڑ ہوں تو لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کو بھی توڑ تاڑ کے رکھدینگے۔

کوئی نئی بولی دو ڈھائی دن میں نہیں بنا کرتی۔ اس کے لئے برسوں دن رات کا اندھیرا اُجالا دیکھنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے راج کی چھاؤں ہزار بارہ سو برس کے لگ بھگ رہی۔ اتنے برسوں کی لگاتار باتیں گھڑی بھر میں ایسی تو نہیں بن سکتیں جیسے کپڑوں پہ پڑی ہوئی دھول جھٹ سے لیکر جھٹک دی۔ نئی ہندی کا جو گھروندا بنایا جا رہا ہے جی بہلانے کے لئے گھڑی بھر کا کھیل ہے تو یہ اور بات ہے اور جو یہ نہیں تو ایسی باتوں کے لئے برسوں کی جوڑ تان، چکلان بھی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ اُردو ہی کو دیکھئے اس ندی کا موتی سا چمکتا ہوا پانی جو لہریں مارتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی سوت کب پھوٹی اور کب پہلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری یونہی سوتیں پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی اتنی آگے بڑھیں جنہوں نے مل ملا کے اسے ایسی اُبلتی اور اُمنڈتی ہوئی ندی بنا دیا جس کا چوڑا چکلا پاٹ آج آنکھوں کے سامنے ہے اور جو آپ ہی کی بات ٹھیک نکلی اور ہندو ایسی ہی بے سُری سرگم بھرتے رہے تو پھر اُردو راگنی کا ستیاناس کس سے دیکھا جائیگا۔ اس کے بچاؤ، دیکھ بھال اور روک تھام کے جتنے جتن ہو سکتے ہیں ایک ایک کرکے وہ سب کے سب کئے جائیں گے۔ پر۔ جب بھی آپ عربی، فارسی بوجھل بولوں کی جو بھرمار اُردو میں چاہتے ہیں یہ بات کبھی نہ ہو سکے گی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟ بھولے بسرے اور کڈھب بولوں کی ٹھولنس ٹھانس بولی کو نڈھال کرکے اَدھ موا بنا دیتی ہے۔ ٹکسالی بولی کی یہی پہچان ہے جس میں الگ الگ بولیوں کے جتنے بھی بول ملے ہوتے ہوں وہ سب کے سب گھلے ملے آئے دن کی بات چیت۔ میں بے جھجک مُنہ سے نکلیں اور آنکھے بولنے میں کہیں رُکنا، ٹھیرنا اور سوچنا نہ پڑے۔

بڑے سے بڑے دیس کو دیکھئے تو اُسے تین ٹکڑوں میں بٹا ہوا پائیے گا۔ سب سے اونچا جتھا، سب سے نیچا جتھا اور ایک وہ جو اِن دونوں کے بیچوں بیچ ہے۔ سب سے بڑا اور اونچا جتھا جس میں بڑے چوٹی کے پڑھے لکھے، دھرم کی سیوا کے رنگ میں ڈوبے ہوتے رات دن بات بات میں موٹے موٹے اور بھاری بھاری بول ٹھونستے رہتے ہیں اور بے اس کے ٹکڑا نہیں توڑتے، ان لوگوں کی بولی کو لٹریچر کی سبھا والے آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔ سب سے نیچا جتھا جو اوٹ پٹانگ، اناپ شناپ بکتا رہتا ہے، اس کی بکواس بھی لٹریچر کے گون کی نہیں۔ اب ایک پہلے اور تیسرے ان دونوں جتھوں کے بیچ کا جتھا ہی رہ گیا۔ یہی بولی کی اونچ نیچ دیکھنے، اس کا کھرا کھوٹا پرکھنے، جانچ پرتال کرنے اور لٹریچر کو آگے بڑھانے والا

ہوا کرتا ہے۔ اسی میں سے کوی، کبیشر اور لٹریچر کے پریمی نکلتے ہیں۔ اسی بھتے کی دیکھ بھال سے بولی سدھرتی اور سنورتی ہے۔ یہی بیج والا جتھا اس پھلواری کو سینچتا اور اسی کی لگاتار دوڑ دھوپ سے لٹریچر پھلتا پھولتا ہے۔ مالی اپنے لگائے ہوئے پودوں اور پیڑوں کی جیسی کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک ایسی ہی یہ اپنی بھاشا کی اکھیڑ پچھاڑ کیا کرتا ہے۔ چلن کی کسوٹی پہ کس کس کے ایک ایک بول کو دیکھتا جاتا ہے۔ جو پرکھنے اور پرتالنے میں ٹھیک نکلتے ہیں وہ رکھ لئے جاتے ہیں اور جن میں کھوٹ ہوتی ہے انہیں نکال ڈالا جاتا ہے۔

بڑھنے والی بولی میں نئے نئے بولوں کی بھی مانگ رہتی ہے۔ یہ مانگ اور بولوں کی بڑھوتری آئے دن کی بول چال اور بات چیت کیلئے نہیں۔ پھر کس لئے؟ اور دوسری الگ الگ بولیوں کی کٹھن لکھتیں اپنی بھاشا کے سانچے میں ڈھالنے کی گھڑی آنے پر بہت سی ایسی بیڈھب جگہیں آجاتی ہیں جن کے گہراؤ اور پھیلاؤ کو آئے دن کے بولے جانے والے گنے چنے بول نہیں سمیٹ سکتے تو جب پورے سوچ بچار سے نئے نئے ایسے بول چننا، بنانا اور گھڑنا پڑتے ہیں جو ان جگھوں کو گھیر کر جوں کا توں دکھا سکیں۔ یہی نئے، چنے، بنے اور گھڑے ہوئے بول "اصطلاح" کہلاتے ہیں۔ ان نئے بولوں کی بڑھوتری سے بولی کا پھیلاؤ اور گہراؤ دن دونا رات چوگنا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس میں کٹھن سے کٹھن گیانوں کی لکھتوں کے سمیٹ لینے کی پوری پوری سکت آجاتی ہے۔ اس سائڈ کو چھوڑ کر کسی بولی میں نئے نئے بولوں کی ٹھونسم ٹھانس کے لئے یونہی سی بھی اور کوئی جگہ نہیں نکل سکتی۔ بولی کا اُتار چڑھاؤ، تاؤ بھاؤ، لوچ اور لچک کا پورا دھیان رکھنا اسی سے ہوسکتا ہے جو اس کے تیور پہچانتا اور اس کے ہتھکنڈے جانتا ہو۔

سید ابو القاسم سرور

آخری منزل

دیدۂ حیراں میں پھر رقصاں ہے عزمِ جستجو
دشت گردی کے لئے بیتاب ہے میرا جنوں

آرزومندی کے شعلوں سے طپاں ہے میرا خوں
پھر تجلّی ہے کسی زہرہ جبیں کی کُو بہ کُو

اُن دھندلکوں میں بلاتا ہے مجھے اک خوبرو
اب رہوں اُس کے تصوّر میں کہاں تک سرنگوں

اب تو وہ وحشت ہے سینے میں کہ ہمدم کیا کہوں
اب بہت بے کیف ہے یہ عالمِ بے رنگ و بُو

جستجو کی آخری منزل ہے میرے سامنے
اب لپک کر پھاند جاؤں گا بساطِ دو جہاں

ایک پل میں قطع کر لوں گا زمین و آسماں
کوئی کیا روکے کہ اب محمل ہے میرے سامنے

نزع کی ان آخری سانسوں سے عقدے کھل گئے
رُوح کی آنکھوں کے گرد آلود پردے دھل گئے

[illegible]

آدمخور!

مرتبہ مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے، ایل ایل بی

کیا سنہ ۱۹۴۰ء میں بھی آدمخوری ہوتی ہے اور آدمی کو آدمی مار کر کھا جاتا ہے؟ اس سوال کا خوفناک جواب کہاں؟ کیسے؟ کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے۔ لاش کو کس شوق سے تندور میں بھونتے ہیں، کس طرح گوشت تقسیم کرکے کھاتے ہیں۔ کس طرح عورت اپنے پیارے بچے کو بھون کر کھا جاتی ہے اور اُسکے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عجیب و غریب اور خوفناک رسمیں اور رواج۔ کس طرح دولھا انسانی گوشت اور کلیجی کے ثابت ٹکڑے نگلتا ہے اور منہ سے ٹکڑا اگر انہیں، کہ خود دولھا ذبح ہوکر باراتیوں کی خوراک بنجاتا ہے۔ عورتوں کو سزا دینے میں ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں۔ ایک شوہر بیوی کو بطور سزا یا تفریحاً بھون کر کھا سکتا ہے۔ کس طرح انسانی شکار کیلئے آہٹ نہ ہونیوالے جوتے پہنے جاتے ہیں۔ اور کس طرح انسان کا انسان کھانے سے پہلے خون چوس کر پی جاتا ہے۔ والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے انگاروں پر اوندھا لٹکا دیتے ہیں اور جب چربی پگھل پگھل کر نکلتی ہے تو کمزور لڑکے کے بدن پر اسکی مالش کرتے ہیں۔ اور پھر بہن کا گوشت بھائی کو کھلاتے ہیں۔ دورِ حاضر کے خوفناک ترین آدمخور کے مختصر حالات۔ اسکی خونخواری، اسکے مظالم اور آدمخوری کی ہولناک داستان۔ آدمخوروں کی شادی غمی وغیرہ کے سچے، دلچسپ مگر لرزہ خیز حالات۔ قیمت عمر۔ دبیز کاغذ۔ لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کی دلچسپ آدمخور کی تصویر۔ عمدہ سرورق، مضبوط جلد۔

دفتر کتابت۔ جودھپور سے خریدیئے!

تربتِ پیرِ ہندی اقبالؒ

(۱)

جبیں میری نگاہیں ہو رہی ہیں
سرود آہیں ہو رہی ہیں
دعائیں پڑھ رہا ہے
عقیدت کا چڑھاوا
غلافِ قبر آہیں ہو رہی ہیں

(۲)

یہاں کس درد آشنا کی قبر پہ ہوں!
کہ محوِ لذتِ دردِ جگر ہوں!
نئے عالم کے نظاروں میں ہوں گم!
الٰہی میں بھی کیا اہلِ نظر ہوں؟

(۳)

لحد میں مردِ مومن سو رہا ہے
نزولِ رحمتِ حق ہو رہا ہے
عقیدت پیرِ ہندی سے ہے کتنی!
کہ جو آتا ہے دل سے رو رہا ہے

(۴)

کھنچا ہے گردِ تربت حلقۂ نور
یہی موسیٰ منش مردوں کا ہے طور
بزرگوں کی زیارت ہو رہی ہے
وہ رومیؒ[۱] ہیں وہ افغانیؒ[۲] و منصور

امین حزیں سیالکوٹی

۱؎ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، ۲؎ مولانا جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ۔

کنایۂ ضمیر پسند

۱

یوں کھلے گلشنِ ملّت میں خوشامد کے پھول ۔۔۔ "خندہ آمادہ" ہو جیسے کوئی دلگیر و ملول
دیکھ کر ان کو بہارِ گزراں روتی ہے ۔۔۔ "زہر خند" آہ خوشامد کی ہنسی ہوتی ہے
فصلِ گل سے نہیں اِن پھولوں کو بالکل سروکار ۔۔۔ یہ تو ہیں گلشنِ ملّت کی خزاں کے آثار
قوم افسردہ دل، ایسے ہی کھلاتی ہے پھول ۔۔۔ مرثیے دورِ خزاں میں ہیں بہاراں کے اُصول
جب تصنّع کی ندامت کا ہٹایا پردہ ۔۔۔ دل گرفتہ نظر آئے یہ خزاں پروردہ
کاش یہ پھول نہ کھلتے چمنِ ملّت میں ۔۔۔ یہ چمن کاش نہ آتا نظر اس صورت میں

۲

آہ کس کس پہ خوشامد کے ہیں کیا کیا اثرات ۔۔۔ فاش کرنا ہی پڑی مجھکو یہاں راز کی بات
ہو اگر "مُردہ ضمیروں" پہ خوشامد کی زد ۔۔۔ شرفِ حج و زیارت کی بھی ہو داد و ستد
زائر اس کو یہ کہے وہ کہے "الحاج" اِسے ۔۔۔ پاس ہے فرطِ خوشامد میں حقیقت کا کِسے
کہیں چھپتا ہی وہ انساں جو خوشامد زدہ ہے ۔۔۔ خود نُما اُس کے تفاخر کا ہر اک شُعبدہ ہے
حاکموں کا بھی یہ دستورِ خوشامد طلبی، ۔۔۔ یہ بہانہ ہے خجل جس سے ہی خود "بے سببی"
یاد مجھکو نہیں اے دوست خوشامد کرنا ۔۔۔ ایسے موقع پہ میں چاہونگا خوشی سے مرنا

۳

مَیں جو لیتا نہیں اَوروں کی خوشامد کا اثر ۔۔۔ علم کا ہے یہ طفیل اور اب وجد کا اثر
نہیں آئینِ خوشامد سے مرا دل آگاہ ۔۔۔ ہیں تصنّع سے بری میرے اصولِ دلخواہ
دُور مجھ سے درِ اعیانِ خوشامد زدہ ہے ۔۔۔ میرے رہنے کیلئے خاص وہ عرفانکدہ ہے
جس میں انسان خوشامد طلب آتا ہی نہیں ۔۔۔ میں خوشامد کی ضرورت کبھی پاتا ہی نہیں
مُلک میں لائقِ تبلیغ عمل میرا ہے ۔۔۔ درِ عرفاں کدہ پر میں نے یہ لکھوایا ہے

کوئی انساں کسی انساں کی خوشامد نہ کرے
جورِ ذلّت نہ سہے خواہ جئے خواہ مرے

علی منظور

حکمِ شعر سازی

(۱)

بجا ہے ناظمِ بزمِ سخن کا حکم بھی لیکن
جو رغبت ہی نہ ہو دل کو تو پھر تعمیل کیوں کر ہو

طبیعت اس قدر ٹھس ہو کہ موزوں ہی نہیں ہوتی
بجا فرمائشِ پیہم مگر تکمیل کیوں کر ہو

(۲)

سخن سنجی بہ فرمائش مرا مسلک نہیں فرحت
دلِ نازک یہ بارِ نامبارک سہ نہیں سکتا

چہکتا ہوں بہ اذنِ طبع مثلِ بلبلِ بے خود
میں پیشہ ور نہیں شاعر میں حکماً کہہ نہیں سکتا

(۳)

طبیعت میں بغاوت جوش کھاتی ہے تو خودداری
سراسر مانعِ اظہارِ محسوسات ہوتی ہے

تخیّل کی غلامی مجھ سے دیکھی ہی نہیں جاتی
سخن فہمی مری، سر پیٹتی ہے اور روتی ہے

(۴)

کسی کے جبر سے مجبور ہو کر بھی کہوں کیوں کر
میں خود مجبور ہو سکتا ہوں، دل آزاد رہتا ہے

میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا بلا ہیجانِ روحانی
مرا فرمائشی گو مائلِ فریاد رہتا ہے

(۵)

یہ سچ ہے شرکتِ "بزمِ سخن" سے عار ہے مجھکو
کہ یہ ناقابلِ برداشت سا اک بار ہے مجھکو

نہ جانے کیوں طبیعت میں تلوّن ہو ہی جاتا ہے
کہ "حکمِ شعر سازی" دعوتِ پیکار ہے مجھکو

(۶)

مری یہ آن ہے وہ آن جس سے لوگ ناخوش ہیں
مگر میں کیا کروں فطرت پہ قابو پا نہیں سکتا

کسی کے نغمۂ شادی سے مجھکو واسطہ فرحت
مرا دل جبکہ روتا ہو تو حکماً گا نہیں سکتا

فرحت کانپوری

آؤ چوری کریں

کشور:۔ (بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں اپنی بیوی سے) آؤ چوری کریں۔

لاجونتی:۔ (چونک کر) کیا کہا؟۔

کشور:۔ یہ کہا، آؤ چوری کریں۔

لاجونتی:۔ میں سمجھی — اب آپ چوری اور سینہ زوری پر اُتر آئے ہیں، یعنی مجھے بتا کر میری کوئی چیز چُرانا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نا یہی بات؟۔

کشور:۔ بھئی کیا سمجھی ہو۔ داد دیتا ہوں تمہاری عقل کی۔ میں چوری کرنے کو کہہ رہا تھا، سینہ زوری نہیں، یہ سینہ زوری کا اضافہ تم نے اپنی طرف سے کیا ہے۔

لاجونتی:۔ یہ اب آپ نے گفتگو کا نیا ڈھنگ سیکھا ہے۔ آؤ چوری کریں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ خود بھی چوری کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے بھی چوری کروانا چاہتے ہیں، تو آپ خود چوری کریں، مجھ سے چوری کرانے کی خواہش یہ ہوئی سینہ زوری، سمجھے؟

کشور:۔ آہستہ بولو، چوری چُھپ چُھپاتے کی جاتی ہے۔ یوں ڈھنڈورا پیٹا نہیں جاتا، ہولے ہولے بات کرو، دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کوئی سُن لیگا تو بڑی بدنامی ہوگی۔

لاجونتی:۔ ہوا کرے، پہلے سے آپ کا کونسا نام ہے جو بدنامی کا ڈر ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ آپ چور ہیں۔ آپ کی اسکولوں کی چوریاں بھی مشہور ہیں۔ کسی کی کتاب، کسی کی پنسل، کسی کا قلم۔ یہ چیزیں آپ دن دہاڑے اُڑا لیا کرتے تھے۔ کرپا رام کا فونٹین پن ایسا ہضم کر گئے کہ ڈکار تک نہ لی۔

کشور:۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

لاجونتی:۔ آپ نے اور کس نے، نرائن صاحب سے باتیں کرتے ہوئے اُس روز کیا آپ نے قبول نہیں کیا تھا کہ دس کتابیں اُڑا کر آپ نے بیچ ڈالی تھیں۔

کشور:۔ کتابوں وغیرہ کی چوری، چوری نہیں ہوتی اور یہ ہے بھی تو اُس زمانے کی بات جب ہم بچے تھے۔

لاجونتی:۔ اور اس عمر میں جبکہ آپ ایک بچے کے باپ ہیں، کیا آپ نے چوریاں نہیں کیں؟

کشور:۔ مثلاً۔

لاجونتی:۔ ابھی کل کی بات ہے کہ بنارسی ساڑھی کی زری تو بیچ کر جو میرے الماری میں رکھی تھی وہ آپ بیچ کر کھا گئے، میرے لئے دوا کے طور پر ڈاکٹر نے جو برانڈی دی تھی آپ چُپکے چُپکے پی گئے اور بوتل میں پانی بھر دیا۔ دس روپے کا نوٹ جو میں اپنے ٹرنک میں رکھ کر بھول گئی تھی آپ نے اُڑا لیا اور اُس پر ستم یہ کہ ایک روپے کے رس گلّے لا کر میرے سر کے اُوپر اُلٹا احسان کیا۔ بجلی کے بل کے روپے آپ ہزار مرتبہ کھا گئے اور مجھے دو دو مہینے کا بل اکٹھا دینا پڑا۔ ایک روز آپ نے پانچ روپے کسی اندھ ودیالہ میں دینے کے لئے مجھ سے لئے اور اُس کی ایک ایک پائی خود ہضم کر گئے۔ پرسوں نعمت خانے سے گاجر کا حلوہ آپ نے نوش جان کر لیا اور چمچے سے ذرا پھیلا دیا، بھئی چور ہو پر کچے چور۔

کشور:۔ بالکل جھوٹ — میں نے گاجر کے حلوے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تمہارے گھر میں مودی خانے کے اندر یہ بڑے بڑے موٹے موٹے سنڈے چوہے جو چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں وہی تمہارا حلوہ کھا گئے ہونگے۔ اور میں حلوہ کھا بھی کیسے سکتا ہوں جبکہ میرا شکر سے پرہیز ہے۔

لاجونتی:۔ میں ثبوت کے بغیر کوئی بات نہیں کہا کرتی۔ آپ کا وہ رومال ابھی تک میلے کپڑوں میں ثبوت کے طور پر موجود ہے جس سے آپ نے حلوا کھا کر اپنے ہاتھ پونچھے تھے۔

کشور:۔ (تھوڑا وقفہ) خیر.... لیکن تم یہ بتاؤ کہ اب چاہتی کیا ہو۔

لاجونتی:۔ اور کچھ نہیں، فقط یہ کہ آدمی چوری کرے تو پکی چوری اور یہ کہ حلوہ خوردن روئے باید۔

کشور:۔ تو خاموش رہو۔

لاجونتی:۔ بہت اچھا۔

(چند لمحات کے لئے خاموشی طاری رہتی ہے۔)

کشور:۔ ("کیا سُنائیں ماجرائے دردِ دل" گنگناتا ہے — پھر دفعتاً جیسے اُسے کچھ یاد آیا ہے کہتا ہے۔) لاجو

لاجونتی:۔ کہو کیا کہتے ہو؟۔

کشور:۔ کہتا ہوں کہ آؤ ایک بڑی مزیدار چوری کریں۔

لاجونتی:۔ ارے کچھ کہو گے یا آؤ چوری کریں کی رٹ لگائے جاؤ گے۔

کشور۔ سنو، ایک پارسل نرائن کا میرے پتے سے آیا ہے، اُسے کھولیں اور صاف ہڑپ کر جائیں۔ کوئی خاص چیز ہوگی جو اُس نے اپنے پتے کے بجائے میرے پتے سے منگائی ہے۔

لاجونتی۔ بھئی ڈر لگتا ہے۔ نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ بعد میں بیکار کا فضیحتہ ہو۔ میں درگذری ایسی چوری کی شرکت سے۔

کشور۔ تم بھی عجب بیوقوف ہو۔ فضیحتہ کیا ہوگا، آخر میں نرائن کو اُلو بنائیں گے اور بات کو ہنسی ہنسی میں اُڑا دینگے۔ وہ اپنا بے تکلف دوست ہے اور یہ کوئی ایسی چوری تھوڑی ہے کہ تھانہ تھنتول ہو۔ لاجونتی تم بڑی ڈرپوک ہو۔ میری بیوی اور ایسے کچے دل کی۔

لاجونتی۔ بھئی جو کچھ ہو، ایک تو یوں چوری چکاری سے میرا دل ہلتا ہے اور وہ بھی اپنے ہم چشموں کی۔ آخر میں نظر ملانا مشکل ہوتی ہے۔ تم تو ہوئے دیدہ دلیر۔ تمہاری تو آنکھوں کا پانی مر گیا۔ نہ بابا مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔

کشور۔ ارے، ایک ننھا منا پارسل ہی تو ہے، کوئی سیر دو سیر سونے چاندی کا پارسل تھوڑا ہی ہے۔

لاجونتی۔ اچھا سنو، اگر کوئی پارسل میں زیادہ قیمت کی چیز ہوئی تو بھئی میں ہاتھ تک نہ لگاؤں گی۔

کشور۔ لو اِسے کھولو۔

لاجونتی۔ پارسل سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی قیمتی چیز ہو۔ پر اُنہوں نے ہمارے پتہ سے کیوں منگایا؟۔

کشور۔ تم اِسے کھولو تو، ابھی سب کچھ معلوم ہوجائیگا — لو یہ اُسترے کا بلیڈ — بس اِدھر سے جھاجھ کاٹ ڈالو۔

لاجونتی۔ بھئی میرے ہاتھ کانپتے ہیں، ابھی وہ آگئے تو ہنسی کی پھبنی ہوجائے گی۔

کشور۔ چلو اب کھول بھی دو، بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔

لاجونتی۔ یہ لو (کپڑا پھٹنے کی آواز) ..... کاغذ ہی کاغذ ہیں ... ... اور یہ ایک بوتل بھی ہے۔

کشور۔ ؎
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
یہ تو فقط ایک لفافہ ہے۔

لاجونتی۔ سچ، یہ تو لفافہ ہی نکلا ... پر اب بھی میرے دل میں ہول ہوتا ہے، نہ معلوم اس میں کیا ہو، .... سیندور سے اَٹا ہوا ہے۔

کشور۔ ذرا اِدھر دو نا، دیکھوں اس میں کیا ہے۔ (لفافہ کھولنے کی آواز، کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ) ایک صفحہ کا خط ہے، سوامی ... ہاں، سوامی رام پرکاش جی ہردوار والے نے بھیجا ہے۔

لاجونتی۔ سوامی رام پرکاش ہردوار والے؟ (اشتیاق سے) اور اس میں کیا لکھا ہے؟

کشور۔ پڑھ کے سناتا ہوں ....

لاجونتی۔ تو پڑھو، پڑھتے کیوں نہیں۔

کشور۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اُس کے کسی دوست کا خط ہے اور اس بوتل میں سر کے گنج کیلئے تیل ہے۔

لاجونتی۔ میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتی ہوں (خط پر جھپٹنے کی آواز) — اڑا لیا نا — خبردار جو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ اب میں آپ کو پڑھ کے سناتی ہوں۔ (پڑھتی ہے) "ڈیر مسٹر نرائن — آپ کا خط مجھے مل گیا تھا اور روپے بھی، مجھے افسوس ہے کہ آپ کی مطلوبہ شے میں فوراً نہ بھیج سکا۔ اس لئے کہ نوچندی کے اتوار میں کچھ دن باقی تھے، اب میں آپ کو ایک موہنی منتر بھیج رہا ہوں" .... ہوں .... موہنی منتر .... اچھا ......

کشور۔ لاجونتی، تمہیں کسی کا پرائیویٹ خط پڑھنے کا کیا حق حاصل ہے؟

لاجونتی۔ چپ رہو جی .... مجھے پڑھنے دو .... لکھا ہے ..... یہ منتر اماوس کی رات کو ایک سو آٹھ مرتبہ پڑھ کر جس کو اپنا گرویدہ اور تابعدار بنانا ہو پھونکا جائے۔ یا واجی کا چمتکار آپ کو معلوم ہوجائے گا۔ اس کو سنبھال کر اپنے پاس رکھئے، بڑی نایاب چیز ہے اور بوتل میں جو تیل ہے یہ بالوں میں ہر روز لگانے کے لئے ہے، اس سے تمام مرادیں پوری ہوجائینگی .... منتر یہ ہے .....

کشور۔ لو اب خط دیدو، سب کچھ تو پڑھ لیا۔

لاجونتی۔ ابھی چار سطریں باقی ہیں .... منتر یہ ہے ..... اونگ نما کا مشیری مدھ مدیش اوتما دے بھرینگ پراسواہا .... اور آپ نے جو کسی کشور صاحب کیلئے منتر مانگا ہے وہ دس پندرہ روز تک آپ کو مل جائیگا۔

کشور۔ لاجونتی، اب مذاق حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، لاؤ خط میرے حوالے کرو۔ یہ منتر و نتر سب بکواس ہے۔ پارسل میں نے خود تمہیں اور نرائن کو بنانے کیلئے پوسٹ کیا تھا۔

لاجونتی۔ کہاں سے؟ ... کپڑے پر مُہر دلی کی لگی ہوئی ہے اور آپ پارسل پوسٹ کرنے دہلی شاید خواب میں گئے ہونگے، کیوں؟ — اجی میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو آپ اور نرائن صاحب کی چوری پکڑی گئی .... بھئی کیا لطیفہ ہوا ہے، یعنی آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا

بھانڈا پھوڑ دیا۔

کشور۔ دیکھو لاج، میں سچ کہتا ہوں، بھیجنے والے کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے، نرائن کو بھلا ایسے منتروں کی کیا ضرورت، کچھ بھی ہو لیکن میرے متعلق...

لاجونتی۔ آپ کے متعلق کیا؟

کشور۔ یہ جو لکھا گیا ہے کہ میں نے منتر مانگا ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ اس کا اوّل جھوٹ، اس کا آخر جھوٹ، یعنی سر سے پیر تک جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

کشور۔ نرائن آیا ہے.... دیکھو لاج، پرماتما کے لئے یہ ساری باتیں اپنے دل تک ہی رکھنا.... تم نہیں جانتی ہو کہ یہ معاملہ کتنا سنگین ہے.... لاؤ ادھر خط مجھے دیدو۔

لاجونتی۔ خط میں ابھی نہیں دوں گی پر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ نرائن صاحب سے اس کا ذکر تک نہ کرونگی۔

کشور۔ قسم کھاؤ۔

لاجونتی۔ لو اب اتنی سی بات پر مجھے قسمیں کھلوانے لگے۔ کہہ جو دیا کہ نہیں کہونگی۔ اگر نرائن صاحب سے میں نے اس خط کا ذکر کیا تو جو چور کی سزا وہ میری، لو بس اب تو اعتبار آگیا۔

کشور۔ پر تم خط واپس کیوں نہیں دے دیتیں... میں... میں... آئیے مسز نرائن.... نمسکار، نمسکار.... تشریف رکھیے... میں، میں.... میں کیا کہہ رہا تھا لاجونتی؟

لاجونتی۔ کہ مسز نرائن بڑی روشن خیال خاتون ہیں جو جادو ٹونے، منتر جنتر کو بالکل فضول سمجھتی ہیں۔

مسز نرائن۔ کشور صاحب، یہ آپ سے کس نے کہا، میرا تو ان چیزوں پر بڑا اعتقاد ہے، کیوں بہن لاجونتی؟

کشور۔ میں نے کس سے سنا تھا؟ ہاں... میں... نرائن... نہیں.... لاجونتی کس نے کہا تھا کہ انہیں ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسز نرائن۔ (کشور سے) آپ کی طبیعت آج خراب معلوم ہوتی ہے؟

کشور۔ میری؟.... نہیں تو.... مگر.... مگر.... شاید آپنے لاجونتی سے پوچھا ہے، اسکی طبیعت واقعی کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں۔

لاجونتی۔ میری؟.... کیوں میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپکو کیسے معلوم ہوا کہ میری طبیعت خراب ہے۔

کشور۔ (چونک کر) کیا کہا؟.... جی ہاں میری طبیعت اسوقت کچھ خراب ہے۔

لاجونتی۔ تو آپ.....

کشور۔ (جلدی سے) لیکن اتنی خراب نہیں کہ میں آپکے پاس بیٹھ نہ سکوں بلکہ یہاں آپس میں باتیں کرنے سے طبیعت فوراً ٹھیک ہوجائیگی۔

لاجونتی۔ بڑے شوق سے بیٹھئے، پر آپ کو ٹونے ٹوٹکوں اور منتر جنتروں کی باتوں میں حصہ لینا پڑیگا۔

کشور۔ ٹونے منتر......

(نرائن کھانستا ہوا آتا ہے)

نرائن۔ بھئی ہماری بھابی نے کیا دماغ پایا ہے، میں جب کبھی آیا انہیں کسی نہ کسی دلچسپ موضوع پر بات کرتے پایا ہے.... آج ٹونے منتروں کی بحث شروع ہے.... اوہو.... ہماری "یہ" بھی تشریف رکھتی ہیں؟ ... کہیئے بھابی جان، آپ کے بلانے پر یہ آئیں کہ خود بخود تکلیف گوارا کی.... ارے.... تم کیوں گم سم بنے بیٹھے ہو کشور؟.... طبیعت خراب ہے کیا؟

لاجونتی۔ جی ہاں، اور میں نے ان سے ابھی ابھی کہا تھا کہ جائیے دوسرے کمرے میں آرام سے سوجائیے۔

نرائن۔ تو یہ جاتا کیوں نہیں؟

کشور۔ ارے بھئی معمولی سا سر میں درد ہے، ابھی باتوں باتوں میں چلا جائے گا۔

لاجونتی۔ درد سر کے لئے بھی تو کوئی منتر یا ٹونہ وغیرہ ہوتا ہوگا، کیوں بہن ساوتری؟

مسز نرائن۔ لاکھوں... ایک سے ایک اچھے۔

نرائن۔ (کشور سے) تو یہ سناؤ تمہارے سر میں درد کیسے شروع ہوگیا۔ قبض کی شکایت تو نہیں ہے؟

کشور۔ اور تو کچھ نہیں پر ابھی ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پیشتر میرے دماغ کو قبض ہوگیا ہے.... بیٹھے بیٹھے ہی کچھ ہوگیا ہے۔ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔

نرائن۔ کبھی کبھی ایسا ہوجایا کرتا ہے.... تو ہاں، بھئی، مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی (ہولے ہولے) میرا ایک پارسل تمہارے....

لاجونتی۔ ساڑھی کا پلہ بہت ہی نفیس ہے۔ تلّے کا کام بہت اچھا کیا ہے.... (ذرا اونچی آواز میں) سوامی رام پرکاش ہردوار والے کافی مشہور آدمی ہیں۔

کشور۔ (ایکا ایکی) لاجونتی!

نرائن۔ رام پرکاش جی؟؟

لاجونتی۔ جی، کچھ آپنے مجھ سے کہا!

کشور۔ نہیں، میں اس سے بات کر رہا ہوں۔

لاجونتی:۔ (مسز نرائن سے) زری کا کام رام پرکاش ہردوار والے خوب کرتے ہیں۔ مَیں اُن سے دو ساڑھیوں پر کام کرا چکی ہوں۔

مسز نرائن:۔ یہ تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔ کون ہیں یہ سوامی رام پرکاش جی ہردوار والے؟

نرائن:۔ (چونک کر) کچھ مجھ سے پوچھا تم نے؟

مسز نرائن:۔ نہیں تو.... پر مَیں پوچھتی ہوں آج بات کیا ہے..... یہاں سب بہکے بہکے کیوں نظر آتے ہیں؟ — لاجونتی بات مجھ سے کرتی ہے اور بیچ میں کشور صاحب ٹپک پڑتے ہیں، مَیں لاجونتی سے کچھ کہتی ہوں اور خواہ مخواہ آپ چونک اُٹھتے ہیں — آخر بات کیا ہے؟

نرائن:۔ (گھبرا کر) بات کیا ہوگی؟ — بات کیا ہو سکتی ہے؟

مسز نرائن:۔ پر آپ پریشان کیوں ہوئے جاتے ہیں؟

نرائن:۔ پریشان؟..... (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے) یہ پریشانی کی بھی ایک ہی کہی..... یعنی زبردستی مجھے پریشان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے..... سُنا کشور تم نے؟

کشور:۔ بھئی مجھے کچھ معلوم نہیں..... تم جانو اور یہ جانیں..... مجھے لڑنے ٹوکنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نرائن:۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے ہے..... بھئی اپنے سر کی بلا ٹالنے کے لئے یہ اچھا گُر گڑھ لیا ہے تم نے؟

کشور:۔ اپنے سر کی بلا؟.... گویا میرے سر پر کوئی بلا ہے"..... سو وہ تم ہی ایسی بلائیں پالتے ہو، لاجونتی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ..... (دبی آواز میں) ارے یہ دونوں آپس میں کیا کھُسر پھُسر کر رہی ہیں؟

لاجونتی:۔ (مسز نرائن سے، ہولے ہولے) ناہن مجھے کچھ معلوم نہیں.....

مسز نرائن:۔ (دبی آواز میں) ایک پارسل آئے گا.... میں نے اُس پتے سے منگایا ہے؟

لاجونتی:۔ (اونچی آواز میں) پارسل؟

کشور:۔ پارسل؟

نرائن:۔ کونسا پارسل؟

مسز نرائن:۔ پارسل؟..... یہی تو مَیں پوچھتی ہوں، کونسا پارسل؟... کیا آپ کا پارسل آ رہا ہے کوئی؟

نرائن:۔ نہیں تو..... میرا پارسل اس پتے سے کیوں آنے لگا؟... کیوں بھابی جان، اس سے پہلے میرا کوئی پارسل اس پتے سے آیا ہے؟

لاجونتی:۔ اس سے پہلے، کوئی نہیں آیا — اس کی گواہی میں دے سکتی ہوں —!

نرائن:۔ لو اب تو آپ کو یقین آ گیا..... (ایکا ایکی چونک کر) اس سے پہلے؟.... اس سے آپکا کیا مطلب؟... یعنی میرا کوئی پارسل آجکل میں اس پتے سے آچکا ہے؟

لاجونتی:۔ آپ اپنے دوست سے پوچھ لیں، پارسل وغیرہ وہی وصول کیا کرتے ہیں!

مسز نرائن:۔ (گھبرا کر) کیا کہا؟.... پارسل وغیرہ کیا یہی وصول کیا کرتے ہیں؟

لاجونتی:۔ آج انہوں نے ہی وصول کیا تھا۔

نرائن:۔ کس کے نام کا تھا۔

مسز نرائن:۔ کس کا تھا؟... میرا تو ہو نہیں سکتا۔

لاجونتی:۔ اور کیا میرا ہو سکتا ہے؟

کشور:۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

لاجونتی:۔ پھر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ پارسل کس کے نام کا تھا۔

کشور:۔ کھولا تمہیں نے ہے، مجھے کیا معلوم؟

لاجونتی:۔ کھولا میں نے ہے اور بوکھلائی بوکھلائی باتیں آپ کر رہے ہیں۔

نرائن:۔ (گھبرا کر) یا... پارسل کھول بھی لیا... یہ دیکھے... یہ دیکھے بغیر کھول لیا کہ وہ کس کے نام کا تھا۔

مسز نرائن:۔ حد ہو گئی ہے — ایک گھنٹہ ہونے کو آیا ہے، سب پارسل پارسل پکار رہے ہیں، پر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ پارسل کس کا تھا.....

لاجونتی:۔ مَیں کچھ نہیں جانتی بابا — بس میری خطا صرف یہ ہے کہ مَیں نے اِنکے کہنے پر پارسل کو چاقو سے کھولا اور جو کچھ اُس میں سے نکلا اِنکے حوالے کر دیا.... اور میں نے اِن سے کہا تھا کہ بھئی ڈر لگتا ہے، نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو، بعد میں بیکار کا فضیحتہ ہو، پر اِن پر تو چوری کرنے کا بھوت سوار تھا۔

نرائن:۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) لو بھئی مَیں چلا..... مجھے ایک ضروری کام ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہاں کتنی دیر ہو گئی۔

کشور:۔ تم ہرگز نہیں جا سکتے..... یہاں بیٹھکر تمہیں میری پوزیشن صاف کرنا ہو گی۔ بھئی واہ، یہ بھی خوب طریقہ ہے کہ یوں چپکے سے کھسک گئے اور دوسروں کو آگ میں جھونک دیا — بھُس میں چنگی ڈال بی جمالو دُور کھڑی ہوئیں۔

مسز نرائن:۔ میرے سر میں تو درد شروع ہو گیا ہے... مَیں جاتی ہوں لاجونتی بہن، پھر شام کو آؤں گی۔

لاجونتی:۔ ذرا تھوڑی دیر تو بیٹھو، اپنے پتی کی پوری کارستانی تو معلوم

کرتی جاؤ.... لو یہ خط پڑھو۔ (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)... تمہارے سوامی نے تمہیں مطیع کرنے کے لئے ایک منتر منگایا ہے اور جادو کے تیل کی بوتل ـــ اب تم دن رات اِن پر لٹو رہو گی۔ اِن ہی کے اشارے پر ناچا کرو گی۔

نرائن۔ یہ... یہ بالکل جھوٹ ہے، لینی، لینی... بالکل جھوٹ... بھلا میں کیوں ایسے منتر اور تیل منگانے لگا... میری اور اِس کی آپس میں کیا بنتی نہیں جو میں ٹونے ٹوٹکے استعمال کروں.... اِنکی ضرورت ہو گی کشور کو جس کی آئے دن آپ سے پخ رہتی ہے... کیوں ساوتری؟... لینی لینی،... ہم تو آپس میں شیر و شکر ہو کے رہتے ہیں... ہماری زندگی تو دوسروں کیلئے ایک نمونہ ہے۔

کشور۔ تم خود ایک نمونہ ہو.... ابھی ساری حقیقت کھل جاتی ہے.... لاجونتی ذرا دینا اِن کے ہاتھ میں وہ خط... پڑھکر ساوتری کو سنائیں جن کے ساتھ یہ شیر و شکر ہو کے رہتے ہیں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے نمونہ بناتے ہیں اور وہ یوں کہ اپنے ایک دوست کو پھنسانے کے لئے اُس کے پتے سے ٹونے منتر منگاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ کرپا کرتے ہیں کہ اُس کے لئے بھی ایک دو منتروں کا آرڈر دے دیتے ہیں ـــ بھئی واقعی بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے دوستی کا؟..... وہ تو لاجونتی عقلمند ہے ورنہ آج تو وہ چچ چلتی کہ توبہ توبہ.... میاں کا چیچھالیدر کر دیتی۔

لاجونتی۔ یہ لیجئے خط... (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)... لو اب سنو ساوتری!

مسز نرائن۔ سن کے کیا کرو گی؟ ـــ انکی ساری قلعی تو کھل گئی۔

نرائن۔ (ایکا ایکی، بلند آواز میں) کون کہتا ہے یہ خط میرے نام ہے....

مسز نرائن۔ پھر کس کے نام ہے؟

نرائن۔ تمہارے.... لو دیکھو (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)... میری قلعی کھلتے کھلتے تمہاری قلعی کھل گئی۔ رنگ ہلدی ایسا زرد پڑ گیا۔ یہ منتر اور تیل تمہیں نے تو منگایا ہے.... پر اس کی ضرورت ہی کیا تھی... میں تو پہلے ہی سے تمہارا محکوم ہوں پر معلوم ہوتا ہے کہ جتنا تابعدار اور تمہارا مرید میں اس وقت ہوں اُس سے بھی زیادہ تم مجھے اپنا تابعدار اور مرید بنانا چاہتی ہو ـــ پرماتما تم جیسی عورتوں سے بچھے۔ ... لو پڑھو.... دیکھو.... ڈیر مسز نرائن.... اور یہ منتر... میری رہی سہی مردانگی کو ختم کرنے کا منتر.... اور یہ تیل جس کو بالوں میں لگانے سے تمہاری سب مرادیں پوری ہو جائیں گی.... اب آپ نے کیوں منہ میں گھنگنیاں بھر لیں، بھابی جان اب آپ کیوں چپ ہو گئیں.... اس میں آپ کا بھی تو ذکر ہے.... آپ نے بھی تو اپنے پتی کو اپنے پر لٹو بنانے کے لئے منتر منگوایا ہے اور شاید جادو کا کوئی چورن بھی جس کو کھاتے ہی یہ ہمیشہ کے لئے الو بن جاتے.... کشور دیکھا، یہ ہماری چوری پکڑاتی تھیں اور اُلٹی اِن کی چوری پکڑی گئی، اسے کہتے ہیں سچائی کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا ـــ تم یقین مانو، اِن دونوں نے مل کر یہ سازش کی تھی، اور تم بھی کتنے بیوقوف ہو کہ گھبراہٹ میں مسز کھسٹر پڑھ گئے.... تم سے یہ بھی نہ کہا گیا کہ مرد ٹونے ٹوٹکوں اور منتر جنتروں کو بالکل بے کار سمجھتے ہیں، وہ عورتیں ہی ہیں جو ایسی فضول چیزوں پر اعتقاد رکھتی ہیں.... منتر.... ہوں.... اور سوامی رام پرکاش... اُس کی ایسی کی تیسی۔

(نوکر کھانستا ہوا آتا ہے)

نوکر۔ نرائن صاحب آپ کے نام ایک پارسل آیا ہے۔ باہر ڈاکیہ لئے کھڑا ہے وصول کر لیجئے۔

نرائن۔ (بوکھلا کر) پارسل... پارسل... کیسا پارسل؟

نوکر۔ کوئی سوامی رام پرکاش ہردوار والے ہیں جنہوں نے دہلی سے بھیجا ہے۔

نرائن۔ ضرور.... ضرور.... کوئی غلطی ہوئی ہے.... میں ابھی آتا ہوں.... ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے.... میں سچ کہتا ہوں ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے (کرسی سے ٹکرا کر گرنے کی آواز).....

سعادت حسن منٹو

ہیملٹ

شہرۂ آفاق شیکسپیئر کا سب سے مشہور ڈرامہ "ہیملٹ شہزادہ ڈنمارک" کا ترجمہ مولانا عنایت اللہ دہلوی نے ایسی قادر الکلامی سے کیا ہے کہ اُردو میں ایک غیر فانی کتاب کا اضافہ ہو گیا۔ اُردو میں لفظی پابندی کے ساتھ آج تک شیکسپیئر کے کسی ڈراموں کا ترجمہ کسی سے نہیں ہو سکا۔ مولانا عنایت اللہ صاحب کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے اِس عظیم الشان ڈرامے کو اُردو میں نہایت عمدگی سے منتقل کر دیا لکھائی چھپائی عمدہ۔ ٹائٹل رنگین۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی

ترلوکی پنڈت

ترلوکی پنڈت انقلابات کا مجسم نمونہ تھے۔ بچپن میں راجہ بختاور والی حویلی میں رہے۔ جوانی عیش میں گذری۔ شیش محل کی پریوں کے ساتھ ناچے۔ دولت لٹائی۔ نشہ اترا تو کانگریس کے کارکن قوم کے لیڈر بنے۔ جیل کی ہوا کھائی۔ پھر جو رنگ بدلا تو گاندھی جی کی جیب سے نکل کر ہندو سبھا کی گود میں اور وہاں سے جو اُچھلے تو حکومت کے قدموں میں آ پڑے۔ آخر سرکار پرستوں میں نام لکھوا لیا۔ پڑھے لکھے تو کچھ یونہی سے تھے، مگر زبان خوب چلتی تھی۔ کانگریس میں رہ کر اور بھی ذہن براق ہو گیا۔ کچھ دن رنگ اچھا جما۔ تھوڑے بہت پیسے بھی کما لئے۔ پھر خود بخود اس زندگی سے نفرت سی ہو گئی اور خانہ نشیں ہو گئے۔ خانہ نشیں ہونے سے میرا یہ مطلب ہے کہ دُنیا سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہے ورنہ غریب کا کوئی گھر رہا تھا نہ گھر والے۔ کبڑی پیپل کے سامنے جھوت والی گلی میں ایک زمین دوز دُکان کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اسی میں رات دن پڑے رہتے تھے۔

بارہ برس کی عُمر سے شراب کا چسکا تھا۔ مدتوں اکشا ہی پی۔ سودیشی کا چرچا ہوا تو ٹھرّے پر اُتر آئے۔ پھر جب ذرا ہاتھ تنگ ہوا تو افیون کھانے لگے۔ ہم نے جب دیکھا افیم گھولتے اور حقہ کا دُھواں اُڑاتے دیکھا۔ کبھی کبھی کوئی جوگی فقیر آ جاتا تو چرس کی چلم بھی چلنے لگتی تھی۔ ورنہ عموماً اکیلے ہی بیٹھے پینگ میں جھونلے کھایا کرتے تھے۔ قریب ہی دو تین منہیاروں کے گھر تھے۔ ان کی بلیاں آ کر اکثر ستایا کرتی تھیں۔ کبھی روٹی نکال لے جاتیں۔ کبھی دودھ پی جاتیں۔ ترلوکی پنڈت بہتیری دوت دپک کرتے بگر وہ کب مانتی تھیں۔ بیچارے کا روز دو چار پیسے کا نقصان کر جاتیں۔ اوّل تو افیمی کا غصّہ ہی کیا۔ اِدھر مزاج میں تیزی ہوئی اُدھر سر جُھکنا اور آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ دوسرے گوشت کے مُچھّے کھانے والے بلاؤ۔ انتہا درجے کے خرانٹ، ذرا چھیڑا اور ٹینٹوے پر آئے۔ پھر پڑوسیوں سے لڑائی کون مول لے۔ کیسا ہی نقصان ہوتا، دو چار کوسنے دس پانچ گالیاں دے کر بیٹھ رہتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت جی صبح سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاید شاہ بڑے کی طرف نکل گئے ہونگے یا کہیں اور نشہ پانی کی دعوت ہوگی۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے واپس آئے۔ روہو کا ایک پٹھا رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ اُسے کھولا، بنایا، آگ سُلگائی، ہنڈیا چڑھا کر آٹا گوندھا۔ مچھلی تیار ہو گئی تو توا چڑھا کر روٹیاں پکائیں اور ایک کنستر میں رکھ کر پاس کنوئیں پر نہائے۔ افیون گھولی، چُسکی لگائی۔ حقہ بھرا اور آسن لگا گدی پر بیٹھ گئے۔ اب پنڈت جی راجہ تھے، دُنیا اُن کے سامنے بھان متی کا تماشہ تھی۔ آنکھیں کبھی بند ہو جاتی تھیں کبھی اُونگھ کا جھٹکا کھا کر کھل جاتی تھیں۔ دماغ میں عرش معلیٰ سے بھی اُدھر کی خبریں آ رہی تھیں۔ پہلو کے طاق پر مٹی کا ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما کر بیسیوں قسم کی پرچھائیاں دکھا رہا تھا۔ کہیں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ کسی طرف لاٹھی چارج ہو رہا تھا اور کسی جگہ مادر وطن پر خون کی بھینٹ چڑھانے والوں کی جوتیوں کے ڈھیر تھے کہ کوٹھڑی میں کوئی چیز دھڑ سے گری۔ پنڈت جی چونک پڑے کہ توپ کا گولا پڑا۔ پھر آواز آئی "میاؤں"!

آنکھیں جو کھولتے ہیں تو ان کا پُرانا دُشمن کالا بلا دودھ پر پلا ہوا ہے۔ دُھن جو بندھی تو سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی گاندھی جی کا مسلمان چیلا ہے۔ میری افیون کی تھیلی چھیننے آیا ہے۔ سنبھلکر ذرا کرارے پن سے بولے کہ "جناب مولانا اس روپ میں آنے سے کیا فائدہ؟ وقت پر آدمی بن کے آؤ گے تو ایک پیالی تمہارے حصّہ کی بھی پیش کر دوں گا۔" جواب میں پھر "میاؤں" سُنا۔ گردن اُٹھائی، دیکھا تو واقعی پڑوس کا بلا تھا۔ خیال آیا کہ میں تو چاندنی چوک میں ایک دُکان کے تخت کے نیچے پڑا ہوا نہتوں کا ہتھیاروں سے مقابلہ دیکھتا رہا اور یہ غنڈا میرا دودھ پی گیا۔ ہے شرط کہ میں بھی اس کا خون پیوں۔ اتنے میں اندر سے غرفش کی آہستہ آہستہ مختلف آوازیں آنے لگیں۔ پنڈت جی اپنی پینگ میں سمجھے کہ بلا کہہ رہا ہے کہ "ہاں! تمہارا دودھ تو میں سب پی گیا اب کہو کیا کہتے ہو۔ ذرا بولے اور میں نے گلا دبایا۔ میرے کئی حمایتی بھی میرے ساتھ ہیں۔"

ترلوکی پنڈت نازک مزاج، نشے باز اور دھرم کے پکے ضرور تھے مگر تھے سمجھدار۔ طبیعت انصاف پسند تھی اس لئے نہ کانگریس والوں سے بنی نہ گورنمنٹ کے طفیلیوں میں رہ سکے۔ دیر تک سوچتے رہے کہ کیا جواب دیں۔ دودھ نہ اُن کا تھا نہ ان کے باپ کا۔ دودھ تھا خدا کی پیدا کی ہوئی اور ہندوستان کے چارے سے پلی ہوئی گائے کا۔ اس پر جس قدر حق پنڈت جی کا تھا اسی قدر اس بلے کا بھی۔ دل میں قائل تھے، مگر انسان ہمیشہ سے اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ دیکھی

مخلوق کے مقابلے میں تو خیر، اپنے ہمجنسوں سے بھی رات دن اس کے یہی فساد رہتے ہیں۔ پھر قدیم سے یہ بھی رسم چلی آتی ہے کہ کتا روٹی لے جائے۔ گائے مُنہ ڈال دے۔ بندر برابری کا دعویٰ کرے۔ بلّی دودھ پی لے تو گالیاں، ڈنڈا۔ لٹھ کسی نہ کسی چیز سے ضرور مقابلہ کرنا چاہیئے۔ حقوق کا سوال۔ خاموش رہیں تو اشرف المخلوقات کون کہے۔ انسانی برادری میں نکّو بن جائیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ارذل تریں مخلوق اپنی قوم میں ایک آریا ورتی سُورما کی بزدلی کا چرچا نہ کردے۔ اس لئے تاؤ آہی گیا۔ اور ہاتھ سے ناریل رکھکر دست پناہ، اُٹھا بلّی کی طرف لپکے۔

بلّی کی ذات اس میں بھی بلّا۔ ایک کاشو پنڈت چُنیا بیگم کے مُریدکی اینٹھ اکڑ خوب جانتا تھا وہ ایسی گیدڑ بھبکیوں میں کیا آتا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ انگڑائی لی اور "میاؤں" کہتا ہوا ایک کونے سے ہٹ کر دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ ترلوکی پنڈت کا تشد جما ہوا تھا۔ مکّھی ہاتھی نظر آرہا تھا اور بلّے کی آواز میں "سوراج زندہ باد" کا نعرہ سُن رہے تھے۔ غصّہ کو تھوک دیا۔ دستپناہ پھینک ناریل اُٹھا اپنے آسن پر آبیٹھے۔ اب انہیں بلّے کی خُرخُر میں مہاتما بدھ کے لیکچروں کا مزہ آنے لگا۔ گویا بلّا کہہ رہا تھا کہ "پنڈت جی مہاراج! مُلک کے سیوک بننے کا دعویٰ اور ایسا غصّہ۔ اپنے مزے میں ذرا سی کھنڈت برداشت نہ ہوئی۔ آپے سے باہر ہو کر مار پیٹ پر آمادہ ہو گئے۔ آج دستپناہ اُٹھایا ہے کل چُھرا نکال لوگے۔ حقّہ پیو، تمباکو جل گیا ہے تو اور بھر لو، اور ذرا شانتی سے بیٹھ کر غور کرو کہ کیا پرماتما کا پیار صرف تمہارے ہی ساتھ ہے۔ اس اکے ناٹک میں اکیلے تم ہی ایکٹر ہو۔ دُنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لئے ہیں۔ ہمارا ان پر کوئی حق نہیں۔ اس لئے کہ تم انسان ہو۔ صورت و شکل، عادات و خصائل میں ضرور فرق ہو لیکن خدا کے کارخانہ میں ہمارا تمہارا ایک درجہ ہے۔ ایک مسالہ۔ ایک کاریگر۔ اب یہ ہماری مسکینی اور تمہاری سرشوری تھی کہ تم اپنی زبان زوری سے آقا بن گئے اور ہم میاؤں میاؤں کرتے رہے۔ پھر بھی ایسی بے انصافی کو تو روا نہ رکھو کہ آپ کھاؤ اور ہمیں نہ دو۔ مانگیں تو سونٹا لیکر دوڑو۔ جان تمہاری بھی ہماری بھی۔ بھوک پیاس تمہیں ہی لگتی ہے ہمیں نہیں لگتی۔ ہزاروں چیزیں تم ایسی کھاتے پیتے ہو جن کی طرف ہم آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دودھ، دہی، مکھن، ملائی، گوشت وغیرہ تھوڑی سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے کھانے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے۔ تو آپ ہمارے کھانے پینے سے کیوں جلتے ہیں اور کس قانون سے ہم پر یہ تشدّد روا رکھتے ہیں۔

یہ انسان کی پیدائشی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتا۔ اپنی برتری کے افسانے گھڑ لئے ہیں۔ اپنا من مانا قانون بنا لیا ہے۔ سچ کہنا اگر یہی دودھ کوئی تلک دھاری پنڈت، کوئی انگریزی مولنا یا کوئی سماجی لیڈر پی جاتا تو کیا اُس پر بھی یونہی دستپناہ لیکر دوڑتے؟ اِن کی اس بے تکلفی کا تم اُلٹا احسان مانتے۔ وہ تمہارے نزدیک معزز ہیں۔ لیکن اُن کو کیا ہم سے زیادہ بھوک لگتی ہے؟ مہاراج تم کیا کرو تمہاری سوسائٹی کا دستور ہی یہ ہو گیا ہے کہ پیٹ بھروں کو کھلاتے ہو۔ اپنے سے زیادہ طاقت کو ڈنڈوت کرتے ہو۔ اور جو بھوک سے پریشان ہو کر بے بلائے آجاتے ہیں اُنہیں چور کہتے ہو اور بس چلتا ہے تو لاٹھی پونگے سے بھی گُریز نہیں کرتے۔

یہ سچ ہے کہ چوری کرنا گُناہ ہے۔ چور کی عزّت نہیں۔ مگر اوّل تو دودھ پی جانا چوری نہیں۔ قدرتی پیداوار میں ہم تم سب برابر کے حصّہ دار ہیں۔ دوسرے ہم بِلّے اگر تمہارے چور ہیں تو تم ہماری بہن گائے کے چور ہو۔ پھر چوری کون کرتا ہے۔ وہی جس کو کھانے کو نہیں ملتا۔ جو اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ دُنیا میں جتنے بڑے پیٹ والے انسانیت کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے ہیں یہ مایا کا جال انہی کا بچھایا ہوا ہے۔ یہی دراصل چور گر ہیں۔ یہ اگر اپنا رویّہ بدل ڈالیں اور غریبوں کیساتھ سلوک کرنے لگیں تو کوئی چور رہے نہ ڈاکو۔

ہمیں دیکھو اِس گھر سے اُس گھر اندھیرے اُجالے میاؤں میاؤں کرتے پھرتے ہیں۔ کسی کی پتیلی میں مُنہ ڈال دینا یا کسی کے کبوتر کو لے بھاگنا یا جیسے تمہارا دودھ چٹ کر لیا۔ اس طرح کسی کی کھیر کسی کے لڈو کھا جانا تو اور بات ہے ورنہ آپ ہی بتائیے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنی خوشی سے روٹی کا ٹکڑا بھی ہمارے آگے ڈالتا ہے۔ کتّوں کو گھی چپڑ کر روٹیاں دیتے ہیں۔ سانپوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ چوہوں کو کھیلیں کھلاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے بلوں کو مَیدے اور شکر سے بھرتے ہیں مگر نہیں دیتے تو ہماری قوم کو، اِس لئے کہ ہم بے ضرر ہیں اور ہمیشہ میاؤں میاؤں کرکے مُنہ تکا کرتے ہیں۔ آواگون کے چکّر میں بھی شاید ہمارا شمار نہیں ہے۔ کیا تمہارا کوئی مرا جیتا کبھی بلّی کی جون نہیں لیتا۔ جو ہم سے اتنے بیزار ہو۔ اپنے آگے کی جھوٹن نالیوں میں پھینک دیتے ہو اور ہم کو بُلا کر نہیں دیتے۔

ہاں اگر اپنی ڈھٹائی سے کوئی بلّا تمہارے ہاں پل جاتا ہے تو اس کے مزے ہی مزے ہیں، ایسا موٹا تازہ چکنا چپڑا ہو جاتا ہے جیسے کسی قومی اکھاڑے کا پہلوان یا کسی بوڑھے سرمایہ دار کی جوان بیوی کا بھائی۔ یا کسی یتیم خانہ کا منیجر یا کوئی بہروپیا مولوی۔ مسلمانوں کے بچّوں کو

البتہ ہمارے بچوں کا شوق ہوتا ہے۔ مگر ناعاقبت اندیش قوم کا شوق بھی مُصیبت ہوتا ہے۔ شوق کا کوئی معیار نہیں۔ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ پیار کرتے کرتے، گودیوں میں بٹھاتے بٹھاتے ذرا مزاج بگڑا اور بوری میں بند کر جنگل میں چھوڑ آئے۔"

پنڈت جی ذرا کھسائے اور نشے میں گُھٹی ہوئی آنکھیں ٹمٹما کر بڑی متانت سے بولے "مگر چوری تو بہت بڑا اخلاقی جُرم ہے۔ فاقوں سے مرجانا اچھا اور چوری کرنا بُرا۔"

اتنا کہنے پائے تھے کہ بلا ایک چوہے پر جھپٹا۔ کھڑبڑ جو ہوئی تو آپ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پھر وہی سماں سامنے تھا۔ بلا کسی قدر ترش رو ہو کر بولا "چوری کو اچھا کون کہتا ہے۔ لیکن ہماری چوری کا گُناہ تمہاری گردن پر ہے۔ جب کوئی کھانے بیٹھتا ہے یا اس کے ہاں کوئی فالتو کھانے کی چیز ہوتی ہے تو پہلے ہم صورت سوال بن کر جاتے ہیں "میاؤں میاؤں" یعنی میں آؤں کہہ کر اُس سے اپنی بھوک کا اظہار کرتے ہیں اور طرح طرح کی حرکتیں کر کے کھانے کو مانگتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ اگر تم نے بخل کیا یا ہمارا حق ہم کو نہیں دیا تو ہم چوری کریں گے۔ پھر جب تمہاری بیدردجنس ہماری حالت پر رحم نہیں کرتی بلکہ دھتکار دیتی ہے تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ چوری کریں۔ عجیب منطق ہے کہ ایک بھوکا اپنے پیٹ کی آگ بُجھانے کا سامان کرے تو مُجرم کہلائے اُس کو سزا دی جائے اور جو باوجود استطاعت محتاجوں کی خبر نہ لے بلکہ ان کو اپنے جبر وتشدد کا شکار بنائے اُس سے کوئی بازپُرس نہ ہو۔"

ترلوکی پنڈت کو پھر ذرا قومی جوش سا آیا۔ تیوری پر بل ڈالکر ارادہ کیا کہ اس زبان دراز ہیکڑی باز بلے کو سزا دینی چاہیئے۔ جھلا کر کہنے لگے "بس۔ زیادہ شُہدپن پر نہ اُترو۔ مغل کبوتر باز نہ شد کہ مادر خواہی کر کے چُپ ہو رہے۔ کسی انیس بھائی سے واسطہ نہ پڑا ہو گا۔ یہاں ہاتھا پائی کا تو دم ہے نہیں اور نہ یہ بھلے آدمیوں کا کام ہے۔ کھانڈ لپٹی ہوئی زہر کی گولیاں بھی دیکھی ہیں، اگر مجھ سے زیادہ اَڑے تو ایک رات میں تم سب کے سب سوتے کے سوتے رہ جاؤ گے۔ اگر زندگی پیاری ہے تو ترلوکی سے ہاتھ نہ ملاؤ۔ تمہاری یہ باتیں بالشویکوں کی سی ہیں۔ سرمایہ داری کے خلاف تمہارا جہاد سوسائٹی کے لئے سخت مُضر ہے۔"

بِلا چوہوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ طاق اور مچان پر سے کبھی کوئی ہنڈیا گرتی تھی کبھی کوئی ڈبا۔ اب جو کونوں کا کنستر لُڑا کا تو پنڈت جی کو بِلے کے قہقہے کا گمان ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہا ہے:-

"آپ کی سوسائٹی سے ہمیں غرض؟ دولتمند سُود خوار دُنیا کو کیا فائدہ پہونچا رہے ہیں؟ سرمایہ دار اگر مٹ جائیں گے تو مفلسوں اور محتاجوں کا کیا نقصان ہوگا؟ مجھے کھانے کو نہ ملے تو میں تمہاری سوسائٹی کو لیکر کیا چولھے میں ڈالوں۔ سماج غریبوں کیلئے کب ہے؟ امیروں کی نمائش گاہ اور تہذیب کا قمارخانہ ہے! مفلسوں کمزوروں اور مزدوروں کا تو وہاں کوئی درجہ ہی نہیں۔ سوسائٹی کے قانون میں افلاس، بھوک، شرم، دیانتداری اور رحم کوئی ناقابل معافی جرم ہیں۔ چور کو سزا دینا اس کا فرض ہے لیکن چوری کے اسباب پر غور کرنا اس کا کام نہیں۔ چور کو سزا دینے کے مسئلہ پر مجھ کو بھی اتفاق ہے آپ چور کو مہینے دو مہینے، سال دو سال کی نہیں، عمر قید کر دیجئے بلکہ پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن تعزیرات ہند میں یہ قاعدہ بھی داخل قانون ہو جائے کہ جو حاکم چور کو سزا دے وہ پہلے تین دن تک فاقہ کرے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اُس کی آنکھوں کے سامنے بھوک سے بلکتے رہیں۔ اس پر اگر مجسٹریٹ یا جج صاحب اپنی خودداری کو قائم رکھیں اور اُن کے دل میں چُرا کر کھانے کا جذبہ نہ پیدا ہو تو ایک چور کو کیا بلکہ اُس کے سارے کُنبے کو سولی چڑھا دیں۔۔۔ پنڈت جی مہاراج تم تو سب کھیل کھیل چکے ہو۔ عیش بھی کیا جیل بھی بھگتا۔ اپنے گھر کی ہولی دیکھی۔ غیروں کے دیئے جلا کر دیوالی منائی۔ کوئی رنگ چھوٹا نہیں۔ پھر تم نے کیا سمجھ کر دستپناہ اُٹھایا تھا۔ میرے کہنے کا یقین نہ آئے تو تجربہ کے طور پر سہی آج سے تین روز تک فاقہ کرو۔ نہ افیون کھاؤ نہ سُلفہ اُڑاؤ۔ نہ دودھ پیو۔ غالباً تم نے ابھی کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ اپنی پچھلی روٹی میرے حوالے کر دو اور ذرا فاقوں کا تماشہ دیکھو۔ تین دن کے اندر اندر گیا تم تو فعلی بھاتی ہو، کل شام تک ہی جرائم کا کتنا لمبا چوڑا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر ننھو امہتر کی ہنڈیا آنکھ بچا کر نہ لے بھاگو یا کم از کم گھاسی رام کی دکان کا تالا توڑ کر افیون نہ چُرا لاؤ تو جتنا چاہے مار لینا۔"

اشرف صبوحی

خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمایا کریں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔

"مینیجر"

ادبِ جدید کا ایک صاحبِ طرز انشا پرداز

عصرِ جدید کے ادبا جو صحیح معنوں میں ہماری داد کے مستحق ہیں اور جنھوں نے واقعی ہمارے ادب میں اضافہ کیا ہے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ نوجوانوں میں ان کی تعداد اور بھی کم ہے۔ یہ اس لئے کہ بہت سے نوجوان ادیب نئے ادب کا غلط مفہوم سمجھ کر غلط راستے پر پڑ گئے ہیں میرے خیال میں جدید ادب کو اپنی سوسائٹی کے نظام کو برباد نہیں کرنا بلکہ اسے کسی صحیح طریقے سے بہتر بنانا ہے۔ کوئی اہلِ قلم ہمارے جذبات و احساسات اور فطرت کے دیگر عناصر کی صحیح عکاسی کرتا ہے تو وہ یقیناً ایسا ادیب ہے جس کی اس زمانہ میں ضرورت ہے۔ اس کا امتحان یہی ہے کہ اس کی تحریریں دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیں۔ طبیعت کو غور و فکر پر آمادہ کریں۔ نظر کو وسعت دیں اور خیالات کو بلند کریں۔ اس نظریہ کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے نوجوان ادیبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نظریں ایک ایسے ادیب پر ٹھیرتی ہیں جس کے ادبی کارناموں نے ہر اہلِ ذوق کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے۔

اس کا نام صادق الخیری ہے۔ علم و ادب کا ذوق اسے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، کالج اور یونیورسٹی کا تربیت یافتہ ہے وہ اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کے بزرگ اردو ادب کے محسنین اور مربی تھے۔ یعنی ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری مرحوم۔

اس کا باپ وہ ہے جس نے اُردو میں افسانہ نگاری کو جنم دیا جس نے ناول نویسی کو عروج پر پہونچایا۔ جس نے ہماری سماج کے ایک مظلوم طبقے کو حیاتِ تازہ بخشی۔

صادق الخیری دورِ حاضر کے جواں سال مگر ممتاز ادیب ہیں انھوں نے اردو ادب میں اپنا راستہ آہستہ آہستہ بنایا ہے۔ کون جانتا تھا کہ جل کماری (مطبوعہ نیرنگِ خیال سنہ ۳۳ء) کا مصنف، یا انتقام کی رات (مطبوعہ ادبی دنیا سنہ ۳۴ء) کا مترجم کہ میں ان دونوں کو ان کے بہت معمولی افسانوں اور ترجموں میں گنتا ہوں اُردو کا ایک زبردست افسانہ نگار، ایک عمدہ مترجم اور محقق نقاد بننے والا ہے۔ اس مضمون میں میں زیادہ تر ان کی افسانہ نگاری پر اظہارِ خیال کروں گا۔ اور وہ بھی صرف افسانوں کے متعلق جو سنہ ۳۴ء یا اس کے بعد

یہاں افسانہ نگاری کی تاریخ طوالت کا باعث ہوگی۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ شروع شروع میں ہمارے ہاں داستانیں اور قصے وغیرہ تھے۔ جن میں خلافِ عقل واقعات کی بھرمار ہوتی تھی۔ بیسویں صدی میں علامہ راشد الخیری اور منشی پریم چند نے افسانہ نگاری کو رواج دیا ان کے علاوہ نیاز فتحپوری اور سلطان حیدر جوشؔ نے اپنے طبعزاد افسانوں سے اُردو کے خزانہ میں بیحد اضافہ کیا اور سجاد حیدر یلدرم اور دیگر حضرات نے غیر ملکی زبانوں کے افسانے اُردو میں منتقل کئے۔ بیسویں صدی کے تیس سال گذرنے کے بعد ہم ایک نیا دور قائم کرتے ہیں۔ اس میں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے نئے نئے فسانہ نگار پیدا ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ فسانے کے نئے نئے موضوعات سامنے آئے۔ اسی زمانہ کے افسانہ نگاروں میں ہمارے جوان العمر ادیب صادق الخیری ہیں۔

ان کی فطرت شاعرانہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں محض شاعری نہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوع زندگی کی تلخیاں اور اصلی واقعات ہیں۔ ان کے ہاں مثالیت (Idealism) بہت کم ہے ورنہ دراصل وہ حقیقت نگار (Realist) ہیں اور کہیں اصلیت (Truth) سے الگ نہیں ہٹتے۔ وہ برابر اپنے گرد و پیش کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ مذہب۔ سماج۔ دولت غریبی۔ غم۔ غصہ۔ محبت۔ رقابت اور اس قسم کے دوسرے جذبات نیز خارجی عناصر انسان میں کیا کیا تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں آپ ان کے افسانوں میں پائیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کے امیر اور غریب گھرانوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انھیں سوسائٹی کے طرزِ عمل اور سماجی انقلاب کے مدارج کا اچھی طرح علم ہے۔ غیر قوموں اور دیگر مذاہب کے پیرووں سے بھی وہ ناواقف نہیں اور سب سے بڑھ کر وہ فطرتِ انسانی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں تصنع کو بہت کم دخل ہے اور وہ ہمیں جیسے گوشت پوست کے انسانوں کو اپنے افسانوں کے کردار بناتے ہیں اس لئے وہ افسانے ہم پر براہِ راست اثر کرتے ہیں۔ اب ہم ان کے افسانوں کو فنی حیثیت

سے جانچیں گے۔

پلاٹ اور موضوع

صادق الخیری یاس پسند ہیں۔ اس لئے وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ ایسے بناتے ہیں جو غم انجام ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی ٹریجڈی مصنوعی نہیں ہوتی۔ وہ اس میں زبردستی موتیں واقع نہیں کرتے۔ ان کے کئی افسانے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی نہیں مرتا لیکن افراد قصہ کو حالات ایسے پیش آتے ہیں کہ ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ بالعموم وہ یہ فضا ناکامی، محرومی اور مایوسی سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے پلاٹ کسی معاشرتی واقعہ یا سماجی مسئلہ کے مختصر سے مختصر عمل پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان میں غیر ضروری پیچیدگیاں یا نامناسب طوالت نہیں ہوتی ان کے افسانوں میں جس طرح بھی ترقی (Development) ہوتی ہے وہ اتنی حقیقت سے قریب ہوتی ہے کہ ہم اسے بالکل سادہ سمجھتے ہیں۔ اس سادگی کے باوجود ان کے ہر افسانے میں کشمکش و پیچ (Suspense) ہوتا ہے۔ وہ سیدھے سادے افسانے بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان میں جگہ جگہ حیرت و استعجاب شاعرانہ رنگینیاں، نفسیاتی بلندیاں اور افسانوی دلکشیاں ہوتی ہیں۔ ان کے کسی افسانے کو شروع کر کے ہم یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آخر میں کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے افسانے کے خاتمہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رکھتے ہیں ان کے پلاٹوں میں تنوع ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے افسانوں کی تعداد بہت کافی ہے ہمیں ان میں یکسانیت (Monotony) محسوس نہیں ہوتی جو کثیر التصنیف افسانہ نگاروں کے ہاں اکثر ہوتی ہے۔ ان کے پلاٹوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر یا کسی خاص مسئلے (Problems) کو حل کرنے کی کوشش میں اسے افسانے کی شکل دیدیتے ہیں۔

اس طرح ان پلاٹوں میں ہمیں مختلف النوع موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہر قسم کی محبت، ہر حیثیت کی عورت، ہر درجے کی سماج، غریبی امیری، تقدیر تدبیر، زندگی، موت، شہر دیہات انسانی فطرت اور اس کی مجبوریوں کو جگہ ملتی ہے۔ اور وہ ایک ماہر فن کی طرح ان کی نہایت دلفریب تصویریں کھینچتے ہیں۔ جوانی ان کا خاص موضوع معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس سلسلہ میں انھوں نے موپساں جیسے آزاد خیال افسانہ نگاروں کا اثر قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے وہ نازک سے نازک موقعوں کی تصویر کشی بغیر کسی جھجک کے کر دیتے ہیں۔ دیور، پریم کا مندر، حسن و شباب۔ بے باپ کا بٹیا اور گلنار ان کی آزادی اور بے جھجک تحریر کے نمونے ہیں۔ حقیقتاً صادق ان افسانوں میں جوانی اور مستی کی تلخیاں دکھاتے ہیں۔ شاید بعض حضرات ان افسانوں پر عریاں نویسی کا الزام دیں مگر میری رائے میں صادق ان میں ادبیت اور شاعرانہ انشا کے ایسے نادر اور اعلیٰ ٹکڑے سمو دیتے ہیں کہ ان افسانوں کی فنی اور ادبی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے حسن و شباب میں سالی بہنوئی کا نازک مسئلہ چھیڑا ہے۔ اس افسانہ میں یہ فلسفی ادیب محبت و نفس کے مسئلے پر بڑی خوبی اور سچائی سے رائے زنی کرتا ہے۔ اور شاعروں کے جھوٹے دعووں کی تردید کرتا ہے یہ دکھا کر کہ محبت نفس سے الگ نہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ہے "دیور" (ساقی) اس کی اشاعت پر خاصا ہنگامہ ہوا۔ اکثر نے تعریف کی اور ایک دو نے مذمت۔ اپنی اپنی رائے ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس افسانہ سے صادق کے مطالعہ نفسیات اور حسیات و جذبات سے باخبری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا پلاٹ شباب کی مستیوں اور جوانی کی لغزشوں کا مرقع ہے۔ جس میں بیحد دلکشی اور جدت اور Originality ہے۔ بیان اگرچہ عریاں ہے مگر بڑا پُرتاثیر کر ابتدا میں جتنی شوخی ہے انجام اتنا ہی درد انگیز ہے۔ کوئی آخر تک نہیں کہہ سکتا کہ پلاٹ میں ایسی حیران کن تبدیلی ہونے والی ہے جسے پڑھ کر کلیجہ دھک سے رہ جائیگا۔ افسانہ میں جا بجا ڈرامائیت ہے اور انھوں نے منتہا کے علاوہ ایک سے زیادہ جگہ Crisis پیدا کیا ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ مصنف کیسا عجیب و غریب اور خالص اپنا (یوروپ کا چرایا ہوا یا مغرب زدہ نہیں) پلاٹ لیکر آیا ہے اور اس کی تعمیر میں کیسی عمدہ کردار نگاری، منظر نگاری اور جا بجا فلسفۂ نفس سے بحث کی ہے۔ محض عریانی کا اعتراض کر کے اسکی خوبیوں کو پس پُشت نہیں ڈالنا چاہیے۔

بے باپ کا بیٹا کی بنیاد ایک نفسیاتی واقعہ پر رکھی گئی ہے نفسی تحلیل (Psycho-Analysis) کے ایسے عمدہ افسانے اُردو میں کمیاب ہیں۔ ایک عورت آسامی کا ذہن اپنے مجرم کا نام بھول جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شخص نفس تحت الشعور (Sub-Concious Mind) میں محفوظ ہو جاتا ہے اور آخر میں ایک زبردست سانحہ سے متاثر ہو کر وہ کردار بالائے شعور آجاتا ہے۔ یہ انقلاب اپنی جگہ پڑھنے کے لائق ہے۔ مصنف نے یہاں غیر معمولی طور پر جوانی کے ہنگاموں کا ایک اور رُخ دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ حساس "حرامزادے" کی نفسیات و کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ یہاں میں

ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کسی انگریزی رسالہ میں ایک کہانی "My Mother's Past" پڑھی تھی میرے خیال میں "بے باپ کا بیٹا" کا پلاٹ اس سے ماخوذ ہے یا ممکن ہو اسے پڑھنے کے بعد موصوف کو اس کے لکھنے کا خیال آیا ہو۔ یہ اس لئے گمان ہوا کہ اس میں کئی مقامات ایسے ہیں جو اس انگریزی کہانی میں بیان کئے گئے تھے۔ البتہ میں اسے اپنانے کی بہت کامیاب مثال سمجھتا ہوں۔ اس کہانی کا انجام انگریزی کہانی کا انجام نہیں ہے بلکہ اسے آگے بڑھا کر صادق نے ایک عجیب وغریب چیز پیش کی ہے جو کلیتاً ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ایک "حرامی" کے ذہنی انتشار کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ اس کا ہیرو جو حرامی ہے آخر میں بہت بڑا آدمی بنتا ہے اور بڑے بڑے لوگ اس کو اپنی بیٹی دینے کے خواہشمند ہیں اور وہ چاہے تو سماج اور مذہب سے انتقام لینے کے لئے شادی کرسکتا ہے مگر:۔

> مگر نہیں اس کی روح افسردہ ہے۔ وہ شعلوں کی لپک میں بھی تاریکیاں منڈلاتی دیکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ناجائز اولاد کو کس قدر شرمندگی، کتنی کوفت اور کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بچے اس کے بعد آوارہ روحوں کی طرح ہر دَر سے دھتکارے جائیں اور لوگ انگلیاں اٹھا کر کہیں "ان کے خاندان میں نی ہے۔ ان کا باپ حرامی تھا"

بیشک صادق الخیری جوانی کے گھناونے رُخ کو زیادہ عریاں کرکے دکھاتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ فلسفۂ زندگی پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ مثلاً جذبہ کور میں وہ ایک فلسفی کی طرح جوانی کے مفید پہلو پر نہایت اچھا درس دیتے ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یورپ کے عریاں نویسوں کے لٹریچر نے ان کے خیالات کو یکسر مغرب زدہ کردیا ہے۔ بیشک وہ "محبت اور جسمانی لذت" شباب دگناہ جوانی اور نفس وغیرہ پر صاف صاف لکھتے ہیں مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی تربیت اسلامی فضا میں ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے وہ افسانے جو انھوں نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے لکھے ہیں ہرگز نظر انداز نہیں کئے جاسکتے "آلام حیات" (جس میں بیوہ کے نکاح ثانی کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے) "طلاقن" (ایک طلاقن کی دردناک زندگی) "نالۂ دل" (شفقت پدری سے محروم لڑکی کی دردناک داستان) "دیدۂ تر" (اولاد سے محروم بیوی پر شوہر کے مظالم) وغیرہ وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں موصوف نے خاص خاص مسائل کو چھیڑا ہے۔ ان المیوں (Tragedies) میں انھوں نے ہمارے رسم و رواج اور مردوں کی زیادتی پر نکتہ چیں انداز میں طنز کی ہے۔ اور یہاں وہ ہمیں ایک ادیب مصلح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اور موضوع ہے "خاندانی تعلقات" چنانچہ انھوں نے دیور بھاوج (دیور) جلیٹھ بھاوج (آخری رات) سالی بہنوئی (حسن وشباب) کے علاوہ سالے بہنوئی (دیدۂ تر) اولاد اور ماں باپ (ماستا افسردگی آرزو باپ کی قربانی) سوتیلی ماں (افسانہ زندگی) سوتیلی بیٹی۔ بہن بھائی۔ میاں بیوی کے متعلق بھی کئی افسانے لکھے ہیں۔ میاں بیوی کی پاک محبت اور ان کے تعلقات پر "ہمدم دیرینہ" (عصمت) میں انھوں نے خوب تبصرہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بوڑھا واقف کار ہمیں اس پرفریب اور پُرشباب دنیا سے نکال کر کسی دوسری معصوم دنیا میں لے گیا ہے۔ میاں کے طرزِ عمل اور بیوی کی خدمت ومحبت پڑھکر ازدواجی زندگی کا ایک اچھا سبق ملتا ہے۔

صادق الخیری شہر کے فسانہ نگار ہیں اور ان کی فسانہ نگاری کی اصلی جولانگاہ شہر کی وسعتیں ہی ہیں لیکن کبھی کبھی وہ دیہات کی بستی میں بھی چلے جاتے ہیں اور جب وہ یہاں کی غریب دنیا کی معصوم باتیں سُناتے ہیں تو جہاں جہاں انھیں موقع ملتا ہے وہ شہر والوں پر طنزیہ فقرے کسنے سے نہیں چوکتے۔ شہر والوں کی نیش زنی سے اکتا کر اور ذہنی خلفشار سے بچنے کیلئے وہ شہر سے دور (نالۂ دل) کسی تنہا جگہ کو بسانا چاہتے ہیں۔ دیہات کے متعلق زیادہ تر پریم چند اور اعظم کریوی نے لکھا ہے۔ اور ان کے ہاں دیہات کے سب کردار ہندو ہیں لیکن صادق الخیری کے دیہاتی افسانوں (صید ہوس) میں ہمیں مسلمان نظر آتے ہیں۔ اور ہمیں مسلمان دیہاتیوں کی بیچارگی اور مفلسی سے واقفیت ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانے افراط و تفریط سے پاک ہیں۔ وہ ان لوگوں کے سکون واطمینان کا ذکر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کی تکالیف اور مصائب بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کہیں تعصب یا یک طرفہ مضامین نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ایک کسان کی حالت اور کشمکش کی کتنی سچی اور دردناک تصویر دکھائی ہے:۔

"تھوڑی سی زمین۔ ایک ہل دو بیل، من دو من

اناج، بس یہی کل اس کا سرمایہ ہے ......
فصلیں اچھی اتر آئیں تو بیشک پو بارہ ہے۔ مگر
ایسا ہوتا کب ہے؟ شاذ و نادر! ورنہ زیادہ تر
تو کسان بیچارہ بھوکا ہی مرتا ہے۔ دن رات
ایک کر کے، جوانی کا لہو پسینے کی طرح بہا کے،
دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیوں سے منہ موڑ کر وہ
صرف عمدہ فصلیں تیار کرنے کا متمنی اور ساعی
رہتا ہے۔ وہ فصلیں جو اس کی ہو کر بھی اسکی
نہیں ہوتیں۔ اس کو (گوری سرن کو) معلوم ہے
کہ قحط سالی میں بنی نوع انسان کے ان سب سے
بڑے خادموں پر کیا کیا بیتا پڑتی ہے۔ ان کی
آنکھیں آسمان والے سے رحم کی بھیک مانگ
رہی ہیں۔ ان کے دل کال کے اندیشے سے بیٹھے
جا رہے ہیں مگر بارش نہیں ہوتی، اور جب
پانی کا ایک چھینٹا بھی نقصان دہ ہوتا ہے تو
طوفان اور سیلاب امڈے چلے آتے ہیں۔
(پنچھی)

صادق الخیری کے پلاٹوں کے متعلق مجھے دو باتیں کہنی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے پلاٹوں میں اچھوتا پن اور تنوع ہے جو بہت کم افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بہت سے افسانہ نگاروں کی طرح وہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں کہ انگریزی افسانوں کو اپناتے ہیں مگر حوالہ نہیں دیتے۔ مثلاً "آہ جوانی" یا "تیر نیم کش"۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے ان میں بڑی زبردست تبدیلیاں کی ہیں اور مختلف نئے واقعات پیدا کر کے نتیجے بھی مختلف اور نئے نکالے ہیں۔ لیکن چونکہ پلاٹ کی داد اصلی مصنف کو ملنی چاہئے اس لئے انھیں کسی قسم کا حوالہ دیدینا چاہئے تھا۔

کردارنگاری

صادق صاحب کے اشخاص قصہ اس وقت سے لیکر جب وہ متعارف ہوتے ہیں اس وقت تک جب ان کا کام ختم ہوتا ہے جو کچھ بھی کہتے ہیں یا کرتے ہیں اور جو کچھ ان پر داخلی یا خارجی اثرات ہوتے ہیں سب کچھ عین فطرت ہوتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو ایک دم کہیں سے کہیں نہیں لیجاتے بلکہ ان میں بتدریج ارتقا ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ان کو فن کی کی بلندی تک پہنچاتے ہیں۔ ان میں جو بھی نشو و نما ہوتی ہے وہ بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی کہ ہونی چاہئے۔ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف نے اپنی طرف سے ان کے عمل یا کردار میں کوئی اضافہ کیا ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں ہمیں نہایت عمدہ کردار نظر آتے ہیں۔ "دیور" میں سہیل کا کیریکٹر بلند اور فطری ہے۔ وہ ایک انسان ہے۔ اس سے جوانی میں لغزش ہوتی ہے۔ اس کے جذبات کی تربیت کبھی نہیں ہوئی اس لئے وہ نہیں جانتا کہ بھاوج سے ربط ضبط بڑھانا خطرناک ہے۔ لیکن جب موقع آتا ہے تو باوجود اپنی اس کمزوری کے وہ انسانیت کا ثبوت دیتا ہے۔ "بے زبان" میں انھوں نے گدھے اور کتے کی کردارنگاری خوب کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے قلم سے جس پر بھی تبصرہ ہوگا اور وہ جس کردار کو بھی اپنے قارئین سے روشناس کرائیں گے اس کو ہمارے سامنے اس کے اصلی رنگوں میں پیش کریں گے۔ "گلناز" میں انھوں نے اس کی ہیروئن کا کردار شاعرانہ رنگ میں دکھایا ہے۔ "صید ہوس" میں کلثوم کا کیریکٹر پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے علاوہ کردارنگاری کی اچھی مثالیں "جیون ایک پہیلی" میں ملتی ہیں۔ جیسے کردار ہیں ویسے ہی ان کے مکالمے اور افعال ہیں۔ "شعلہ سوزاں" میں ہیروئن کا کردار بہت اہم ہے جو محبت اور فرض کی کشمکش میں مبتلا ہے لیکن فرض کی پکار سن کر محبت کو خیرباد کہتی ہے۔ "تیر نیمکش" میں صادق نے مراد کا کردار بہت بلند کر دیا ہے۔ اور "ماتا" کی ہیروئن تو اس زمانہ کی مناسبت سے آجکل کی عورتوں کیلئے آئیڈیل ہے۔ اس میں فضا اور Situations کس طرح تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں اور وہ خارجی اثرات سے کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں مصنف کے کمال کردارنگاری پر دال ہیں۔

منظرنگاری

صادق الخیری اپنے افسانوں کی ترتیب میں مناظر کو Back Ground یا Fore-Ground جہاں بھی پیش کرتے ہیں وہ اس خوبصورتی سے کہ سارا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ ان کے الفاظ نہایت تصورزا (Suggestive) ہوتے ہیں۔ نیز وہ اپنے کرداروں کے لطیف احساسات اور جذبات کا اظہار اور فطرت انسانی کی تشریح ایسی عمدگی اور صفائی سے کرتے ہیں کہ ہم انھیں بجا طور پر فطرت نگار کہہ سکتے ہیں۔ کہیں کہیں سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں

ایک دفعہ شب ماہ میں وہ مجھے سیب کا ایک
کھلا ہوا درخت دکھانے لے گیا جو علف زار

میں سپید پھولوں کا ایک ہوے ہوئے گرنے والا آبشار معلوم ہو رہا تھا بلکہ دور سے تو ایسا نظر آتا تھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی شمعی انگلیاں معبود کی پرستش کر رہی ہیں۔ (میرا ایشیائی محبوب)

"کھوہ میں گھسا ہوا تو یکبارگی سیٹی بجاتا ہوا اڑا اور فرشتۂ اجل کے پروں کی ہیبت ناک پھڑپھڑاہٹ سن کر مریض نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں اور جسم محسوسات سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگیا۔۔۔ صبیحہ ڈر گئی اور اس نے گھبرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مردہ دانت نکوسے اس کو گھور رہا تھا گویا حیاتِ مستعار کا مذاق اڑا رہا ہے۔ (آلامِ حیات)

وہ یکسر بدل چکا تھا۔ اس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ لاش اپنی روح کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سامنے پہاڑیوں کی بلند چوٹیاں دونوں وقت ملتے افق کی جھلملیوں میں خواب کی موجیں معلوم ہوتی تھیں اور دائیں بائیں بل کھانے والی بھیانک وادیاں سمندر کی نامعلوم گہرائیاں۔ (تیرِ نیمکش)

پرانی دلی کا ایک منظر:۔ لیجئے انھوں نے جھولا ستہ اور سارا باغ ساون کے گیتوں سے گونج اٹھا۔ کچھ جھول رہی ہیں۔ کچھ جھلا رہی ہیں باقی اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی ہیں جیسے چمن میں تیتریاں ہوں یا جنگل میں ہرنیاں۔ بہو بیٹیوں کا لباس دیکھکر آنکھوں کو فردوس کا گمان ہوتا ہے۔ گلناری۔ ملاگیری۔ گل شفتالو۔ اودے اور گیندئی جوڑے دھانی چوڑیاں۔ آنکھوں میں سرمہ۔ ہاتھوں میں پور پور مہندی رچی ہوئی۔ انگلیوں میں چاندی کے چھلے۔ دانتوں پر مسّی کی دھڑی اور لبوں پر لاکھا۔ گویا ایک رنگین خواب دیکھا جا رہا ہے یا حوران فردوسی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ فرشِ زمردیں پر جلوہ گر ہیں۔

ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں صرف نفسیاتی بلندی اور افسانوی دلکشی ہے بلکہ فنی سحر کاری بھی ہے اور وہ اپنے قاری کو اس میں محو کر لیتے ہیں۔

مکالمہ صادق الخیری اپنے کرداروں کے احساسات کو بعض اوقات اپنے بیان سے زیادہ خود ان کی گفتگو اور مکالمہ کے ذریعہ ذہن نشین کراتے ہیں اور منظر کشی یا تفصیل نگاری میں بے ضرورت وقت نہیں ضائع کرتے۔ ان کے مکالموں سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ان کے قلم میں طاقت ہے اور جوش و خروش ہے اور جذبات کے اظہار پر قدرت ہے۔ ان کے کردار جو بھی باتیں کرتے ہیں وہ نیچرل ہوتی ہیں۔ ان میں بیساختہ پن اور آمد ہے۔ وہ کہیں بھی الجھا کر بات نہیں کہتے۔

چند اور فنی خصوصیات افسانے کے لوازمات خصوصی (پلاٹ۔ کردار۔ مکالمہ وغیرہ) کو جانچنے کے بعد جب ہم افسانہ کی فنی خصوصیات کو جزوی طور پر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کی بھی کمی نہیں۔ ان کے ہاں نہ صرف حقیقت پسندی ہے بلکہ فنی حقیقت (Artistic Truth) ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے افسانہ میں سادگی اور اختصار کے علاوہ زمان و مکان اور عمل اور اثر کا اتحاد (یونٹی Unity) برقرار رکھیں۔ چونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع معلوم ہوتا ہے اس لئے ان کے افسانوں میں تصنع بالکل نہیں ہے۔ افسانہ میں چونکہ تفصیلات معیوب ہیں اس لئے وہ بالعموم اس کی بجائے ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جن میں تصور آفرینی (Suggestiveness) ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کی ابتدا، خاتمہ اور منتہا بھی اپنی جگہ خوب ہوتے ہیں اور وہ انھیں اپنے دلچسپ اور پُر اثر انداز بیان سے اسقدر بلند کر دیتے ہیں کہ ان کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

ان کے افسانوں کے عنوان بھی بڑے تصور زا ہوتے ہیں اور ان کی کشش پڑھنے والوں کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے۔ غرض ان کے افسانوں کا فطری پن، ارتقائی اصول کی پابندی۔ پلاٹ کی دلچسپی۔ تخیل میں جدت اور واقعات میں ڈرامائیت یہ تمام باتیں انھیں اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں کھڑا کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کہیں کہیں "اصلاح" بھی ملتی ہے مگر وہ فن کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اور بعض اوقات اخلاق کو فن پر قربان بھی کر دیتے ہیں۔

اسلوبِ بیان کسی نے ایک عمدہ افسانہ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "ایک دلچسپ پلاٹ ایک دلکش اسٹائل میں

لکھا جائے"۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ سٹائل یا اسلوب بیان بعض اوقات اپنی خوبیوں کی وجہ سے ایک معمولی پلاٹ کو بھی نہایت بلند افسانہ بنا دیتا ہے۔ صادق الخیری کو یہ نعمت میسّر ہے۔ ان کے پلاٹوں پر ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اسلوب بیان کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی فطرت شاعرانہ ہے اس لئے وہ جذبات کے اظہار کیلئے مترنم الفاظ اور نہایت ستھری زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے دلکش جملے چست بندشیں اور انوکھی ترکیبیں احساسات و کیفیات کی نہایت عمدہ تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک بڑا حسن ان کا طرز بیان ہے جس میں بیساختگی اور زور ہے۔ لیکن ایک بات عجیب نظر آتی ہے۔ ان کے اسٹائل دو طرح کے ہیں۔ ایک خالص دہلوی علامہ راشد صاحب کے رنگ میں، دوسرا مغربی اسالیب سے متاثر ہو کر ان کا اپنا۔ اوّل الذکر بالعموم ان کے ابتدائی افسانوں میں ہے۔ اس کی نمایاں مثال "پال کی آگ" (ساقی ۳۳ء) ہے۔ جس میں دلی کے محاورات اور روزمرہ کا استعمال ہے۔ غالباً شروع میں انھوں نے اپنے والد مرحوم کا اسٹائل کا چربہ اتارا ہے۔ "پال کی آگ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ستّرن تھی تو اسی زمانہ کی اور تعلیم و تربیت بھی آج ہی کل کی ہوئی مگر ماں کے دودھ کا کچھ ایسا اثر چڑھا تھا کہ سہیلیوں کی صحبت اور اُستانیوں کی ہدایت بھی اس کے خیالات متزلزل نہ کر سکی۔ وہ قدامت میں گرفتار تھی نہ جدّت کی عاشقِ زار۔ خیالات کی شستہ عقائد کی پختہ۔ دل کی صاف۔ نیت کی پاک۔ سچ مچ کی انسان اور حقیقی معنوں میں مسلمان تھی چھوٹوں پر شفقت اس کا شیوہ۔ بزرگوں کی عزت اس کی عادت۔ حاجت مندوں کی خدمت اس کی خصلت مختصر عورت کی صورت میں ایک جنّت تھی جو نعیم کو میسّر آ گئی۔ . . . . مگر وہ وقت کا دیوانہ فیشن کا پروانہ نخوت میں چُور خوفِ خدا سے ہزاروں کوس دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میاں بیوی میں اکثر اختلاف ہوتا اور بعض دفعہ لڑائی بھی۔ لیکن زبردست کے بسوے بیس۔ یہ کہ بیوی ہی غریب کو جھکنا منّنا، بلانا اور منانا پڑتا۔

یا پھر یہ اسٹائل ان کے ان مضامین میں نظر آتا ہے جو انھوں نے اپنے وطن دہلی کے متعلق (جس کی ہر چیز کو وہ دُنیا جہان سے بہتر سمجھتے ہیں) لکھتے ہیں۔ اس قسم کے اسٹائل کو دیکھکر مولانا شاہد احمد صاحب نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہر شخص کو اتفاق ہوگا کہ "خدا کا شکر ہے کہ علامہ راشد الخیری مرحوم کا اسٹائل ان کے بعد صادق کے ورثہ میں آ گیا۔ اب ہم اپنی بہترین توقعات اس امید سے وابستہ کر سکتے ہیں کہ علامہ مرحوم کے اٹھ جانے سے جو جگہ اُردو انشا پردازی میں خالی ہو گئی تھی وہ زیادہ عرصہ خالی نہیں رہے گی"۔

اُن کا دوسرا اسٹائل انگریزی لٹریچر کے کثرتِ مطالعہ سے بنا ہے اور بالکل نیا ہے۔ ان کی زبان کی صحت کے متعلق تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ اس پر فصاحت، شیرینی، شاعرانہ بیان اور کہیں کہیں استہزا کی لطیف چاشنی سونے پر سہاگہ ہے۔ ان کے تمام تازہ اور ترقی پسند (Progressive) افسانے اسی جدید اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً صید ہوس۔ حسن و شباب۔ بے باپ کا بیٹا۔ گلناز۔ بیجھی۔ ہمدم دیرینہ۔ بے زبان۔ آلامِ حیات وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ ان کے انداز بیان میں قنوطیت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور وہ عام طور پر ایسے جملے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں جو حزن اور یاس کی تصور زائی کریں۔

ترقی پسند عنصر جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے صادق الخیری اگرچہ شاعرانہ فطرت رکھتے ہیں مگر کسی چیز کو اس کی اصلیت سے علیحدہ نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں کا اصلی موضوع زندگی اور اس کے متعلقات ہیں۔ وہ اپنے ارگرد نظریں دوڑاتے ہیں اور اسی ماحول سے اپنے افسانوں کیلئے مواد حاصل کرتے ہیں۔ جو چیز ان کو جیسی نظر آتی ہے وہ اس کو اسی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہم میں اور ہماری سماج میں جو کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں "زندگی اور زندگی کی کشمکش" ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں صرف بیکسی، مجبوری اور مصائب ہی نہیں ملتے بلکہ ان کی تحریریں بیداری روح اور آزادی و حرّیت پر بھی ابھارتی ہیں۔ لیکن وہ "ہنگامہ پرور" نہیں ہیں اور ان کے ہاں حد سے متجاوز سرکشی بھی نہیں ہے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ترقی پسند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری سماج میں اصلاح اور ہماری ذہنیتوں میں پُرسکون طریقے سے تبدیلی ہو جائے۔ وہ بغاوت اور دوسروں کو تباہ و برباد کر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں امارت کا تختہ الٹ دینے کی نہیں بلکہ مفلسی اور غریبی کو دُور کرنے کی خواہش ہے۔ وہ ادب کا مقصد اصلاح و ترقی سمجھتے ہیں اور قاری

محض اشاروں اشاروں میں ان کے مافی الضمیر کو سمجھ جاتا ہے ۔ وہ صرف کہیں ایک فقرے سے ، کہیں کسی اشارے سے کوئی درس دیتے ہیں ۔ اور یہ بہت کم ہوتا ہے کہ وہ کہیں واعظ یا مصلح نظر آئیں صادق مرثیہ گو نہیں ہے ۔ اس کے ہاں صرف اسلاف کے کارناموں کی مدح نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے موجودہ زمانہ کا ادیب ہے ۔ اسے نہ ماضی کا افسوس ہے نہ مستقبل کا انتظار ہے ۔ اس کے سامنے صرف حال ہے اور وہ سماج پر اور ہمارے رسم و رواج اور ہمارے عقائد باطلہ پر بے دردی سے تنقید کیے جاتا ہے ۔

عورت ان کا خاص موضوع ہے ۔ چنانچہ وہ آج ترقی پسند ادب میں بھی اس کی حمایت کرتے ہیں "کھلونے" میں ہیروئن کی زبانی عورت کی محکومی کا حال یوں بیان کرایا ہے :۔

ہم جان کر بھی جاننا نہیں چاہتے کہ ہم عورتوں کی کیا حیثیت ہے ۔ ہم تو بس کھلونے ہیں جن سے مرد جس طرح چاہتے ہیں کھیلتے ہیں ۔ شادی سے پہلے باپ اور باپ کے بعد بھائی ہم عورتوں کے مالک ہوتے ہیں ۔ اور جب شادی ہو جاتی تو شوہر اور شوہر کے بعد بیٹے کا اختیار رہتا ہے ۔ وہ جو چاہے ہم سے سلوک کرے ۔ ہماری کیا مجال کہ کسی معاملہ میں اپنی رائے دے سکیں ۔"

۔۔ لیکن اس کے دل کی صدا عرش کے کنگورے ہلا رہی تھی کہ اے معبود ! بیکس لڑکیاں ظالم اور زبردست مرد سے تحفظ عصمت کیونکر کریں ۔"

وہ سوسائٹی کی بے عنوانیاں اور عورت کے معاملے میں مردوں کی زیادتی دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے ہیں ۔ "طلاقن" میں انھوں نے ایک طلاقن کی مصائب سے دبی ہوئی زندگی کا دلخراش مرقع کھینچا ہے اور اسی کی زبانی چیلنج کے انداز میں سماج پر تبصرہ کیا ہے ۔ سماج مذہب ، رسم و رواج کے علاوہ وہ قدرت کو بھی ٹوکنے سے نہیں جھجکتے "صید ہوس" میں ایک فقرہ بڑا چبھتا ہوا ہے :۔

۔۔ کبھی کبھی گاڑیبان کے چمکارنے یا کسی فاقہ زدہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے پیدا کرنے والے سے جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اپنی بیچارگی کی شکایت کر رہا تھا ۔"

امارت و حکومت پر "جیون ایک پہیلی" میں خوب طنز کی ہے ۔

کارخانہ کا مالک بڑا بدمزاج اور مغرور شخص تھا ۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک حقارت سے دیکھا "تو تم نوکری کرو گے ؟ ہوں !! پتھر تم سے کاہے کو کٹیں گے ؟ کدال تم سے کیسے چلے گی ۔ تم تو بابو ہو بابو ۔ تم نے اس لالچ میں پڑھا کہ سرکار تمھیں نوکری دے دیگی ۔ جاؤ نا اب اس کے پاس ! تمھیں ان حالوں پھرتے دیکھتے اسے لجا نہیں آتی

ایک اور افسانہ میں انھوں نے امیروں کی کوٹھیوں اور غریبوں کے گھروں کی تصویر کھینچی ہے ۔ جس میں در اصل یہ دکھایا ہے کہ حقیقی محبت غریبوں میں ہے امیروں میں نہیں ۔ پہلے ایک غریب گھرانے کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے :۔

یہ غریبوں کی بستی ہے ۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھر ہے سامنے اس خاک سے اٹے ہوئے طاق میں جس کی کمر بڑھاپے سے دوہری ہوگئی ہے ایک شمع چپکے چپکے رو رہی ہے ۔ شاید اس لئے کہ چند پروانوں کو اس کے شعلۂ حسن نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے ، دیکھو شمع پروانہ سے کہہ رہی ہے ۔ "پیارے ! میں تجھ سے ہمکنار نہیں ہو سکتی لیکن اے میرے محبوب ! تیرے سوز نے میری جان پر بنا دی ہے ۔"

اب امیروں کے مکانوں کو دیکھئے :۔

" عالی شان مکانات میں بجلی کے قمقمے ہیں ۔ پروانے یہاں بھی آتے ہیں ۔ ان کے گرد طواف کرتے ہیں مگر ان کے پر نہیں جلتے ۔ ان میں سوزش نام کو نہیں ہوتی ۔ اور ہو بھی کیسے ؟ یہ شمع تھوڑی ہے ۔۔۔ ! ایک پروانہ دیوانہ وار آیا اور اس سے اپنا سر ٹکرانے لگا ۔ قمقمے کا مزاج برہم ہوگیا اس نے خشمناک ہو کر کہا ۔ ارے دیوانے ! کیوں میرا اجلا بدن میلا کرتا ہے ؟ ایسا ہی مرتا ہے تو وہ سامنے دیکھ ، آتش دان میں اپنا جسم جھلس لے ۔"

ان کا ایک افسانہ "گلناز" ہے ۔ ہر جہت سے نرالا ہے ۔

ہر طرح نیا اور دلکش۔ اور بجلیٹی (Originality) کا، جو ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں عام طور پر مفقود ہے اعلیٰ نمونہ منتہا (Climax) انتہائی ڈرامائی۔ اس میں ہمیں کئی چیزیں ملتی ہیں آجکل کے نوجوانوں کی زبوں حالی، حقوق اور فرائض، جوانی اور نفسانیت انتقام اور بدمستی، غم روزگار، جسم اور روح کی بھوک، فلاکت اور بیچارگی، اولاد اور کے پالک کی محبت وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہونے کے باوجود افسانہ مختصر ہے اور فنی اعتبار سے مکمل اور میرے خیال میں صادق کا شاہکار ہے۔ نیز افسانہ نگار نے اسے ایسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ کئی بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ابتدا دلچسپ اور انجام غمناک ہے ایک دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

یہ اگلے زمانہ کے لوگ اس زمانہ کے نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کا ہرگز اندازہ نہیں کرسکتے جب تک بچارے تعلیم پاتے ہیں، سینکڑوں امیدیں ہزاروں ارمان اور ان گنت آرزوئیں ان کے دل میں پرورش پاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر ہم یہ بنیں گے وہ بنیں گے، دولت کی فراوانی ہوگی جو چاہیں گے خریدیں گے اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ لیکن حصول تعلیم کے بعد جب بیکاری ایک سوالیہ نشان بن کر ان کے سامنے اپنا بھیانک منہ کھولتی ہے تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور خوش آئند توقعات کی منور شمع اس طرح گل ہوجاتی ہے گویا اب کبھی روشن نہ ہوگی۔"

"اللہ غنی! ایک آسامی کیلئے ڈھائی سو نوجوان قسمت آزمائی کیلئے آئے تھے! کاش ان کے والدین نے بی۔اے کی ڈگری کو قرآن و حدیث کا حکم اور دولت

ملازمت کی گارنٹی نہ سمجھا ہوتا!"

ہر آرٹسٹ کی طرح صادق الخیری کے بھی چند نظریئے ہیں مگر چونکہ وہ جوان العمر ہیں اس لئے وہ ابھی اپنے نظریوں پر قائم نہیں ان کے خیالات بدلتے رہتے ہیں اور میری یہ رائے ہے کہ انہیں ابھی آخری نتیجوں پر پہنچنا باقی ہے۔ کبھی وہ تقدیر کا مذاق اڑاتے ہیں اور کبھی کسی افسانہ میں انسان کو بالکل مجبور و عاجز سمجھتے ہیں۔ کبھی وہ زندگی سے مایوسی کا اظہار کرکے موت کو راہ نجات سمجھتے ہیں اور کبھی وہ اسے بھی چیلنج دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے اور یہاں کے تمام مصائب و آلام پر فتح پانی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کرنی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ صادق الخیری کے پاس اپنے خیالات کے اظہار کے لئے لفظوں کا وسیع خزانہ ہے اور استعارے بھی نئے نئے اور دلکش دیتے ہیں مگر وہ اپنی چند تشبیہوں اور ترکیبوں کو کئی کئی افسانوں میں دوہراجاتے ہیں مثلاً "اس کی ساق ہائے سیمیں دعوت لمس دے رہی تھیں" کو میں نے کوئی تین افسانوں میں پڑھا۔

"جب بزم انجم سراپا گوش ہوتی"

"موت کا سا سکوت" "موت کی سی زردی کھنڈی ہوئی تھی"

وغیرہ بھی معمولی ردوبدل کے ساتھ کئی افسانوں میں استعمال ہوئے ہیں یہ عیب ناگوار گذرتا ہے۔

ناشکر گذاری ہوگی اگر میں محترم ایڈیٹر صاحب ساقی کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے کمال مہربانی سے مجھے مختلف رسائل جن کی مجھے ضرورت تھی بہم پہنچا کر اس مضمون کی تیاری میں مدد دی۔

حمید الدین

(ایم۔اے۔ پی۔ سی۔ ایس)

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خون آشام زہرہ کا افسانہ محبت

اس ناول کو پڑھکر آپ عرب اور عرب کے جنگجو لوگوں کے جملہ حالات، مثلاً ان کے رسم و رواج، انکی مہمان نوازی عادات و خصائل، بہادری اور جرأت، فنون حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب، معاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہوجائیں گے۔ اس کی مصنفہ مس جان کونکوئیسٹ ہیں۔ جنہوں نے ایک عرصہ تک عرب میں رہکر اور وہاں کا بنظر غائر مطالعہ کرکے اس کو قلم بند کیا تھا اور اب اسے اردو کے مشہور ادیب و مترجم مسٹر صادق الخیری ایم۔اے دہلوی نے نہایت دلفریب اور دلکش اسلوب میں ہماری زبان کا جامہ پہنایا ہے۔ کتابت و طباعت بہترین سرورق خوشنما۔ قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ:۔ مینجر ساقی بک ڈپو۔ کھاری باؤلی دہلی

بنارس

ازبنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

بڑے بڑے مقدس مقامات پر بھی کبھی کبھی وہ روحانی مسرت اور شرحِ صدر نصیب نہیں ہوتا جس کے لئے نہایت ذوق وشوق سے ہم سفر کرتے ہیں۔ نورِ حقیقت اتفاقیہ ہی نظر آتا ہے۔

میں تیسری بار بنارس میں وارد ہوئی تھی، دوپہر کا وقت تھا، اور وشواناتھ بازار کا مقدس مقام، تمام بازار پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دُکاندار سادھوؤں کی طرح بیٹھے جھونکے کھا رہے تھے۔ لمبے لمبے جنیو پہنے ہوئے منتر پڑھتے ہوئے اور شیوجی کی مورتی سامنے رکھی ہوئی، پٹری پر آمد و رفت بند تھی، البتہ کبھی کبھی کوئی چڑیا اِدھر سے اُدھر اُڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی جو سائبان کے گھونسلوں میں اُڑکر آئی ہوگی۔ فضا میں وشویشور مندر کے گھڑیال کی گونج اپنا اثر جماتے ہوئے تھی، اِسلئے کہ ہر ایک عبادت گُذار ننگے پاؤں مندر میں پوجا کے لئے داخل ہوتا اور رُخصت کے وقت گھنٹہ بجا کر جاتا، گھنٹہ کی گونجتی ہوئی لہریں تمام شہر میں اپنا ساحرانہ تقدس نشر کرتی رہتی ہیں، یوں خیال فرمایئے کہ لہریں جو تمام اکناف بنارس میں مُنتشر ہوتی ہیں رنج و مسرت اور آمال و آمانی کا مرجع ہیں، گھڑیال ایک نساج ہے جو اتحاد اور اتفاق کے تار بن رہا ہے۔ اور رنج و مسرت کے شکستہ تار بغیر اس کے بے حقیقت ہیں ـــــ،

دروازے سے گذر کر ایک قدم آگے گُل فروشوں کی دُکانیں ہیں جو شیو کی نذر کیلئے سفید پھول بیچتے ہیں۔ کس قدر پُر لطف مشغلہ ہے۔ شیوجی کی نذر کے لئے روز روز پھول دینا، تمام عمر اسی میں بسر کر دینا، کیا کوئی متنفس بھی ایسا ہوگا جس نے یہ دلچسپ مشغلہ اختیار کیا ہوگا اور روز روز اس نذرانہ کے ذریعے نجات کا تصور کرتے ہوئے اسکی نجات نہ ہوگئی ہوگی؟

اس وقت مجھے مغرب کے قدیم اربابِ تقدس یاد آگئے جو گروہ کے گروہ عبادتخانے کے گرد رہتے ہیں۔ بالکل یہی حال اہلِ بنارس کا ہے جو فصیل کے اندر عبادتگاہ کے آس پاس لیٹے پڑے ہیں۔

بنارس اِس لحاظ سے بالکل جدید ہے کہ اُس کی گنگا کنارے کی بستی تقریباً تین سو برس کے اندر اندر آباد ہوئی ہے، ہندوستان میں قدامت اب بھی اپنا تسلط اس قدر رکھتی ہے کہ اگر تمام آبادی کو مٹا دیا جائے تو دوبارہ اسی نہج پر بنا دیا جائیگا، کسی قدیم شہر نے قدامت کے گیت ایسے نہیں گائے ہونگے، گھروں میں، بازاروں میں، گلیوں میں، ہر جگہ قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔ جھوچھتر جو جونپوری پٹھانوں کی تعمیری یادگار ہے ۱۲۰۰ء سے لیکر ۱۶۰۰ء تک کے آثارِ حیات اس سے نمودار ہیں۔ اِسی کے قریب ہم اشوک کے زمانے کی پٹریوں کے چھجے اور کٹہرے دیکھتے ہیں جن میں لکڑی کے بجائے پتھر لگا دیے گئے ہیں، یہیں میں نے ایک مکان میں وسیع ہال بھی دیکھا جس میں سے گنگا صاف نظر آتی ہے، یہ مکان یقیناً دو ہزار برس پہلے کا بنا ہوا ہوگا جیسا کہ اس کے مالک کا خیال ہے۔ یہی وشواناتھ بازار جس میں اب ہم چل پھر رہے ہیں وہی دشت ہوگا جس میں سے ویدک زمانے کے بُزرگ گُزرتے ہونگے۔ جب اُنہوں نے سب سے پہلے مشرق میں دریائے گنگا کے کنارے سُورج نکلتے دیکھا ہوگا، اور اشلوک پڑھتے ہوئے ہوم کیا ہوگا بالکل یہیں جہاں کہ آج وشویشور کا طلائی جنگلہ ہے، سڑک سے زیادہ کوئی جگہ پائدار نہیں ہوتی، جس طرح مغربی ممالک میں باغیچوں اور مکانات کے پیچھے گلیاں ہوتی ہیں اور پگڈنڈیاں ہوتی ہیں جو مرغزار تک چلی جاتی ہیں بالکل اِسی طرح تمام دوسرے ممالک میں بھی گلیاں خاموش تاریخی ثبوت ہیں جن کو کوئی مورخ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا، لیکن اِس چھوٹی سی گلی کے حال کا کون انکشاف کریگا، یا کون ان لوگوں کی موت و حیات پر نظمیں لکھے گا۔ جن کے قدموں نے آمد و رفت میں اِس گلی کے پتھروں کو چہار ہزار سال قبل چھوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بنارس ایک محقق کے خیال سے بھی زیادہ قدیم ہے، یہاں سرناتھ میں ۵۸۳ قبل مسیح یا کچھ اس سے بھی پہلے سب سے بڑے پیغامِ خداوندی کا الہام ہوا جس کی گونج کبھی تاریخ سے ناپید نہیں ہوئی کہ "زاہد و اچھی طرح سُن لو کہ موت سے نجات کی راہ مِل گئی" اور مہاتما بُدھ کے دورانِ حیات میں بھی سرناتھ سے اسکی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے، ان سے پہلے بھی یہ نجات کی جگہ سمجھی جاتی تھی اور فلسفہ میں اپنے زمانے کی بہترین یونیورسٹی تھی۔ تین سو سال

کے بعد اشوک نے مہاتما بدھ کی یادگار میں ان تمام مقامات کے احترام کیلئے گنبد بنا دئے جو پہلے زمین دوز تھے اور جن کو مہاتما بدھ کے قدم مبارک نے مقدس بنا دیا تھا، اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سرناتھ مندر ۵۸۳ قبل مسیح اور پھر ۵۰۰ قبل مسیح ہی میں خصوصیت کا حامل نہیں تھا بلکہ اس کے درمیانی زمانے میں بھی مسلسل مرجع انام اور مذہبی روایات کا زندہ نشان رہا ہے، اور پھر یہ صرف سرناتھ نہیں تھا جس نے نئے مذہب کے سلسلہ میں مہاتما بدھ کو آتے جاتے دیکھا، اور نہ صرف یہ ایک اجگر یا گھنٹہ (مرنے کے بعد کے حقوق کی مقررہ جگہ) تھا جو مذہبی تقدس کے لحاظ سے اسلام کے دور سے پہلے بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وساسو مٹھ گھاٹ اور بازار ایک بہت دراز مدت کی یادگار ہے جس میں کم سے کم دس بادشاہی نسلیں ضرور ختم ہوئی ہونگی۔ پاٹلی پتر خاندان کے دوران حکومت میں بھی بنارس شاہنشاہی کا اعلیٰ تریں مقام تھا۔ بنارس میں اب بھی دو اشوک کے برج ہیں، ایک تو تن کالج گراونڈ میں اور دوسرا سرناتھ کا مٹھ۔ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مہاتما بدھ کے ایام شباب میں بھی بنارس اعلیٰ صنعت و حرفت کا مشہور مرکز تھا، اس لئے کہ بہت سی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مہاتما بدھ نے شاہانہ خلعت اتار کر جو گیروا لباس پہنا وہ بنارسی ریشم کا بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ وہ ہے جس کو حقیقت میں ہم جانتے ہیں، اسلئے کہ دریا کا کنارہ قرون سابقہ میں جغرافیائی اعتبار سے ہر ملک کیلئے بڑی اہمیت رکھتا تھا، اور بنارس کے گنگا کے شمالی جانب محل وقوع نے اس کو تمام مشرقی اور جنوبی ممالک کی منڈی بنا دیا اور اس طرح ہندوستان کا سب سے اہم مرکز بن گیا، اور کہا جا سکتا ہے کہ بنارس سینکڑوں بار لکھی ہوئی قدیم تریں تختی ہے۔ اس میں عمارتوں پر عمارتیں چنی جاتی رہی ہیں اور دور کے اوپر دور گزرتے رہے ہیں۔ بنارس کی گھنی آبادی کے مکانات کی بنیادیں اینٹوں کی کانوں پر رکھی ہوئی ہیں جن کے مالک اپنے قدیم آبا کے ورثہ پر بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں میں نے ایک ایسا مندر دیکھا جس کا فرش عام راستے سے تقریباً دس فٹ نیچے دھسا ہوا ہے، اس کی عمر سترہ اٹھارہ سو برس ہوگی۔

اگر ہم بڑی چیزوں کا چھوٹی سے مقابلہ کریں تو بنارس کو ایام اشوک کا کنٹربری کہا جا سکتا ہے، جیسے دہلی بعد میں راجپوت اور مسلمانوں کا فوجی مرکز رہا اسی طرح بنارس مہاتما بدھ کی قرون اولیٰ کے لئے تمام شہروں کا مرجع رہا۔ سرناتھ میں بڑے بڑے سناسیوں کی یادگار پیروان بدھ و جین نے محفوظ رکھی۔ بنارس میں برہمن بہترین شہری تمدن پیش کرتے ہیں اور عملی طور پر بتا دیتے ہیں کہ اس قادر مطلق کے سوا کوئی نہیں ہے۔ شیو چیتے کی کھال پہنے مہاتما بدھ کی طرح مکاشفہ میں بیٹھا ہے جیسا کہ شیو کا سنگین مجسمہ ابھار کے ساتھ منقش ایلیفنٹا کے دروازے پر بنا ہوا ہے، اور یہ ہندو تخیل بدھ کے مجسمہ کی نقل ہے، اس طرح یہ ویدک شہر جس کی گلیوں میں کبھی مہاتما بدھ چلے تھے شیوجی کا مقدس شہر بن گیا، ان کے نشانات قائم کرنے کے لئے غیر مجسم خدا کے مجسمے تیار ہو گئے، یہ بالکل اسی طرح تیار کئے گئے جیسا کہ مہاتما بدھ کی مقدس یادگار کے لئے بھٹے بنائے گئے تھے، ابھی تک مہاتما بدھ کی ابتدائی یادگاریں باقی ہیں اور انہیں کیساتھ آخر کے زمانہ کی یادگار شیو کی مورتیاں بھی بنارس کی سڑکوں اور گھاٹ پر موجود ہیں جو مہاتما بدھ کے اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔

لیکن بنارس ہندوستان کا صرف کنٹربری ہی نہیں ہے بلکہ یہ یہاں کی آکسفورڈ (یونیورسٹی) بھی ہے۔ مٹھ اور مندروں میں اسکول ہیں۔ ماہران سنسکرت کی قیام گاہیں ہیں، اطراف ہند کے گوشہ گوشہ سے طلبا کے گروہ کے گروہ علوم قدیم اور مذہبی تعلیم کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ ندیا یونیورسٹی سنسکرت کی منطق میں مشہور ہے، لیکن بنارس سنسکرت کی فلاسفی اور برہمنوں کے علوم میں مشہور ہے، اس لئے وہ مذہبی معاملات اور اعتقادات میں حکم ناطق رکھتا ہے اور اطراف و کناف ہند میں ان طلبا کے ذریعے جو یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے صوبوں کو جاتے ہیں اس کا اثر چھایا ہوا ہے۔ بنارس درمیانی زمانے کے تمدن کا گہوارہ ہے۔ یہاں ایک کتاب کے پڑھنے میں آدمی کے بارہ سال صرف ہو جاتے ہیں، اس کے مقابلے میں عصر حاضر کے طریقے کے موافق ہم صرف ایک سال میں عموماً سطحی طور پر تقریباً بیس یا اس سے بھی زیادہ کتب کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مضمون کے ایک ہی رخ سے واقف ہوتے ہیں اور مقابلے کی تعلیم و تبصرہ سے مجبور ہوتے ہیں۔ ہم اس کے صنائع و بدائع سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں لیکن مدارج مقابلہ سے بالکل نابلد۔ بنارس اس صفت خاص سے اعلیٰ ماہر تیار کرتا ہے جو نہایت مستقل مزاج اور اپنے شعبہائے علوم کے بیان کرنے میں ایسے بیباک ہوتے ہیں جیسے ترقی یافتہ دنیا کے درمیانی زمانے کے لوگ بنیان اور ولیم بلیک ہیں۔"

ہم بنارس میں مرکز تہذیب و تمدن ہونے کے لحاظ سے موجودہ زمانے میں بھی (جس میں بنارس کی مرکزیت فنا ہو رہی ہے) ایک اور غیر معمولی دلچسپی محسوس کرتے ہیں کہ وہ سنسکرت تعلیم کا مرکز اور ہندوئیت کا قبلہ ہے۔ وہ جونپور کا بھی حریف ہے۔ وہ جونپور جو ہندوستان میں اسلامی علوم کا مرکز تھا، حقیقت میں بنارس ہند و صوبوں کی سنسکرت تہذیب اور اسلامی فارسی و عربی تہذیب کا سنگھم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنارس اب بھی ایسے بلند معیار کے افراد رکھتا ہے جنہوں نے دنیا میں ایک دفعہ قومی تعلیم کو نہایت مکمل نظام کے ساتھ دستور العمل پیش کر دیا تھا۔ سابق ہندو حضرات اپنی طفلی میں صرف سنسکرت ادب کی ہی ترتیب نہیں پاتے تھے بلکہ اس زمانے کے اعلیٰ و ممتاز شاہی ادب یعنی فارسی شاعری کو بھی جزو تعلیم خیال کرتے تھے۔ اس مرکز اتصال یعنی بنارس میں جو دماغ پیدا ہوئے ہندوؤں کے اعلیٰ پنڈت اور مسلمانوں کے بہترین مولوی وہ علامۂ عصر نہیں تھے بلکہ وہ اِس وسیع عالم میں خلق و تہذیب کا بہترین نمونہ تھے، اعلیٰ تہذیبِ انسانیت اُن ہندوؤں کے ساتھ ہی ختم ہو گئی جنہوں نے فارسی کی بھی ترتیب پائی تھی، جن لوگوں نے موجودہ دَور اور گزشتہ دَور کی تہذیب کا مقابلہ کیا ہوگا انہیں اس میں کوئی شک نہیں ہوگا کہ علم و ادب کا صحیح ذوق تو گزشتہ لوگوں ہی میں تھا جس کے ہلکے ہلکے آثار اب بھی کہیں کہیں ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔

بنارس حقیقت میں ایک اعلیٰ یونیورسٹی ہے جس میں وسطی دَور کی اور یونیورسٹیوں کی طرح طلبا کی باہمی امداد کے ایک وسیع جال کے ذریعہ امداد کی جاتی ہے۔ جب ایک لڑکے کو علم کی محبت سینکڑوں میل پیدل کھینچ لائی تو پھر روٹی مانگ لینے میں کیا ذلت ہے۔ درمیانی زمانے میں آکسفورڈ یا ہنڈل برگ یونیورسٹی میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا یہی طلبا ہیں جن کے لئے ہمارے اسکول اور کالج قائم کئے گئے ہیں، ایسے طلبا کی ضروریات کا انتظام شہری خاندانوں کی بیویاں کر دیتی ہیں، لیکن بنارس میں صرف کھانے کی ضرورت ہے۔ موسم سرما کی ایک تاریک شب کو میں بنگالی ٹولہ کی طرف سے اشنان گھاٹ کو جا رہی تھی کہ میں نے دُور سے سنسکرت پڑھنے کی آواز سنی، میں فوراً ہی ایک طالب علم کے قریب جا پہونچی جو رات بھر ایک اعلیٰ مکان کے پتھر کے چبوترے پر سویا تھا اور اس سردی سے بچنے کے لئے ایک معمولی بوری کا پردہ تان کر رات گزاری تھی، اور صبح پانچ بجے سے پہلے اٹھکر لالٹین کے ذریعے دن کیلئے مطالعہ کر رہا تھا، ایک اور طالب علم دیکھا جس کے پاس نہ بچھانے کیلئے بوری تھی اور نہ لالٹین تھی، وہ تمام رات کھلے ہوئے فرش پر اپنے ایک کمبل میں لپٹا پڑا رہا تھا اور ایک معمولی دِیے کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔

اس محنت و غربت کے ساتھ ان میں علم کی محبت ہے۔ انکے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ کچھ کما لیں اور پھر اپنے اسکولوں کا کام بھی پورا کر لیں، اُمرا، شُرفا اور تاجروں کی سخاوت بیشک درمیانی زمانہ میں کافی تھی، جس وقت کہ مذہبی جوش بہت تھا اور ضروریات محدود تھیں اُن چند پنڈتوں کا خیال کافی تھا جن کے گھروں میں لڑکے رہتے تھے، مگر موجودہ زمانے میں چھتر کی درسگاہیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہر میں تین سو پینسٹھ ہیں۔ چھتر ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں ایک مقررہ تعداد کو روز کھانا ملتا ہے، کہیں دلو ڈول ملتے ہیں، کہیں برہمنوں کے علاوہ دوسروں کو بھی ملتا ہے۔ بہت سوں کیلئے پرہیز گار بیواؤں اور راجاؤں کی طرف سے مقرر ہے۔ لیکن یہ اہل شہر کا فرض ہے کہ وہ تمام طلبا کے لئے کھانا مہیا کریں۔ کیا بنارس شیو کے اُن لڑکوں کیلئے انا پورن ماں نہیں ہے جسکے ہاتھ غلّے سے پُر ہوں۔

بنارس کی عظمت صرف مندروں سے ہی وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ محض ایک یونیورسٹی ہے اور نہ یہ کہ وہ تین ہزار سال کا تاریخی اور صنعتی مرکز ہے بلکہ وہ ان سے بھی بڑھکر عظیم الشان دلچسپیاں خود سے وابستہ رکھتا ہے، مقدس من کرنیکا سب سے اعلیٰ قومی شمشان گنگا کے عین مقابل واقع ہے۔ جو بنارس میں مرتا ہے اُسے نجات حاصل ہوتی ہے، الفاظ دلی کیفیت کے ترجمان ہیں، ایسے حسین ترین گھاٹ پر کون مرنا پسند نہیں کریگا جبکہ شب ہلکے سانس لے رہی ہو یا صبح بنارس کی ابرو پر طلوع ہو رہی ہو، مندروں کی گھنٹیاں، برہمنوں کے اشلوک سنائی دے رہے ہوں، شیو کے وعدے اور گزشتہ عظمت اس کے دل میں ہو۔۔۔۔۔ ایسی موت بذاتِ خود مسرت و شادمانی کا سبب ہے، کیا یہی نجات نہیں ہو گئی؟

"اے خدا تو میرے دل میں خلوت نشیں ہے" یہ الہام تھا جو ایک شخص پر ہوا جبکہ وہ گل فروشوں کی سہ دری سے وشوشیور کے آس پاس ہجوم کئے ہوئے برہمنوں کے اشلوک سننے کے لئے جُھکا۔ ایسا آدمی پھر کبھی خدا کو تخت پر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، خواہ اُس کے بچے بھی اُس کے پاس ہوں، اس لئے کہ یہ راز اسکے

منکشف ہوگیا ہے کہ شیو انسان کے دل میں ہے، خدا علم محض ہے، نور غیر مجسم ہے، اور ذات مطلق ہے ــــ ہم میں سے کون نہیں مریگا اُس مقام پر جہاں ذات مطلق کا نورانی پیغام دل میں سما رہا ہو۔

تمام ہندوستان اِسے محسوس کرتا ہے، تمام ہندوستان اِس دعوت کو سُن رہا ہے، اور ایک کے بعد ایک قدم قدم چلتے ہوئے سر جُھکائے ہوئے، ننگے پاؤں اطرافِ ہند سے وہ لوگ آرہے ہیں (خصوصاً بیوائیں اور سادھو) جنہوں نے زندگی ہی میں تمام خواہشات کو ترک کر دیا ہے اور محض خاتمہ بخیر چاہتے ہیں۔ بنارس میں بہت سی ستی کی یادگاریں دکھائی دیتی ہیں، کچھ ستی کرنیکا گھاٹ پر اور بہت سے نشانات باہر جنگلوں اور سڑکوں پر موجود ہیں۔ یہ بیواؤں کے نقشِ وفا ہیں جو رنج و الم میں کامیاب ہوئیں۔ یہاں بنارس میں کچھ نقش وفا و مسرت اور ہیں، سفید کپڑے سفید ساڑھی پہنے ہوئے۔ نہاتے ہوئے روزہ رکھتے ہوئے، دُعا کرتے ہوئے تاریک گلیوں میں ہزاروں وہ عورتیں رہتی ہیں جن کی زندگی آخرت کی نیکیوں کی تحصیل کے لئے ایک طویل جد و جہد ہے اور عام لوگ اگر قومی خدمت گار ہیں تو زاہد بھی کچھ کم نہیں ــــــ عملی عورت کی شمع مورتی کے چرنوں میں تاریک سائبان کے نیچے جل رہی ہے، اس میں بالکل لرزش نہیں۔ کیا یہی روشنی تمام دُنیا میں نہیں پھیل رہی ہے۔

بنارس تمام ہندوستان کی قومیت کا اجتماعی سنگم اور مرکز ہے، اور اگر کوئی نیا شخص دریا کے بہاؤ کی طرف کشتی میں سیر کرے تو وہ مندروں اور اشنان گھاٹوں کی ایک طویل قطار کے پاس سے گزرے گا۔ اُن میں سے جب ہر ایک کی تاریخ دُہرائی جائے گی تو پھر ایک خوبصورت عمارت کا نظارہ کرتے ہوئے وہ محسوس کرے گا کہ ہندوستان کے تمام مذاہب کی رہنمائی بنارس کو ہی کرنی چاہیئے۔

یہاں کیدار ناتھ کا مندر ہے جو شمالی سادھوؤں کا مرکز ہے اور جو اہلِ بنارس کے لئے ہمالیہ یاترائی کی تمام خوبیوں کا نمونہ ہے، قریب ہی اہلیا بائی رانی کا گھاٹ ہے جو زبردست مرہٹہ رانی گزری ہے، جس کے مندر اور سڑکیں تمام ہندوستان میں رانی کے مہربان دل کی گواہی دیتی ہیں، اس کے بعد شنکر اچاریہ کا مٹھ اور ناگپور محل وغیرہ زبردست چیزیں یکے بعد دیگرے بنی ہیں، اگرچہ یہ شیو کا شہر ہے لیکن تمام چیزیں شیو جی کے نام پر ہی معنون نہیں ہیں، یہاں، بنی مادھو کا بھی مندر ہے جو وشنو کا عزیز ترین نام ہے۔ یہاں تو مسلمان حکومت کے آثار بھی بُھلائے نہیں جا سکتے، اکبر کے زمانے کے مان مندر

اس کے کتھا کے ہال اور سائبان میں انتہائی انسانی صناعی صرف کی گئی ہے، اور اورنگ زیبی مسجد اپنے میناروں میں اسلامی معتقدات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ حقیقت میں گنگا کا نظارہ اور بھی پُر لطف ہو جاتا ہے۔ جب ہم گزشتہ کا خیال کرتے ہیں اور مجموعی طور سے شہر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے کوئی نئی عمارت نہیں بنوائی بلکہ اُس نے امرت سر کے ساتھ ایک ناقابل شکست نشانی وشویشور مندر میں قائم کر دی ہے۔ یعنی اُس کی چھت میں سونے کے پتر جڑ دئے ہیں، بنگال کے زمیندار، پنجاب کے سکھ، راجپوتانہ کے شرفا نے غرضکہ تمام نے مندر، چھتریاں، سدا برت اور دوسرے صدقات قائم کر کے نیکیوں میں حصّہ لیا ہے جو پانچ کوس تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بنارس صنعتی صدر مقام بھی ہے، اس کے بُنے ہوئے خوشنما نازک تھانوں کے علاوہ ہم بنارس میں مدراسی اور دکھنی ساڑھیاں بھی خرید سکتے ہیں۔ وشو ناتھ بازار میں لکڑی کا پنجابی صنعتی کام ملیگا، اور اسی بازار میں ناسک ٹرچینا پولی۔ نیپالی سرحد کا پیتلی سامان خریدا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے دیگر مقامات کی نسبت یہاں گیا، جبل پور اور آگرہ کے مٹی کے برتن اور نربدا کے شیو اور گومتی و نیپال کے سالگ رام اچھے دستیاب ہوتے ہیں، یہاں کی گلیوں میں ہر صوبے کا کھانا خریدا جا سکتا ہے۔ یہاں کی چہار دیواری میں ہندوستان کی ہر ایک زبان سُننے میں آتی ہے۔

ایک مقدس شہر میں یقیناً سکانِ شہر کو باہمی امداد کی اپنی حفاظت کے لئے عظیم ترین ضرورت ہوتی ہے، اس قِسم کے شہر کے لئے دیگر مقامات کی بہ نسبت پولس کی زیادہ ضرورت ہے۔ صفائی، تیمارداری، شفاخانوں اور بدمعاشوں کے لئے کیا انتظام کیا گیا تھا، یہ چیزیں درمیانی زمانے میں اُسی نام سے موسوم نہیں ہونگی لیکن یقیناً اس قسم کے کسی نہ کسی صورت میں سب انتظامات ہونگے۔ باشندے ایک احاطے یا ایک گلی کی جماعت بنا لیتے تھے، بنارس چھوٹی چھوٹی گلیوں اور فصیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ شاہراہ سی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر ایک کے سِرے پر ایک دروازہ بنا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے ان میں سے ہر ایک اپنا محافظ رکھتا تھا۔ اکثر مقامات سے پھاٹک اُتار لئے گئے ہیں، لیکن سُتون، کُندے اور چوکھٹیں اب تک قدامت کے آثار اور شہادت موجود ہیں۔ بعض جگہ پھاٹک دیوار کے سہارے لگے ہوئے ہیں اور گزرنے والا آدمی ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنے لگتا ہے کہ یہ کتنے برس پہلے

آخری مرتبہ بند کئے گئے ہوں گے۔ ہر ہر احاطے کے ہندوؤں کی جانب سے بنائے ہوئے دروازے حقیقت میں بنارس کی صفائی کی خاموش شہادت ہیں۔ ایڈنبرگ اور پیرس کی طرح یہاں بھی اُمرا کے احاطے رات ہوتے ہی بند کر لئے جاتے تھے اور وہ اِس احاطے میں آزادانہ طور سے اچھائی اور بُرائی کے ذمّہ دار ہوتے تھے، احاطہ کی صفائی کا تعلق شہر کی زمین دوز نالیوں سے ہونا ضروری تھا جو بالکل قدیم پاٹلی پتر کی طرح تھا۔ وہاں بیماروں کے لئے نہایت ذمّہ دارانہ طور سے تیمار داری کا انتظام ہوتا تھا۔ اور اس احاطے کے اراکین مجموعی طور سے شہری اُمور میں پورا پورا حصّہ لیتے تھے۔ اگر ہم کسی محلہ یا احاطہ کے دروازے پر غور کریں جہاں بعض جگہ اب بھی چوکیدار باہر کھڑا ہوا ہے تو ہم درمیانی زمانے کے دماغوں کی قابلیت کے شہری انتظام اور حفاظت کی نسبت اندازہ کر سکیں گے، اس لئے کہ ان دروازوں پر ہم خدائی کوتوال کا بھیروں کا پتلا بنا ہوا دیکھتے ہیں، جو ہر شب کو شیو کے شہر میں لکڑی اور کتّے کے ساتھ گھومتا ہے سنتری اور چوکیدار جس کی پوجا کرتے ہیں، اور جو کمزور اس مبارک سرحد میں آنا چاہیں اُن کا داخلہ اسکے اختیار میں ہے، ہر ایک شہر کا محافظ خود کو اُس خدائی کوتوال کا نائب اور دُنیاوی نمائندہ تصوّر کرتا ہے۔ کال بھیروں یعنی شیو کی اُس سیاہ مورتی کی پوجا میں ہم درمیانی زمانے میں بنارس کے شہری انتظام کی تمام تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔

اور مقامات کی بہ نسبت نیا زمانہ یہاں کچھ دیر میں آیا لیکن آہی گیا۔ جب یہ یہاں آیا تو اس کا کام اور مقامات کی طرح وہی تعداد مسائل تھے، اور ان طریقوں کی وقعت اُٹھا دینا تھا جو آہستہ ترقی کے دور میں دریافت کئے گئے تھے۔ وہ تمام خود حفاظتی رسّیاں جو جو بہت سے مقامی رشتوں سے اور مُلکی ذمّہ داریوں سے کَسی ہوئی تھیں، اور جن کے ذریعے بنارس اپنی ضروریات پوری کرتا تھا سب منقطع ہو گئیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کو سخت نقصان پہونچا اس لئے کہ یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ یہ اجتماعی اور مرکزی طاقت کے مقابلہ میں بیکار ہے۔ اس لئے ذاتی اختیارات اور شہر کے خانگی انتظامات کا خاتمہ ہو گیا۔ اِسی اثنا میں ریلوے نے بنارس کو تمام ہندوستان سے مِلا دیا۔ اور یہ ممکن کر دیا کہ ایک روز میں اس قدر بیمار، آوارہ اور بھوکے لوگ آکر بھر جائیں جتنے کہ ایک سال کی مدّت میں پیدل چلکر یا کشتی کے ذریعے آسکتے تھے۔ اس سے موجودہ بنارس ضروریات کا گہوارہ بن گیا ہے جسکے سامنے گذشتہ قوم کی عقلمندیاں جذبہ

خدمت اور اقتصادی شہری نظم بیکار ہے۔

جب غریبوں کی آرزوؤں کی آخری کرن بھی ماند پڑجاتی ہے تو وہ اُمید لگا کر یہاں آتے ہیں کہ ایشور اُن کو اپنے شہر میں پناہ دیگا۔ قدیم ایام میں جبکہ بنارس ایک دولتمند شہر تھا، اس وقت یہ لوگ بعض مکانوں میں یا اپنے ضلع سے آتے ہوئے دولتمند لوگوں کے احاطوں میں گنجائش پا سکتے ہونگے اور اُن کی اعانت سے رفتہ رفتہ کام سے بھی لگ جاتے ہوں گے لیکن اب تو وہ خود کو بیگانوں میں پاتے ہیں، صرف مندر کی گھڑیال کی موسیقی ان کی ایک آشنا صدا ہے۔ پُجاری اور گُرد تو انجان ہیں ہی، اور آخر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بلدِ امین میں پے در پے آفتوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔

یا غریب طالب علم یہاں پڑھنے آتا ہے، زمانۂ قدیم میں اسکے لئے اُستاد یا کسی امیر سرپرست کے وہاں کمرہ اور کھانے کا انتظام ہو جاتا تھا، اگر وہ بیمار پڑ جاتا تھا تو گھر کے ایک رُکن کی طرح اس کی خدمت کی جاتی تھی، لیکن آجکل اس قِسم کے طالب علموں کی کثرت ہے۔ اور عام طور سے ان میں اکثر کاہل ہیں۔ بہت سی خواہشات نے انہیں لاجمع کیا ہے، اور ہر وہ اخلاقی قدیم رشتہ جو احاطوں اور دُور کے ممالک میں تھا وہ بھی جاتا رہا، بسا اوقات ان طالب علموں میں نہایت محنتی اور اچھے طالب علم بھی جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سڑکوں پر زندگی بسر کرتے ہیں، اور جب بیمار ہوتے ہیں تو کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں ہوتا، اس لئے کہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ چیتھر کی بیٹنگ نے بردست درسگاہیں ہیں جو اپنے بچّوں کی ضروریات پوری کر کے اِس قدیم شہر کی خلافت اُمید طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لیکن چیتھر مکانات اور شفاخانے مُہیا نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اِن چیزوں کی بھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔

اور آخر میں شریف عورتوں کا معاملہ ہے جو اپنے وفات یافتہ کیلئے دُعا کرنے بنارس آتی ہیں، دوسروں کی طرح ان کے لئے بھی عام طور سے یہاں کوئی سامان مُہیا نہیں ہے۔ آجکل وہ کسی مُلاقاتی کے یہاں نہیں آسکتی ہیں، بلکہ انہیں کمرہ کرایہ پر لینا پڑتا ہے، مالک مکان کو کرایہ دینا پڑتا ہے۔ ہم ساہوکاروں کو بُرا کہنے کی بھی ہمّت نہیں کر سکتے جو اپنے کرایہ دار کو باہر نکال دیتا ہے ——— خواہ وہ ناز و نعم میں پلی ہوئی ایک عورت ہی کیوں نہ ہو، جبکہ کرایہ بہت عرصے کا باقی ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ خود کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے تو بیشک وقت کے دباؤ کے موافق اسی معیار و رفتار سے وہ بھی عمل کریگا۔ ان سب سے زیادہ مؤثر چیز پولیس کا خوف ہے جو ہر جگہ بیکسوں میں (بقیہ بر صفحہ ۴۲)

ہماری مہذب دُنیا کے ہنگاموں سے بے نیاز بُت تراش کی اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا آباد ہے۔ پہاڑ کے غیر ہموار ٹیلوں پر، شاداب مگر خاردار جھاڑیوں میں، آوارہ بادلوں میں، پریشان ہواؤں میں، گنگناتے ہوئے آبشاروں میں، قصّہ گو ستاروں میں۔ ہماری مہذب دُنیا کے ہنگاموں سے بے نیاز، بُت تراش کی اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا آباد ہے!

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے۔ ظلمت آفریں شب کی معصیت آشکار تاریکی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک رات کے سیاہ آنچل پر شب زندہ دار ثوابت وسیّار کا مدانی کی طرح دمک رہے ہیں! ہوا کے سرد جھونکے خوابیدہ درختوں کی شاخوں اور پتّیوں کو گدگداتے ہوئے نہ معلوم کہاں جا رہے ہیں؟

جس طرح سوتے سوتے کبھی کوئی بچّہ اُچھل پڑتا ہے، اسی طرح گیدڑوں کی آواز سے جنگل کی خاموشی بار بار لرز اُٹھتی ہے۔ سیاہیاں مضطرب ہو کر پھر مجتمع ہو جاتی ہیں۔

پَو پھٹ رہی ہے۔ عالم آغوشِ سحر میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ جانور بیدار ہو چکے انسان بیدار ہونا باقی ہے — وہ انسان جو اپنی اس غیر مرئی دُنیا کی طرح عالمِ رنگ و بو کے اور انسانوں سے مختلف بھی ہے اور بے نیاز بھی! اس سب کے باوجود اُس کی ہستی زندگی کے ہر ممکن شعبہ سے مزیّن ہے، مگر کسی قدر مختلف! اس کی اخلاقیات مقتضائے فطرت پر منحصر ہیں۔ اس کی معاشرتی زندگی کا پہلو وحوش و بہائم سے وابستہ ہے، اس کا فلسفہ اقتصادیات اسکے الفاظ پر کار کن ہے۔ اسکا مقصدِ حیات محبّت اور صرف محبت ہے۔ جس کو یہ آج تک نہیں پا سکا ہے۔ کل کی خبر نہیں ہے۔ محبت! — آہ کتنا دلکش لفظ ہے!

دن نکل آیا — سنہری دُھوپ۔ شبنم آلود پتّوں کو جگمگاتی ہوئی غار کے اندر داخل ہوئی اور بُت تراش کے گرد آلود آہنی چہرے پر چمکنے لگی۔

"تُو نے نہیں اُٹھایا؟" دُھوپ نے غار کی ہوا سے کہا۔

"بہت اُٹھایا۔ اُٹھاتے اُٹھاتے ہار گئی.... مگر نہ اُٹھنا تھے نہ اُٹھے؟..." ہوا نے کسی قدر سرد مہری سے جواب دیا۔

"تجھے جگانا نہیں سُلانا آتا ہے، میں اُٹھاتی ہوں دیکھ!" دُھوپ نے ہوا سے کہا اور اپنی تابانی کو فروغ دیا۔ "اب تو اُٹھ بیٹھو، لو میں آ گئی ہوں!" دُھوپ نے بُت تراش سے کہا۔

بُت تراش نے ایک کروٹ لی اور پھر خرّاٹے لینے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا.... اب مت سو.... اب اُٹھ بیٹھو.... دیکھو تو پتھروں پر لگی ہوئی کائی تک بیدار ہو چکی ہے.... اور تم سو رہے ہو!"

بُت تراش نے اپنے لانبے اور نکیلے ناخنوں سے اپنی اُلجھی ہوئی اور پریشان ڈاڑھی کو کھجایا اور چت ہو گیا۔

"یوں نہیں اُٹھو گے!" دُھوپ نے کہا اور اپنی شعاعِ افگن دراز اُنگلیوں کو نہایت آہستگی سے بالوں میں سے گذار کر بُت تراش کے چہرے پر پہونچا دیا۔

"...اب اُٹھتے ہو یا بتاؤں؟" دُھوپ نے پھر پوچھا۔

بُت تراش اُسی سکون اور اطمینان سے سوتا رہا۔ دُھوپ نے تنگ آ کر اُس کے چہرے کو گدگدایا، بُت تراش نے ایک آدھ مرتبہ اپنے سر کو اِدھر اُدھر جنبش دی اور آنکھیں کھول دیں۔

بُت تراش نے ایک جمائی لی اور آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا: "تو آپ آ گئیں.... آں.... بہت دیر ہو گئی؟"

"تمہیں کیا، میں دو گھنٹے سے اُٹھا رہی ہوں.... تمہیں کچھ اور بھی آتا ہے.... دن بھر بیٹھے بیٹھے کھٹ کھٹ کھٹ پتھر توڑا کرتے ہو اور پھر رات بھر سویا کرتے ہو۔" دُھوپ نے جل کر کہا۔

"آنا تو نہیں.... مگر شاید آ جائے۔" بُت تراش نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آ جائے.... ذرا مجھے تو بتاؤ" دُھوپ نے کسی قدر تیز ہو کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" بُت تراش نے اپنی گنجان ڈاڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر وہی واہی تباہی باتیں.... تمہیں نہیں معلوم تو پھر آ کیا جائے؟....!"

دُھوپ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ بُت تراش نے بات کاٹتے

ہوئے کہا ۔ تو میں اب چلا ۔۔۔ تم بھی جاؤ ۔۔۔ پہاڑ کے اس طرف سیب اور آڑو کے ننھے منے پودے تمہارے منتظر ہیں !"

بُت تراش لغزیدہ قدموں کے ساتھ غار سے باہر نکلا اور اپنی لانبی اور گھنی پلکوں کو دو چار بار جلدی جلدی جھپکا کر آسمان کو گھورنے لگا سورج کسی قدر اور بلند ہو کر پہاڑ کی دوسری جانب چمک رہا تھا۔ اس نے اپنی پنجہ شکن انگلیوں سے دو تین مرتبہ اپنی بڑی اور گلابی آنکھوں کو ملا۔ ایک دفعہ پھر آسمان پر ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور گردن جھکائے ہوئے ایک طرف کو ہو لیا، اُس کی گفتگو غیر معمولی حد تک فلسفیانہ ہوتی تھی۔ اُس کی رفتار میں دیوانگی کے ساتھ ساتھ عظمت نمایاں تھی ۔۔۔ اُسکی وحشی اور متجسس آنکھیں روشن اور پُرآب تھیں اور اُس کے جسم پر اُگے ہوئے بال "خودرو" گھاس کی طرح لانبے نرم اور شاداب تھے ! یہ اپنے ہاتھوں کو ہلاتا ہوا ۔ کسی خیال میں کھویا ہوا ۔۔۔ کچھ جاگا ہوا کچھ سویا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکایک شاہ بلوط کے درخت کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو بگاڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔ کہاں چلے بُت تراش ۔ آج تو کئی دن میں اِدھر آنا ہوا ہے، آؤ بیٹھو تو کچھ باتیں ہی رہیں" درخت نے کہا۔

"وہ آج ذرا معبد جانا ہے نا ۔۔۔ پھر کسی روز آؤنگا" بُت تراش نے بغیر اپنی رفتار کو کم کئے ہوئے جواب دیا اور چلتا رہا ۔ فرق صرف اسقدر ہوا کہ پہلے ایک رفتار تھی اور اب ایک اضطراب ، یا یوں کہئے کہ پہلے ایک دیوانگی تھی اور اب ، ایک زندگی ۔ یا یوں سمجھئے کہ پہلے ایک جمود تھا اور اب ایک حرکت ۔۔۔ یا اس سب کے برخلاف سمجھ لیجئے ۔ غرض اس کی گذشتہ اور موجودہ رفتار میں ایک بیّن فرق تھا جو یا یہ تھا یا وہ تھا ! رفتہ رفتہ بُت تراش کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ٹھہر گیا ۔ پتاور اور نکیلے پتھروں کی مدد سے وہ اُس پہاڑی پر چڑھا اور آہستہ آہستہ ایک طرف کو چلا ۔ یہاں پہنچکر اُس نے دیکھا کہ اس کا عزیز چشمہ ۔۔۔ ع ۔

سوکھا پڑا ہے وسعتِ دریا لئے ہوئے !

بُت تراش کو دیکھتے ہی چشمہ نے کہا "آؤ آؤ بُت تراش ، ٹھٹک کیوں گئے ؟"

"کچھ نہیں دُبرو ۔ وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا ۔۔۔"

"کیا بتائیں بُت تراش ، بارش ہی نہیں ہوئی ، پانی کہاں سے لائیں ۔۔۔ بڑا افسوس ہے ۔۔۔"

"اچھا پھر چلے ۔۔۔ کسی قدر ضروری کام ہے ۔۔۔ وہاں ذرا معبد جو جانا ہے نا ۔۔۔ ذرا "منیرا" کو اور دیکھ لیں"

"ہاں ہو آؤ شاید کام چل جائے ۔۔۔ بارش ہی نہیں ہوئی بُت تراش پانی کہاں سے لائیں"

"وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا ۔۔۔" بُت تراش نے کہا اور کسی خیال میں اور زیادہ مستغرق ایک طرف کو چل دیا ۔ پہاڑوں کی تین قطاریں طے کرنے کے بعد یہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی نے اہلاً وسہلاً مرحبا کہکر اُسے چونکا دیا !

"خیر تو ہے، آج اِدھر کیسے آ نکلے ۔۔۔ دُبرو سے دوستی ہو گئی ہے ۔۔۔ اب اِدھر کیوں آنے لگے ؟"

"نہیں نہیں مَنیرا یہ بات نہیں ۔۔۔ وہ ذرا قریب ہے نا ، بس یہی بات ہے ۔۔۔ آج گئے تھے دُبرو کے بھی پاس ، بیچارہ خشک پڑا تھا، کہنے لگا بارش ہی نہیں ہوئی بُت تراش پانی کہاں سے لائیں ۔۔۔ تم سے ملے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا تھا ۔۔۔ اور پھر وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا ۔۔۔۔۔۔"

"ٹھیک تو کہتا تھا غریب بارش ہی نہیں ہوئی پانی کہاں سے لائے ۔۔۔ لو پانی ، کہو کتنا پانی چاہیئے ۔۔۔ بات یہ ہے بُت تراش، جو کسی کے تابع رہتے ہیں وہ بیچارے نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے ۔۔۔ اور جو اپنے نہاں خانۂ دل میں چشمہ رکھتے ہیں انہیں اس سب کی ضرورت نہیں ! اپنے اندر چشمہ بہا لو بُت تراش، پھر دُبرو اور مَنیرا دونوں سے بے نیازی ہے ۔۔۔۔!"

"اپنے اندر بہالوں ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟"

"چشمہ تمہیں میں ہے بُت تراش ۔ منہ بند ہے، کوشش کرو بہنے لگیگا"

"اچھا تو بہنے لگیگا ۔۔۔ پھر دُبرو اور مَنیرا دونوں سے بے نیازی ہے ۔ مگر وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا" بُت تراش یہ کہکر جھرنے کے پاس بیٹھ گیا اور نہانے لگا۔

"تم اکثر معبد جایا کرتے ہو ۔۔۔ وہاں کس کی عبادت ہوتی ہے ؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" بُت تراش نے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا کیا مذہب ہے ؟"

"شاید جستجو میرا مذہب ہے اور محبت میرا ایمان ہے مَنیرا !"

"مگر وہاں تو تمہارے اپنے بنائے ہوئے بُت ہیں نا ؟"

"ہاں ٹھیک ہے ۔۔۔ شاید انہیں کی پوجا کرتا ہوں"

"سب کی ؟ وہ تو بہت سے ہیں !"

"نہیں ایک کی... حقیقت تو سب کی پتھر ہی ہے نا؟"

"مگر وہ تو تمہارے بناتے ہوتے ہیں، اپنے بناتے ہوتے کی آپ پوجا کرتے ہو؟"

"ہاں پوجا تو اپنے ہی کی ہوتی ہے.... آن نہیں ہوتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں.... پتہ لگا تو بتاؤں گا.... اچھا تو پھر چلا منیرا.... وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا؟"

بُت تراش نہا دھو کر وہاں سے چلدیا۔ اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں پانی کے شبنمی قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں بہتے بہتے اس حد تک پہونچ گیا تھا، یہ شاید اُسی بھی نہ معلوم تھا کہ اُسے کہاں پہونچنا ہے! وہ چلتا رہا اور اپنے غار پر پہونچا۔ یہاں سے اُس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور اپنے نئے بناتے ہوئے بُت کو نہایت احترام سے اُٹھا کر معبد کی طرف چلدیا۔ پتھریلی چٹانوں پر پا برہنہ گھومنے سے اُس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ مگر وہ اس سب کی پروا نہ کرتا تھا، اُس کے نزدیک زندگی نام تھا حرکت کا اور اس کے قائم رکھنے کے لئے اُس کے راستے میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکتی تھی۔ وہ طوفان کی طرح پہاڑوں اور میدانوں سے گذرتا چلا جاتا تھا — اسی طرح وہ آج بھی جا رہا تھا!

بالآخر وہ اپنے معبد پر پہونچ گیا، یہ جگہ پہاڑ کی ایک اُونچی سی چوٹی پر واقع تھی۔ وہاں نہ کوئی عمارت تھی اور نہ کوئی مکان!۔ مگر معبد تھا صرف معبد! اس چوٹی پر اُس کے بناتے ہوئے متعدد بُت رکھے ہوتے تھے۔ جب یہ کوئی نیا بُت بناتا تھا تو اُسے نہایت احترام کیساتھ یہاں لا کر رکھتا تھا۔ اور اس جگہ کو معبد کہا کرتا تھا!

بُت تراش نے اپنے بُتوں کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے!
بانگِ درا، بالِ جبریل، اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق، ضربِ کلیم وغیرہ وغیرہ اور آج جو بُت یہ بنا کر لایا تھا اُس کا نام تھا مُسافر!

مُسافر کو منزلِ مقصود پر پہونچانے کے بعد بُت تراش نے سکون اور اطمینان کا ایک ٹھنڈا سانس لیا اور آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے اُتر آیا! دھوپ تیز تھی، بُت تراش کو پسینہ آرہا تھا وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر جا رہا تھا۔ اُس کی نگاہ اُٹھی اور اُس نے دیکھا کہ سامنے والے درخت کی ایک پتلی سی شاخ پر فاختہ کا جوڑا بیٹھا ہوا ہے،

فاختہ آنکھیں بند کئے، پر پھیلائے بیٹھی ہے اور نر اپنی چونچ سے اُسکے سر اور پَروں کو کھجا رہا ہے!

"او ہو بُت تراش... کہاں چلے! یہاں آؤ یہاں آؤ" فاختہ نے پکارا۔ دوسری فاختہ نے اپنے پھُولے ہوئے پروں کو سمیٹتے ہوئے آنکھیں کھولدیں۔

"کہیں نہیں" بُت تراش نے جواب دیا اور درخت کے نیچے آگیا۔

"کہاں سے آرہے ہو بُت تراش"

"معبد سے"

"اور کہاں جا رہے تھے؟"

"جہاں پہونچ جاتا!"

فاختہ کو ہنسی آگئی "تم کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہو؟"

"مَیں کس قسم کی باتیں کیا کرتا ہوں؟ تمہارے سوال کا جواب دے رہا تھا"

"یہ تمہیں نہیں معلوم کہ تم کہاں جا رہے تھے؟"

"مجھے واقعی نہیں معلوم"

"پھر کسے معلوم ہے؟"

"جانے اور لیجانے والی ہستی کو" بُت تراش نے اپنے پاؤں کی مٹی کو ملتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ کون ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم!"

"تمہیں یہ بھی نہیں معلوم، وہ بھی نہیں معلوم، تو پھر آخر تمہیں کیا معلوم ہے؟"

"مَیں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ کبھی کبھی تو صرف مَیں ہوتا ہوں... مگر بہت کم... اور کوئی نہیں ہوتا — اور اکثر کوئی اور ہی ہوتا ہے اور... میں... نہیں... ہوتا"

"اچھا جب تم ہوتے ہو تو تم کیا کیا کرتے ہو؟"

"وہ مجھے یاد نہیں رہتا.... اس لئے کہ جب مجھے یہ احساس شروع ہو جاتا ہے کہ میں تھا تو اُس وقت عالمِ امکان پر کوئی اور کارفرمائی کر رہا ہوتا ہے!"

فاختہ نے کسی قدر سنجیدگی سے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ تم تنہا ہو، تمہاری زندگی ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہے... جہاں بے بسی ہے اور مایوسی (بُت تراش غور سے سُنتا ہے) وہ اُبھرنا چاہتی ہے مگر بُجھ کر رہ جاتی ہے.... اپنی زندگی کو کسی سے معنون کردو...

اُس کے بعد تمہاری جبینِ شوق میں سجدے بیدار ہوں گے ......
انہیں اُسی سے منتسب کر دو .... یہ کیفیت جاتی رہیگی بُت تراش!"
"زندگی کہاں ہے جو کسی سے منتسب کی جاسکے"
"محبت کرو بُت تراش، زندگی اور خودداری دونوں پیدا ہو جائیں گی"
"محبت، وہ تو میرا ایمان ہے؟"
"ہاں مگر بعینہ تعیّن کے بیکار بھی ہے اور خوابیدہ بھی ۔۔ پہلے بیدار کرو، تعیّن خود بخود ہو جائیگا!"
"مگر میں محبت تو کرتا ہوں نا شاید؟"
"کس سے کرتے ہو، اچھا ذرا بتاؤ تو سہی؟"
"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!"
"ہاں تو بس یہی تو کہہ رہی ہوں" فاختہ نے کہا "یہی تو معلوم کر لینے کی ضرورت ہے!"
"تو آخر کس سے محبت کرنے لگوں ... تمہیں بتاؤ"
"اپنے آپ سے .... اپنی ذات سے" فاختہ نے کہا۔
"یہ کیسے ممکن ہے؟" بُت تراش نے بھووں پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"حیرت سے گذر جاؤ بُت تراش اور تعیّنات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو ـــــــ یہی مقصدِ حیات ہے!"
"کیا کہا حیرت سے گذر جاؤں ... یہی مقصدِ حیات ہے .... یہ حیرت کیا چیز ہے؟"
"محبت کی خاموش لہروں میں سویا ہوا طوفان!"
بُت تراش خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ دوسری فاختہ نے جو اس تمام دوران میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی، اپنی دُم ہلا کر آنکھیں کھول دیں اور اپنے پیروں کو کھجانے لگی۔
فاختہ نے کہا "اب گھر جا کر سوچنا ... ہم تو چلے بُت تراش .... دوپہر ڈھل گئی کچھ دانا تلاش کریں"
بُت تراش نے زمین پر گڑی ہوئی آنکھوں کو اوپر اُٹھایا۔۔
... اور فاختہ کا جوڑا ایک طرف کو اُڑ گیا .... اور تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی کے اُس طرف جا کر بُت تراش کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا!

وہ دوسروں کی خوشی اور مسرت کو غور سے دیکھتا ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے کس طرح مل سکتی ہے؟ اُسکی زندگی ہمیشہ غم سے دوچار رہی ہے اور آج بھی ہے۔
خوشی شاید کوئی چیز ہوتی ہوگی ۔۔ مگر وہ اس سے واقف نہ۔

"حیرت سے گذر جاؤ اور تعیّنات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو ...... یہی مقصدِ حیات ہے" سوچتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا بُت تراش جس طرف سے آیا تھا اُسی طرف کو چلدیا، فاختہ کے اس فقرے نے بُت تراش کے نظریۂ حیات کو عجیب طرح سے متاثر کیا تھا! یہ فقرہ اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا وہ مبہوت تھا، بات یقیناً سلیقہ کی تھی مگر اس کا حصول اپنی جگہ ایک سوال تھا، وہ اپنی منزل کی طرف چلتا رہا ۔۔ نامعلوم منزل کی طرف ـــــ غیر محسوس طریقہ پر چلتا رہا۔ پہاڑ کے مختلف نشیب و فراز سے گذرنے میں آج اُس کے قدم اُتنے نہیں ڈگمگا رہے تھے ـــــ آج اُس کے راستہ میں روشنی سی تھی ـــــ اُس کے ارادے میں کسی قدر استقلال، مگر اُس کا دماغ ہمیشہ سے زیادہ پراگندہ تھا اور اُس کے خیالات ضرورت سے زیادہ متلاطم! راستہ میں بہت سی چیزوں نے اُسے روکنا چاہا مگر وہ ہر ایک سے یہی کہتا ہوا کہ "حیرت سے گذر جاؤ اور تعیّنات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو، یہی مقصدِ حیات ہے" آگے بڑھتا چلا گیا اور بالآخر اُس نے اُس وقت دَم لیا جب وہ اپنے غار کے سامنے پہونچ گیا ـــــ اُس کی رفتار کم ہو گئی اور اُس کے اعضا مضمحل! وہ سیدھا اپنے غار میں چلا گیا اور بغیر کچھ کھائے پئے ایک طرف کو لیٹ گیا۔

تین دن اور تین راتیں اسی طرح گذر گئیں وہ جہاں لیٹا تھا وہیں لیٹا رہا، اُس کی آنکھیں غار کی سیاہ اور کائی آلود چھت کو نہایت خوفناک طریقے پر گھورتی رہیں، گذشتہ تین روز سے ہر چیز بُت تراش کی منتظر ہے ـــــ سوائے غار کی نم آلود ہوا، ٹیڑھے اور غیر ہموار پتھروں اور کنارے پر لگی ہوئی کائی کے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ بت تراش کہاں ہے اور کس حال میں ہے ـــــ مگر کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔ اس کا سب کو احساس تھا۔ نہ معلوم کیوں؟

رات ہو چکی ہے .... ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے ... شمشاد اور شاہ بلوط کے تناور درخت عفریت پیکر دیووں کی طرح اپنے سروں کو ہلا رہے ہیں ـــــ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پراگندہ ہو رہے ہیں! چاندکی سرد اور نورانی وادیوں میں بہنے والی

دوشیزہ ہوا کی تیز رفتار لہروں پر بیٹھکر زمین کی سیاحت کے لئے آہستہ سے دُنیا میں آئی اور خاموشی سے غار میں داخل ہوئی ——— غار کی تاریکی مدھسم چاندنی سے بدل گئی ——— بُت تراش بے خبر سو رہا ہے ——— تین دن کے بعد آج اُس کی آنکھ لگی ہے ——— غار کی ہر چیز سو رہی ہے ——— وہ دبے پاؤں واپس لوٹ گئی ——— آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پراگندہ ہو رہے ہیں۔

سوتے سوتے بُت تراش ایک دم اُچھلا اور آنکھیں کھولدیں، کچھ عرصے تک بغیر پلک جھپکاتے ہوئے وہ غار کے باہر دیکھتا رہا اور اس کے بعد یکلخت کھڑا ہو گیا ——

اُس نے کچھ دیکھا ہے —— ایک خواب —— ایک رنگین نغمہ —— مجسّم نغمہ —— جو اُس کے دماغ پر حاوی ہے —— جو ایک عرصہ سے اُس کے قلب کی تنہائیوں میں پرورش پا رہا تھا —— جسے دیکھنے کی تمنّا اُسے ہر وقت بے چین رکھتی تھی —— جس کے حصول کی آرزو میں وہ زندہ تھا —— جس کے لئے اُس نے غیر محسوس طریقے پر بہت سے بُت بنا کر ایک معبد تیار کیا تھا ——— آج اُسے بُت تراش نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا!

اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اُس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور رات کی مِلی جلی چاندنی اور تاریکی میں اپنے غار سے نکل کر سیدھا معبد کی طرف چلدیا۔ بت تراش نے اُسی درخت کے نیچے جاکر دم لیا جہاں تین چار روز ہوئے اُس نے بڑی دیر تک فاختہ سے باتیں کی تھیں، وہاں پہونچکر اُس نے اپنے اوزار زمین پر رکھدئے اور درخت کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنے تصوّر کی دُنیا میں پھر اُسے ایک بار دیکھنا چاہا جسے وہ ابھی ابھی دیکھ چکا تھا، مگر کامیابی نہ ہوئی اور اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں!

بت تراش تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور اس کے بعد اُٹھکر اپنے معبد کے نیچے پہونچا، وہاں سے اُس نے ایک بڑا سا پتھر کا ٹکڑا اُٹھایا اور پھر اُسی درخت کے نیچے آبیٹھا۔ اُس نے اپنے اَوزار اُٹھائے اور پتھر کے ٹکڑے کو جگہ جگہ سے توڑنے اور بنانے لگا!

تاریکی آہستہ آہستہ کم ہوئی .... پو پھٹی .... دن نکل آیا .... دوپہر ہو گئی .... بُت تراش اُسی طرح بیٹھا ہوا کچھ بناتا رہا!

فاختہ کا جوڑا پھر کہیں سے آکر اُسی درخت پر بیٹھ گیا۔

"کیا بنا رہے ہو بُت تراش؟"

"جو اکثر نہیں بناتا تھا!"

"اکثر کیا بنایا کرتے تھے بُت تراش؟"

"جو آج نہیں بنا رہا!"

"ہمیں بھی تو معلوم ہو..... کچھ"

"انسانی نسل کے تعلیمیافتہ جُہلاء کے لئے ایک مُعمّہ!"

"اور آج کیا بنا رہے ہو؟"

"اپنے لئے ایک معمّہ!" بُت تراش نے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا!

دوپہر، شام میں تبدیل ہو گئی اور شام رات میں .....

رات پھر صبح میں بدلی اور صبح اپنے مختلف مدارج سے گذر کر رات ہو گئی۔ اسی طرح پانچ دن اور پانچ راتیں آئیں اور گئیں .... مگر بُت تراش اسی طرح بیٹھا ہوا اپنا کام کرتا رہا!

چھٹے دن صبح کو دوپہر دن چڑھے بُت تراش نے اپنے اَوزار رکھ دئے .... پتھر کا غیر ہموار ہشت پہل ٹکڑا اور مجسّموں سے مختلف ..... ایک عورت کا مجسّمہ بن چُکا تھا!

مجسّمہ بن چکا تھا مگر ابھی اُس میں کسی چیز کی کمی تھی! بُت تراش کو اس چیز کا احساس تھا! وہ مجسّمہ کو اُٹھا کر معبد پر لے گیا۔ یہاں پہونچکر اُس نے اپنے تمام بُت ایک ایک کر کے پھینکدئے جو معبد کی بلندی سے گرے اور زمین کی پستی پر پہونچتے پہونچتے فنا ہو گئے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے پریشان بالوں سے معبد کے ایک حصّہ کو صاف کیا اور وہاں اپنے اِس نئے مجسّمے کو بڑے "تزکِ احتشام" سے رکھا اور اپنا پہلا حقیقی سجدۂ عبودیت اُسکی بارگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔

——— محبّت کا وہ سجدۂ اوّلیں جو ہمہ مخلوق نے "قالوا بلا" کہکر ربِّ اعلیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا تھا .... اور جس کے بعد موسیقی کی تخلیق ہوئی تھی اور دُنیا ..... آگ دھوئیں اور پانی کی دُنیا ..... روشن ہو گئی .... اور جانے کیا کیا ہوا تھا .... اور جس سجدے کو اُس نے اُس بارگاہ پر نچھاور کرنے سے انکار کر دیا تھا .... اور جسے اُس نے اِس آستانے کی نذر کیلئے اس طرح چُھپایا تھا جس طرح ایک خوبصورت اور حسین دوشیزہ محبت اور ولا کے لطیف —— شیریں اور معصوم —— اچھوتے اور "کنوارے" —— دردناک اور باایں ہمہ کیف آور تاثرات

کو بنفشہ اور گلِ مہندی کی عطر بیز اور مُسکر آمیز خوشبوؤں سے بچا کر اپنے اعماق قلب کے منوّر مگر سرد گوشے میں دفن کر لیتی ہے ——— بُت تراش چاہتا تھا کہ دیوی کم از کم اُس کے اس سجدے کو تو شرفِ قبولیت بخش کر اُسے مایوس نہ جانے دے ——— ورنہ کہیں تقدیر تماشہ نہ بنا دے!

اس سے فارغ ہو کر اُس نے مجسمہ پر پھر ایک نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ مجسمہ یقیناً اُس کے خواب کی تعبیر تھا ——— مگر حرارت کی کمی تھی ——— زندگی کا فقدان تھا! ——— اس خیال کے آتے ہی بُت تراش کچھ دیر کے لئے مایوس ہو گیا، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس کا چہرہ مسرت سے تمتما اُٹھا، اُس نے اپنے اوزاروں میں سے چھینی اُٹھائی اور بائیں جانب اپنے دھڑکتے ہوئے دل میں بھونک لی اور مجسمہ کے قدموں سے لپٹ گیا ———

تازہ تازہ خون دھڑکتے ہوئے دل کی زندہ رگوں میں سے اُچھل اُچھل کر مجسمہ پر گر رہا تھا ——— دُنیائے محبت میں حُسن اور عشق ہولی کھیل رہے تھے۔

——— دل کا اضطراب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا ——— مجسمہ بھی مکمل ہوتا جا رہا تھا اور مجسمہ ساز بھی ——— مجسمہ کی تکمیل ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ بُت تراش کی بھی!

فاختہ کا جوڑا یہ کہتا ہوا اُڑ گیا "حیرت سے گذر جاؤ.... تعینات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو.... یہی مقصدِ حیات ہے!"

راحت سعید

بنارس (بسلسلہ صفحہ ۳۷)

موجود ہے، اور جس کی وجہ سے مالک مکان کراہتے ہوئے لبِ دم مُفلس کو نکالنے پر مجبور ہوتا ہے، اِس خیال سے کہ کہیں بعد میں وہ متوفی کے مال چُرانے کے الزام میں گرفتار کر کے کچہری میں نہ کھینچا جائے۔

قدیم زمانے کا مکمل ترین شہر اس وقت عہد جدید کے شکست افگن گستاخ ہاتھوں میں مجبور پڑا ہوا ہے کیا یہ اپنی اولاد کے لئے چار ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ کی مسلسل ترقی کے بعد اب صرف ایک یادگار بن جائے گا، یا ایک ساحرانہ قوت؟ ایک نئے جوش کے ساتھ ظاہر ہوگی جو قوم کی رگوں میں دوڑ رہی ہے جو اسکے دریائے

نغمۂ نور

دل میرا تیرا تابع فرماں ہے کیا کروں
اب تیرا کفر ہی مرا ایماں ہے کیا کروں

باہوش ہوں مگر مرا دامن ہی چاک چاک
عالم یہ دیکھ دیکھ کے حیراں ہی کیا کروں

کہتا نہیں ہوں اور زمانہ ہے باخبر
چہرے سے دل کا حال نمایاں ہی کیا کروں

ہر طرح کا سکون ہی ہر طرح کا ہے کیف
پھر بھی یہ میرا قلب پریشاں ہی کیا کروں

دامن کروں نہ چاک یہ ممکن تو ہے مگر
مضطر ہر ایک تارِ گریباں ہی کیا کروں

اشکوں کی داستاں کو چھپانا محال ہی
دامن پہ ایک داغ نمایاں ہی کیا کروں

اک بیوفا کے واسطے سب کچھ لُٹا دیا
بہزاد اب نہ دیں ہی نہ ایماں ہی کیا کروں

بہزاد لکھنوی

---

۴ حیا، بقا کو نئے سرے سے موجزن بنا دیگی۔

(مارگریٹ) مُترجمہ عبید اللہ قدسی

خدا کے حریف

شاعر

شعر میرے پھول بھی ہیں اور انگارے بھی ہیں
سنگ ریزے بھی ہیں، سیارے بھی، مہ پارے بھی ہیں

شعر سے میں نے کیا ہے گرم حشرِ کارزار
شعر سے میں نے اُلٹ دی ہے بساطِ روزگار

شعر میں پیدا کیا میں نے محبت کا ظہور
شعر سے میں نے مٹایا ہے حکومت کا غرور

شعر سے برسائی ہے میں نے ستم خانوں پہ آگ
شعر سے چھیڑا ہے زندانوں میں آزادی کا راگ

شعر سے چھیلا ہے جابر کی رگِ آزاد کو
شعر سے دی ہے شفا میں نے دلِ بیمار کو

شعر ہیں لبریز میرے کیفیت سے درد سے
طور بن کر یہ نکلتے ہیں حجابِ گرد سے

شعر میرے وحی بھی، پیغام بھی، الہام بھی
قائدِ اعظم ہوں، پیغمبر ہے میرا نام بھی

بادہ خوار

ظرف ہے میرا سمندر، میرا ساغر آفتاب
نکہتِ سرو سمن مستی، شفق میری شراب

چاندنی بہتی ہے میرے ساغرِ زرکار سے
نور کا چشمہ اُبلتا ہے دلِ سرشار سے

ڈال کر نظریں جواں ہر شے کو کر دیتا ہوں میں
خشکیوں میں مستیوں کا رنگ بھر دیتا ہوں میں

رنگ بھرتا ہوں گنا ہوں کا میں لطفِ شام میں
جذب کر دیتا ہوں فتنے گردشِ ایام میں

میرے مشرب سے ہویدا ہیں رموزِ بے خودی
صوفیوں کے زہد کا سرمایہ میری زندگی

ایک دُنیا ہے خرابِ غم مری تقلید میں
میرے ساغر کی کھنک ہے نغمۂ ناہید میں

چند جرعے پی کے جب بدمست ہو جاتا ہوں میں
دو جہاں کو ٹھوکروں میں سجدہ سا پاتا ہوں میں

سرمایہ دار

سیم و زر نے ہر طرف سے یوں مجھے رکھا ہے گھیر
پھیل جاتے ہیں فلک پر جس طرح تاروں کے ڈھیر

دل میں نشۂ ملکیت کا سر میں دولت کا غرور
بھاگتی ہے مفلسی سائے سے میرے دُور دُور

بے گنہ لوگوں کو سولی پر چڑھا سکتا ہوں میں
مجرمِ سنگین کو پھانسی سے بچا سکتا ہوں میں

جوہرِ عصمت مرے سکوں کی تعدادِ قلیل
میرا اِک اُگلا نوالہ لاکھ کُنبوں کا کفیل

میری وزنی تھیلیوں میں خون ہے مزدور کا
ہر اشارہ میرا اک قانون ہے مزدور کا

پُرخطر میری محبت دوستی بھی خوفناک
پیار سے میں ڈالتا ہوں دوستوں کے سر پہ خاک

زندگی کی بھی ضرورت ہو تو دے سکتا ہوں میں
میرا دعویٰ ہے خدا کو مول لے سکتا ہوں میں

انسان

میری ہستی کا نہیں پیدا دو عالم میں جواب
آب و گل میرا نقاب اور میں حقیقت کا حجاب

میرے ایواں کا ہمالہ ایک قد آور ستوں
چاند سورج قمقمے، چھت آسمان نیلگوں

نزہتیں میرے لئے رنگینیاں میرے لئے
حسن بھی ہے اک نشاط جاوداں میرے لئے

حاصل ایجاد، فطرت کا ہوں یکتا شاہکار
نازش کونین، عالم ساز، فخر روزگار

میرا دل کچھ بھی سہی لیکن دُرِ نایاب ہے
اس کی نازک رگ میں رنگ و نور کا سیلاب ہے

دبدبے بھی مانگتے ہیں میری ہیبت سے پناہ
زلزلوں کی بھی مرے آگے لرزتی ہے نگاہ

ضد پر آؤں تو کسی سے بھی نہیں ڈرتا ہوں میں
سجدہ بھولے سے خدا کو بھی نہیں کرتا ہوں میں

شیطان

میں خدا کی بزم کا اک عابدِ مغرور ہوں
اب خدا سے بھی زیادہ دہر میں مشہور ہوں

جاگتا ہوں صبح کو میں پہلوئے زردار میں
رات کو سوتا ہوں اکثر حسن کے بازار میں

جھونپڑی پر میرا سایہ قصر بھی میرا مکاں
خاک پر بھی حکمراں میں تخت پر بھی حکمراں

اب خدا بھی میری ہستی کو مٹا سکتا نہیں
آگ جو میں نے لگائی ہے بجھا سکتا نہیں

روزِ اوّل سے جہاں کو کرتا آیا ہوں خراب
کون ہے جو لائے میری شورش و یورش کی تاب

میری نظریں حق شکن ہیں اور میں یزداں شکار
ہوں علمبردارِ مکر و فن خدائے انتشار

یہ مرا بڑھتا ہوا طوفان رک سکتا نہیں
حشر تک میرا سرِ مغرور جھک سکتا نہیں

مخمور جالندھری

ریزۂ مینا

ساقی کے دس سال کا نادر انتخاب۔ جس میں پچاس مشہور انشاپردازوں کے بے مثل افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ ایسے اعلیٰ درجے کے پچاس افسانے کہیں بھی آپکو یکجا نہیں مل سکتے۔ کتابت و طباعت، کاغذ نہایت عمدہ۔ ضخامت چھ سو صفحے۔ جلد کپڑے کی مضبوط اور خوشنما سنہری ٹھپّہ والی۔ یہ کتاب ہر لائبریری کی زینت بن سکتی ہے۔ قیمت تین روپے۔
ساقی کے مستقل خریداروں کے لئے صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک۔ آرڈر کے ساتھ نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے ورنہ یہ رعایت نہیں دی جائیگی۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

گدھا کانفرنس

کیوں جناب ہم نہ کہتے تھے؟ اور بنایئے انجمنیں اور کیجئے کانفرنسیں! لاکھ لاکھ سمجھایا بار بار جتایا کہ دیکھو یارو گھر کے حواس کلھیا میں بند کر کے، گرہ کی عقل کو تل چھوڑ کے، پرائے ختکے پہ شکرا پالنا، بات بات پہ، وہ جو مثل ہے کہ نون نہیں، لا میری پالکی، تیل نہیں، لا میری پالکی۔ توے تغاری کے لئے، چولھے چکی کے لئے انجمنیں بنانا، کانفرنسیں بٹھانا تمہیں راس نہیں آنے کا، بقول ہمارے لالہ جی کے، سچ مالمو تو بڑو کھوٹو ہے ساب منکہ۔ تو بھلے مانس کان میں انگلیاں دئے بیٹھے رہے، ایک نہ سُنی۔ لگی پھانس اور بنی انجمن، آئی چھینک اور رچائی کانفرنس! پھر جو یہ آندھی چلی تو اللہ دے اور بندہ لے۔

اتنے ہی پہ قرار آجاتا تو بس تھا، ایک لال بجھکڑ کا پیٹ جو پھولا، تو نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی، آؤ دیکھا نہ تاؤ، اِس سرے سے اُس سرے تک، اپنے بیگانے، اڑوسی پڑوسی سب کو سمیٹ، لگا دُم گزا نام رکھا "آل انڈیا کانفرنس" اب حالت یہ ہے کہ یہی آل انڈیا جو آکاش بیل کی طرح پھیلا ہے، تو ہمالیہ کی چوٹی سے لنکا جی کی ایڑی تک، تو میں، ایرا غیرا، نتھو اخیرا، سبھی اِس دہاجال کے جنجال میں پھنسے ہیں، جیسے آل انڈیا پیٹ بھرے کانفرنس، آل انڈیا خالی پیٹ کانفرنس، آل انڈیا سالن کانفرنس، آل انڈیا روٹی کانفرنس، آل انڈیا میاں کانفرنس، آل انڈیا بیوی کانفرنس آل انڈیا دھوتی کانفرنس، آل انڈیا ٹوپی کانفرنس، آل انڈیا یہ کانفرنس آل انڈیا وہ کانفرنس، غرض کہ اس آل انڈیا کے ایک انڈے سے اتنے بچے نکلے ہیں کہ اب گھر میں کھانے کو دانہ ہے نہ خیر سے ٹاپے میں رہنے کو ٹھکانا، اَب بھگتئے اس کانفرنس بازی کا خمیازہ، یعنی سُن لیجئے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑا، غضب خدا کا جو مخلوق قطب شمالی سے قطب جنوبی تک سندی احمق، بین الاقوامی گھامڑ کہی سُنی اور سمجھی جاتی تھی، اُس نے بھی سنبھالا لیا، اور عین اُس وقت کہ ہم کہہ رہے ہیں اور آپ سُن رہے ہیں، گدھا کانفرنس جُڑی ہے، اور صدارت کا خطبہ صادر ہونے کو ہے۔

افسوس ہے کہ جلسے کا پورا پورا لطف آپ نہ اٹھا سکیں گے، وجوہ ناگزیر ہیں، تقریب گدھوں کی ہے، کارروائی راز میں ہے اور خود آپ کا رپورٹر غیر برادری ہونیکی بنا پر، یا دولتیوں کے ڈر سے جلسہ گاہ سے باہر۔

لیجئے ہل چل بند، چیخ پکار ممنوع، فضا میں سناٹا، کان کھڑے ہوئے، دُم ہلی، صدر صاحب شروع ہو گئے۔

"قوم کے کھمبو! برادری کی چھتو! بھائی گدھو اور گدھی بہنو! جیسٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دوپہر تپتی دُھوپ اور جُھلسی ہوئی دوب کے اس فرحت بخش بنجر میں آپ کے یہ مطمئن اور بشاش چہرے، آپ کی یہ خاموشی اور ہمہ تن جوش بھیڑ دیکھ کر جی بے اختیار "ہیں چو ہیں چو" کرنے کو چاہا، مگر میرے جذباتِ خودداری جُوتی پیزار، دھینگا مشتی پر اتر آئے، جب میں نے محسوس کیا کہ اس یادگار موقع پر آپ میں سے بعض حضرات کے پھُولے ہوئے نتھنے اور لٹکی ہوئی تھوتھڑیاں چغلی کھا رہی ہیں کہ جیسے خدا نہ کرے مجھ میں انس گند آتی ہو! مُنہ میں ہری گھاس لیکر کہتا ہوں کہ اگر میرے شبہات صحیح ہیں تو آپنے گدھے کی فطرت میں بٹا لگایا، اور قصور معاف، اپنے کردار کے خلاف بغاوت کی، آپ بد گمان نہ ہوں، حریفوں میں عمر کا سوفی صد حصہ گزارنے، اور دودھ کے دانت گرنے سے، دُم جھڑنے تک، دشمنوں میں ایک جان دو قالب کی طرح بسر کرنے کے باوجود، پاتا ہوں کہ نصیبِ عدا آدمیت کی بو باس سے آج بھی ویسا ہی معرا ہوں جیسا کہ روحِ خس کی مہک سے مٹی کا تیل، یا خود ہمارے سر سے سینگ! یقین کیجئے کہ آپ کی روایتی بردباری اور پشتینی تحمل پر مجھے بدہضمی کی حد تک اعتماد نہ ہوتا تو شاید آسمانی سلطانی، یا بجلی پانی کی بڑی سے بڑی طاقت اس پیرِ خرف کو اپنے خداوند مجازی یعنی کلوا دھوبی کی ہاتی برابر لادی پٹک کر راہِ فرار اختیار کرنے، اور اس قومی جلسے کی صدارت کا خوشگوار بار اُٹھانے پر مجبور نہ کر سکتی، یہی نہیں، نیک نیتی مجھے یہ عرض کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ خدانخواستہ گدھا کانفرنس کی صدارت کا اعزاز اگر آپ نے اس مغالطے میں بخشا ہے کہ یہ ہیچ مداں قوم کا سب سے برگزیدہ، تجربہ کار اور زمانے کا نبض شناس فرد ہے، تو معاذ اللہ مجھے آپ کے حُسنِ ظن پر ماتم اور اپنے ساتھ ساری جماعت کی پوزیشن صاف کرنا پڑیگی، سمجھئے اور ہوسکے تو یاد رکھئے گدھے کی حیثیت سے ہماری ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ حُسنِ اتفاق سے جو گدھا ہے وہ ازل ہی سے گدھا ہے، اور اُس کا فرض عین ہے کہ ابد تک گدھا ہی رہے، اتنا ہی نہیں، گدھے پن میں اُصولِ مساوات پر ہمارے اسلاف اتنے مُصر اور سختی سے کاربند رہے

ہیں، کہ ہر گدھے کا بچہ ماں کے پیٹ ہی میں آخری کسر تک باپ گدھے کے مساوی ہی تسلیم کیا گیا ہے، آزمائش کے لئے آپ میں سے جس کا جی چاہے آدمی کا بہروپ بھر دیکھے، چیلنج دیتا ہوں کہ رنگ روغن جب اُڑے گا، گدھا اور نرا گدھا ہی برآمد ہو گا۔

بہرکیف باپ دادا کے نقشِ سُم پر چلنے والا یہ بدنام کُنندہ نکو نامے چند کسی مغالطے یا خود فریبی کو اپنے لئے کسی قیمت پر بھی جائز رکھنے کے لئے تیار نہیں، مدارج کی زیادہ سے زیادہ برتری جو آپ کے کسی فرد پر میرے سر تھوپی جا سکتی ہے اتنی ہی ہے، کہ دو مُنہ گھاس آپ سے بڑھ کر کھائی ہو گی، یا چار دولتیاں آپ سے زیادہ جھاڑی ہوں گی، بس۔

دوستو! آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ آرام کی میٹھی نیند سونیوالے کو جھنجوڑ کر چونکا یا جائے تو ننانوے فی صدی پاؤں کی عزت ہات میں لے لیتا ہے، پھر یہ بیسویں صدی کے فلفل مزاج گدھے کچھ ایسی پتلی کانچ کا مزاج لیکر آئے ہیں، کہ اِدھر کسی پُرانے خرانٹ کے مُنہ کی بھاپ لگی، اُدھر تاؤ تیز ہوا، اور ہوئے چھن سے ایک کے ہزار ٹکڑے، اسی خطرے سے بچاؤ کے لئے میں نے آپ کی صدارت کا جوا کاندھے پر رکھتے ہوئے ٹھان لی تھی، کہ دھواں دھار تقریر اور ملمع کے رزولیشنوں سے اُتنا ہی گُریز کروں جتنا پانی سے ایفمی، یا پولس سے بدمعاش، اور بیداری کی پہلی جماہی آتے ہی یاد دلا دوں کہ آپ کیا تھے، کیا ہوئے، اور بضیب دُشمناں اب بھی لوٹ نہ لی تو کیا ہو جائیں گے، آپ گنوار نہیں گدھے ہیں، اگر بارہ برس بعد اُس کے دن پھر سکتے ہیں تو کیا معنی کہ آپ کے دن نہ پھریں۔

علم سینہ کی بعض پیچ در پیچ اور گول مول بلکہ سچ پوچھیئے تو بے معنی روایتوں سے ہمارے کسی نہ کسی جدِ اعلیٰ کا وجود اُس دور میں ثابت کیا جا سکتا ہے جب حکیم ققنس مشہور ماہر فلکیات کی تحقیق کے مطابق آسمان زمین ننھے ننھے بنے تھے، سُورج برف کا ٹھنڈا گولہ، اور چاند کی بُڑھیا تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی، اور بادلوں سے پانی کے بجائے کھیلے بتاشے، یا لڈو پیڑے برسا کرتے تھے، ان ہی روایتوں سے اس بات کے بھی آتے پتے ملتے ہیں کہ ہماری جدیت کے دعویدار دو بزرگوار تھے، ایک گھوڑے صاحب، دوسرے خچر میاں، اپنے اپنے دعووں کے ثبوت میں دونوں نے کیسا کیسا لتیا ڈکیا ہو گا تاریخ کا مُنہ کیلا ہوا ہے۔ البتہ ہمارے پرائیویٹ احساسات ٹٹولے جائیں تو لے سمجھے بوجھے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں اولوالعزم ہستیوں میں ہمارے دادا بننے کی اتنی ہی صلاحیت پائی جاتی ہے جتنی کسی مرغی،

میں انڈے دینے کی قابلیت، کان کی نوکیں چھانٹ دیجئے، دُو مٹھی قد عنایت ہو، بات بھر بیل بڑھ جائے، اور گلا ایک ذرا سُریلا ہو جائے، پھر کوئی سلوتری ہم میں اور گھوڑے دادا میں رتی بھر فرق نکالدے تو چونچا کرا دیجئے، اور یہ تو کُھلی ہوئی بات ہو کہ میاں خچر اور ہمارے درمیان صرف مزاج کی ٹیڑھ اور رفتار کی اُونچ نیچ کا بل ہے، سو، ایک توے کی روٹی، کیا چھوٹی کیا موٹی۔

غرض کہ ع:۔ دو عمل میں ہمارا آشیاں تھا۔ کہ تاریخ کے حروف ماند پڑ گئے، اور پیڑھی در پیڑھی گزرنے پر دوبارہ اُبھرے تو وہ سُنہری دور آ چکا تھا جب ایک کلّے پر چانٹا کھا کے دوسرے کی بانگی دکھانا ثواب سمجھا جاتا تھا، اور ہمارا منطقی بھائی انسان، انسانیت کے اُونچے چھپّر سے قلابازی کھا کر آدمیت کی خندق میں نہیں گرا تھا، اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا اگر عیب نہ گنا جاتا، تو خاک چاٹ کے کہتا ہوں، ڈھول پیٹ پیٹ کر یہ بھید کھولتا کہ یہ ہماری مرنجان طبیعت، یہ سیدھا سپاٹ مزاج، اور ہماری یہہ پالیسی کہ "او دھوکا دین نہ ما دھوکا لین" جو اِس کھینچ تان کے زمانے میں بھی ہمارا قومی امتیاز ہے، اُسی دورِ زرّیں کی امانت ہے جس کی ایک ادنیٰ سی برکت یہ ہے کہ دُنیا ایک ہی گت ناچتے ناچتے اتنی اکتائی کہ بے تالی ہو گئی۔ مگر ہم ہیں کہ آج تک اُسی لے میں گڑے ہوئے ہیں جس سے اُٹھے تھے۔

بھائیو آؤ! اُس زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک جُھرجُھری لیں، اور مُنہ اُٹھا کر بیساختہ "ہیں چو، ہیں چو" کریں، یوں دُنیا کو جتا دیں، کہ ع:۔

ہرچند بے سُرے ہیں مگر بولتے تو ہیں،

برادرو! بات پر بات یاد بھر آئی، ہو چکی تھی اگرچہ ساری بات، آج مجمع کو اغیار سے خالی پا کر جرأت کرتا ہوں، اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایسی ڈھکی چھُپی بھی تم پر کھول دوں جس کو بھُلا کر تم نے ہمسایوں کی نگاہ میں اپنا نہیں ساری گدھا برادری کا وقار غت رَبود کر دیا، اور اُنہیں یقین دلا دیا کہ اِن ہری چُگوں کے جارحانہ تو کیا مدافعانہ ہتیار بھی کُند ہو گئے۔

جانتے ہو کہ تمہارے کردار کو ایک مکمّل گدھے کی باعزت حیثیت تک ترقّی دینے میں باہری علّتوں کے سوا ایک اندرونی حادثہ بھی کارفرما ہے، یہ تمہارے اعضا کی بناوٹ اور کردار سے اُن کے لگاؤ کا مسئلہ ہے، اور اس حد تک نازک اور دقیق ہے کہ بجز ہمارے قومی مفکّروں کے تحقیق اور جستجو کے دوسرے مدعی اس کو نظر انداز کر دینے پر ہمیشہ مجبور پائے گئے ہیں، باوجودیکہ اس کم سواد پر قومی معلومات کے ماہرِ اعظم

ہوئے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ مگر میں بھی پریشان ہوں کہ دُم سے شروع کروں یا سر سے، گدھے کی کوئی چیز ایک دوسرے سے افضل نہیں۔ بہرصورت گفتگو کی ابتدا سر سے کیجئے، تو آپ پائیں گے کہ اس کے اندر بھیجا تو ہے مگر کھانے کے کام کا نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم ذات بھائی دس پانچ مکر کبھی کاؤں کاؤں کرتے سنائی نہیں دئے، اپنی اپنی جگہ اپنے خیال میں ڈوبے ہوئے کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں، جس کا جی چاہے اس یکسوئی کی تقلید کرے، طرفہ ماجرا یہ کہ اس بھیجے میں نہ کوئی حجرہ ہے نہ دالان، کہ عقل سی مضر صحت، مخل اوقات، بِس کی گانٹھ، فساد کی پڑیا، فتنے کی جڑ اس میں رہے بسے، اور کرایہ میں ہماری ہی زندگی اجیرن کر دے۔ بھیجے کی اس سادگی کا طفیل ہے کہ آج تک ہماری قوم کا کوئی فرد نہ کبھی جیل گیا نہ پاگل خانے میں دیکھا اور چھٹے چھ ماہے کوئی بھولا بسرا اگر کانجی ہوس چلا بھی گیا، تو اس کا محرک ہمارا دماغ نہیں گیہوں یا چنے کا وہ لہلہاتا کھیت ہوتا ہے جس کی سبزی اور گل ریزی کا لطف اُٹھانے اور ایسا ہی من بھایا تو نمک چشی کے لئے چار تنکے مُنہ میں ڈال لینے بھر کے ہم ذمہ دار ضرور ہوتے ہیں، یا وہ خسیس تنگ دل اور بدمذاق کسان، جو ہمارے ذوقِ بہار پرستی کی داد نہ دیتے ہوئے اپنے پتے پتے کو جیون مور کی بوٹی یا اکسیر اعظم سمجھ کر ہمارے اور کھیت کے درمیان ببول کے کانٹے حائل کر دیتا ہے، اور ذرا نہیں شرماتا کہ ہم کس فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے آبائی رمنوں میں اُس کو گھاس چھیلنے یا الاؤ کے لئے سوکھے پتے بٹورنے دیتے ہیں اور اُف نہیں کرتے۔ خیر، یہ ایک سرسری بات تھی، ہماری قوتِ حافظہ اس ڈھنگ پر رکھی گئی ہے کہ حد سے زیادہ پاؤں نہ پھیلا سکے، نہ خواہ مخواہ ہمارے روزمرہ میں دخل دے۔ خانگی اذکار، یا قومی کاروبار میں ڈھبلے ڈوبے، دن دو دن، کسی چراگاہ میں، قصبے کی گلی کوچوں میں، یا کسی اوسر بنجر میں گزر جائیں، تو یاد دلا دے کہ اب مٹھو دھوبی کے گھر جانا ہے یا رامو کمہار کے، اور یہ نہ بتائے کہ اس نعمت بلا استحقاق پر ڈنڈے پڑینگے، لات مکی کے ذریعہ جو باز پرس ہوگی، اُس کا "ہیں چو، ہیں چو" کے سوا ہمارے پاس اور کوئی جواب بھی ہے۔

ہونٹوں چڑھی کوٹھوں چڑھی، کے ڈر سے صاف صاف نہیں کہہ سکتا، اشارے کنائے کی آڑ میں کہتا ہوں، کہ اسی دماغ میں اُن خوردبینی جراثیم کی پیشنگوئی بھی کی گئی ہے، جن کی پُراسرار اور ترقی یافتہ قوتوں سے ایک زمانہ آئے گا کہ دجال سی فتنہ خیز ہستی اُٹھے گی اور فائدہ اُٹھائے گی، یہ سوال کہ اُس کے انتخاب کی داد دی جائے یا اپنی قوم کو مبارکباد آج تک چیستاں بنا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم ہر وقت گردن ڈالے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ گویا ایک پیکرِ مجبوری ہیں کہ مُنہ سے بولے نہ سر سے کھیلے، کم نظرے کیا جانیں کہ یہ دراصل ہماری دماغی ادھیڑبن کی دلیل ہے کہ گھاس کی درآمد برآمد، گھسیاروں کی چوری اور سینہ زوری، یا واشنگ کمپنیوں کی کمی زیادتی کا ہماری آئندہ زندگی پر کیا اقتصادی اثر پڑنے والا ہے، یا پھر علامت ہے اُس انکسار کی جو طاؤس، لقہ کبوتر اور راج ہنس سوا کڑ باز شیخی خوروں کے ہاں عنقا کا حکم رکھتا ہے۔

کبھی اپنی بتیسی دیکھی ہے؟ کیسی صاف جیسے موتی، کیسی مسلسل، جیسے مالا، اور کتنی بے ضرر کہ ڈرپوک سا ڈرپوک، آپ سے نڈر! آپ پر شیر کا گماں؟ نعوذ باللہ! آپ کے جبڑوں سے اندیشہ؟ استغفراللہ!

اس موقع پر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اگر ہم گدھے اہنسا کے قائل نہ ہوتے تو اپنے سم پنجوں سے بدلو اگر اُس خونی برادری میں جنم لیتے جس کا نام سُن کر اور نہیں اور رہیں، تپ تو چڑھ ہی آتی ہے، ہمارے نزدیک مچھر کی نکسیر پھوڑنا بھی قتل عمد کے مساوی ہے، چنانچہ یہ سُم تو ہماری ٹانگوں کی طاقت رفتار کو اعتدال پر رکھنے کے کام آتے ہیں۔ یا ایسے ہی کبھی دولتی چلانے کی نوبت آئے تو اُس کے جھٹکے کو چوٹ پروف بناتے ہیں۔

دوستو! گفتگو شیطان کی آنت ہو چلی، میں دیر تک تمہارے ضبط سے کھیلتا رہا، ایک جملہ اپنی کھال کے متعلق بھی سُن لو، وہ یہ کہ فی الحال تمہاری کھال شال کا کام دیتی ہے، مگر جب تم نہ ہوگے، تمہاری کھال کی یادگار، کمبخت کے جوتے برتے جائیں گے، اور قیامت کے بگل بجنے تک تمہاری ارواح کو ثواب پہونچائیں گے، لو، گفتگو ختم ہوئی فقط دُم کی کسر ہے، سر سے پاؤں تک تمہارے بدن میں بے چین اگر کوئی ہے تو تمہاری دُم ہے، کوئی مانے یا نہ مانے، مگر کسی طبلچی سے اپنی دُم کی قدر پوچھو۔ گدھے کی دُم کا ٹھیکہ بجاتا ہے، تمہاری اُستادی، اپنی شاگردی کا معترف ہے، اور تمہارا نام آتے ہی کان پکڑتا ہے۔

غرض کہ یہ تھے ہم، اور یونہی رہتے اگر بدقسمتی سے یہ آدمی کا بچہ ہمارے معاملات میں دخل در معقولات نہ بنتا اور عقل کی لگائی بجھائی میں آکر ہم سے دُشمنی نہ باندھتا، اس نے ہر چیز پر اپنا کرو را بٹھایا، جھاڑ پہاڑ کیڑے مکوڑوں تک اپنا گز سکہ چلایا۔ ہم گدھے تھے، ہم نے احتجاج کیا، اپنی پوری پوزیشن واضح کی، مگر آدمی جو آج تک خود نہ سمجھ سکا کہ میں کیا ہوں، کیا جانتا کہ گدھے کون ہیں، پھر کیا ہوا؟ ناگفتنی ہے، مختصراً ہم اَڑے رہے کہ گدھے رہیں گے، وہ مُصر رہا کہ آدمیت سیکھنا ہوگی۔ جدائی کی بنیادیں پڑ گئیں، علیحدگی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں، رفتہ رفتہ ہم نے

اپنی دُنیا الگ بنالی۔ اور اپنے رسم و رواج کو سینے سے لگاتے ہوئے وہ کیا جو ایک گدھے کو کرنا چاہیئے تھا، یعنی آدمی اور اُس کی گڑھی ہوئی آدمیت کو، بھاری پتھر تھا، چُوم کر چھوڑ دیا اور ایسے ہو گئے کہ ۔ ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا، ہم سے کچھ میل ہی نہ تھا گویا، اِس ترکِ موالات کا انتقام آدمی نے اُس گندے پروپگنڈے سے لیا' جو صدیوں سے ہمارے خلاف جاری ہے' اور اگر ہم گدھے ہی رہے، جیسا کہ رہینگے، تو اُس وقت تک جاری رہیگا کہ دجّال کی پُرجلال تشریف آوری کا ہلّڑ مچے، اور ہمیں اُن کی سرپرستی اور غاشیہ برداری کا شرف حاصل ہو۔

آپ کی دلچسپی کے لئے، نقلِ کُفر کُفر نہ باشد، آدمی کی زباندرازی کے دوچار نمونے سُناتا ہوں، ہنسی اس پر آتی ہے کہ تیزی میں آکر کہہ تو جاتا ہے، مگر ذرا نہیں سوچتا کہ اُلٹی آنتیں اُسی کے گلے پڑتی ہیں، مشہور ہے کہ ؎

خرِ عیسےٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

اوّل تو تاریخ کے اعتبار سے اِس واقعہ کا امکان غلط، پھر ہم کہتے ہیں کہ بھلے آدمی تیری ذات والے کتنے ایسے ہیں جو وہاں جاکر آدمی ہی لوٹتے ہیں۔ شکر ہے کہ ہم تو جیسے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے! ایک کہنے والے نے یہ کہکر اپنے نزدیک بڑا ہدف مارا کہ ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

یعنی گھوڑے بوجھوں مرتے ہیں، گدھے سونے کے طوق پہنتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس مطلبی آدمی نے، گھوڑے دادا کو چنگ پر چڑھا کر ہم سے بدظن کرانے کی ٹھانی۔ کوئی پوچھے کہ بھیّا طوق ملنے پر تجھے کس قاعدے سے حسد ہوا، اس کا گلہ کوئی بچھیڑا کرتا تو واجبی تھا ہم دونوں بھگت لیتے۔

یہی کیا، ہمیں چڑانے کے لئے مذموم چیزوں کے لئے ہمارا نام لگا کر الفاظ تراشے، جھنجی کوڑی کو شتر مہرہ، فیل وار' کہتے منہ دُکھتا تھا "خرمہرہ خروار" کہا۔ زخم کے لئے "خراش" گڑھا۔ غل غپاڑے کے لئے "خروش" بنایا، چڑچڑے کو "خردماغ" کہا۔ بُرے کو "خراب" ویرانے کے لئے "خرابہ" وضع کیا۔ مکروہ صورت کیکڑے کو "خرچنگ" پکارا بُڈھے "خرف" بنے۔ مال گنوا کر "خرچ" کیا۔ شراب خانے کو "خرابات" جھگڑے کو "خرخشہ" بنایا۔ اس پر چین نہ آیا، کتّے نے کاٹا "گوش خر" تجویز ہوا۔ کھا کھا کر موٹا ہوا تو "گدھے کی طرح پھولا"۔ دوستو! سُنتے سُنتے کان بہرے ہوجائینگے اور یہ فہرست ختم نہ ہوگی۔

واقعات ہوچکے، حالات سُن چکے، مطالبات کی باری ہے۔ گدھوں کی خیر رہے، گرمی کی رُت آئے، پیٹ جھڑ ہو، گھاس سوکھے، تب اسی بنجر میں، اسی چلتی لو میں، آئندہ جیٹھ کی پورنماشی کو ہم تم پھر ملیں گے' لوند ملا کے سال کے تیرہ مہینے دیتا ہوں، سوچ بچار کے آنا کہ اِس کانفرنس کی رائے میں بم اور مشین گنوں کے ساتھ ساتھ دُنیا کا جغرافیہ بدلنے کے لئے گدھوں کے بل چلوانا بھی کارآمد ہے، فوج میں گدھوں کی سفرمینا بھی رکھی جائے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں گھوڑے اور گدھے میں تمیز کرنا ہمارے قومی احساسات کی توہین ہے، جُرم قابلِ دست اندازی پولس قرار دیا جائے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں ڈربی کی ریس میں صرف گھوڑے دوڑانا گدھوں کے سول حقوق کو پامال کرنا ہے، آئندہ سے ہمارے منتخب نمائندوں کو بھی اشتراکِ عمل کی دعوت دی جائے، ورنہ گدھے اپنے کو دیوانی چارہ جوئی پر مجبور پائیں گے، اور ہرجے خرچے کا بوجھ نہ اُٹھائیں گے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں جائز نہیں ہے کہ آدمی اپنے کسی ہم جنس کو ہمارے معزز نام سے یاد کرے، بشرطیکہ گدھوں کی پنچائت بہ غلبۂ آرا طے کردے کہ مسمی، ہمارے کم از کم تین چوتھائی خصوصیات کا حامل ہے۔

یہ کہ، اِس کانفرنس کی رائے میں .... دوستو ٹھہرو! وہ دُور سے کلوا دھوبی ہات میں ڈنڈا' بغل میں رسّی دبائے دکھائی دے رہا ہے، خطبہ ختم، کانفرنس ملتوی، باعزت پسپائی، مار سے پہلے پکار کی نوبت نہ آئے۔ راہِ مولا ایک ایک دولتی جھاڑو اور دُم دبائے جدھر سینگ سمائے غائب ہوجاؤ۔

"آوارہ"

ہرودیاس۔ فرانسیسی مفکر فلابیر کا نایاب کارنامہ۔ سلومی کا رقصِ موت کا ناچ تھا۔ یوحنا پیغمبر سے اُسے دیوانہ وار عشق تھا۔ جب وہ اُسے زندہ حاصل نہ کرسکی تو اُس نے اپنے ناچ کے انعام میں پیغمبر کا سر مانگا۔ اس مُردہ سر کے خوں آلود لبوں کو اُس نے پاگلوں کی طرح چُوما اور خود بھی دیکھنے والوں کے غیظ و غضب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ حُسن و موت کی عجیب و غریب کہانی۔ قیمت صرف ۱۲؍
ملنے کا پتہ:۔ ساقی بُک ڈپو۔ دہلی۔

انتقام

۱۔ سازِ شکستہ

رات سنسان تھی لیکن کیف و رومان سے لبریز۔ بعض وقت کی تنہائی بھی کتنی نشاط انگیز ہوتی ہے۔ جھیل شوش کے کنارے سلمیٰ خالہ کی چھوٹی سی سبز کوٹھی زمرد و بجلی کی روشنی میں انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ جھیل کا پانی بالکل خاموش اور ساکت تھا جیسے کوئی سفید چادر۔ دور جھیل کے اُس پار نشاط رسٹوران میں ایک اکیلی روشنی جاذبِ توجہ تھی ——

اِس وقت گیارہ بجے رات کو اس روشنی کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے! وہی جس کے لئے رسٹوران بدنام تھا —— سلمیٰ خالہ کتب خانہ کی قدِ آدم کھڑکی کھولے عجب محویت کے عالم میں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی سبز اونی چادر اُن کے شانوں سے کھسک کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں کھڑکی کا ایک پٹ پکڑے پاس ہی کھڑی تھی۔ مغربی ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بہت نشہ آور تھے۔ رات رانی کی خوشبو سے سارا کمرہ اُڑا جاتا۔

سلمیٰ خالہ کے چہرے کی نرم گلابی کھال چمک رہی تھی۔ اُن کی صاف اور شفاف بلند پیشانی رنج والم کے نشانات سے پاک تھی لیکن اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بڑی ہی گہرائی تھی جس کو اُن کی لمبی لمبی پلکیں بھی نہ چھپا سکتیں۔ ان کی اس وقت کی خود فراموشی بڑی ہی دلفریب تھی۔

دفعتاً خالہ میری طرف مخاطب ہوئیں: "رضیہ وہ روشنی دیکھو!" اُنہوں نے جھیل کے اُس پار کی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے مستقبل بعید کی کوئی اُمید موہوم!" میں نے کہا۔

"نہیں! جیسے ماضی بعید کی کوئی تڑپتی یاد" سلمیٰ خالہ نے ایک تلخ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"چاروں طرف کی تاریکی تو دیکھو!"

"آپ کیا یاد کر رہی ہیں؟ بتائیے!" میں نے خالہ کا معصوم چہرہ دیکھکر بڑی لجاجت سے انکا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں؟" بڑی محبت سے مسکراتے ہوئے خالہ میری طرف جھکیں اور کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ پھر رک گئیں —— جیسے کوئی کسی پیاسے کی حلق میں پانی ڈالنے کے لئے صراحی جھکائے لیکن جیسے ہی پہلا قطرہ ٹپکنے کو ہو صراحی پھر سیدھی کرلے —— میں پیاسی کی پیاسی ہی رہ گئی۔

خالہ نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور کہنے لگیں: "مستقبل بعید کی کوئی اُمید موہوم! تیری شادی! بڑی مکار ہے تو!"

وہ ہنس رہی تھیں لیکن میں سمجھتی کہ ان کا دل کُڑھ رہا ہے۔ میں اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئی۔

* * *

۲۔ جوانی دیوانی

صبح کی پہلی کرنوں میں سلمیٰ خالہ کا چہرہ اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے اُن کے ہیروں کے آویزے۔ رات کی سیاہی کے ساتھ اُن کے غم کی سیاہی بھی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اس پھول کی طرح شاداب تھیں جسے پہلے پہل نسیمِ سحر نے جگایا ہو۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ باغ میں ٹہلنے چلے گئے۔

"کیسی ہے یہ نئی مالا کلو" خالہ نے پوچھا۔

"بہت بُری" میں نے منہ بنا کر کہا۔

خالہ بے اختیار ہنسنے لگیں "کیوں؟"

"صورت نہیں اچھی اس کی! چڑیل ہے پوری چڑیل" میں نے کہا۔ خالہ اتنا ہنسیں کہ ہنستے ہنستے بے دم ہو گئیں اور ایک بنچ پر بیٹھ گئیں۔

"چھانٹ کر رکھا ہے میں نے اِسکو!"

"یہ آخر کیوں؟ آپ اپنا گھر بھوت خانہ بنانا چاہتی ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بھوتوں سے بچنے کیلئے!" خالہ ہنستی ہی چلی جاتیں۔

"جب کبھی گت کی مامار کھو ہمیشہ اُس کے پیچھے دو چار مرد وے کوٹھی کے اِرد گرد ضرور پھرا کرتے۔ کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ مرد۔ اچھی صورت دیکھی نہیں کہ پھسلے۔ مجھے تو نفرت ہے ان کی صورت سے" اب خالہ سنجیدگی کا رنگ اختیار کر رہی تھیں: "سایہ کی طرح پھرا کرتے ہیں یہ عورت کے پیچھے۔ کہاں تک بیچاری اپنی جان بچاتے۔ سکینہ —— وہی —— تھی نہیں وہ گورے رنگ کی چھوٹی سی لڑکی! اپنا کام کرتی تھی وہ! میں نے ہی پالا پوسا بڑا کیا اُسکو اور مُردوؤں نے تاک لیا۔ جب دیکھو کوٹھی کے اِرد گرد گھوم رہے ہیں لوگ!

کوئی درخت کی آڑ میں نہ ہو تو کوئی اصطبل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی اپنے باپ کا گھر سمجھ کر گھسا جاتا ہے باورچی خانے میں! جان عذاب کر ڈالی۔ جان! پھر نکال دیا میں نے اس کو!"

"یہ آپ کی دُلاری کلو تو نہیں کرتی ایسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی بڑے بس کی گانٹھ ہے۔ نہ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ اسکے فراق میں بھی میں نے کل احاطہ میں ایک پرچھائیں دیکھی تھی"

"اس بیچاری پر کون عاشق ہوگا نگوڑا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن خالہ کی سنجیدگی کم نہ ہوئی۔

"یہ نہ کہو بی بی! جوانی تو دیوانی مشہور رہی ہے۔ یہ کالی سہی تو ہوا کرے جوان تو ہے"

میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن خالہ نے ٹوک دیا "میں تو کہتی ہوں کہ یہ لڑکیاں ہی بدمعاش ہیں آج کل کی۔ آخر میں بھی تو جوان تھی کبھی؟ مجال تھی کسی کی ...."

میں نے خالہ کی طرف دیکھا وہ کچھ گھبرا سی گئیں انہوں نے فوراً آنکھیں نیچی کرلیں اور کہتی ہوئی بات بھول گئیں۔ یہ کیا؟ میں سمجھ نہ سکی!

۳۔ یہ مَردُوئے!

سلمٰی خالہ میری دُور کی رشتہ کی خالہ تھیں۔ بڑے دولتمند ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ نازونعم سے پالی گئیں اور پندرھویں برس بڑے حوصلے اور ارمان سے شہر کے ایک ہونہار خوبرو نوجوان کو بیاہی گئیں۔ لیکن شادی کے دو ہی برس کے بعد نہ ماں باپ رہے اور نہ شوہر۔ دُنیا میں بیچاری بالکل ہی اکیلی رہ گئیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید بہت جلد عقد ثانی کرلیں اور اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بھی سننے میں آئے لیکن خالہ نے اپنی بیوگی کے جامے کو کبھی نہیں اُتارا۔ اپنی پُرانی چار پانچ ماماؤں کے ساتھ وہ شہر کے باہر "زمرد" میں رہنے لگیں اور وہیں اپنی بیوگی کے ستائیس سال نہایت سلامت روی سے کاٹ دئے۔ بیچاری مجھے بہت چاہتیں۔ میں اکثر اُن کے یہاں جایا کرتی اور دو دو چار چار روز رہتی۔ بڑی خاطر کرتیں اور مثل اپنی لڑکی کے سمجھتیں۔

شہر کے باہر رہنے سے سلمٰی خالہ نے اپنے شہر کے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع نہیں کرلئے تھے۔ وہ اکثر اُن کے یہاں جایا کرتیں۔ اور شہر کی کوئی قابل ذکر تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں وہ اپنی شرکت ضروری نہ سمجھتیں۔ خالہ بہت خلیق، ملنسار اور ہنسمکھ تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا پھول جھڑتے۔ جو اُن سے ملتا اُن کا گرویدہ ہوجاتا اور اُن کی قدر کرتا۔ خالہ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن ابھی تک شباب کے آثار اُن کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ جوان لڑکیوں سے ملتیں تو اُن میں ایسا گھُل مل جاتیں کہ اُنہی میں سے ایک معلوم ہوتیں۔ لیکن خالہ کے کردار میں ایک چیز بہت زیادہ ناقابل فہم تھی ـــــ بہت ہی زیادہ ـــــ اُنہیں مَردوں سے سخت نفرت تھی۔ گفتگو کا کوئی موضوع ہو لیکن وہ اپنے اس جملے کی اس میں ضرور گنجائش پیدا کرلیتیں "بڑے بیوفا ہوتے ہیں۔ یہ مَردوئے!" ـــ اس میں اُن کی جوانی کا کوئی رازِ پنہاں تھا! اور خالہ اس راز کو صرف اپنا ہی رکھنا چاہتیں۔

۴۔ من کی آگ

ایک روز میں نو بجے خالہ کے یہاں پہونچی۔ معلوم ہوا کہ ابھی خوابگاہ سے نہیں نکلیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا لیکن جیسے ہی میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا میں نے دیکھا خالہ خود آرہی ہیں۔ آج ان میں غضب کا نکھار تھا۔ چہرے کی جگمگاہٹ میں معلوم ہوتا جیسے جلد کے اندر سے کوئی روشنی نکل رہی تھی، خالہ عجب والہانہ انداز سے چل رہی تھیں۔ کوئی شرابی بھی کیا چلے گا! سر کی جنبش دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ ہر قدم پر خمار بڑھتا ہی جاتا۔ ان کے لانبے لانبے بال بڑی بے ترتیبی سے اُن کے سینے پر جہاں خود ایک حشر بپا تھا کھیل رہے تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک خاص ترتیب تھی جو خالہ کے حُسن کار ہاتھوں کی شرمندۂ احسان معلوم ہوتی۔ خالہ قریب آئیں تو عطردان بن گئیں۔ ان کے جسم سے عطر کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس "جوشِ بہار" پر میں دنگ رہ گئی۔

میں نے سلام کیا خالہ نے لپک کر چپٹا لیا۔ اتنی زور سے کہ میں چیخ اٹھی۔

"آج کچھ رنگ بیڈھب ہے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اتنی دیر سے آئی کمبخت! اور اوپر سے کہتی ہے کہ رنگ بیڈھب ہے۔ کیوں نہ ہو بیڈھب؟" خالہ نے چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ جھینپ سی گئیں۔

"چل ناشتہ کرلے۔ آج تجھے ایک بات بتاؤں گی" خالہ مجھے کھینچتی ہوئے لئے چلی گئیں۔

ہم لوگ ناشتہ کے بعد نشست گاہ پہونچے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔

"پھر بتائیے خالہ! وہی بات! جو بتانے کو کہی تھی"

"تیرے کام کی نہیں وہ!"

"نہیں!" میں نے ٹھنک کر کہا۔

"کیا کرے گی سُن کر پچیس تیس برس کی بات!"

"واہ یہ اچھی رہی! خود ہی آپ نے کہا تھا کہ ایک بات سُنا تے گا!"

"تو یہ تھوڑی کہا تھا کہ تو میری جان کو آجا۔ اچھا سُن!" خالہ نے اپنی آنکھیں جھکا کر کہا۔ "تو نے بھی کی ہے کبھی کسی سے محبت!"

"کی کیوں نہیں!" میں نے کہا اور ہنسنے لگی۔

"تو میں نے بھی کی" خالہ نے کہا۔

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو بتا!" خالہ نے کہا۔

"نہیں"

"نہیں"

میں خفا ہو کر اُٹھکر جانے لگی۔ خالہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا سُن لیکن خبردار جو کسی سے کہا"

"کیا مجال!" میں نے اطمینان دلایا۔

"ایک مالی کے لڑکے سے!" خالہ نے شرمندگی میں اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"پھر!"

"پھر بڑھی یہ محبت!"

"پھر!" میں نے پوچھا۔

"پھر اُس نے وہی کہا جو ہر مرد ہر محبت میں کہتا ہے"

"کیا؟"

"بھاگ چلو میرے ساتھ یا پھر شادی کر لو"

"آپ نے کیا کہا؟"

"تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟"

"بھاگ چلوں گی" میں نے کہا۔

"آہ! میں نے یہ نہیں کہا! میں نے ڈانٹ دیا اُسکو۔ خبردار جو ایک شریف لڑکی سے ایسی باتیں کیں۔ اپنی اوقات نہیں پہچانتے تم!"

"پھر اُس نے کیا کہا؟"

"وہ چلا گیا چُپ چاپ یہ کہتا ہوا کہ ہاں مجھ بھوکے سے کون شادی کر سکتا ہے؟"

"پھر"

"محبت کی کشتی بھوک کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی" خالہ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"بس!"

"نہیں! وہ پچیس برس نہیں آیا لیکن اب پھر آگیا ہے"

"آگیا ہے؟ کہاں ہے؟" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"شہر میں ہے۔ کافی روپیہ کما لایا ہے وہ۔ اب کوئی تجارت شروع کرنے والا ہے"

"آپ سے کہاں ملا؟"

"آیا تھا مجھ سے ملنے! لیکن پُرانی باتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آج پھر آئیگا چار بجے! وہ اب بھی ویسا ہی بانکا جوان ہے!"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا!" میں فرطِ محبت سے خالہ سے لپٹ گئی۔

"پہلے وہ بھوکا تھا اور اب میں۔ من کی آگ تن کی آگ سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے"

خالہ بے اختیار سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں معلوم ہوتا جیسے اُن کا دل ٹوٹا جا رہا ہو۔ میں نے اب اور آگے اُنہیں چھیڑنا نہ چاہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ انکی خوش مزاجی کی کائی کے نیچے کتنا گہرا سمندر ہے!

۵۔ انتقام

اُس دن میں دو ہی بجے خالہ کے یہاں سے چلی آئی لیکن دوسرے دن سویرے ہی سے پہونچ گئی۔ وہ تنہا باغ میں چہلقدمی کر رہی تھیں اور ضرورت سے زیادہ بشاش اور مسرور نظر آئیں۔

"کیا ہوا اصلی خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہوتا کیا؟ وہ آیا اور چلا گیا!"

"کیا کہا اُس نے؟" میں مارے اشتیاق کے مری جاتی۔

"اُس نے اپنا انتقام لے لیا۔ پچیس برس کے بعد میرا بوجھ میرے سر سے ہٹ گیا۔ میں نے اُسکی بھوک ٹھکرائی تھی اُس نے میری بھوک ٹھکرا دی" خالہ نہایت اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

"وہ کیسے؟"

"اُس نے کہا پچیس برس ادھر تم نے سچ کہا تھا اور اب جھوٹ کہہ رہی ہو۔ سماج نے ہماری قسمتوں پر مُہر لگا دی ہے۔ تم دولتمند ہو اور میں بھک منگا ہمارا تمہارا جوڑ نہیں ہے!"

"پھر!"

"پھر میں ہنسنے لگی اور وہ چلا گیا!"

وجاہت سندیلوی

ہماری دھوبن

ظاہر ہے کہ عورت ہے مگر ہمارے خاندان کے سب چھوٹے بڑوں کو ناکوں چنے چبواتی ہے۔ ہر دفعہ وعدہ کرتی ہے کہ فلاں دن کپڑے لے آؤنگی مگر آج تک اُس نے کبھی وعدہ پورا نہیں کیا۔ کبھی اُس کے رشتہ دار مر جاتے ہیں جس کی وجہ سے وعدہ خلافی ہو جاتی ہے۔ کبھی خاص اُس کے گھاٹ پر ہی موسلا دھار بارش پڑتی ہے اس لئے کپڑے نہیں سُوکھ سکتے۔ بعض دفعہ خود بیمار بن بیٹھتی ہے۔ غرضکہ اُس کو لاکھوں بہانے یاد ہیں۔ مگر سال میں ایک دفعہ اس کا بہانہ بہانہ نہیں ہوتا۔ یعنی زچگی کی وجہ بتلاتی ہے اور ساتھ ہی اپنا نیا بچہ بھی ثبوت کے طور پر لاتی ہے۔ جس کو دیکھکر ہمارے خاندان کے بزرگ و بچے سب گِلے بھول جاتے ہیں اور اُس کے بچے سے پیار کرتے ہیں۔ دھوبن خوش ہوتی ہے۔ سب مُسکراتے ہیں نام پوچھتے ہیں اور بعد میں سب کے سب "ابکی مرتبہ وقت پر کپڑے لانے" کی درخواست کرتے ہیں۔ دھوبن مُسکراتی ہے اور کہتی ہے "ضرور لاؤنگی"۔ مگر یہ تو وہ ہر دفعہ ہی کہتی ہے۔ اسکے وعدے معشوق کے وعدوں سے بھی کم اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہر دفعہ یقین دلاتی ہے۔ اپنے فن کی ماہر ہے یعنی جھوٹے وعدے کر کے یقین دلاتی ہے۔ کپڑے دھونا اس کا کام نہیں صرف بہانہ ہے۔

بالو پانچ فٹ سے ہرگز اونچی نہیں۔ اکہرے بدن کی۔ پتلی پتلی ٹانگوں والی۔ ساڑھی گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے رکھتی۔ سر میں کبھی تیل نہیں ڈالتی سُوکھے بال ہمیشہ ہمارے خاندان کے اراکین کی طرح پریشان رکھتی ہے۔ ہر دم ڈاڑھ میں پان دبائے رکھتی ہے۔ ایک آنکھ سے ترچھا دیکھتی ہے۔ اسکے ہونٹوں پر ہمیشہ مُسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ دھوبی اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ کپڑے لے جانے کے لئے گدھے رکھتے ہیں۔ مگر ہماری بالو کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس نے بیل گاڑی بنا رکھی ہے۔ اُسی میں کپڑے لاد کر لے جاتی ہے اور جب دل چاہتا ہے لے بھی آتی ہے۔

یہ سال میں گیارہ دفعہ کپڑے دھو کر لاتی ہے۔ اسی وجہ سے گھر کے چند نئی روشنی کے نوجوانوں نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند کیا تھا مگر خاندان کے پُرانے اُصولوں کی طرح اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایک زمانے سے یہ ہمارے گھر والوں کے کپڑے دھوتی آئی ہے۔ اور جب سے اُس نے ہمارے خاندان کے کپڑے دھونے کا ذمہ اپنے سر لیا ہے اُس دن سے گھر کے تمام نوکر کپڑے دھونے کے فن میں ماہر ہو گئے ہیں۔

گھر کے اخراجات میں سوا دس روپے کا کپڑے دھونے کا صابن بھی ہر ماہ شامل ہوتا ہے۔ گھر ہمیشہ دھوبی گھاٹ بنا رہتا ہے۔ گھر میں جتنے نل پانی کے ہیں وہ بارہ گھنٹے چلتے رہتے ہیں اُن کے نیچے مختلف آدمی طرح طرح کے کپڑے دھوتے رہتے ہیں اور دھو دھو کر گھر کے برآمدوں میں سُوکھنے ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے گھر والوں کو پانی کا ٹیکس بھی عام شرفا سے زیادہ دینا پڑتا ہے۔ (شاید دُنیا میں ہر ایک سفید پوش کا یہی حال ہو؟) پانی اور صابن کے خرچ کے علاوہ اس دھوبن کو ملازم رکھنے سے بجلی کا بھی خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ بجلی کی استری ہمیشہ گرم رہتی ہے بلکہ کپڑے استری کرنے کے لئے گھر کی ایک ہی استری کو استعمال کرنے کے لئے گھر کے اراکین میں ہر دم جنگ چھڑی رہتی ہے۔ بعض اوقات گھر کے کمسن بچے استری سے کھیلتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں جلا بیٹھتے ہیں تو ڈاکٹر کا خرچ اور بڑھ جاتا ہے۔ غرضکہ گھر میں عجب ہنگامہ مچا رہتا ہے۔

کپڑے دھونے کا کام دھوبن کے آنے کے ایک ہفتہ بعد تک بند رہتا ہے کیونکہ اُن دنوں دھوبن کے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ مگر استری برابر گرم رہتی ہے کیونکہ دھوبن کے استری کئے ہوئے کپڑے دراصل بغیر استری کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر بھی دھوبن کا یہ کہنا ہے کہ وہ برابر استری کرتی ہے۔ چند سالوں سے اب اس موضوع پر بحث نہیں کی جاتی۔ بلکہ یہ امر طے پا چکا ہے کہ ہر شخص اپنے کپڑے پہننے سے قبل خود استری کر لیا کرے۔ اس کام کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ اس قدر عادی کہ اگر کسی معجزے کے باعث ہماری دھوبن درحقیقت کپڑے ٹھیک طرح سے استری کر کے لے بھی آئے تو بھی سب گھر والے اُن کو پھر سے استری کر کے ہی پہنیں گے۔

جس دن دھوبن کپڑے دھو کر لاتی ہے وہ دن بھی ہمارے گھر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گھر کے سب نوکر اُس دن عید مناتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہفتہ کے لئے اُن کو کپڑے دھونے کے کام سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ عام طور پر گھر کا کوئی بچہ دھوبن کی بیل گاڑی کو دُور سے آتا دیکھکر گھر کے کونے کونے میں یہ خبر پہونچا دیتا ہے۔ نوکر دھوتے ہوئے کپڑے اُسی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ اور گھر کے اراکین کو جب یہ خبر پہونچتی ہے تو سب کے چہرے شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ ع۔

ع ۔ اُسکے آنے سے ہی آجاتی ہے مُنہ پر رونق

اور اپنے بارونق چہروں کے ساتھ تمام گھر والے گھر کے تمام پہننے اوڑھنے اور بچھانے والے کپڑے کمروں سے نکال نکال کر دھوبن کے لئے ڈھیروں کی شکل میں جمع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک مدت سے میلے ہوگئے ہوتے ہیں اور پچھلے ایک ماہ سے دھو دھو کر استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ دھوبن مُسکراتے ہوتے آتی ہے اور ہر ایک کے کپڑے الگ الگ جما کر رکھدیتی ہے۔ اس گھر کا ہر فرد لبشرا اپنے کپڑوں کا حساب خود لکھتا ہے اس لئے دھوبن ہر ایک کا حساب چُکاتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے کم لاتی ہے، جب کوئی شکایت کرے تو اوّل تو انکار کرتی ہے کہ وہ کوئی کپڑا رکھکر نہیں آئی مگر جب ڈرا کر، پیار سے، اور آخر گھُٹنوں کے بل بیٹھکر آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے کہنے کو مان لے اور جو کپڑا رکھ آئی ہے وہ لا دے تو وہ مان جاتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ "آئندہ دُھلائی کے ساتھ لے آؤں گی"! مگر عام طور پر نہیں لاتی اور اگر بفرض محال کبھی غلطی سے لے بھی آئی تو اُس دفعہ کی دُھلائی میں سے ایک کی بجائے دوٗ کپڑے رکھ آتی ہے۔ اس لئے گھر کے تجربہ کار لوگ ایسی شکایت کرتے ہی نہیں اور ایک ہی کپڑا کھو کر یہ کہتے ہیں کہ۔ "خدا جو کرتا ہے بھلے کیلئے کرتا ہے"!

میں تجربہ کار نہیں ہوں مگر یہ کہنے سے دریغ نہ کروں گا کہ ان معاملوں میں خُدا جو کچھ کر چکا ہے، کر رہا ہے اور کریگا اس میں دھوبن کا ہی فائدہ ہوگا۔

کچھ عرصے تک یہی کپڑے لینے اور دینے کا سلسلہ مع تکرار و شکوہ جاری رہتا ہے۔ آخر دھوبن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میلے کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھ کر اُن کو بیل گاڑی میں لادتی ہے اور جس مُردوئے کو ساتھ لاتی ہے وہ گاڑی ہانکتا ہے۔ یہ ساتھ بیٹھکر پان کی تھیلی کھول کر نیا پان لگاتی ہے۔ ہمارے گھر کے تمام مرد عورت برآمدے میں کھڑے ہو کر دھوبن کو رُخصت ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، ان میں سے بعض ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں اور زبانِ حال سے یوں کہتے ہیں "اے دھوبن تو پھر کب آئیگی؟"

بیل، چابک کھا کر چلتے ہیں اور گاڑی کو مع دھوبن کے کم از کم پانچ ہفتوں کیلئے ہم سب کی نظروں سے غائب کر دیتے ہیں!

جونہی دھوبن رُخصت ہوتی ہے اُسی دم گھر کا ہر فرد و بشر اپنے اپنے کمرے میں جاکر اپنے کپڑوں کی ڈھیری کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ ایک عدد قینچی، سوئی دھاگہ، مختلف رنگوں کے بٹن کہیں سے فراہم کرلیتا ہے اور ہر ایک کپڑے کا کھول کھول کر معائنہ کرتا ہے۔ ہر ایک کپڑا قابلِ مرمّت ہوتا ہے۔ بعض دھوبن کی مار کھا کر پھٹ گئے ہوتے ہیں۔ قمیصوں اور پتلونوں کے بٹن غائب ہوتے ہیں۔ اس لئے سب اپنی اپنی جگہ اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جس طرح مورچوں پر سپاہی بیٹھے ہوں۔ اور سلائی کا کام تین چار گھنٹے تک برابر جاری رہتا ہے۔ غرض کہ دھوبن کے آتے ہی گھر دھوبی گھاٹ سے بدل کر کسی پُرانے پارچہ فروش کا گھر معلوم ہوتا ہے اور اُس کے جاتے ہی گھر کا نقشہ پھر بدل جاتا ہے اور ابکے ہمارا گھر کسی درزی کی درسگاہ یا رفوگر کی دُکان کی طرح بن جاتا ہے۔ یہ کام ختم ہو جانے کے بعد استری کرنے کا کام شروع ہوتا ہے اور شام اسی طرح ہو جاتی ہے۔ اُس دن گھر کا کوئی شخص کہیں باہر نہیں جاسکتا۔

ایک دفعہ میں سردی کی چھٹیاں گھر گذار رہا تھا۔ دھوبن آئی اور میرے سب کپڑے پھاڑ کر لائی۔ مجھے نہایت غصّہ آیا۔ میں نے اُسے ڈانٹا۔ "تم کیوں سب قمیصیں اور پاجامے پھاڑ لائیں۔ اور شیروانیوں کے سب بٹن غائب ہیں! تم بٹنوں کا بیوپار تو نہیں کرتیں؟"

اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "سرکار آپکے سب کپڑے کثرت استعمال کی وجہ سے بوسیدہ ہوگئے ہیں۔ کپڑوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن کتنا ہی اچھا کپڑا کیوں نہ ہو ضرور پھٹ جاتا ہے۔ البتہ شیروانی کا ایک آدھ بٹن ضرور میری سوکن کے داماد سے ٹوٹ گیا ہے۔ مَیں اُسے تنبیہ کر دوں گی کہ آئندہ سے بٹنوں والے کپڑوں کو پتھر پر زور سے نہ پٹخا کرے۔ آپ شیروانیوں میں ایسے بٹن کیوں نہیں لگاتے جو دھوتے وقت علیحدہ کر دئے جائیں؟"

میں نے کہا۔ "دھوبن تم سے باتوں میں کوئی جیت نہیں سکتا۔ مگر اس دفعہ میں چند نئی قمیصیں دھونے کے لئے دے رہا ہوں۔ یہ ریشمی ہیں اور نہایت مہنگی ذرا میرے حال پر رحم کرنا!"

دھوبن نے میری نئی قمیصوں میں سے ایک کو ہاتھ میں لیکر غور سے دیکھا اور بولی۔ "حضور یہ کپڑا جاپانی ہے۔ دیکھنے میں ریشم نظر آتا ہے مگر نہایت ناقص ہے اگر یہ قمیصیں پھٹ گئیں تو مَیں ذمہ دار نہ ہونگی۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور تڑخ جائیں گی!"

مَیں نے دل ہی دل میں کہا ؎

دھوبن سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جو پھاڑنے پہ آئے تو پہلے پکار دے

(بقیہ بر صفحہ ۶۲)

رونے سے بھی اب دل کی تسکین نہیں ہوتی　　مایوسیٔ تمنا کی اللہ رے بیتابی

⁂

تھمتے نہیں سرشک اب قلب پہ یہ اثر پڑا　　آہ نہ پوچھ ہمنشیں خواب میں کیا نظر پڑا

⁂

پابندیوں نے کھولی یہ راہِ ہمکلامی　　میں اور سے مخاطب، وہ اور سے مخاطب

⁂

مجھکو سب کچھ بھول جانے پر بھی سب کچھ یاد ہے　　دل کا ہر گوشہ تمہاری یاد سے آباد ہے

⁂

تم اگر ہمراہ ہوتیں، ہم بھی ہنستے بولتے　　چاندنی، سبزہ، لبِ جو، لوگ محوِ اختلاط

⁂

خوں ہوا جاتا ہے دل پھولوں پہ شبنم دیکھکر　　عارضِ گلگوں پہ اشکِ گوہریں یاد آگئے

⁂

مجھکو تمنّا پہ اختیار نہیں ہے　　اپنی حقیقت کو جانتا ہوں مگر آہ

⁂

چشم و لب و آغوش کی تسکین کہاں اب　　ہاں تیرا تصوّر بھی نہیں کیف سے خالی

⁂

تیرے سوا کوئی حسیں دل میں سما سکتا نہیں
جویائے نکہت کیلئے تصویرِ گُل بیکار ہے

"پریم پجاری"

مَیں نہیں جانتی!!

کون سی چیز میرے دل کو متاثر کر رہی ہے ـــــ ؟ آہ مَیں نہیں جانتی!۔

کیا شرمیلی کلیوں کی وہ دلفریب ادا؟ جو سُورج کی پہلی کرن کو دیکھ کر مُسکرا پڑتی ہیں؟۔

یا غمگین چڑیا کا وہ پہلا نغمہ؟ ـــ جو گرم موسم کی صبح میں گونجتا ہے؟۔

اور جو میری خوابگاہ کے قریب دریچی کے پاس ہارسنگھار کی پتلی سی ٹہنی پر بیٹھ کر گھنٹوں گایا کرتی ہے؟۔

مَیں نہیں جانتی۔ مَیں بعض وقت اُداس کیوں ہو جاتی ہوں؟ اور کونسی چیز میرے دل کو متاثر کرتی ہے؟۔

کیا وہ غمناک تاریک اُداسی جو آفتاب کے غروب ہوتے ہی گیہوں کے کھیتوں پر چھا جاتی ہے؟۔

یا اُداس قبروں کے بھُورے شکستہ پتھروں کی یاد! جنکے نیچے سینکڑوں رومان دفن ہیں؟۔

اے رازکے جویا!! مجھسے نہ پوچھ ـــ کہ مَیں کیوں یکایک اُداس ہو جاتی ہوں۔ مَیں نہیں جانتی ـــ میری اُداسی کا سبب کیا ہے؟

کیا اس حسرتناک افسانے کی یاد؟ ـــــــ کہ پروانہ کس طرح جمالِ آتشیں کو چُومنے کی آرزو میں جل مرتا ہے؟۔

یا وہ مرتعش تاریکی جو شمع کے گُل ہو جانے کے بعد کمرے پر طاری ہو جاتی ہے؟۔

مجھے نہیں معلوم ـــــــ مَیں نہیں جانتی!!

خدا کے لئے شہد کی مکھیو! آہستہ آہستہ بھنبھناؤ۔ اور اے سیاہ بھونرے! اس جگہ سے چُپ چاپ نکل جا۔

جون کے گول اور نارنجی رنگ کے آفتاب کی سُرخ کرنیں تیرے بالوں کو چمکا رہی ہیں۔

اور بُلبل ـــــــ دُور عشق پیچاں کی بیلوں کے پیچھے مُنہ دیئے بیٹھ گئی ہے۔

ایسے سمے میں۔ ان کاسنی پھُولوں کے درمیان اے خواب کے شیدائی! تو کس سوچ میں مصروف ہے؟۔

حجاب امتیاز علی؛

تحفے
اور دوسرے شگفتہ افسانے
حجاب امتیاز علی

کی تازہ ترین کتاب کے چند کیرکٹروں سے ملئے:۔

(۱) حضرت مرجان مزے سے ایک کباب کھاتے ہوئے فرماتے ہیں:۔ "سامان سامون پیک پوک ہو گیا؟... آپ کی بھیتی پوچپٹی کا خیال ہے.. ... میں بیر پور کی شام شوم کی ٹرین ٹرون سے چلا جاتا"

(۲) وارفتہ مزاج نوجوان پوتا ریحانی جوش میں کہتا ہے "یہ دادا ابا کو کیا ہو گیا؟ ان لوگوں کو انتخاب زدواج میں ذرا بھی سلیقہ نہیں۔ تف ہی تف"

(۳) "اخروٹ کی مٹھائی"! بیگم نجم کی سُریلی آواز گونجی۔ کپتان مرحوم موتیا کی بیلوں میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھے تھے اور پتوں کی اوٹ سے خاتون کی طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے ـــ اس کتاب میں محبت، رومان، ہنسی، شگفتگی۔ نوجوانوں کے پروگرام۔ بزرگوں کے عتاب اور پھر روحی کا بیان رنگین۔ غرض سب ہی کچھ موجود ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت پنجاب، ۷ ریلوے روڈ۔ لاہور

فکرِ شعر

جھکی ہوئی شاخوں پر شام کی ہوائیں نڈھال ہیں۔
اور سبز پتے سکوت میں گم ہیں۔
دن رات میٹھے گیت گانے والا چشمہ اپنے سر دھیمے کر چکا۔
شیریں تریں! تو سر جھکائے اس کنج باغ کی تنہائی میں کس سوچ میں مصروف ہے ـــــ؟

(بسلسلہ ماہ اپریل)

تحلیل نفسی

مختلف دبستاں

گزشتہ مضمون میں بالتفصیل بیان ہوچکا ہے کہ کس طرح فرائڈ نے تنِ تنہا تحلیل نفسی کے بنیادی اصولوں اور ابتدائی قانونوں کی بنیاد رکھی۔ پہلے پہل تو وہ اکیلا ہی مشاہدات اور تجربات کے اس بے کنار سمندر میں غواصی کرتا پھرا۔ لیکن بعد میں (بیسویں صدی کے اوائل میں) جرمنی کے چند طلبا ء علم طب اس کے شاگرد بن کر اس کے ماتحت تحقیق و تفتیش کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس کے شاگردوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وائنا اور وسطی یورپ کے شہر اس کے شاگردوں سے بھرپور ہوگئے۔ یہاں تک کہ ان کثیر التعداد شاگردوں میں روحِ تعاون پھونکنے کیلئے متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ اور ان جلسوں میں تحلیل نفسی کے متعلق نئے نئے مسائل اور جدید ترین ایجادات پر بالتفصیل تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ فرائڈ کے اولین شاگردوں میں تحلیل نفسی کے جن ماہروں کی خاص شہرت ہوئی ان میں برلن کے رہنے والے ابراہیم (Abraham) اور نیویارک کے رہنے والے برل (Brill) سب سے پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے سنہ ۱۹۱۰ء کے قریب قریب فرائڈ کی توجیہات اور نظریات کی تبلیغ میں خاص زور مارا۔ اگرچہ تحلیل نفسی کا فن جلد ہی دنیا کے گوشہ گوشہ میں جا پہنچا۔ اور کئی بیرونی حکما اس فن میں اور اس اسکول میں خاص الخاص مراتب پر متمکن ہوئے (مثلاً ڈاکٹر ارنسٹ جونز ایم۔ ڈی۔ جو سنہ ۱۹۲۰ء میں تحلیل نفسی کے بین الاقوامی جرنل کے ایڈیٹر مقرر ہوئے) لیکن قدرتی طور پر اس دریائے فن کا سرچشمہ وائنا ہی میں قرار پایا۔ اور اس دبستان کی صدارت کا فرض خود فرائڈ کے سپرد ہوا۔ چنانچہ یہ اسکول فرائڈ اور اس کے مددگار شاگردوں یعنی فرنشی (Ferenczi) اور رینک (Rank) وغیرہ کے ہاتھوں ترقی کرتا ہوا آسمانِ کمال تک جا پہنچا۔ ان حضرات کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ مثال کے طور پر فرنشی نے احساسِ[1] حقیقت کے ارتقائی ادوار پر روشنی ڈالی ہے اور برل نے اکلوتے بچہ کا نفسیاتی[2] مطالعہ کیا ہے، رینک[3] نے پیدائش کے نفسی حادثہ کے متعلق بہت تحقیق کی ہے۔ (یہ وہ دھچکا ہے جو بچے کو پہلے پہل بیرونِ رحم زندگی سے دوچار ہونے پر لگتا ہے)

اب تحلیل نفسی کے اُن دبستانوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو فرائڈ کے نظریات سے ذرا پرے ہٹ گئے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک کتاب موسوم بہ "لفظی تلازم کے چند مشاہدات" (Studies in word Association) شائع ہوئی۔ ژنگ اور رکلن کی یہ تصنیف ان کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ اور دبستانِ زیورچ (Zurich School) کا اوّلین شاہکار تھی۔ اس کتاب کی بدولت ایک تو تجرباتی نفسیات کے ایک مشہور طریقے یعنی لفظی تلازم کا استعمال تحلیل نفسی میں عملی طور پر رائج ہوگیا اور دوسرا یہ کہ نفسی معلومات کے احاطہ میں ایک ایسے نئے رجحان کا داخلہ ہوا جو کافی حد تک تلازم کے مذہب عالیہ (Classical Associationism) سے مشابہ ہے۔ اس رجحان کے زیر اثر جملہ ذہنی زندگی ایک قسم کے تلازمات کا عکس قرار پائی۔ اور امتحان تلازم کا فرض ٹھہرا کہ اس جذبات اور جبلّات کے تانے بانے سے بنی ہوئی تخیلی جال کی گتھیاں سلجھائے۔ ذہنی الجھاؤ دور کرنے کا یہ طریقہ ونٹ (Wundt) کے سادہ طریقے سے مشابہ تھا۔ اور زیادہ تر استقرائی (Inductive) تھا۔ یعنی امتحان تلازم[4] کے وقت کی کمی بیشی پر عمر، صنف اور تعلیم کے اثرات کی تحلیل کی گئی۔ اور تلازم کی

---

1. In "Sex in Psycho-Analysis" Ferenczi 1906.
2. The only or favourite child in adult life in his volume Psycho-Analysis (Third Edition, 1922.)
3. Das Trauma der Geburt. 1924.
4. امتحان تلازم (Association Test) کے مختلف طریقے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کرنے والا بے ربط اور عام الفاظ کی ایک لمبی سی فہرست پہلے سے تیار کر لیتا ہے۔ معمول کا کام یہ ہوتا ہے کہ جونہی وہ ایک لفظ عامل کی زبان سے سنے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مختلف قسموں کی جماعت بندی کی گئی۔ اس میدان میں ژُنگ نے بہت کارنمایاں کئے ہیں۔ اور تجرباتی نفسیات کے ماہروں نے اس کی انتھک ہمت کی بہت داد دی ہے۔ ژنگ کے طریقے کی عملی تشریح اور اس کی وقعت کے ثبوت کا ایک ادنیٰ نمونہ فرسٹ (Furst)[1] کے وہ تجربات ہیں جس میں اس نے ایک خاندان کے جملہ افراد کی اقسام تلازم میں فطری یکرنگی اور قدرتی یگانگت کی موجودگی ثابت کر دکھائی ہے۔ ان امکانات کے باوجود جس چیز نے تجربے کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچا ہے وہ یہ کیاتی (Quantitative) استعمال نہ تھا بلکہ وہ تو یہ خیال تھا کہ کسی طرح انسانی جذبات کی صفاتی (Qualitative) تحلیل کے لئے امتحاناتِ تلازم سے مدد حاصل کی جائے۔ ماہرانِ تحلیل نفسی امتحان تلازم میں مندرجہ ذیل امور پر نظر رکھتے ہیں۔ دستور سے بہت زیادہ سُست یا چُست جواب۔ معمول کا عامل کے الفاظ کو دُہرانا۔ معمول کے چہرے یا دیگر حرکات وسکنات سے کسی خاص جذبہ کا ظاہر ہونا (مثلاً کھانسنا۔ الفاظ بخوبی ادا نہ کرسکنا) ان کے خیال میں اس قسم کے خاص الخاص اشارات خفیہ جذباتی کش مکش کا اظہار کرتے ہیں۔ اور وہ ان خفیہ اشارات اور دیگر آشکارا علامات کو تحلیل نفسی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اوّل اوّل ایک تو ژُنگ اور اس کے ہمراہیوں نے اس طریقے کو فرائڈ کے طریقے (مریض کا آزاد تلازم) کا نعم البدل نہ قرار دیا اور دوسرا خود فرائڈ نے اس نئے طریقے کو اپنے پرانے طریقے کا معاون گردانا۔ اور اس وجہ سے کافی مدّت تک ان دونوں استادوں کے تعلقات خوب گہرے رہے۔

آہستہ آہستہ ژُنگ اپنے نظریات اور توجیہات کے سلسلوں میں نئی نئی تبدیلیاں کرنے لگا، اور آخر کار فرائڈ کا یہ نوجوان شاگرد اپنے استاد کو چھوڑ کر ایک نئے اسکول (یعنی دبستانِ زیورچ) کا صدر بن بیٹھا۔ اگرچہ فرائڈ کی تعلیمات اور زیورچ اسکول کے خیالات میں بہت زیادہ امورات میں فرق ہے۔ لیکن بنیادی فرق توجیہہ جذبۂ الفت (Theory of Libido) میں نمایاں ہوتا ہے۔ ژُنگ کے نزدیک فرائڈ کا جنسی تعلقات پر اتنا زور دینا بے بنیاد اور غلط ہے۔ بقولِ ژُنگ انسانی کوششوں کی بنیاد زیادہ تر اس نفسی قوت پر قائم ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو نئے رنگوں میں نمایاں کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا خیال ہے کہ نفسِ لاشعور محض انسان کے دبے ہوئے تجربات کا خزینہ ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک قسم کا بہروپیہ یعنی انموذجی مادہ کا مجموعہ (Symbolic Material) ہے جو انسانی خواہشات کے اظہار کے علاوہ بعض ایسے امور کا آئینہ بردار بنتا ہے جو ایک فرد کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ زندگی کی وہ تمام سہولتیں اور عیش وعشرت کے وہ تمام امکانات جو والدین کو نصیب ہوسکتے تھے اور جن سے وہ تمام عمر مصنوعی وجوہات کے سبب غیر ارادی اجتناب کرتے رہے ہیں ان کی اولاد کو امنگوں، اکساہٹوں اور رجحانات کی صورت میں بطور ورثہ مل جاتے ہیں۔ یعنی بچے غیر ارادی طور پر اپنے والدین کی زندگی کی مجبوریوں کی تلافی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات حد سے بڑھے ہوئے دیندار والدین کے ہاں سخت بداخلاق بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک غیر ذمہ دار اور فضول خرچ باپ کا لڑکا بلند ہمتی کا مجنون[2]

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق) وہ فوراً اس کے جواب میں ایک اور لفظ کہہ دے یعنی عامل کے لفظ کو سن کر بغیر سوچے سمجھے جو پہلا لفظ اس کے ذہن میں پیدا ہو وہی ادا کرے۔ عامل ان الفاظ کو لکھتا جاتا ہے اور بعد میں ان دونوں فہرستوں کے تقابل سے معمول کی نفسیاتی افتاد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنے وقت میں معمول عامل کے ایک لفظ کے جواب میں کوئی دوسرا لفظ بولتا ہے اسے امتحان تلازم کا وقت (Association Time) کہتے ہیں۔

[1] See Jung "The Association Method:" Am. j. Psychol. XXI 1910.

[2] اس کے ساتھ ہی ژُنگ جذبۂ شہوانی کی اہمیت سے منکر بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ایک کتاب "نفسِ لاشعور کی نفسیات (Psychology of The Unconscious)" میں رقمطراز ہے "ہم جذبۂ الفت Libido سے مختلف اشکال میں دوچار ہوتے ہیں۔ بچپنے میں یہ جذبہ زیادہ جبلت نشو ونما کا بھیس بدلتا ہے۔ ..... جسمانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس جذبہ کے استعمال کی نئی نئی راہیں نکلتی آتی ہیں۔ .. اس کا سب سے آخری لیکن عملی طور پر سب سے اہم استعمال کا احاطہ شہوتِ حیوانی کا احاطہ ہے۔"

4. C.G. Jung: Contributributions to Analytical Psychology 1928.

بن جاتا ہے۔ جُنگ کے خیال میں یہ بہروپ بدلنا جذبات و خواہشات کے دبانے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس لاشعور کی فطری وحشت کا تقاضا ہے کہ ایک فرد استعارہ وکنایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ نظریات کے اس تغیر کے طفیل تحلیل نفسیات جُنگ کے ہاتھوں تک پہونچ کر فرائڈ کی تحلیل نفسی نہ رہی۔ بلکہ ایک نئی شکل اختیار کر گئی۔ ایک عالم نفسیات کی فرائڈ کی پیروی میں یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اپنے مرض کو خود سمجھ کر اپنی برباد شخصیت کو پھر سے ایک نئے سانچے میں ڈھال لے۔ عام حالات میں اپنے خوف، نمائش اور حقارت وغیرہ کے جذبات کی ماہیت اور سبب سے متعارف ہو جائے۔ لیکن جُنگ کے ہمنواؤں کے نزدیک تحلیل نفسی کا مسئلہ اس سے کہیں گہرا ہے ان کے خیال کے بموجب معالج کو جذبہ الفت (Libido) کے نئے نئے تغیر اور بہروپ تلاش کرنے کے لئے ہر بار نئے سرے سے دیومالا، صنمیات، تاریخ، مذہب اور فنون لطیفہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مریض کے اوہام کی تاریکیوں میں راہ نکالنے کے لئے یہی تغیرات اور بہروپ مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہ اوہام جو فرائڈ کے نزدیک محض پنہاں خواہشات کی تخیلی تکمیل کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور جن کا ارادی کوششوں سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ بقول جُنگ جذبہ الفت (Libido) کے عالی شان محل کا بنیادی پتھر ہیں۔ اور چونکہ ایک فرد کی یہ نفسی قوتیں ہمیشہ نئے نئے بھیس بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے تحلیل نفسی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس طرح کٹر نفسیات کے ماہروں کے نزدیک فرائڈ کی توجیہ محض ایک خیالی گھروندا ہے۔ اس طرح فرائڈ کے ہمنواؤں کے نزدیک جُنگ کا یہ نظریہ ایک بے بنیاد تخیلی محل ہے۔

اس نظریہ کی چھان بین اور جذبہ الفت (Libido) کی ان شعبدہ بازیوں کی تحقیق کے سلسلہ میں جُنگ کو مختلف قسم کی شخصیتوں کی جماعت بندی کا خیال پیدا ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بعض افراد میں جذبات باہر نکلنے کیلئے زور مارتے ہیں۔ اور بعض حضرات میں یہ جذبات اندر کو گھستے ہیں۔ خارجی (Extrovert) افراد اپنے گرد و پیش کو افعال و کردار کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے برعکس باطنی (Introvert) افراد کی قوتوں کا رخ اندر کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ تخیل کی دنیا کے بسیا ہوتے ہیں۔ اور ان میں وہ تمام شاعر، نقاش، سنگتراش اور مغنی شامل ہیں جو تخیل کی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ باطنیت اور خارجیت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جن ماہروں نے جُنگ کے اس نظریہ کے الاؤ سے دیئے جلائے ہیں وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دونوں حالتیں انتہائی حالتیں ہیں۔ واٹسن (Watson)[1] کا خیال ہے کہ "تمام افراد ہرگز ہرگز ان دو اقسام میں تقسیم نہیں ہو سکتے۔ فی الحقیقت یہ دونوں قسمیں علیحدہ علیحدہ پیدا نہیں۔ یعنی عام انسان نہ تو صرف باطنی ہوتے ہیں اور نہ ہی صرف خارجی . . . . بلکہ کبھی ان کا خارجی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ان کا باطنی رنگ چمک جاتا ہے۔ (یعنی وہ Ambivert ہیں)"۔ باطنیت انسان کو خواب کی دُنیا کا باشندہ بنا کر اسے ایک غیر اجتماعی (Unsocial) شخصیت بنا دیتی ہے۔ اس کے اثرات کا انتہائی شکار ایک قسم کا ذہنی مریض ہوگا جسے کریپلن (Kraepeline) نے Dementia Peocox کا نام دیا ہے۔ جُنگ اس چیز کے مریضانہ پہلو پر اتنا زور نہیں دیتا۔ اس کا قول ہے کہ اندرونی دنیا اور مشاہداتی دنیا اپنی حقیقت میں یکساں ہیں۔ اس لئے کسی ایک دنیا پر مائل ہونا کچھ زیادہ قابل اعتراض امر نہیں۔

اگرچہ جُنگ کی نفسیات میں ہر پھر کر ذہنی امراض کے تذکرے ہیں۔ پھر بھی اس نے اپنی توجیہ (Theory) کا مرکز نفس شعور میں قائم کیا ہے۔ جس طرح فرائڈ کی توجیہ کا خمیر عام طور پر مریضوں کے مشاہدہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح جُنگ نے اپنے نظریات کے مشاہداتی ثبوت ادب سے فراہم کئے ہیں۔ جُنگ کا نفسی اصولات کو اسی طرح پس پشت ڈال دینا فرائڈ کو بہت ناگوار گذرا۔ چنانچہ اسی رنجش کے باعث فرائڈ نے اپنی کتاب General Introduction to Psycho-Analysis کے صفحہ ۲۲۲ پر کہا تھا کہ "کبھی وہ وقت بھی تھا جب جُنگ محض ایک ماہر نفسیات ہونے پر ہی قانع تھا۔ یا اب اسے یہ دن لگے ہیں کہ پیغمبری کا دعوی کرتا پھرتا ہے"۔

فرائڈ اور جُنگ کے مذکورہ بالا دبستانوں کے علاوہ فرائڈ کے ایک اور شاگرد الفریڈ ایڈلر نے دُنیا میں ایک تیسرے دبستان کی بنیاد رکھی۔ ایڈلر کے ابتدائی کارنامے اس احساس سفلی (Sense of Inferiority)[2] سے متعلق ہیں جو کسی عضوی خامی یا کسی جسمانی ناہمواری سے پیدا ہوتا ہے۔

1. G. B. Watson "Character tests of 1926. Vocational Guidance Magazine V 1927.

2. Study of Organic Inferiority & its Psychical Compensation 1907.

مختلف قسموں کی جماعت بندی کی گئی ۔ اس میدان میں ژنگ نے بہت کار نمایاں کئے ہیں ۔ اور تجرباتی نفسیات کے ماہروں نے اس کی انتھک ہمت کی بہت داد دی ہے ۔ ژنگ کے طریقے کی عملی تشریح اور اس کی وقعت کے ثبوت کا ایک ادنیٰ نمونہ فرسٹ[1] (Furst) کے وہ تجربات ہیں جس میں اس نے ایک خاندان کے جملہ افراد کی اقسام تلازم میں فطری یکرنگی اور قدرتی یگانگت کی موجودگی ثابت کر دکھائی ہے ۔ ان امکانات کے باوجود جس چیز نے تجربے کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچا ہے وہ یہ کیاتی (Quantitative) استعمال نہ تھا بلکہ وہ تو یہ خیال تھا کہ کسی طرح انسانی جذبات کی صفاتی (Qualitative) تحلیل کے لئے امتحانات تلازم سے مدد حاصل کی جائے ۔ ماہرانِ تحلیل نفسی امتحان تلازم میں مندرجہ ذیل امور پر نظر رکھتے ہیں ۔ دستور سے بہت زیادہ سست یا چست جواب ، معمول کا عامل کے الفاظ کو دُہرانا ، معمول کے چہرے یا دیگر حرکات و سکنات سے کسی خاص جذبہ کا ظاہر ہونا (مثلاً کھانسنا ۔ الفاظ بخوبی ادا نہ کرسکنا) ان کے خیال میں اس قسم کے خاص خاص اشارات خفیہ جذباتی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں ۔ اور وہ ان خفیہ اشارات اور دیگر آشکارا علامات کو تحلیل نفسی کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ اوّل اوّل ایک تو ژنگ اور اس کے ہمراہیوں نے اس طریقے کو فرائڈ کے طریقے (مریض کا آزاد تلازم) کا نعم البدل نہ قرار دیا اور دوسرا خود فرائڈ نے اس نئے طریقے کو اپنے پرانے طریقے کا معاون گردانا ۔ اور اس وجہ سے کافی مدت تک ان دونوں [illegible] کے تعلقات خوب گہرے رہے ۔

آہستہ آہستہ ژنگ اپنے نظریات اور توجیہات کے سلسلوں میں نئی نئی تبدیلیاں کرنے لگا ، اور آخر کار فرائڈ کا یہ نوجوان شاگرد اپنے استاد کو چھوڑ کر ایک نئے اسکول (یعنی دبستانِ زیورچ) کا صدر بن بیٹھا ۔ اگرچہ فرائڈ کی تعلیمات اور زیورچ اسکول کے خیالات میں بہت زیادہ امورات میں فرق ہے ۔ لیکن بنیادی فرق توجیہہ جذبۂ الفت (Theory of Libido) میں نمایاں ہوتا ہے ۔ ژنگ کے نزدیک فرائڈ کا جنسی تعلقات پر اتنا زور دینا بے بنیاد اور غلط ہے ۔ بقول ژنگ انسانی کوششوں کی بنیاد زیادہ تر اس نفسی قوت پر قائم ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو نئے رنگوں میں[2] نمایاں کرتی رہتی ہے ۔ ساتھ ہی اس کا خیال ہے کہ نفسِ لاشعور محض انسان کے دبے ہوئے تجربات کا خزینہ ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک قسم کا بہروپیہ یعنی انمودجی مادہ کا مجموعہ (Symbolic Material) ہے جو انسانی خواہشات کے اظہار کے علاوہ بعض ایسے امور کا آئینہ بردار بنتا ہے جو ایک فرد کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملتے ہیں ۔ قاعدہ ہے کہ زندگی کی وہ تمام سہولتیں اور عیش و عشرت کے وہ تمام امکانات جو والدین کو نصیب ہوسکتے تھے اور جن سے وہ تمام عمر مصنوعی وجوہات کے سبب غیر ارادی اجتناب کرتے رہے ہیں ان کی اولاد کو امنگوں ، اکساہٹوں اور رجحانات کی صورت میں بطور ورثہ مل جاتے ہیں ۔ یعنی بچے غیر ارادی طور پر اپنے والدین کی زندگی کی مجبوریوں کی تلافی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات حد سے بڑھے ہوئے دیندار والدین کے ہاں سخت بد اخلاق بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک غیر ذمہ دار اور فضول خرچ باپ کا لڑکا بلند ہمتی کا مجنون[3]

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق) وہ فوراً اس کے جواب میں ایک اور لفظ کہہ دے یعنی عامل کے لفظ کو سن کر بغیر سوچے سمجھے جو پہلا لفظ اس کے ذہن میں پیدا ہو وہی ادا کرے۔ عامل ان الفاظ کو لکھتا جاتا ہے اور بعد میں ان دونوں فہرستوں کے تقابل سے معمول کی نفسیاتی افتاد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے ۔ جتنے وقت میں معمول عامل کے ایک لفظ کے جواب میں کوئی دوسرا لفظ بولتا ہے اسے امتحان تلازم کا وقت (Association Time) کہتے ہیں ۔

[1] See Jung "The Association Method." Am. J. Psychol. XXI 1910.

[2] اس کے ساتھ ہی ژنگ جذبۂ شہوانی کی اہمیت سے منکر بھی نہیں ہوتا ۔ وہ اپنی ایک کتاب "نفسِ لاشعور کی نفسیات (Psychology of The Unconscious)" میں رقمطراز ہے "ہم جذبۂ الفت Libido سے مختلف اشکال میں دوچار ہوتے ہیں ۔ بچپنے میں یہ جذبہ زیادہ جبلت نشوونما کا بھیس بدلتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جسمانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس جذبہ کے استعمال کی نئی نئی راہیں نکلتی آتی ہیں ۔ ۔ ۔ اس کا سب سے آخری لیکن عملی طور پر سب سے اہم استعمال کا احاطہ شہوتِ حیوانی کا احاطہ ہے ۔"

4. C.G. Jung: Contributributions to Analytical Psychology 1928.

بن جاتا ہے۔ ژُنگ کے خیال میں یہ بہروپ بدلنا جذبات و خواہشات کے دبانے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس لاشعور کی فطری وحشت کا تقاضا ہے کہ ایک فرد استعارہ و کنایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ نظریات کے اس تغیر کے طفیل تحلیلی نفسیات ژُنگ کے ہاتھوں تک پہونچ کر فرائڈ کی تحلیل نفسی نہ رہی۔ بلکہ ایک نئی شکل اختیار کر گئی۔ ایک عالم نفسیات کی فرائڈ کی پیروی میں یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اپنے مرض کو خود سمجھ کر اپنی برباد شخصیت کو پھر سے ایک نئے سانچے میں ڈھال لے۔ عام حالات میں اپنے خوف، نمائش اور حقارت وغیرہ کے جذبات کی ماہیت اور سبب سے متعارف ہو جائے۔ لیکن ژُنگ کے ہمنواؤں کے نزدیک تحلیل نفسی کا مسئلہ اس سے کہیں گہرا ہے۔ ان کے خیال کے بموجب معالج کو جذبہ الفت (Libido) کے نئے نئے تغیر اور بہروپ تلاش کرنے کے لئے ہر بار نئے سرے سے دیومالا، صنمیات، تاریخ، مذہب اور فنون لطیفہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مریض کے اوہام کی تاریکیوں میں راہ نکالنے کے لئے یہی تغیر اور بہروپ مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہ اوہام جو فرائڈ کے نزدیک محض پنہاں خواہشات کی تخیلی تکمیل کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور جن کا ارادی کوشش سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ بقول ژُنگ جذبہ الفت (Libido) کے عالی شان محل کا بنیادی پتھر ہیں۔ اور چونکہ ایک فرد کی نفسی قوتیں ہمیشہ نئے نئے بھیس بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے تحلیل نفسی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس طرح کٹر نفسیات کے ماہروں کے نزدیک فرائڈ کی توجیہ محض ایک خیالی گھروندا ہے۔ اس طرح فرائڈ کے ہمنواؤں کے نزدیک ژُنگ کا یہ نظریہ ایک بے بنیاد تخیلی محل ہے۔

اس نظریہ کی چھان بین اور جذبہ الفت (Libido) کی ان شعبدہ بازیوں کی تحقیق کے سلسلہ میں ژُنگ کو مختلف قسم کی شخصیتوں کی جماعت بندی کا خیال پیدا ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بعض افراد میں جذبات باہر نکلنے کیلئے زور مارتے ہیں۔ اور بعض حضرات میں یہ جذبات اندر کو گھستے ہیں۔ خارجی (Extrovert) افراد اپنے گرد و پیش کو افعال و کردار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے برعکس باطنی (Introvert) افراد کی قوتوں کا رخ اندر کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ تخیل کی دنیا کے بسیا ہوتے ہیں۔ اور ان میں وہ تمام شاعر، نقاش، سنگتراش اور مغنی شامل ہیں جو تخیل کی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ باطنیت اور خارجیت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جن ماہروں نے ژُنگ کے اس نظریہ کے الاؤ سے دیئے جلائے ہیں وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دونوں حالتیں انتہائی حالتیں ہیں۔ واٹسن (Watson) کا خیال ہے کہ "تمام افراد ہرگز ہرگز ان دو اقسام میں تقسیم نہیں ہو سکتے۔ فی الحقیقت یہ دونوں قسمیں علیحدہ علیحدہ پیدا نہیں۔ یعنی عام انسان نہ تو صرف باطنی ہوتے ہیں اور نہ ہی صرف خارجی .... بلکہ کبھی ان کا خارجی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ان کا باطنی رنگ چمک جاتا ہے۔ (یعنی وہ Ambivert ہیں)"۔ باطنیت انسان کو خواب کی دُنیا کا باشندہ بنا کر اسے ایک غیر اجتماعی (Unsocial) شخصیت بنا دیتی ہے۔ اس کے اثرات کا انتہائی شکار ایک قسم کا ذہنی مریض ہوگا جسے کریپلن (Kraepeline) نے Dementia Peocox کا نام دیا ہے۔ ژُنگ اس چیز کے مریضانہ پہلو پر اتنا زور نہیں دیتا۔ اس کا قول ہے کہ اندرونی دنیا اور مشاہداتی دنیا اپنی حقیقت میں یکساں ہیں۔ اس لئے کسی ایک دنیا پر مائل ہونا کچھ زیادہ قابل اعتراض امر نہیں۔

اگرچہ ژُنگ کی نفسیات میں ہر پھر کر ذہنی امراض کے تذکرے ہیں۔ پھر بھی اس نے اپنی توجیہ (Theory) کا مرکز نفس شعور میں قائم کیا ہے۔ جس طرح فرائڈ کی توجیہ کا خمیر عام طور پر مریضوں کے مشاہدہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح ژُنگ نے اپنے نظریات کے مشاہداتی ثبوت ادب سے فراہم کئے ہیں۔ ژُنگ کا نفسی اصولات کو اسی طرح پس پشت ڈال دینا فرائڈ کو بہت ناگوار گذرا۔ چنانچہ اسی رنجش کے باعث فرائڈ نے اپنی کتاب General Introduction to Psycho-Analysis کے صفحہ ۲۴۲ پر کہا تھا کہ "کبھی وہ وقت بھی تھا جب ژُنگ محض ایک ماہر نفسیات ہونے پر ہی قانع تھا۔ یا اب اسے یہ دن لگے ہیں کہ پیغمبری کا دعویٰ کرتا پھرتا ہے"۔

فرائڈ اور ژُنگ کے مذکورہ بالا دبستانوں کے علاوہ فرائڈ کے ایک اور شاگرد الفریڈ ایڈلر نے دُنیا میں ایک تیسرے دبستان کی بنیاد رکھی۔ ایڈلر کے ابتدائی کارنامے اس احساس سفلی (Sense of Inferiority) سے متعلق ہیں جو کسی عضوی خامی یا کسی جسمانی ناہمواری سے پیدا ہوتا ہے۔

1. G. B. Watson "Character tests of 1926. Vocational Guidance Magazine V 1927.

2. Study of Organic Inferiority & its Psychical Compensation 1907.

اس کا خیال[1] تھا کہ عام حالات اور ذہنی امراض کی علامات کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہمیں ان غیر شعوری کوششوں پر خاص نظر رکھنی چاہیئے جو جسمانی کمزوریوں کی تلافی کرنے کے لئے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ گو دبستانِ فرائڈ کے حکما نے ایڈلر کی پیش کردہ توجیہات میں سے چند ایک نظریات کو بجا بھی تسلیم کیا۔ پھر بھی انھوں نے ایڈلر کی خدمات کو کوئی خاص وقعت نہ دی۔ ادھر ایڈلر بھی اپنے نام کا ایک تھا اس نے فرائڈ سے ہیٹا ہوا کسی صورت پسند نہ کیا اور اپنا علیحدہ اسکول قائم کر لیا۔ اس نئے دبستان کی پہلی سرگرمیوں کے طور پر احساسِ سفلی کی توجیہ پر بالتفصیل حاشیہ آرائی کی گئی۔ اور غیر شعوری تلافی (Unconscious Compensation) کے ثبوت سماج کے افعال و کردار سے بہم پہنچائے گئے۔ ذہنی امراض کے پیدا ہونے کے متعلق یہ حکم لگایا گیا کہ یا تو اس تلافی کا فقدان یہ امراض پیدا کر دیتا ہے یا کبھی کبھار کوئی فرد تلافی کرتے کرتے حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے اور اس طور (Superiority Complex) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس توجیہ کے نئے نئے شاخسانے نکالنے کے علاوہ ایڈلر اسکول کے حکما دو اور باتوں پر بھی متفق ہیں۔ ایک تو ان کا یقین ہے کہ خواب کی تعبیر کبھی بھی سچی اور یقینی ہو ہی نہیں سکتی۔ یا بالفاظِ دیگر خواب کے حقیقی معنی کبھی بھی بیان نہیں ہو سکتے، دوسرا یہ کہ نفسِ لاشعور اور نفسِ شعور ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ واضح ہو کہ اگرچہ ایڈلر کی شہرت اس کی ان توجیہات پر قائم ہے جو احساسِ سفلی و علوی سے متعلق ہیں لیکن اس کی دبستانِ فرائڈ سے علیحدگی اس کے مذکورہ بالا دو اصول موضوعہ ہیں یعنی تعبیرِ خواب اور اقسامِ نفس سے انکار۔

ایڈلر کی ایک امریکی تصنیف "The Science of Living" "زندگی بسر کرنے کا فن" کے دیباچہ میں ایڈلر کو مغربی ممالک کا کنفیوشس مانا گیا ہے۔ اس دیباچہ کے مصنف[3] فرماتے ہیں:۔

"یہ خیال کہ نفسِ لاشعور ایک قسم کا حیاتیاتی حافظہ (Biological Memory) بن جاتا ہے نفسیات میں عام ہے۔ اس تصور (Concept) کو زیادہ متعین کرنے کے پیرایہ میں یہ حکم لگایا تھا کہ صرف انہی فتوحات یا ناکامیابیوں کی یاد ہی حیاتیاتی حافظہ بن سکتی ہے جو کسی نہ کسی طرح جنسی جذبات سے متعلق ہوں۔ ژونگ نے فرائڈ کے اس نظریہ کو تنگ اور محدود سمجھ کر خاندانی اور جدی یاد کی اہمیت کو بھی ثابت کر دکھایا۔ ان ہر دو حضرات کی خدمات سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی نفسِ لاشعور کو حیاتیاتی حقائق سے مکمل طور پر ملانے کا شرف ایڈلر کو ہی حاصل ہے۔ ایڈلر نے ابتدا ہی میں یہ ثابت کر دکھایا کہ ہر فرد کا نظامِ حافظہ (Scheme of Memory) مختلف ہے یعنی تمام افراد میں لاشعوری حافظہ ایک ہی مرکز کے گرد پیدا نہیں ہوتا۔ یا بالفاظِ دیگر آپ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک شخص کی لاشعوری یاد کی تہ میں جنسی جذبات ہی پنہاں نہیں ہوتے بلکہ تحقیق کرنے سے پتہ ملتا ہے کہ ہر ایک فرد اپنے مشاہدات اپنے کسی اصول کے ماتحت چن چن کر اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ انتخاب کا یہ اصول کیسے رو پذیر ہوتا ہے؟ ایڈلر کا خیال ہے کہ اس انتخابی اصول کی بنیاد کسی عضوی اشتہا کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایک روح اپنی مادی اور جسمانی حقیقتوں سے باخبر ہے اور کسی ایک کمی کی تلافی کئے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ مثال کے طور پر ایک نحیف الجثہ فرد کی تمام زندگی اس امر کی کوشش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلد ہی عظمت اور بلندی حاصل کرے۔ ایشیائی حکما کے کلام سے بھی یہ خیال مترشح ہے اور شاید ذوق مرحوم نے کسی ایسے ہی جذبہ سے متاثر ہو کر فرمایا تھا کہ ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ!
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

اگرچہ یہ اصول ہر ایک جگہ مستعمل ہے۔ لیکن خیال رہے کہ اس کا استعمال بعض مواقع پر بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک تو مختلف خامیوں کا اجتماع اصول کو اکثر پیچیدہ بنا دیتا ہے اور دوسرا اکثر افراد کا خیالی اور وہمی خامیوں میں مبتلا ہونا اصول کو گنجلک کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جنسی جذبات انسانی زندگی کی روحِ رواں بننے کی بجائے اسی اصول تلافی میں سما جاتے ہیں۔ کیونکہ شہوت جذبات

1. The Neorotic Constitution. (1912.)
2. Understanding Human Nature. (1927.)
3. Phillipe Mairet.

کے احاطہ میں داخل ہے اور جذبات کا احاطہ اسی اصول تلافی و انتخاب کے اشاروں پر قائم ہے۔

اس اصول کے طفیل حیاتیات اور نفسیات آپس میں بغل گیر ہو جاتی ہیں اور ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ روحانی رجحانات کی باگ ڈور اور دماغی ارتقا کی کنجی ان کوششوں کے ہاتھ میں ہے جو ان خامیوں کی تلافی کیلئے عرصۂ عمل میں لائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک فرد کی جملہ غیر معمولی حرکات و سکنات کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ تلافی کا یہ اصول ایڈلر سے کافی پہلے کی اختراع ہے۔ ایڈلر سے پہلے یہ معلوم تھا کہ جسم کے کسی حصے کو زخم کی تلافی کیلئے جسم کا کوئی اور حصہ زیادہ پرورش پاجاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کا ایک گردہ بیکار ہو جائے تو اس کا دوسرا گردہ غیر معمولی نشوونما پاکر دونوں کی خدمات انجام دینے کے قابل بن جائیگا۔ تلافی کے طور پر یہ جسمانی نشوونما ایڈلر سے پیشتر بھی کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی لیکن اس تصور کو نفسیات کا بنیادی اصول بنا دینے کا سہرا ایڈلر ہی کے سر ہے۔

اگرچہ موجودہ دور کا قرب نگاہِ مشاہدہ کو چندھیا دیتا ہے اور جدید زمانہ کے متعلق کوئی ٹھیک رائے قائم نہیں ہوسکتی۔ پھر بطور مشتے از خروارے تحلیل نفسی کی جدید نشر و اشاعت کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی مناسب ٹھیرتا ہے۔

جرمن زبان بولنے والے ممالک[1] میں اس توجیہ نے بیسویں صدی کے آغاز سے ترقی کرنا شروع کیا اور اب تک یہ مسئلہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا جارہا ہے اور حکما کے اعتراضوں کے باوجود ان ممالک کے جملہ اطبا اب تک اس مسئلہ کے بنیادی اصولوں سے مکمل طور پر واقف ہو چکے ہیں۔ یورپ کے دیگر ممالک میں یہ نظریہ قیاس نہ تو نفسی فنون پر اثر انداز ہوا ہے اور نہ ہی نفسیات کو اپنے رنگ میں رنگ سکا ہے۔ البتہ برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں اس کے جھنڈے گڑ رہے ہیں۔ اس توجیہ میں امریکہ کے نفسی فنون میں داخل کرنے کا فخر برل[2] کو حاصل ہے۔ کیونکہ اس نے کمال تندہی سے فرائڈ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کرکے امریکہ کے حکما پر اس فن کے تمام باب وا کر دیئے ہیں۔ برل کی ان تمہیدی کاوشوں کے بعد فرائڈ اور ژونگ نے بہ نفس نفیس کلارک[3] یونیورسٹی میں لیکچر دے کر اس مسئلہ کی اشاعت امریکہ میں عام کر دی۔ برطانیہ میں اس توجیہ کا شاخسانہ جنگِ عظیم کے بعد اٹھایا گیا۔ اور حکما "جنگ کے ذہنی دھچکوں" کا مطالعہ کرتے کرتے اس نظریہ کی طرف مائل ہوئے۔ ان سب میں River[4] پیش پیش تھا۔ ان اسباب نشر و اشاعت کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ نفسی فنون میں آگے ہی ایسے رجحانات موجود تھے جو تحلیل نفسی کے مددگار ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر Meyer اور Hoch کے نظریات کو فرائڈ کی توجیہ کا عکس تو نہیں کہے جا سکتے۔ پھر بھی ان دونوں حکما کے نزدیک تمام ذہنی امراض کی تہ میں جسمانی عارضے کی نسبت نفسیاتی اثر زیادہ کارکن ہیں۔ میئر کا "نفص دار دماغی عادات" کا بار بار ذکر کرنا اور ہوچ کا یہ کہنا کہ باطنیت کا مسکن گوشۂ تنہائی ہے صرف فرائڈ کی تقلید ہی ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ موجودہ دور میں کرپلین، جینٹ اور مارٹن پرنس وغیرہ کے زیر اثر شخصیت کے مطالعہ کا شوق بہت عام ہو گیا ہے۔ فی الحقیقت موجودہ دور میں مختلف نظریات کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آج نہ صرف تحلیل نفسی کی حدود متعین کرنا ہی سخت مشکل ہے بلکہ مختلف مسئلہ جات پر فرائڈ اور اس کے حواریوں کی تعلیمات کے اثرات کا اندازہ لگانا بھی بہت کٹھن امر بن گیا ہے۔

خود نفسیات تحلیل نفسی کی توجیہات ماننے سے سراسر منکر ہے۔ یہ انکار کی عادت برطانیہ کی نسبت امریکہ میں کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کمرۂ تعلیم اور دار التجربہ کی بجائے اس مسئلہ کے نشیمن دماغی ہسپتال قرار پاتے ہیں۔ امریکہ کے حکما تجرباتی نفسیات میں خوب ماہر ہیں۔ اور اس کے برعکس برطانیہ کے ماہران نفسیات تجرباتی نفسیات کو بہت غیر اہم چیز سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں

---

[1] ہماری مراد سوئٹزرلینڈ، جرمنی، آسٹریا اور ان کے قریبی علاقوں سے ہے۔

[2] اس نے "تعبیر خواب از فرائڈ" کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں شائع کیا تھا۔

[3] یہ لیکچر ۱۹۰۹ء میں ہال کی دعوت پر دیئے گئے تھے۔

[4] ملاحظہ ہو River کی لکھی ہوئی "جبلات اور نفس لاشعور" "Instinct And The Unconscious (1920)"

تحلیل نفسی کی بہت زیادہ قدر ہوئی ہے۔ برطانیہ کے ماہرینِ نفسیات کی رائے ہے کہ شخصیت کے گورکھ دھندے کو سلجھانے میں تجرباتی نفسیات کی نسبت فرائڈ کی توجیہات بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔ برطانیہ کے مشہور اہلِ قلم J. A. Thomson نے اپنی کتاب (1922) "Outline of Science" میں فرائڈ کی تعلیمات کو "جدید نفسیات" کا نام دیا ہے۔ اور انہی دنوں برطانیہ میں ہزاروں تعلیمی نصاب تحلیل نفسی کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ کی جدید ادبی تاریخ میں تحلیل نفسی کی اتنی عزت کا ایک آدھ واقعہ رونما پذیر نہیں ہوا۔

نفسیات کا اس مسئلہ سے متاثر نہ ہونا چند در چند وجوہات پر مبنی ہے۔ ایک تو نفس لاشعور کا تصور اور غیر فنی اصطلاحات (مثلاً قوتِ محبّت (Libido)، سنسر، ایغو) قابلِ اعتراض چیزیں ہیں۔ دوسرا شہوتِ حیوانی کا ذکر اور خاص طور پر بچپنے کے جذباتِ جنسی کی داستان۔ جو فرائڈ کی توجیہ کی جان ہے مذاقِ سلیم پر بار گزرتے ہیں۔ تیسرا خالص فنی تجربات کا فقدان اور خود تحلیل نفسی کے درمیان اختلاف تحلیل نفسی کی قدر و منزلت گھٹاتا ہے لیکن ان اسباب کے باوجود آجکل کونسی تصنیف ہے جس میں فرائڈ کی خاص الخاص اصطلاحات کا گزر نہیں۔ اور آجکل ایسا اہلِ قلم کہاں موجود ہے جو شخصیت باطنیت۔ خارجیت اور دیگر نفسی مقامات سے غیر متعارف و ناواقف ہے ——— موجودہ نثر و نظم پر مسئلہ تحلیل نفسی کے اثرات کا ذکر کسی آئندہ مجلس کیلئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

ے باقی د ماہتاب باقی

علیٰ ہذا:۔ سلسلۂ کاسبق

انور مختار صدیقی

بی۔اے، ایل ایل بی

سلہ ملاحظہ ہو River کا وہ لیکچر جو اس نے نیویارک میں ۱۹۱۹ء میں دیا تھا۔

ہماری دھوبن

(بسلسلۂ صفحہ ۵۴)

کہتے ہیں کہ۔ ع:۔ "رنج کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" چنانچہ میں بھی دھوبن کے برتاؤ سے مانوس ہو چکا ہوں۔ شکوہ و شکایت کبھی نہیں کرتا۔ اکثر کپڑے گھر میں دھلوا کر پہنا کرتا ہوں۔ خود ہی استری کر لیتا ہوں۔ سوئی دھاگہ اور قینچی سے مسلح رہتا ہوں اور جب دھوبن کپڑے لاتی ہے تو چند گھنٹے صرف کر کے اپنے چیتھڑوں کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ پہننے کے قابل ہو جائیں۔ کسی طرح گزر کر رہا ہوں مگر اے خدا ہمارے گھر والوں کو اتنی جرأت عطا کر کہ وہ کسی نئے دھوبی کو آزمانے کی کوشش کر سکیں۔

بھارت چند کھنہ

خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمائیں تاکہ تعمیل میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔ — منیجر ساقی

قیدِ حیات و بندِ غم

دیر کی بات ہے دل آرزو آباد بنا

اور اک کھلتے ہوئے پھول کی خاطر میں نے\
تج دیا اپنی جوانی کا لہکتا گلزار!\
کچھ دنوں تک یہ مرا پھول جناں ساز رہا\
اور میں لوٹتا گیا اسکے تبسم کی بہار!\
آخرکار شفقِ زار و نکی سرخی اک شام\
خلد کو لے گئی ساتھ اسکے وہ سولہ سنگھار\
"بہہ گیا آنکھ سے دل خونِ تمنا ہو کر"\
کچھ جگر پارے اچھل آئے بشکل اشعار!

میری تقدیر کہ میں شاد سے ناشاد بنا!

مختار صدیقی

پھانسی

دسواں باب

دیواریں گر رہی ہیں

ورنر زندگی اور کشمکش سے تھک چکا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ زندگی سے بیحد محبّت کرتا تھا۔ تھیٹر، ادب اور آپس کے میل جول میں اُسے لطف آتا تھا۔ قدرت نے اُسے اعلیٰ درجے کا حافظہ اور مضبوط قوتِ ارادی بخشی تھی۔ اِس ودیعتِ خاص کی بدولت اُس نے یورپ کی کئی زبانیں بڑی عمدگی سے سیکھ لی تھیں اور ان پر اُسے اتنا عبور حاصل تھا کہ جرمنی، فرانس یا انگلستان والوں کو اسکے اہلِ زبان ہونے میں کسی قسم کا شُبہ نہیں ہوتا تھا۔ جرمن زبان جب بولتا تو بالعموم بیویریا والوں کے لہجے میں لیکن جب چاہتا برلن والوں کی طرح بھی بولنے لگتا۔ عمدہ لباس کا اُسے شوق تھا اور خوش اخلاقی میں تو جواب نہیں رکھتا تھا۔ انجمن کے کُل ممبروں میں صرف ورنر ہی اکیلا ایسا ممبر تھا جو اُونچی سوسائٹی کی دعوتوں میں اس طرح شریک ہو سکتا تھا کہ کسی کو اُس کے غیر ملکی ہونے کا شُبہ تک نہ ہو۔

مگر کافی عرصے سے اُس کے دل میں بنی نوعِ انسان کی طرف سے نفرت جاگزیں ہو کر راسخ ہو گئی تھی۔ اس نفرت میں مایوسی اور خوفناک تھکن کا جُزو بھی شامل تھا۔ مگر اُس کے دوستوں کو اِس کیفیت کا مطلق علم نہیں تھا۔ فطرتاً وہ مُہندس زیادہ اور شاعر کم تھا۔ اب تک اُسے کشف کبھی نہیں ہوا تھا، اور نہ کبھی کوئی سرمدی اُمنگ ہی اُس کے دل میں اُٹھی تھی۔ بعض اوقات اُسکے خیالات پاگلوں جیسے ہو جاتے تھے اور انسانی خون کی پیاس لگنے لگتی تھی۔ وہ دشمن جس سے روزانہ کشمکش کرتا تھا بجائے عزّت و احترام کے نفرت و حقارت کے جذبات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ یہ ایک جال تھا کم عقلی، فریب اور مکّاری کا۔ ذلّت و اہانت اور پست فریب کاریوں کا۔ آخری واقعہ جس نے زندگی سے اُسے ہمیشہ کیلئے بیزار کر دیا ایک سرکاری افسر کا قتل تھا۔ اس افسر کو اُس نے انجمن کے حکم سے قتل کیا تھا۔ قتل کرتے وقت ورنر کو مطلق ہراس نہیں ہوا لیکن جب اُس نے مُردہ چہرے پر رحم طلب آثار دیکھے تو ورنر اپنی ذات اور اپنی اس حرکت سے بے زار ہو گیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ منفعل ہو گیا بلکہ وہ اپنے اس فعل کو وقعت کی نظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی ذات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ گویا کوئی بے حقیقت چیز تھی، بالکل اجنبی۔ لیکن چوں کہ مضبوط قوتِ ارادی رکھتا تھا اِس لیے انجمن سے علیحدہ نہیں ہوا۔ بظاہر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی چیز تھی، سرد اور تکلیف دہ اُس کے بارے میں وہ کسی سے گفتگو نہیں کرتا تھا۔

ورنر میں ایک اور صفت بھی تھی۔ جیسے بعض آدمی ہوتے ہیں کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ دردِ سر کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح ورنر نہیں جانتا تھا کہ خوف کسے کہتے ہیں۔ جب اور لوگوں کو وہ ڈرتے دیکھتا تو اُسے نہ تو اُن پر اعتراض ہوتا اور نہ ترس آتا۔ جیسے کسی متعدی مرض کو وہ شخص دیکھے جو خود اُس مرض سے بچا رہے۔ اپنے ساتھیوں پر اُسے افسوس ہوتا تھا خصوصاً کیشرن پر۔ لیکن اِس افسوس کی نوعیت افسرانہ تھی، جس میں سرد مہری ہو۔ جیسا افسوس بعض اوقات مُنصفوں کو ہوتا ہے۔

ورنر جانتا تھا کہ پھانسی کے معنی صرف موت کے نہیں تھے۔ بلکہ اس سے علیحدہ کچھ اور بھی تھے۔ لیکن اُس نے تہیّہ کر لیا کہ سکون کے ساتھ اُس سے دوچار ہو۔ جیسے کوئی ناقابلِ التفات چیز ہے۔ آخیر تک اس طرح زندہ رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں، گویا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف یہی ایک طریقہ تھا جس سے وہ قتل کی سزا کی تحقیر کر سکتا تھا اور روح کی اُس آزادی کو قائم رکھ سکتا تھا جو اس سے زبردستی چھینی نہیں جا سکتی تھی جب مقدمہ عدالت میں پیش تھا۔ اور اس کے ساتھی بھی جو اُس کے تکبّر آمیز و بے خوف رویّہ سے بخوبی واقف تھے، شاید یقین نہ کرتے ورنر نہ تو موت کا خیال کر رہا تھا اور نہ زندگی کا بلکہ اپنا خیال بڑی یکسوئی اور طمانیت سے شطرنج کی ایک مشکل بازی پر جمائے ہوئے تھا۔ ورنر شطرنج کا بہت اچھا

کھلاڑی تھا۔ قید ہونے کے پہلے ہی دن سے اُس نے غائب شطرنج
کی بازی شروع کر دی تھی اور اُسے اب تک برابر جاری رکھا تھا۔
پھانسی کے حکم تک نے اس کی خیالی بساط پر ایک مہرے کی
بھی کمی نہیں کی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بازی کے ختم ہونے سے
پہلے زندگی کی بازی ختم ہو جائے گی اُس نے کھیل جاری رکھا۔
اور زندگی کے آخری دن صبح کو اُس نے جب یہ بازی جاری
رکھی تو ابتدا گزشتہ دن کی ایک غلط چال کی تصحیح سے کی۔
گھٹنوں میں اپنے ہاتھ دبائے بہت دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔
پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ چلنے کا طریقہ
عجیب تھا۔ اُوپر کا دھڑ آگے کو جھکا ہوا اور زمین پر ایڑیاں
جما کر چلتا تھا۔ خشک زمین پر بھی اس کے نقش قدم صاف
دکھائی دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ سیٹی بجا رہا تھا جس میں
ایک اطالوی گیت کی دُھن بجا رہا تھا۔ اِس سے سوچنے میں
اُسے مدد ملتی تھی۔

لیکن اب کے کسی وجہ سے کام ٹھیک نہیں ہوا۔ ایک
ناخوشگوار خیال تھا کہ شطرنج کی بازی میں کوئی بڑی، کوئی
بُری غلطی ہو گئی ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ساری بازی پر پھر سے
غور کیا۔ کوئی غلطی نظر نہیں آئی لیکن غلطی سرزد ہونے کے
خیال نے نہ صرف اسکا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ اور بھی شدید اور
ناگوار ہو گیا۔ یکایک ایک غیر متوقع خیال اُس کے دل میں آیا۔
شطرنج کھیلنا ہی سرے سے غلطی تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا
تو نہیں ہے کہ اُس میں منہمک ہو کر پھانسی کی طرف سے خیال
ہٹانا اور موت کے خوف سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؟
کیونکہ یہ خوف تو ہر اُس شخص کے لئے ناگزیر ہے جسے موت
کا حکم سُنایا جا چکا ہو۔

"سب بیکار ہے، آخر اس سے کیا حاصل؟" درزنر نے
سرد مہری سے یہ الفاظ کہے اور شطرنج کی خیالی بازی روک دی۔
اور اسی انہماک و توجہ سے جس سے بازی کھیل رہا تھا اُس نے
اپنی موجودہ حالت کی بے بسی اور خطرے کا جائزہ لینا شروع
کیا۔ اپنی کوٹھری پر ایک نظر ڈالی، ایسی کہ کوئی چیز چھوٹنے
نہ پائے۔ گویا کسی سخت امتحان میں مبتلا تھا۔ پھانسی میں
کتنا وقت باقی تھا، ایک ایک گھڑی گن ڈالی۔ پھانسی کے
منظر کا پورا اور صحیح تصوّر کیا اور جب مکمل تصویر آنکھوں کے
سامنے آ گئی تو بے بسی سے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ پھر جیسے
کسی سے پوچھ رہا ہو بولا "لیجئے۔ یہ موجود ہے۔ خوف کہاں ہے؟"

حقیقت میں خوف کا وجود نہیں تھا۔ نہ صرف خوف
موجود نہیں تھا بلکہ کوئی اور چیز بالکل ہی اس سے مختلف،
متضاد، رونما ہوئی۔ مبہم لیکن عظیم و وحشیانہ مسرّت کا احساس
اور وہ غلطی جس کا اُسے اب تک سراغ نہیں ملا تھا، اب
اُس کی طبیعت میں پریشانی اور کُدبدی پیدا نہیں کر رہی تھی۔
ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غلطی اب کسی اچھی چیز کے غیر متوقع طور پر
ل جانے کی خوشخبری سُنا رہی تھی۔ جیسے کسی عزیز دوست کے مر جانے
کا یقین ہو اور وہ دوست زندہ سلامت، ہنستا ہنستا سامنے
آ کھڑا ہو۔

درزنر نے پھر اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا اور اپنی نبض دیکھی
—— اُسکا دل ذرا تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن مضبوطی و
ہمواری سے، جس میں مسرّت کا کچھ شائبہ تھا۔ اُس نے ایک بار
پھر چاروں طرف دیکھا، غور سے، جیسے کوئی پہلی دفعہ قید خانے
کی کوٹھری کو دیکھے —— دیواروں کو دیکھا، دروازوں کی
چٹخنیوں کو دیکھا اور کُرسی کو دیکھا جو فرش میں جڑی ہوئی
تھی اور سوچنے لگا:

"مجھے اتنا سکون کیسے حاصل ہو گیا؟ اتنی خوشی اور اتنی
آزادی میں کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ میں سوچتا ہوں کہ کل
مجھے پھانسی دی جائیگی —— اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ پھانسی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ میں دیواروں کو دیکھتا ہوں۔
اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی موجود نہیں ہیں۔ اور میں اس
قدر آزاد محسوس کرتا ہوں گویا قید خانے میں نہیں ہوں بلکہ
ابھی ابھی کسی ایسے قید خانے سے چھوٹا ہوں جس میں میری ساری
عمر گزری ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

اُس کے ہاتھ کانپنے لگے —— ایسی کپکپی کا پہلے کبھی اُسے
تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اُس کے خیالات وحشت زدہ پرندوں کی
طرح پھڑپھڑانے لگے۔ حالت یہ تھی جیسے آگ کی لپٹیں اُسکے
دماغ میں اُٹھنے لگی ہوں اور یہ آگ بھڑک کر باہر نکلنا چاہتی
ہو اور دُور تک اُس فاصلہ کو منوّر کر دینا چاہتی ہو جو رات کی
طرح تاریک تھا۔ اب آگ پھوٹ کر باہر نکل آئی تھی اور اُس کی

روشنی سے دُور تک فاصلہ چمک اُٹھا تھا۔

وہ تھکن جو گزشتہ دو برس سے ورنر کو اذیت پہونچا رہی تھی غائب ہو گئی تھی۔ وہ مُردہ، سرد، بھاری اژدہا جس کی آنکھیں بند اور مُنہ موت سے بھنچا ہوا تھا، ورنر کے سینے پر سے کھسک چکا تھا۔ موت کے رُوبرو حسین شباب اس کے جسم میں دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ حقیقت میں حسین شباب سے بھی زیادہ کچھ اور تھا۔ روح کی اُس پُراسرار شفافی میں جو کبھی کبھی چند لمحوں کیلئے انسان کو میسّر آتی ہے، ورنر نے یکایک زندگی اور موت دونوں کو دیکھا۔ ایسا پُرشکوہ منظر اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اُسے دیکھکر وہ مبہوت ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ سب سے اُونچی پہاڑی چوٹی پر وہ چل رہا ہے۔ اور راستہ ایسا ہے جیسے تلوار کی باڑھ۔ ایک طرف اُسے زندگی نظر آئی اور دوسری طرف ——— موت ——— جیسے دو جھلجھلاتے گہرے حسین سمندر ہوں، جو حدِ نظر پر ایک۔ لامحدود سطح میں مُدغم ہو گئے ہوں۔

ورنر نے آہستہ سے کہا "یہ کیا ہے؟ کیسا سرمدی منظر ہے!" یہ کہہ کر غیرارادی طور پر سیدہا ہو بیٹھا گویا کوئی عظیم المرتبت ہستی اُس کی نظروں کے سامنے تھی۔ دیواروں، وقت اور فصل کی قیود کو تک کر ورنر کی نظر اُس زندگی کی گہرائی میں پہونچی جس سے اُسے بہت جلد جُدا ہونا تھا۔

اور زندگی اب اُسے ایک نئے رُوپ میں نظر آئی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا، اب اُسے پہلے کی طرح الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش ورنر نے نہیں کی۔ اور نہ کم مایہ انسانی زبان میں ایسے الفاظ ہی موجود تھے۔ بنی نوعِ انسان کی طرف سے اُسکے دل میں جو نفرت اور بُرے خیالات تھے اب یکسر معدوم ہو چکے تھے۔ جیسے کوئی ہوائی جہاز میں اُونچا اُڑے اور اسے تنگ و تاریک گلی کوچوں کی گندگی نظر نہ آئے اور بُری اور بدنما چیزیں بھی خوشنما نظر آنے لگیں۔

اِنسان اُسے اب کچھ اور ہی دکھائی دیتے تھے ہنسمکھ اور جنہیں دیکھکر جی خوش ہو۔ وقت کی قید سے بلند ہو کر اُسے بالکل صاف نظر آ رہا تھا کہ بنی نوعِ انسان جو کل تک جنگلی درندوں کی طرح دہاڑ رہے تھے، اور خوفناک، نفرت انگیز اور ناقابلِ معافی نظر آتے تھے، اب ایکا ایکی بیحد محبوب ہو گئے تھے۔ جیسے کوئی بچہ بڑوں کی طرح چلنے سے معذور رہو، جیسے کوئی بچہ بے معنی باتیں بڑبڑائے اور اس میں سمجھ اور عقلمندی جھلک رہی ہو۔ بچّے کی مضحکہ خیز غلطیوں اور چوٹ چپیٹ لگ جانے کی طرح، انسان بھی بے بس و مجبور نظر آنے لگا تھا۔

ورنر کے دل میں انسانوں کی محبّت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یکایک مُسکرایا اور اس کے انداز میں جو ایک شان تھی یکلخت معدوم ہو گئی۔ اور وہ پھر ایک قیدی بن گیا تھا جو اپنی تنگ کوٹھری میں بند ہو۔ دروازے کے سوراخ میں سے دیکھنے والوں کی نظروں نے اُسے تھکا دیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی ابھی ایک لمحہ پہلے اُس نے جو کچھ دیکھا تھا سب بھُول چکا تھا۔ اور اِس سے زیادہ عجیب یہ کہ اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کی اُسنے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور دیواروں اور سلاخوں کو دیکھنے لگا۔ لبوں پر ایک عجیب شفقت آمیز مُسکراہٹ تھی جو اس کی اپنی مُسکراہٹ سے بالکل علیحدہ چیز تھی۔ ایک اور نئی بات بھی ورنر کے ساتھ ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ——— اُس نے ایکدم سے رونا شروع کر دیا۔ وہ روتا رہا اور کہتا رہا "میرے پیارے ساتھی۔ میرے پیارے ساتھی!"

خدا جانے وہ کیا پُراسرار طریقے تھے جنہوں نے مغرور، بددماغ اور آزاد منش ورنر کو رقیق القلب اور مُحبِ خلق بنا دیا۔ ورنر کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اُسے اپنے ساتھیوں پر ترس آ رہا تھا یا اس کے آنسو کسی اور بلند تر احساس کو چھپا رہے تھے؟ اس کے نئی زندگی سے دھڑکنے والے دل کو اسکی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا "میرے پیارے ساتھی۔ میرے پیارے ساتھی!"

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ زار زار روتا اور آنسوؤں میں سے مُسکراتا انسان وہی مغرور اور من چلا ورنر ہے۔ منصف بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے، اس کے ساتھی بھی، بلکہ خود ورنر اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

گیارہواں باب

پھانسی کے راستے پر

جن لوگوں کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی اُنہیں گاڑی میں بٹھانے سے پہلے سبکو ایک بڑے کمرے میں بھیجا گیا تھا۔ یہ کمرہ

سرد تھا اور اس کی وضع ایسی تھی جیسے کسی دفتر کا کمرہ ہو جو خالی پڑا ہو یا کوئی اُجاڑ مہمان خانہ ہو۔ قیدیوں کو اب آپس میں بات چیت کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔

صرف تانیا نے اس اجازت سے فوراً فائدہ اُٹھایا۔ اوروں نے خاموشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ ان کے ہاتھ برف کی طرح سرد اور آگ کی طرح گرم تھے۔ اور خاموش، ایک دوسرے سے نظریں چُرائے سب کے سب کھوئے ہوئے سے ایک جگہ جمع ہوگئے۔ اب جبکہ سب اکٹھے ہوئے تو سب اپنی اپنی جگہ پر شرمندہ و نادم تھے اُس احساس کے خیال سے جو تنہائی میں اُن پر طاری ہوا تھا۔ اس ندامت کو دیکھنے یا چھپانے کے لئے وہ ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے۔

لیکن تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد انھوں نے ایک دوسرے کی طرف اُچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور مسکرائے اور فوراً ہی اُن کا حجاب جاتا رہا اور پہلے کی طرح گھل مل گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اور اگر ہوئی بھی تھی تو اتنی غیر محسوس کہ کسی ایک میں بھی پہچانی نہیں جاسکتی تھی۔ سب باتیں کر رہے تھے اور چل پھر بھی رہے تھے لیکن عجیب طرح سے۔ اُن میں کوئی توازن نہیں تھا۔ رُک رُک کر یا ایکدم سے۔ بہت تیز یا بہت آہستہ۔ بعض اوقات الفاظ کی کثرت سے اُن کا گلا گھٹ جاتا اور ایک ہی بات کو کئی کئی دفعہ دُہراتے۔ کبھی کوئی بات ادھوری ہی رہ جاتی اور وہ سمجھتے کہ پوری کہہ چکے ہیں۔ انہیں کچھ فرق معلوم نہ ہوتا۔ انکی پلکیں جھپکے جاتی تھیں اور معمولی معمولی چیزوں کو بھی تعجب سے دیکھتے تھے گویا انہیں پہچان نہیں سکتے تھے۔ جیسے کسی کو عینک کی عادت ہو اور اس کی عینک اُتار لی جائے۔ سب کے سب بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے گویا کوئی انہیں آواز دیکر کچھ دکھا رہا ہے۔ لیکن انہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی۔ مسیا اور تانیا کے رُخسار اور کان جل رہے تھے۔ سرجے شروع شروع میں ہلدی کی طرح زرد تھا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل گیا اور جیسا پہلے دکھائی دیتا تھا ویسا ہی نظر آنے لگا۔

صرف ویسلی سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان سب کی موجودگی میں بھی وہ عجیب اور بھیانک نظر آرہا تھا۔ ورنر پریشان ہو کر چپکے سے مسیا سے کہنے لگا "مسیا یہ ویسلی کو کیا ہوگیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ــــ کیا؟ مجھے اُس کے پاس جانا چاہیئے۔"

ویسلی نے ورنر کی طرف دُور سے دیکھا اور اس طرح کہ جیسے اُسے پہچانتا ہی نہیں۔ پھر اپنی نظریں نیچی کرلیں۔

ورنر نے کہا "ویسیا، تم نے اپنے بالوں کا کیا حشر کیا؟ کیا ہوگیا تمہیں؟ کچھ پروا نہیں عزیزمن، کچھ پروا نہیں۔ بس اب ختم ہوا جاتا ہے۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ نہیں ہارنی چاہیئے۔"

ویسلی خاموش تھا لیکن جب یہ معلوم ہونے لگا کہ اب یہ کچھ نہیں بولیگا تو ایک گھٹی ہوئی مردہ سی آواز سنائی دی جیسے کوئی قبر میں سے بول رہا ہو:۔

"میں ٹھیک ہوں۔ میں نہیں ہارا۔"

پھر اس نے الفاظ دُہرائے "میں نہیں ہارا۔"

ورنر خوشی سے اُچھل پڑا۔ "یہی بات ہونی چاہیئے۔ یہی بات ہونی چاہیئے۔ شاباش لڑکے۔ یہی بات ہونی چاہیئے۔"

لیکن اُس کی نظریں ویسلی کی تاریک اور تھکی ہوئی نظروں سے دوچار ہوئیں اور افسردگی سے بولا "یہ کہاں سے دیکھ رہا ہے؟ یہ کہاں سے بول رہا ہے؟" اور جیسے کسی عزیز کی قبر دیکھکر کوئی بولے، ورنر نے بڑی دلسوزی سے کہا "ویسیا، سُن رہے ہو؟ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

ویسلی کی زبان بڑی مشکل سے ہلی "اور میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

یکایک مسیا نے ورنر کا ہاتھ پکڑ کر تعجب سے کہا "ورنر یہ کیا؟ تم نے کہا 'میں محبت کرتا ہوں؟' تم نے اس سے پہلے 'میں محبت کرتا ہوں۔' کسی سے نہیں کہا۔ اور تم کیوں؟ کیوں سراپا رقیق القلب بن گئے ہو؟ کیوں؟"

مسیا نے یہ الفاظ اس طرح جما جما کر ادا کئے جیسے کوئی ایکٹرس تماشہ گاہ میں ادا کرتی ہے اور ورنر نے بھی مسیا کا ہاتھ زور سے دبا کر کسی ایکٹر کی طرح جواب دیا "ہاں، اب میں بہت محبت کرتا ہوں۔ اوروں سے اس کا ذکر مت کرنا۔ غیر ضروری سی بات ہے مجھے شرم سی آتی ہے لیکن میں دل سے

محبّت کرتا ہوں "

ان کی نظریں ملیں اور ان میں چمک پیدا ہوگئی اور انکے چاروں طرف جو کچھ بھی تھا ایسا معلوم ہوا کہ اندھیرے میں چھپ گیا۔ جیسے بجلی کی چمک میں اور سب روشنیاں فوراً اپنا نور کھو بیٹھتی ہیں اور بھاری زرد شعلے کا سا سایہ زمین پر پڑنے لگتا ہے۔

مُسیا نے کہا "ہاں ہاں ورنر"

ورنر نے جواب دیا "ہاں۔ ہاں مُسیا۔ ہاں "

ان دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور اس لمحے کوئی چیز اُن میں استواری سے طے ہوگئی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور ورنر کے دل میں پھر ایک طوفان اُٹھا اور وہ جلدی سے سرجے کی طرف بڑھا۔

" سرلوژا!"

لیکن سرجے کے بدلے تانیا نے جواب دیا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچّے پر ناز کرے اور مامتا کے جوش میں رونے لگے۔ تانیا نے سرجے کی آستین کو جھٹکا دیکر کہا "سنو ورنر میں اس کے لئے رو رو کر مری جاتی ہوں اور یہ ہے کہ ورزش کے خیال میں مصروف ہے!"

ورنر نے مسکرا کر کہا "مُلر کی بتائی ہوئی ورزش؟"

سرجے کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں آیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "ورنر ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں نے پوری طرح یقین کر لیا ہے ــــ"

سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک دوسرے سے قوّت و ہمت حاصل کر کے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا توازن پھر قائم کر لیا۔ پھر ویسے ہی ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ اور سمجھے کہ کبھی بدلے ہی نہیں تھے۔ یکایک ورنر نے سرجے کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا تو سب کی ہنسی بند ہوئی۔ ورنر نے کہا "تم سچ کہتے ہو سرلوژا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو"

گولوون نے خوش دلی سے کہا "نہیں، لیکن تمہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ــــ"

لیکن اتنے ہی میں انہیں روانہ ہونے کا حکم ملا۔ انکے محافظوں نے اتنی مہربانی اور کی کہ انہیں دو دو کے جوڑے بنا لینے کی اجازت دیدی۔ محافظ فی الجملہ مہربان ہی نہیں تھے بلکہ بہت زیادہ مہربان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محافظ کچھ تو اپنی نرم دلی دکھانی چاہتے تھے اور کچھ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا تو عدم وجود برابر ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے گویا کسی مشین سے ہو رہا ہے۔ ان سب کا رنگ زرد تھا۔

ورنر نے ویسلی کی طرف اشارہ کر کے کہا "مُسیا تم اُسکے ساتھ ہو جاؤ"

ویسلی بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ مُسیا نے سر کے اشارے سے کہا "میں سمجھ گئی۔ اور تم؟"

"میں؟ تانیا سرجے کے ساتھ جائیگی۔ تم ویسیا کے ساتھ۔ ...... میں اکیلا جاؤنگا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ میرے لئے یہ ٹھیک ہے۔ تم جانتی ہی ہو"

جب سب باہر صحن میں آئے تو سیلی ہوئی مُلائم تاریکی اُن کے چہروں اور آنکھوں سے ٹکرائی اور اُنکا دم گھٹنے لگا۔ پھر ایکا ایکی ہلکی ہلکی گرمی ان کے جسم میں داخل ہو کر انہیں فرحت پہونچانے لگی۔ مشکل سے یقین آتا تھا کہ ایسا فرحت بخش اثر محض موسم بہار کی ہلکی گرم اور نم آلود ہوا کا تھا۔ بہار کی عجیب رات پگھلتی برف کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی اور سنّاٹے میں بوندوں کے گرنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ یہ بُوندیں جلدی جلدی گر رہی تھیں گویا ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جب زمین سے ٹکراتیں تو ایک مدھم سا نغمہ پیدا کرتیں۔ کبھی کبھی ان میں سے ایک اس طرح بھی گرتی کہ نغمے کو بے سُرا کر دیتی اور اس کی آواز بھی منتشر موسیقی میں جذب ہو جاتی پھر کوئی موٹی سی بُوند گرتی اور نغمۂ بہار کا تسلسل پھر قائم ہو جاتا۔ شہر کے اُوپر اور گڑھی کی چھتوں پر بجلی کی روشنیوں نے زرد سُرخ نور پھیلا رکھا تھا۔

سرجے نے ایک لمبا سانس لیا اور تازہ فرحت بخش ہوا کو پھیپھڑوں میں روک لیا۔

ورنر نے پوچھا "یہ موسم کب سے ہے؟ بڑا عمدہ بہار کا موسم ہے"۔

جواب ملا "آج دوسرا ہی دن ہے۔ اس سے پہلے اکثر کُہر چھائی رہتی تھی"

کالے رنگ کی گاڑیاں سڑک پر روانہ ہو رہی تھیں۔ اُنا میں دو دو قیدی بیٹھتے جاتے تھے اور اندھیرے میں گاڑیاں غائب

ہوتی جاتی تھیں۔ اُن کی منزل وہ مقام تھا جہاں پھاٹک پر ایک لالٹین جھول رہی تھی۔ ہر گاڑی کو محافظ دستے کے سوار گھیرے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے نعل زمین سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے یا کبھی کبھی پھسلتی برف پر گھوڑے کا پاؤں پڑتا تو چھپاکا سُنائی دیتا۔

گاڑی میں سوار ہونے کے لئے جب ورنر جھکا تو ایک سپاہی نے چپکے سے کہا "تمہارے ساتھ ایک اور آدمی بھی جا رہا ہے۔"

ورنر کو بڑا تعجب ہوا "کہاں؟ کہاں جا رہا ہے؟ اچھا! کوئی اور بھی ہے؟ کون ہے وہ؟"

سپاہی خاموش رہا۔ گاڑی کے اندر اندھیرے میں کوئی کونے میں بے حس و حرکت دبکا بیٹھا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ورنر نے اس کی کھلی آنکھ چمکتی دیکھی۔ بیٹھتے ہوئے ورنر کا پاؤں اس کے پاؤں سے ٹکرایا۔ ورنر نے کہا "معاف کرنا ساتھی۔"

اُس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا جب گاڑی روانہ ہوئی تو اُسنے اکھڑ زبان میں بڑی مشکل سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں ورنر ہوں۔ اقدامِ قتل کے جرم میں پھانسی کا حکم ملا ہے۔ اور تم؟"

"میں یانسن ہوں۔ مجھے پھانسی نہیں ملنی چاہیئے۔"

یہ دونوں گاڑی میں سوار چلے جا رہے تھے تاکہ دو گھنٹے بعد اُس ناقابلِ فہم رازِ عظیم سے دوچار ہو جائیں جسے سمجھنے کیلئے زندگی سے گزر کر موت کی سرحد میں داخل ہونا پڑتا ہے —— اور یہ دونوں بیٹھے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کر رہے تھے۔ زندگی اور موت دونوں ساتھ ساتھ گزر رہی تھیں اور آخری وقت تک اپنی تمام مضحکہ خیز اور بدمزہ خصوصیات کے ساتھ زندگی زندگی ہی رہی۔

"تم نے کیا کیا تھا یانسن؟"

"میں نے اپنے آقا کو چھری سے مار ڈالا۔ میں نے روپیہ چرایا۔"

اُس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ یانسن کو نیند آ رہی ہے۔ ورنر نے اُسکا ڈھیلا ڈھالا ہاتھ اندھیرے میں ٹٹول کر اپنے ہاتھ میں لیا اور محبت سے اُسے دبایا۔ یانسن نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا۔

ورنر نے پوچھا "کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"میں پھانسی پانا نہیں چاہتا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ ورنر نے یانسن کا ہاتھ پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر زور سے دبایا۔ ورنر کے ہاتھ خشک تھے اور ہتھیلیاں جل رہی تھیں۔ یانسن کا ہاتھ ساکت پڑا تھا جیسے بیجان ہو، لیکن اُس نے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

گاڑی بند تھی اور اس میں دم گھٹنے لگا۔ سپاہیوں کے کپڑوں کی سیل اور گیلے جوتوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے کی گدّی پر جو سپاہی بیٹھا تھا اُس کا گرم سانس ورنر کے مُنہ پر لگ رہا تھا۔ اور اس کے سانس میں پیاز اور گھٹیا تمباکو کی بدبو تھی۔ لیکن کہیں کہیں دراروں میں سے ٹھنڈی تازی ہوا کی رمق آ جاتی تھی اور اس کی وجہ سے موسمِ بہار اس بند گھٹی ہوئی گاڑی میں اور بھی شدّت سے محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی کبھی دائیں کو مڑتی کبھی بائیں کو۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ واپس چل رہی ہے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا کہ کسی وجہ سے ایک ہی جگہ کے چکر گھنٹوں سے کاٹتے جا رہی ہے۔ شروع میں ایک نیلی بجلی کی روشنی چڑھی ہوئی کھڑکی کی دراروں میں سے جھلکی۔ پھر یکایک ایک موڑ کے بعد اندھیرا ہو گیا۔ اور صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اب وہ کسی اُجاڑ بازار میں سے گزر رہے ہیں اور ریل کے اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی جب گاڑی ایکدم سے مڑتی تو ورنر کا زندہ گھٹنا سپاہی کے زندہ گھٹنے سے ٹکرا جاتا اور یقین نہ آتا تھا کہ موت قریب ہے۔

یانسن نے یکایک پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

گاڑی کے بار بار مُڑنے سے اُسے چکر سا آ رہا تھا اور جی بھی متلا رہا تھا۔

ورنر نے جواب دیا اور اُسکا ہاتھ اور زور سے دبایا۔ گویا بہت مہربانی، شفقت و محبّت سے اونگھتے ہوئے ساتھی کو جواب دیا۔ ورنر کو اُس سے ایسی محبّت ہو گئی تھی کہ ابتک کسی اور سے نہیں ہوئی تھی۔

"پیارے بھائی، تم بڑے بے آرام بیٹھے ہوئے ہو، اور اِدھر ہو جاؤ۔"

یانسن تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا "شکریہ تمہارا۔ میں ٹھیک بیٹھا ہوں۔ کیا تمہیں بھی پھانسی دینے لے جا رہے ہیں؟"

"ہاں۔"

ورنر نے اس طرح ہنس کر جواب دیا گویا کوئی بڑی خوشی کی بات تھی اور اپنا ہاتھ اس طرح ہلایا گویا یانسن نے کسی مضحکہ خیز بات کا ذکر کیا ہے یا کسی مذاق کی یاد تازہ کردی جو اُس کے ساتھ کیا جانے والا ہے۔

یانسن نے پوچھا "کیا تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں۔ میری بیوی نہیں ہے میں نے شادی نہیں کی۔"

یانسن نے کہا "میں نے بھی شادی نہیں کی۔ اکیلا ہوں۔"

ورنر کا سر بھی چکرانے لگا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ کسی میلے کی سیر کو جارہے ہیں۔ عجیب بات تھی کہ جتنے بھی پھانسی پانے جاتے سبھی کو ایسا ہی محسوس ہوتا۔ غم و خوف میں ایک نامعلوم خوشی کا جُزو بھی شامل ہوتا۔ پھانسی پانے والے جب انجام پر غور کرتے تو ایک طرح کی مکمل خوشی کا احساس بھی ہوتا۔ حقیقت کو دیوانگی و موت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ اور یہ نشہ جب زندگی سے آمیز ہوتا تو عجیب عجیب پرچھائیاں نظر آتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی خوشی کا تہوار ہے اور سب گھروں پر جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔

جب گاڑی ٹھہری تو ورنر نے خوش ہوکر کہا "پہونچ گئے ہم۔" یہ کہکر گاڑی میں سے کُود کر نیچے اُتر گیا۔ لیکن یانسن کے ساتھ دوسرا ہی معاملہ تھا۔ خاموشی سے اور نیند میں جھومتے کھاتا وہ اترنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ جب اُسے اتارنا چاہا تو اُس نے دروازے کی ہتھی پکڑلی۔ سپاہی نے آہستہ سے اُسکی کمزور اُنگلیوں کو کھولا اور اُسکا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر یانسن نے گاڑی کا کونہ پکڑ لیا، پھر دروازہ، پہیّا وغیرہ لیکن سپاہی کی ذرا سی کوشش پر اُسنے ہر چیز کو چھوڑ چھوڑ دیا۔ حقیقت میں اُسنے ان چیزوں کو پکڑا ہی نہیں تھا بلکہ نیند میں ہر چیز سے چمٹ رہا تھا اور آسانی سے کھینچ لیا جاتا تھا۔ بالاخر وہ جاگ اُٹھا۔

جھنڈیاں وغیرہ کچھ نہیں تھیں۔ ریل کا اسٹیشن سُنسان پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ریلیں آجا نہیں رہی تھیں۔ اور جو گاڑی ان مسافروں کیلئے کھڑی تھی اُسکے لئے روشنی یا چہل پہل کی ضرورت نہیں تھی۔ ورنر نے ایکدم سے تھکن محسوس کی۔ کوئی خوف یا کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ جیسے کوئی بہت ہی تھک کر بیدم ہوگیا ہو اور چاہے کہ کہیں جاکر زور سے آنکھیں بھینچ کر پڑ رہے۔ ورنر نے انگڑائی لی اور آہستہ آہستہ جمائی لی۔ یانسن نے بھی انگڑائی لی اور جلدی جلدی کئی جمائیاں لیں۔

ورنر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "انہیں جو کچھ کرنا ہو جلدی سے کرکراکے ختم کریں۔" یانسن خاموش اور سُکڑا جا رہا تھا۔

جب سارے ملزم پلیٹ فارم پر سپاہیوں کے گھیرے میں جمع ہوئے اور اندھیرے ڈبوں کی طرف چلے تو ورنر نے اپنے قریب سرجے گول ون کو دیکھا۔ سرجے اپنے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف بتاکر کچھ کہہ رہا تھا لیکن صرف ایک لفظ "لالٹین" سمجھ میں آیا۔ باقی سارے الفاظ جمائی لینے میں غائب ہوگئے۔

ورنر نے بھی جمائی لیکر پوچھا "کیا کہہ رہے تھے تم؟"

سرجے نے کہا "لال ٹین۔ لالٹین کا کلا بھڑک رہا ہے۔"

ورنر نے پلٹ کر دیکھا۔ لالٹین کا کلا واقعی بہت بھڑک رہا تھا۔ اُوپر سے چمنی کالی ہوچکی تھی۔

"ہاں بھڑک رہا ہے۔"

یکایک اُسے خیال آیا "مجھے اس سے کیا؟ کلا بھڑکے تو اور نہ بھڑکے تو۔ کیونکہ ــــــ"

سرجے نے بھی شاید اپنے دل میں یہی سوچا، کیونکہ اُسنے ایک نظر ورنر کی طرف دیکھا اور مُنہ پھیر لیا۔ دونوں کی جمائیاں رُک گئی تھیں۔

ڈبوں میں سب کے سب خود جا بیٹھے۔ صرف یانسن کو دھکیلنا پڑا۔ پہلے تو اُس نے اپنے پاؤں پٹخے اور اس کے جوتے ایسا معلوم ہوا کہ پلیٹ فارم کے فرش سے چپک گئے۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے موڑ لئے اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ اُس کے پاؤں اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے کوئی بیہوش شرابی ہو، جوتے فرش پر گھسٹ رہے تھے۔ ڈبے میں اُسے دھکیلنے تک خاصی دیر لگ گئی۔

ویسلی کیشرن بھی چل رہا تھا، چل کیا رہا تھا اپنے ساتھیوں کی حرکات کی نقل بے جانے بُوجھے اُتار رہا تھا۔ جو وہ سب کرتے وہی یہ بھی کرتا۔ لیکن جب گاڑی میں سوار ہونے لگا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑا گئے اور ایک سپاہی نے کہنیوں میں ہاتھ دے کر اسے سنبھال لیا۔ ویسلی لرزنے لگا اور ایک تیز چیخ مار کر اپنے ہاتھ سپاہی سے کھینچ لئے۔ ورنر اُس کی چیخ سُنکر دوڑ کر آیا اور پوچھنے لگا "کیا ہے ویسا؟" ویسلی خاموش تھا۔ اُسکا رُواں رُواں

کانپ رہا تھا۔ اس حرکت پر سپاہی خود حیران اور ناراض تھا۔ بولا "میں نے تو گرنے سے بچایا تھا مگر یہ ـــــ"

"آؤ میں تمہیں لے چلوں وسیا" یہ کہہ کر ورنر نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن وسیلی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور ایک چیخ پہلے سے بھی زور کی ماری۔

"وسیا، میں ہوں ورنر"

"مجھے معلوم ہے۔ مت چھوؤ مجھے۔ میں خود چلا جاؤنگا"

اور کپکپاتا لرزتا وہ خود ہی ڈبے میں چڑھا اور ایک کونے میں جا بیٹھا۔ مسیا کی طرف جھک کر اور آنکھوں سے وسیلی کی طرف اشارہ کرکے ورنر نے آہستہ سے پوچھا "اس کی کیا حالت ہے؟"

مسیا نے بھی آہستہ سے کہا "بہت بری۔ وہ تو مر چکا ہے۔ ورنر مجھے یہ تو بتاؤ کہ موت بھی کیا واقعی کوئی چیز ہے؟"

ورنر نے سنجیدگی سے جواب دیا "میں نہیں جانتا مسیا، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے"

"یہی خیال میرا بھی ہے۔ لیکن وہ؟ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھنا مجھے اجیرن ہو گیا ـــــ بس جیسے میں نے کسی لاش کے ساتھ سفر کیا ہو"

"میں نہیں جانتا مسیا۔ شاید کوئی ایسی چیز بعض لوگوں کے لئے ہوتی ہے جسے موت کہا جاتے۔ فی الحال شاید اس کا کوئی وجود ہو لیکن آئندہ موت کوئی چیز نہیں ہوگی۔ پہلے میرے لئے بھی موت کا وجود تھا لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے"

مسیا کے زرد رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اسنے پوچھا "تو اسکا وجود تھا ورنر؟ تھا نا؟"

"ہاں تھا۔ لیکن اب باقی نہیں ہے۔ بالکل وہی میرے لئے ہے جو تمہارے لئے ہے"

ڈبے کے دروازے میں کچھ شور سنائی دیا۔ مشکا سکا لوک جوتے زور زور سے پٹختا اور کھنکارتا تھوکتا داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور ٹھہر گیا۔ تھکے ہوئے سپاہی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور چیخ کر بولا "میرے لئے یہاں آرام کرنے کی جگہ نکالو ورنہ میں ہرگز نہیں جاؤنگا۔ یہیں سامنے کے کھمبے پر مجھے لٹکا دو۔ کیا گاڑی دی ہے مجھے ان کتوں نے۔ ارے یہ گاڑی ہے؟ یہ تو شیطان کا پیٹ ہے۔ گاڑی ہے یہ؟"

لیکن یکایک اس نے اپنا سر جھکایا، گردن آگے بڑھائی اور آگے اوروں کی طرف بڑھا۔ ان کے بکھرے ہوئے بالوں اور داڑھی میں سے کالی کالی آنکھیں وحشت بلکہ دیوانگی سے چمک رہی تھیں۔

"اچھا شرفا بیٹھے ہیں! یہ بات ہے۔ کہیئے جناب!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ ورنر کی طرف ایکدم سے بڑھا دیا، اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر ذرا آگے جھک کر ایک آنکھ دبائی اور جلدی سے اپنا ہاتھ گلے پر رکھکر بولا:-

"تم بھی؟ ہائیں؟"

ورنر نے مسکرا کر کہا "ہاں"

"کیا ہم سبکو پھانسی ملنے والی ہے؟"

"سب کو"

سکا لوک نے دانت پھاڑ کر کہا "اوہو!" اس کے دانت چمک رہے تھے۔ ایک ہی نظر میں اس نے سبکو بھانپ لیا مسیا اور یانسن پر ذرا دیر تک اس کی نظر ٹھہری۔ پھر آنکھ مار ورنر سے بولا "وزیر اعظم؟"

"ہاں۔ وزیر اعظم۔ اور تم؟"

"جناب میں یہاں اور ہی سلسلے میں ہوں۔ مجھ جیسے آدمی وزیروں سے واسطہ نہیں رکھتے۔ میں تو جناب قاتل ہوں بس یہ ہوں میں۔ ایک معمولی قاتل۔ خیر کچھ پروا نہ کیجئے جناب۔ ذرا اور ادھر ہو جائیے۔ میں اپنی مرضی سے آپ لوگوں کا ہم جلیس نہیں بنا ہوں ہم سب کے لئے دوسری دنیا میں کافی جگہ ہوگی"

اس نے ایک تیز مشتبہ وحشیانہ نظر میں سبکو تاڑ لیا۔ سب کے سب اسے خاموشی اور سنجیدگی اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنے دانت چمکائے اور کئی دفعہ ورنر کے گھٹنے پر تھپکی دی۔

"یہ بات ہے جناب! کیا بول ہیں اس گیت کے؟
مت دھن سر کو ہرے جنگل کی ماتا........"

"تم مجھے "جناب" کیوں کہتے ہو؟ ہم سب تو......"

سکا لوک نے کہا "ٹھیک۔ جب تمہیں بھی میرے ہی ساتھ پھانسی ملنے والی ہے تو پھر تم کس قسم کے جناب ہوئے؟ وہ ہے تمہارے جناب" اور یہ کہہ کر اس نے ایک خاموش سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وسیلی کی طرف آنکھ سے اشارہ کرکے بولا "وہ ہم سے کمتر درجے کا نہیں ہے جناب، اجی جناب آپکو ڈر لگ رہا ہے نا؟"

ڈیسلی نے بڑی مشکل سے جواب دیا "نہیں"۔
"خیر اس نہیں وہیں کو چھوڑو۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے۔ کُتّے تو ہو نہیں تم کہ پھانسی پانے جاؤ اور دُم ہلاتے رہو آخر انسان ہو۔ وہ افیونی کون ہے؟ تمہارا ساتھی تو نہیں معلوم ہوتا یہ"۔
اُس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور سانپ کی طرح پھنکارتا اور تھوکتا رہا۔ بالٹسن بیجان سی گٹھڑی بنا کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ پُرانے کنٹوپ کے پاکھے ہل رہے تھے مگر وہ خاموش ہی رہا۔ ورنر نے اُس کے بدلے جواب دیا "اُس نے اپنے آقا کو مار ڈالا"۔ سگا نوک نے تعجب سے کہا "یا اللہ! ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت کیوں مل جاتی ہے؟"
کچھ دیر سے سگا نوک کنکھیوں سے مُسیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب ایکدم سے مُڑ کر اس نے گھُور کر مُسیا کو دیکھا۔
"صاحبزادی! تم سُناؤ"۔
پھر ورنر کے گھُٹنے پر اپنی فولادی انگلیاں جما کر بولا "دیکھو وہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔ دیکھو دیکھو"۔
مُسیا کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا اور اُس نے بھی پریشان ہو کر مُسکرا کر اس کی وحشیانہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
گاڑی تیز چل رہی تھی اور پہیئے بہت شور مچا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں پٹریوں پر اچھل رہی تھیں۔ جب کوئی موڑ آتا یا سڑک پر سے گزرنا ہوتا تو انجن کرخت آواز کی سیٹی دیتا ـــ انجن چلانے والے کو خوف ہوتا کہ کوئی جھپیٹ میں نہ آجائے۔ عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ جس گاڑی میں پھانسی پانے والے سوار ہوں اُس کے چلانے میں اتنی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ دُنیا کی سب سے بڑی دیوانہ وار حرکت اس سادگی و عقلمندی سے کی جا رہی تھی۔ گاڑی چل رہی تھی اور اس میں انسان بیٹھے تھے جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے۔ اور یہ سفر کر رہے تھے جیسا کہ عام طور سے سب کرتے ہیں، اور پھر گاڑی حسبِ معمول ٹھہر جائے گی۔

"گاڑی پانچ منٹ کیلئے ٹھہر جائے گی"۔
اور وہاں موت انکا انتظار کر رہی ہو گی ــــــ

ـــــ رہبرِ عظیم۔

(اور جب گاڑی ٹھہری تو اِن سات پھانسی پانے والوں کی کیا حالت ہوئی؟ پھانسی کے پھندے پڑنے تک اِن ساتوں نے کیا کیا؟ اور بالآخر موت کا استقبال کس طرح کیا؟ اسکی پوری رُوداد آیندہ قسط میں دیکھئے۔ آخری باب موت کے وحشتناک احساسات کا دل ہلا دینے والا مُرقع ہے۔)

شاہد

اُردو میں یورپین زبانوں کا بہترین لٹریچر
ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی کے نفیس تراجم

تائیس:- اناطول فرانس کا شہ پارہ۔ تائیس جسکا حُسن نظر بھر کے دیکھنے سے میلا ہوتا تھا۔ دولت جسکی لونڈی اور دولتمند جس کے غلام تھے۔ راہب پفناطوس نے اُسے گناہ کی زندگی سے نکال کر فرشتوں میں شامل کر دیا۔ مگر خود ملعون و مردود ہو گیا اور اسکا چہرہ مسخ ہو گیا۔ حیرت انگیز داستان قیمت عـ۸/

سلامبو:- فلابیر کا شہ پارہ۔ قرطاجنہ کی حسین ترین دوشیزہ سلامبو نے وحشیوں کے دیو ہیکل سردار ماتو کو اپنے حسن کے دام میں گرفتار کیا اور اپنے ملک کو بچانے کے لئے اپنی زندگی برباد کر لی۔ بھوکے وحشی اپنے مُردے تک کھا گئے۔ تاریخ و رومان کا حسین مُرقع جس میں کئی ہزار سال پہلے کی تہذیب پیش کی گئی ہے۔ قیمت تین روپے۔

نجم السحر:- رائڈر ہیگرڈ کا شہ پارہ۔ مصر قدیم یعنی پانچ ہزار سال گزرے مصر میں یہ حسین شہزادی پیدا ہوئی۔ طلسم و سحر۔ جنگ و جدال۔ شاہی درباروں کے پُرشکوہ مناظر۔ اُس زمانے کے کل رسم و رواج۔ سنگین مظالم، نُورانی کی ہوسناکی۔ اشمون نجومی کی تسخیر خیزی۔ کیفر کی پُراسرار شخصیت۔ دل ہلا دینے والے واقعات۔ قیمت عـ۸/

انطونی اور کلا لپطرہ:- شیکسپیر کا دوسرا کارنامہ۔ کلا لپطرہ کے سانس میں زہر اور آغوش میں موت تھی۔ شہرۂ آفاق ڈرامہ۔ قیمت ایک روپیہ (عـ۱)

ملنے کا پتہ:- ساقی بکڈپو۔ کھاری باؤلی۔ دہلی۔

آل انڈیا ریڈیو اور ہارمونیم۔

کھلی چٹھی

ڈھاکا۔ ۴؍اپریل سنہ ۴۰ء

پیارے شاہد، اپریل کا ساقی ملا۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے ہارمونیم کے اخراج کے متعلق تم نے جو نوٹ لکھا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ دراصل تم نے میرے دل کی بات چھین لی اور بڑی خوبصورتی سے بیان کی۔ تمہارا بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ اُسے پڑھ لینے کے بعد بہت مُشکل ہے کہ کوئی شخص تم سے اختلاف رائے کر سکے۔ ہاں اُس کی سمجھ ہی اُلٹی ہو یا بر بنائے مصلحت ہٹ دھرمی پر اُتر آئے تو بات دوسری ہے۔

اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ آئندہ صرف وہی لوگ ریڈیو پر گا یا کریں گے جو فنِ موسیقی کے ماہر ہیں تو البتہ ہارمونیم کا بائیکاٹ چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ ماہر گانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر ریڈیو اسٹیشن کو ایسے گانے والے کافی تعداد میں مل نہیں سکتے اور بفرضِ محال اگر مل بھی جائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ چند ہی روز میں عام سُننے والے اُنکے گانے سے بیزار ہو جائیں گے بلکہ اُنہیں گانے کے نام سے نفرتِ کلی ہو جائیگی۔ جس طرح سونے چاندی کا نرخ بیان ہوتے وقت بڑے بڑے سوداگروں کے سوا دوسرے لوگ اپنا اپنا ریڈیو بند کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر صرف "اُستاد" لوگ ہی ریڈیو پر گائیں تو سوائے اُن لوگوں کے جو فنِ موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں اور کوئی بھی اس استادانہ گانے کو سُننا پسند نہ کریگا۔ اجناس کے نرخ صرف چند منٹ بیان کئے جاتے ہیں اس لئے لوگ اُسے صبر سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن گانے کا پروگرام تو اتنا مختصر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اسے نکال ڈالا جائے تو پھر اسکے بعد عام سننے والوں کے نقطۂ نظر سے ریڈیو میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔

مجھے خُوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ رامپور میں ایک بڑے "اُستاد" کہیں باہر سے تشریف لائے۔ میں بھی ایک دوست کے ہمراہ اُن کا گانا سُننے گیا۔ اُستاد نے اپنی اُستادی کے خُوب خُوب جوہر دکھائے اور چند جاننے والوں نے جو اس محفل میں موجود تھے، اُستاد کی تعریف بھی بہت کی لیکن عام طور پر سامعین بہت بے لُطف ہوئے۔ مجھے بھی خاصی کوفت ہوئی کیونکہ وہ خدا کا بندہ گھنٹہ بھر تک "گلے بازی" ہی میں مصروف رہا۔ آ آ آیا سرگم کی تکرار کے سوا مُشکل ہی سے کوئی لفظ اُسکے مُنہ سے نکلا ہوگا۔ لوٹتے وقت میں نے راستہ میں اپنے دوست سے پوچھا کہ کہو گانا پسند آیا؟ اُنہوں نے بڑی حیرت سے کہا کہ گانا؟ کہاں تھا گانا؟ اسکا نام گانا ہے؟ ایسا ہی گانا سُننا ہو تو انسان کتے کے اینٹ نہ مار دے۔ اور یہ خیال استادی گانے کے متعلق عام ہے۔

جن حضرات نے ہارمونیم کے خلاف رائیں دی ہیں اُن میں ہندوستان کے بعض مقتدر لوگ بھی شامل ہیں۔ لتنے بڑے بڑے لوگوں کو ہارمونیم کی مخالفت کرتے دیکھکر انسان مرعوب ہو جاتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ ایک مغالطہ، ایک فریب ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی مُلک کا گورنر ہونیکی کافی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو مگر گانے کے متعلق اُسکی معلومات اتنی بھی نہ ہوں جتنی بخشا قوال یا واعظ قوال کی ہیں۔ انجنیئر کیلئے حکیم اور پروفیسر کیلئے مصوّر ہونا ضروری نہیں۔ ان بزرگوں میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں موسیقی سے ذرا بھی مس نہیں پوچھا جائے تو شاید دو چار سے زیادہ راگ راگنیوں کے نام بھی نہ بتا سکیں۔ اُنکی مخالفت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماہرین کے نقطۂ نظر سے ہارمونیم کا ایک نامکمل ساز ہونا سب کو معلوم ہے۔ اسلئے ان حضرات نے بھی اُسی فنّی نقطۂ نظر سے ماہرین کی رائے کا اعادہ ضروری سمجھا تاکہ لوگ اُنہیں موسیقی سے بے بہرہ نہ سمجھیں۔ دوسرے ابھی چند سال ہوئے ایک یورپین سیّاح نے جس کا نام اسوقت مجھے یاد نہیں رہا ہندوستان کے دورانِ قیام میں یہاں کی موجودہ موسیقی اور فنِ تعمیر وغیرہ کے متعلق اسٹیٹسمین میں ایک مضمون لکھا تھا۔ موجودہ ہندوستانی موسیقی کی ہجو کرتے ہوئے اُسنے کہا تھا کہ "ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی پستی اسی سے ظاہر ہے کہ وہاں ہارمونیم جیسا ناقص ساز گانے کے ساتھ بجایا جاتا ہے"۔ گورے نقّاد کا بیان کالے بڑے لوگوں نے بھی پڑھا اور حسبِ معمول آمنّا و صدّقنا کہا اور اب جو اظہار رائے کا موقع ملا تو بڑی دُھوم دھام کے ساتھ، ہارمونیم کی آواز سے بھی کہیں زیادہ بلند آہنگی سے "ہزماسٹرس وائس" کو دُہرا دیا۔ تاکہ پانچویں سواروں میں اُنکا نام بھی شامل ہو جائے مگر یہ نہ سوچا کہ ماہرینِ موسیقی کے نقطۂ نظر سے ہارمونیم ایک نامکمل ساز سہی مگر ریڈیو کی موجودہ ضروریات کیلئے تو نامناسب نہیں ہے۔ ریڈیو پر جو تھیٹریکل قسم کے گانے گائے جاتے ہیں وہ خود کب اتنے مکمل ہوتے ہیں کہ اُنکے لئے مکمل ساز کی ضرورت پیش آئے۔ بقول آپکے ہارمونیم کے بغیر قوالی کا تو خاتمہ ہے۔ اور بقول پروفیسر مرزا محمد سعید کے ہارمونیم کے بغیر ہندوستانی آرکسٹرا بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں اُستادوں کے سوا ریڈیو کے عام گانے والوں

چندہ سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے، مع محصول ڈاک؛ فی پرچہ ۶ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں

جرعات

شائع ہوتا ہے اور ہر سال اس کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں۔ مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی؛

جلد ۲۱ — ساقی دہلی۔ بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۰ء — نمبر ۶

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرینِ ساقی نے سید ابو القاسم صاحب سرور کا مضمون "سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی اَنچھر" (جو ساقی میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے) بہت پسند کیا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اتنے دقیق مسائل کو اتنی سلیس عبارت میں واضح کرنا سید صاحب ہی کے بس کا کام ہے۔ افسوس ہے کہ اس اشاعت میں اس مضمون کی قسط شامل نہیں ہو سکی۔ اگست کے ساقی میں آخری قسط پیش کی جائے گی۔

زیرِ نظر اشاعت میں پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا ایک بے مثل مضمون "دلّی کی بیگمات" شامل ہے۔ یہ مضمون "نظامِ ادب" سے نقل کیا گیا ہے۔ "نظامِ ادب" طلبائے نظام کالج۔ حیدر آباد دکن کا ششماہی رسالہ ہے جس کا پہلا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ساقی کے قلمی معاون سید بادشاہ حسن صاحب اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے "نظامِ ادب" اُردو کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ظاہری شکل و صورت بھی عمدہ اور دلکش ہے۔ قیمت دو روپے سالانہ یا ایک روپیہ فی پرچہ ہے۔ اُمید ہے کہ ایسے پاکیزہ پرچے کو زندہ رکھا جائے گا اور نظام کالج میگزین کی طرح بے توجہی کا شکار نہیں ہونے دیا جائے گا۔

حضرت ایم۔ اسلم کی تصنیف نرگس ساقی بک ڈپو سے شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن بہت خوشنما شائع ہوا ہے۔ قیمت میں بھی ۸ر کی کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی اب عہ۱ میں طلب کی جا سکتی ہے۔

دلّی ریڈیو کی بدعنوانیاں ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً کوئی غلط اُردو بولے تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو کی زبان بول رہا ہے۔ کوئی بے سُرا الاپے تو کہا جاتا ہے کہ اس ریڈیو کو تو بند کرو۔ کسی محکمے کی ابتری بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو والوں سے بھی بد تر ہے۔ چِکنے گھڑے کی پھبتی بھی اب پُرانی ہو چکی۔ کوئی ڈھٹائی کرے تو کہا جاتا ہے کہ خاصے ریڈیو بنے ہوئے ہو۔ دلّی ریڈیو کی اس "ہر دلعزیزی" کا سہرا اُسکے معصوم اسٹیشن ڈائریکٹر کے سر ہے۔ یہ ڈائریکٹر صاحب سندھی ہیں اور اُردو ہندی میں بھی اتنے ہی کورے ہیں جتنے کہ موسیقی میں۔ دلّی اسٹیشن کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ یہ بزرگ اُس پر مسلط کئے گئے ہیں۔ سابق کنٹرولر مسٹر فیلڈن کی مردم ناشناسی کی اِس یادگار کو اگر قائم ہی رکھنا ہو تو مناسب ہوگا کہ موجودہ کنٹرولر صاحب سندھ میں ایک نیا اسٹیشن کھولنے کی تجویز پر غور فرمائیں۔ بقول ہمارے ایک محترم دوست کے (جو انگریزی میں سوچتے ہیں) "دلّی اسٹیشن کتّوں کو جا رہا ہے"۔ ہم موجودہ کنٹرولر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان بدعنوانیوں کا تدارک فرمائیں اور دلّی اسٹیشن کو "کتّوں کو جانے" سے بچا لیں۔ زبان کو انہوں نے کافی برباد کر لیا۔ موسیقی کو تباہ کرنے پر آئے تو ہارمونیم کا جنازہ تک نکال دیا۔ ع:۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ناظرینِ ساقی میں یہ غمناک خبر افسوس سے سُنی جائے گی کہ ساقی کے خاص قلمی معاون مسٹر سعادت حسن منٹو کی والدہ نے گذشتہ ہفتے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے بابرکت سائے سے اپنے پیارے بچے کو محروم کر گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ عاطفت میں جگہ دے اور منٹو صاحب کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

آئندہ ماہ ساقی کا "افسانہ نمبر" شائع ہوگا۔ افسانے بڑی کاوش سے جمع کئے گئے ہیں۔ تعداد تقریباً تین درجن ہوگی۔ مفصل اشتہار صفحۂ ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"شاہد"

یورپ پہلی نظر میں

یورپ کی پہلی جھلک نے مجھ پر جو اثر ڈالا تھا وہ ابھی تک مجھے بھولا نہیں ہے۔ ہمارے دیس کی سڑکوں اور گھروں میں جو ایک عام بے ترتیبی اور خرابی ہوتی ہے، اُسے دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ان کی دیکھ ریکھ کسی کنوارے بوڑھے کے سپرد ہے۔ جسے انتظام اور بندوبست سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یورپ کے بناؤ سنگار میں مجھے سب سے پہلے عورت کا ہاتھ نظر آیا۔ یہاں میرا مفہوم بچے پیدا کرنیوالی اور جھاڑو دینے والی عورت سے نہیں، بلکہ اُس عورت سے ہے جو آرٹ کی محرک سمجھی جاتی ہے۔

اسکے برعکس مجھے یورپ کے آسمان سے نفرت ہوئی۔ مجھے آکاس سے لگاؤ ہے اور اُس کے تاروں سے محبت ہے۔ لیکن یورپ کے مٹیالے آسمان میں تارے اتنے ہی کمیاب ہیں جتنے وہاں کے گاؤں میں دئے اور چراغ۔ مجھے یہ کمی ہمیشہ اکھری، اور یہ شک اب بھی ہوتا ہے کہ اگر یورپین میں تخیل کی کمی اور واقعیت کی زیادتی ہے تو اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ آسمان میں کچھ نہیں دیکھتا، اسکی آنکھیں زمین پر لگی رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد ہی یہ سمجھ میں آگیا کہ یورپین کیوں تندرست اور خوش مذاق، اور ایشیائی عموماً کیوں اداس اور بد مذاق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپین سماج حرفتی ہو گیا ہے اور جب بہت سے لوگ ایک ساتھ کام کرنے اور رہنے کے عادی ہو جائیں تو انہیں ایک سنگت سنگ سا ملتا ہے اور ہنسنے گانے بھلا برا کٹ ہی جاتا ہے۔ لیکن جن دیسوں کی سماجی زندگی کا دارومدار کھیتی پر ہو ــــ میرے آگے ہندوستان کے سوا چین اور پرانے روس کی مثالیں ہیں ــــ تو وہاں کے لوگ رفتہ رفتہ اُداس اور بے دلے ہو جاتے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی معاشرتی زندگی کو بنانے بدلنے میں عورت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وجہ سے ہنسی مذاق فحش نہیں ہو پاتے اور مرد کی طبیعت کی سختی کو عورت کا پاس نرم کر دیتا ہے۔

جب پت جھڑ آئی تو مجھے دکھ ہوا۔ ایک دو ہفتے کے اندر پیڑ پودے ننگے ہو گئے اور کسی باغ کو جانا گویا درد سر بلانا تھا۔ مگر جب بہار آئی اور ہر راہ چلتا ٹھہر کر نئی کونپلوں اور کھلتی ہوئی کلیوں کو دیکھنے لگا تو معلوم ہوا کہ یورپ میں اس کی مشینوں اور کارخانوں کے باوجود کسی حد تک آرٹ کا چرچا کیوں ہے۔

اب میں نے اپنے آس پاس کے یورپین کو غور سے دیکھا۔ بظاہر اس میں ایک حیوانی قسم کی تندرستی تھی۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اور اس کی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ کا یہ انداز تھا گویا دُنیا کی ہر چیز اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پہلی نظر میں اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل اسی وقت اور اسی مقام پر چاہتا تھا۔ ہندوستان میں مروّت کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ اس میں بالکل ناپید تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر راہ گیر دوسروں کو دھکا دیتا ہوا چلا جاتا ہو یا یہ سڑکوں کے اور چھوڑ دو کریم بھائی۔ اور لالہ جی۔ کے نعروں سے گونج رہے ہوں۔ ہر طرف گھما گھمی تھی لیکن ایک کو دوسرے کے آرام کا خیال تھا اور شہریت کے اس اصول کو سب نے گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ سماج کے بھلے ہی میں آدمی کا بھلا ہے۔

یورپ میں میرا زیادہ وقت فرانس میں کٹا اور زبان سیکھنے کے لئے میں ایک فرانسیسی گھرانے میں رہنے لگا۔ اُن کے لئے کسی ہندوستانی سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہندوستان کے متعلق اُن کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھے اپنا ہاتھ دکھلانا چاہا اور جب میں نے اس فن سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو انہیں کچھ اچنبھا سا ہوا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں دو قسم کے انسان آباد ہیں، راجہ مہاراجہ جن کا وقت رنواسوں اور خواجہ سراؤں میں گذرتا ہے۔ اور سادھو یا جوگی جو جنگلی پہاڑوں میں بیٹھے عبادت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آدمیوں کے متعلق اُن کی دلچسپی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُن کی توجہ یہاں کے ہاتھیوں، سانپوں اور شیروں کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ مقدس سانڈوں اور بندروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ کشمیر کی شال اور گولکنڈے کے ہیرے کے علاوہ وہ ہماری کسی چیز کو نہیں جانتے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان اُن کے نزدیک ایک چڑیا گھر اور عجائب خانہ ہے جسے کسی دوسرے خدا نے پیدا کیا تھا۔ بعض پڑھے لکھوں نے مجھ سے ٹیگور کی ڈاڑھی اور گاندھی جی کی بکری کا بھی ذکر کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرینِ ساقی نے سید ابوالقاسم صاحب سرور کا مضمون "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" (جو ساقی میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے) بہت پسند کیا ہے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اتنے دقیق مسائل کو اتنی سلیس عبارت میں واضح کرنا سید صاحب ہی کے بس کا کام ہے۔ افسوس ہے کہ اس اشاعت میں اس مضمون کی قسط شامل نہیں ہو سکی۔ اگست کے ساقی میں آخری قسط پیش کی جائے گی۔

زیرِ نظر اشاعت میں پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا ایک بے مثل مضمون "دلّی کی بیگمات" شامل ہے۔ یہ مضمون "نظامِ ادب" سے نقل کیا گیا ہے۔ "نظامِ ادب" طلباے نظام کالج، حیدرآباد دکن کا ششماہی رسالہ ہے جس کا پہلا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ساقی کے قلمی معاون سید بادشاہ حسن صاحب اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے "نظامِ ادب" اُردو کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ظاہری شکل و صورت بھی عمدہ اور دلکش ہے۔ قیمت دو روپے سالانہ یا ایک روپیہ فی پرچہ ہے۔ اُمید ہے کہ ایسے پاکیزہ پرچے کو زندہ رکھا جائے گا اور نظام کالج میگزین کی طرح بے توجہی کا شکار نہیں ہونے دیا جائے گا۔

حضرت ایم۔ اسلم کی تصنیف نرگس ساقی بک ڈپو سے شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن بہت خوشنما شائع ہوا ہے۔ قیمت میں بھی ۸؍ کی کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی اب عہ؍ میں طلب کی جا سکتی ہے۔

دلّی ریڈیو کی بدعنوانیاں ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً کوئی غلط اُردو بولے تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو کی زبان بول رہا ہے۔ کوئی بے سُرا الاپے تو کہا جاتا ہے کہ اس ریڈیو کو تو بند کرو۔ کسی محکمے کی ابتری بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو والوں سے بھی بدتر ہے۔ چکنے گھڑے کی پھبتی بھی اب پُرانی ہو چکی۔ کوئی ڈھٹائی کرے تو کہا جاتا ہے کہ خاصے ریڈیو بنے ہوئے ہو۔ دلّی ریڈیو کی اس "ہر دلعزیزی" کا سہرا آکر معصوم اسٹیشن ڈائرکٹر کے سر ہے۔ یہ ڈائرکٹر صاحب سندھی ہیں اور اُردو ہندی میں بھی اتنے ہی کورے ہیں جتنے کہ موسیقی میں۔ دلّی اسٹیشن کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ یہ بزرگ اس پر مسلّط کیے گئے ہیں۔ سابق کنٹرولر مسٹر فیلڈن کی مردم ناشناسی کی اس یادگار کو اگر قائم ہی رکھنا ہو تو مناسب ہوگا کہ موجودہ کنٹرولر صاحب سندھ میں ایک نیا اسٹیشن کھولنے کی تجویز پر غور فرمائیں۔ بقول ہمارے ایک محترم دوست کے (جو انگریزی میں سوچتے ہیں) "دلّی اسٹیشن کتّوں کو جا رہا ہے"۔ ہم موجودہ کنٹرولر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان بدعنوانیوں کا تدارک فرمائیں اور دلّی اسٹیشن کو "کتّوں کو جانے" سے بچا لیں۔ زبان کو انہوں نے کافی برباد کر لیا۔ موسیقی کو تباہ کرنے پر آئے تو ہارمونیم کا جنازہ تک نکال دیا۔ ع۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ناظرینِ ساقی میں یہ غمناک خبر افسوس سے سُنی جائے گی کہ ساقی کے خاص قلمی معاون مسٹر سعادت حسن منٹو کی والدہ نے گذشتہ ہفتے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے بابرکت سائے سے اپنے پیارے بچے کو محروم کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ عاطفت میں جگہ دے اور منٹو صاحب کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

آیندہ ماہ ساقی کا "افسانہ نمبر" شائع ہوگا۔ افسانے بڑی کاوش سے جمع کیے گئے ہیں۔ تعداد تقریباً تین درجن ہوگی۔ مفصّل اشتہار صفحہ ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"شاہد"

یورپ پہلی نظر میں

یورپ کی پہلی جھلک نے مجھ پر جو اثر ڈالا تھا وہ ابھی تک مجھے بھولا نہیں ہے۔ ہمارے دیس کی سڑکوں اور گھروں میں جو ایک عام بے ترتیبی اور خرابی ہوتی ہے، اُسے دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ان کی دیکھ ریکھ کسی کنوارے بوڑھے کے سپرد ہے۔ جسے انتظام اور بندوبست سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یورپ کے بناؤ سنگار میں مجھے سب سے پہلے عورت کا ہاتھ نظر آیا۔ یہاں میرا مفہوم بچے پیدا کرنے والی اور جھاڑو دینے والی عورت سے نہیں، بلکہ اُس عورت سے ہی جو آرٹ کی محرک سمجھی جاتی ہے۔

اسکے برعکس مجھے یورپ کے آسمان سے نفرت ہوئی۔ مجھے آکاس سے لگاؤ ہے اور اُس کے تاروں سے محبت ہے۔ لیکن یورپ کے مٹیالے آسمان میں تارے اتنے ہی کمیاب ہیں جتنے وہاں کے گاؤں میں دیے اور چراغ۔ مجھے یہ کمی ہمیشہ اکھری، اور یہ شک اب بھی ہوتا ہے کہ اگر یورپین میں تخیل کی کمی اور واقعیت کی زیادتی ہے تو اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ آسمان میں کچھ نہیں دیکھتا، اسکی آنکھیں زمین پر لگی رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد ہی یہ سمجھ میں آگیا کہ یورپین کیوں زندہ دل اور خوش مذاق، اور ایشیائی عموماً کیوں اداس اور بد مذاق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپین سماج حرفتی ہو گیا ہے اور جب بہت سے لوگ ایک ساتھ کام کرنے اور رہنے کے عادی ہو جائیں تو انہیں ایک سنگت سکھ سا ملتا ہے اور ہنستے ہنستے گاتے بھلا برا کٹ ہی جاتا ہے۔ لیکن جن دلیسوں کی سماجی زندگی کا دار و مدار کھیتی پر ہو —— میرے آگے ہندوستان کے سوا چین اور پرانے روس کی مثالیں ہیں —— تو وہاں کے لوگ رفتہ رفتہ اُداس اور بے دلے ہو جاتے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی معاشرتی زندگی کو بنانے بدلنے میں عورت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وجہ سے ہنسی مذاق فحش نہیں ہو پاتے اور مرد کی طبیعت کی سختی کو عورت کا پاس نرم کر دیتا ہے۔

جب پت جھڑ آئی تو مجھے دُکھ ہوا۔ ایک دو ہفتے کے اندر پیڑ پودے ننگے ہو گئے اور کسی باغ کو جانا گویا درد سر بلانا تھا۔ مگر جب بہار آئی اور ہر راہ چلتا ٹھہر کر نئی کونپلوں اور کھلتی ہوئی کلیوں کو دیکھنے لگا تو معلوم ہوا کہ یورپ میں اس کی مشینوں اور کارخانوں کے باوجود کسی حد تک آرٹ کا چرچا کیوں ہے۔

اب میں نے اپنے آس پاس کے یورپین کو غور سے دیکھا۔ بظاہر اس میں ایک حیوانی قسم کی تندرستی تھی۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اور اس کی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ کا یہ انداز تھا گویا دُنیا کی ہر چیز اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پہلی نظر میں اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل اسی وقت اور اسی مقام پر چاہتا تھا۔ ہندوستان میں مروّت کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ اس میں بالکل ناپید تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر راہگیر دوسروں کو دھکا دیتا ہوا چلا جاتا ہو یا یہ سڑکوں کے اور چھوڑو کریم بھائی اور لالہ جی کے نعروں سے گونج رہے ہوں۔ ہر طرف گھما گھمی تھی لیکن ایک کو دوسرے کے آرام کا خیال تھا اور شہریت کے اس اصول کو سب نے گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ سماج کے بھلے ہی میں آدمی کا بھلا ہے۔

یورپ میں میرا زیادہ وقت فرانس میں کٹا اور زبان سیکھنے کے لئے میں ایک فرانسیسی گھرانے میں رہنے لگا۔ اُن کے لئے کسی ہندوستانی سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہندوستان کے متعلق اُن کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھے اپنا ہاتھ دکھلانا چاہا اور جب میں نے اس فن سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو انہیں کچھ اچنبھا سا ہوا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں دو قسم کے انسان آباد ہیں، راجہ مہاراجہ جن کا وقت رنواسوں اور خوابگاہوں میں گذرتا ہے۔ اور سادھو یا جوگی جو جنگلی پہاڑوں میں بیٹھے عبادت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آدمیوں کے متعلق اُن کی دلچسپی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُن کی توجہ یہاں کے ہاتھیوں، سانپوں اور شیروں کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ مقدس سانڈوں اور بندروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ کشمیر کی شال اور گولکنڈے کے ہیرے کے علاوہ وہ ہماری کسی چیز کو نہیں جانتے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان اُن کے نزدیک ایک چڑیا گھر اور عجائب خانہ ہے جسے کسی دوسرے خدا نے پیدا کیا تھا۔ بعض پڑھے لکھوں نے مجھ سے ٹیگور کی ڈاڑھی اور گاندھی جی کی بکری کا بھی ذکر کیا۔

سب سے بڑا سبق جو مجھے پہلے پہل یورپ میں ملا یہ تھا کہ وہاں انسان انسان سمجھا جاتا ہے۔ کیا مجال کہ گھر کے نوکر یا ہوٹل کے خادم سے کوئی بُرا برتاؤ کرلے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں مالک اور نوکر کا ناتا اس معنی میں ہے ہی نہیں۔ کسی کے پاس پیسہ ہے۔ کسی کے پاس محنت ہے۔ اور ان دونوں میں باہمی ادلا بدلی ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی ہم میں نوکر کو غلام سمجھنے کی عادت باقی ہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہاں کے لوگ عام طور پر آرٹ کا ذوق رکھتے ہیں۔ اچھی موسیقی، مصوری یا ادب کو سمجھنے والے وہاں بھی کم ہیں۔ انگریزوں کا تو ذکر ہی کیا، فرانس میں بھی پیرس کے علاوہ کہیں اور ان چیزوں کا شوق کم ہے۔ ہر طرف مغربی قوالی یعنی "جاز" کا زور ہے۔

ہمارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یورپ سے مذہب کا نام اُٹھ گیا۔ پادریوں کا چُغہ وہاں اتنا ہی عام ہے جتنی یہاں مولوی کی قبا یا پنڈت جی کا تلک۔ اور اتواروں کو گرجا گھر اتنے ہی آباد ہوتے ہیں جتنی جمعہ کو یہاں کی مسجدیں یا تیوہاروں کے دن یہاں کے مندر۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب ان کے گھر میں رہتا ہے سڑک پر نہیں چلتا۔ مذہب کے بارے میں کوئی کسی سے بات چیت یا بحث نہیں کرتا اور یہ بالکل ذاتی چیز سمجھی جاتی ہے۔ مذہبی حجت وہاں بداخلاقی اور بدتہذیبی کی انتہا سمجھی جاتی ہے۔ میں ایسے کئی گھرانوں کو جانتا ہوں جہاں بیوی کٹر دین پرست اور شوہر بالکل بے دین ہے۔ اس کے باوجود انکی گھریلو زندگی بڑے مزے میں بسر ہوتی ہے۔

سڑکوں پر بھکاری بہت کم دیکھنے میں آئے۔ وہ سڑکوں پر گاتے بجاتے چلے جاتے تھے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے۔ یا دیا سلائیاں بیچا کرتے تھے۔

پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی اسپتال میں مدتوں رہکر صحت مندوں کے بیچ میں آگیا ہوں۔ ان میں بھی امیر غریب سب تھے۔ زندگی یہاں بھی بہتوں کے لئے کٹھن تھی۔ لیکن اس میں ایک قسم کا توازن سا تھا۔ وہاں لوگ محنت کرنا تو جانتے ہی ہیں لیکن فرصت کی گھڑیوں کو سکھ چین سے گذارنا اس سے زیادہ جانتے ہیں۔ زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا بڑا آرٹ ہے اور وہ اس کے ماہر ہیں۔۔۔ ہمارے یہاں تو لوگ زندگی کو ایک لمبا کام کا دن یا لمبی چھٹی سمجھتے ہیں۔ یورپ میں یہ بات نہیں۔

اور تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی میری آنکھیں رُکیں۔ نفسی نفسی کا بازار وہ گرم تھا کہ توبہ۔ جان پہچان کی ایک بڑی بی، جن کے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، گھر سے بہت خوش حال، اپنا وقت ہمیشہ ناٹکوں اور فلموں میں گذارتی تھیں۔ ان کی سگی بوڑھی بہن جو غریب تھی پاس کے اسپتال میں دم توڑ رہی تھی۔ لیکن بڑی بی کو آخر دم تک توفیق نہ ہوئی کہ اپنی بہن سے ملنے جائیں۔ ڈر یہ تھا کہ علاج کے لئے روپے نہ مانگ بیٹھے۔ کوئی کسی کے غم کا شریک نہیں۔ نغمہ سُننے والے سب، نالہ سُننے والا کوئی بھی نہیں۔ خود غرضی (خودی) ورغرض کا وہ سیلاب اُمڈا ہوا نظر آیا جس میں جل تھل برابر تھے۔

دوسری چیز جو آنکھوں کو بہت کھٹکی وہ "بڑھیوں کا سنگار" تھا۔ کسی حسین کے لئے سنگار تو نورٌ علیٰ نور ہے اور زیبا بھی ہے۔ مگر میرے خیال میں کوئی کشمکش اتنی نفرت انگیز اور دردناک نہیں جتنی بڑھاپے سے بوڑھی عورت کی لڑائی۔ کوئی تلاش اتنی مایوس کن نہیں جتنی بدصورت عورت میں حُسن کی تلاش۔ مگر یورپ میں بوڑھی عورتوں کو سج دھج کا شوق سب سے زیادہ ہے۔ پوپلے چہرے پر وہ لیپا پوتی کی جاتی ہے، ہونٹوں پر وہ دھڑی جماتی ہیں، نوک پلک یوں درست کرتی ہیں کہ دور سے یا اندھیرے میں دھوکا ہو ہی جائے! لیکن ہائے بڑھاپا! عمر کو کون دھوکا دے سکتا ہے۔

یہاں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ عورت کی ساری توجہ سیکس اپیل یعنی جنسی ترغیب پر تھی۔ اور یہ رجحان کچھ ایسے بھونڈے پن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میرے آرٹسٹک کلچر کو یہ چیز ناگوار ہوئی۔

شہروں سے زیادہ مجھے یورپ کے دیہاتوں نے متاثر کیا۔ وہاں میں نے شہر اور گاؤں کے تمام آراموں کو یکجا پایا اور اُن کی تنظیم اور صفائی ایسی تھی کہ میں دنگ رہ گیا۔ پہلی مرتبہ جس چھوٹے سے گاؤں میں میں جاکر رہا اس میں روز ڈاک آتی تھی۔ ایک معمولی سا چائے خانہ جس میں بلیرڈ کھیلنے کا انتظام تھا۔ روز شہر کی بڑی دکانوں کے ایجنٹ گھر گھر مال دینے اور آرڈر لینے کو آتے تھے۔ بہت سے گھروں میں ریڈیو سیٹ تھے اور اخبار صبح صبح مل جاتے تھے۔ مجھے اب بھی وہ مالی یاد ہے جو ایک پُرانے محل کی پھلواری کی گھاس صاف کرتے ہوئے مجھ سے چین اور جاپان کی جنگ پر بحث کیا کرتا تھا۔

یورپ کے معیار سے دیکھا جائے تو دیہاتی اب بھی کسی نہ کسی حد تک جاہل اور وہم پرست ہیں۔ چُنانچہ ایک بڑھا کسان جو پچھلے انتخاب میں سوشلسٹ پارٹی کو ووٹ دے چکا تھا، ہر اتوار کو اپنے

گرجا گھر میں گھنٹہ بجایا کرتا تھا! دیہاتوں میں پادری کا بڑا اثر پایا۔ اور کسانوں کو یہ سن کر سخت حیرت ہوتی کہ میں عیسائی نہیں ہوں۔ انہوں نے دبی زبان سے مجھے راہ راست پر آنیکی تلقین بھی کی۔

شاید ہر ایشیائی کو یورپ کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے زمان و مکان کو سمیٹنے کی کوشش۔ دنیا کے زیادہ سے زیادہ لوازمات ایک ہی جگہ ایک ہی زندگی میں مل جائیں —— میرے نزدیک یورپین تہذیب کا یہ نچوڑ ہے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور مختصر ہے، اسے جتنی اچھی طرح گذارا جاسکے جتنے تجربات، مشاہدات اور لوازمات سے مالامال کیا جاسکے، کر لیا جائے۔ مثلاً رہنے سہنے کے ہی مسئلہ کو لیجئے۔ تین چار آدمی ایک ساتھ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ فلیٹ چھوٹا سا ہے۔ لیکن اس کی ایک ایک انچ جگہ کسی نہ کسی مصرف میں آتی ہے۔ قرینہ اور صفائی درجہ کمال پر ہے۔ غریبوں کے گھر بھی تصویریں ہیں۔ ریڈیو نہیں تو گراموفون ہی ہے۔ کرسی میز سب کچھ ہے۔ گھر کے آس پاس زندگی کی تمام ضروریات مل جاتی ہیں۔ یہاں کی طرح نہیں کہ کپڑا بریلی میں ملے تو آٹا راسے بریلی میں اور جوتے بانس بریلی میں۔ دکاندار کو فون کیجئے تو ہر چیز گھر پر موجود ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گو ہر لحاظ سے یورپ کا ایک بڑا شہر بمبئی، کلکتہ وغیرہ سے سو گنا زیادہ آرام دہ ہے لیکن معمولی قسم کا یورپین معیارِ زندگی نبھانے کے لئے بھی یہاں وہاں سے زیادہ روپے خرچ کرنے ہوتے ہیں اور پھر بھی صاحبیت والر کری سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اگر پردیسی انسانیت سے کام لیں تو فرانسیسی کو میں نے خلیق اور صاحبِ دل پایا۔ چپراسی اور جمعدار جو ہر جگہ چھوٹے موٹے نانہ شاہ ہوتے ہیں یہاں رعایا کے دوست اور مددگار نظر آئے۔

یورپ میں میرا زیادہ وقت فرانس میں کٹا اور اس کا زیادہ حصہ پیرس میں۔ میں نے جو کچھ کہا یا کہوں گا اسے فرانس تک محدود سمجھنا چاہیئے۔ یورپ میں بھی سماجی ماحول، آب و ہوا اور نسلی و تاریخی روایتوں کے مطابق مزاجوں اور اداروں میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

ایک چھوٹا سا پیرس تو وہ ہے جسے چلتے پھرتے پردیسی ہزار بیس روز کے اندر دیکھ جاتے ہیں۔ نہ شراب و شباب، نغمہ و رباب کا پیرس ہے۔ یہ وہ پیرس ہے جہاں جنس کے بھوکے سیاح آتے اور نچی ہوئی ہڈیوں کو چبا کر اپنے گھر لوٹ جاتے اور صوفیانہ انداز میں وہاں کی گناہ پرستیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس پیرس کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس نے ان چیزوں کو جو دنیا کے ہر حصہ میں نہایت ہی کریہہ اور بھونڈے طریقے سے موجود ہیں زیادہ سجا اور بنا کر ایک جگہ رکھ دیا ہے۔

لیکن وہ پیرس جو مغرب کے افکار و فنون کا گہوارہ ہے وہ کچھ اور ہے۔ اسے جاننے کے لئے آدمی کو وہاں برسوں رہنا، زبان سیکھنا اور چل پھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ وہ مغربی کی جمہوری تہذیب کا گھر ہے اور وہ چوراہا ہے جس پر ہر ملک کے لوگ آکر ملتے اور ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔

پیرس شہر کی جو چیز پہلی بار سیاح کو متوجہ کرتی ہے —— وہ ہے عمارتوں کا محل وقوع۔ ہر دیکھنے کی چیز اپنی اپنی جگہ پر نگینہ کی طرح جڑی ہے اور شہر کی تقسیم میں تناسب اور تقسیم کا یہ التزام رکھا گیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ لندن انگریزوں کی ٹھنڈی طبیعت اور ذہنی الجھاؤ کی مثال ہے۔ برلن جرمنوں کی جسمانی صفائی مگر مزاجی بھونڈے پن کا مثالیہ ہے، پیرس فرانسیسی کی خوش ذوقی اور دماغی صفائی کی نظیر ہے۔

میں روحانی اور خیالی آوارہ گردی کا قائل ہوں۔ پیرس میں قدم رکھتے وقت میری کیفیت نامور فرانسیسی ادیب رومن رولاں کے آرٹسٹ ہیرو ژاں کرستوف کی سی تھی۔ اسی کی طرح میں بھی کچھ ڈھونڈنے وہاں گیا تھا۔ مجھے نہ ڈگری کی تلاش تھی نہ مال و دولت کی۔ اس قسم کے بہت سے لوگ دور دور سے وہاں آتے اور رم جاتے ہیں۔ کچھ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ ناکام ——

(اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی)

(ڈاکٹر) **اختر حسین** رائے پوری

محبت —— اور —— نفرت

تہدیۂ محبت نفرت کے نام

اردو کے سب سے جدت طراز ادیب اختر حسین رائے پوری کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ جس میں دکھایا گیا ہے کہ محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کے لئے اور نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کے لئے۔

قیمت ۱۲؍ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ :- ساقی بک ڈپو۔ دہلی

تربتِ شہید

ظاہر میں گو یہ قبر ہے مٹی کا ڈھیر ہے ۔۔۔ لیکن اسی کی اوٹ میں اللہ کا شیر ہے
وہ شیر جس کو اپنی خودی کا شعور تھا ۔۔۔ جو فیضِ سوزِ عشق سے خود نخلِ طور تھا
دھاڑوں سے جس کی دشت میں شور نشور تھا ۔۔۔ جس کے نفس نفس میں نہاں نفخِ صور تھا
تھی جس کی آنکھ برقِ تہوّر کا آسماں ۔۔۔ گرتی تھیں جس سے کفر کے حاصل پہ بجلیاں
باطل پرست لرزہ براندام ڈر رہے تھے ۔۔۔ بھٹکی ہوئی نگاہ میں لرزاں شرر سے تھے
فرعونیوں کی روح تھی جس سے عذاب میں ۔۔۔ تھا جاگتے میں چین جنہیں اور نہ خواب میں
افسردہ جس نے آتشِ نمرودِ وقت کی ۔۔۔ جس پر نہ چل سکی کسی آذر کی آذری
جس کا عصا تھا در دِ وہ موسیٰ یہی تو تھا ۔۔۔ ایمان جس کا تھا یدِ بیضا یہی تو تھا
باطل کو اپنی قوتِ بازو پہ ناز تھا ۔۔۔ شیرِ خدا کا آپ خدا کارساز تھا

قدرت خدا کی اپنا کرشمہ دکھا گئی
تیغِ جفا ہی جامِ شہادت پلا گئی

کیوں کہیے موت یہ تو دوامِ حیات ہے ۔۔۔ اس موت میں ثبات و قیامِ حیات ہے
اک شب کہ جس کی گود میں صبحِ نشور ہے ۔۔۔ اک شمعِ کشتہ جس کی رگ و پے میں نور ہے
طوفانِ نوبہار بداماں گُلِ چمن ۔۔۔ خونی کفن شفق میں ستاروں کی انجمن
ققنس کا سوز سازِ حیاتِ نوی ہوا ۔۔۔ یعنی فنا کا فعل نئی زندگی ہوا
آئینہ ٹوٹ کر کئی آئینے ہو گئے ۔۔۔ اک نور کے امین کئی سینے ہو گئے
پھینکا گیا ہے توڑ کے اک کو کنار کو ۔۔۔ دعوت نمو کی ہے یہی لالہ زار کو
غنچہ پِسا تو بُو کو ملا اذنِ انتشار ۔۔۔ کٹنے سے اور پھیل کے رہتی ہیں شاخسار
حق پر نثار ہو کے شہادت جو پا گیا ۔۔۔ اپنے عمل سے ہم کو یہ نکتے سمجھا گیا
اس موت کا شمار ہے اُن ممکنات میں ۔۔۔ جن کا کوئی جواب نہیں کائنات میں

جس قوم میں شہید نہیں نا اُمید ہے
یعنی حسین اُس کا غلامِ یزید ہے

امینِ حزیں

مکتب کی گزران

بچپن کے وہ دن، جب بہشت نصیب اماں باوا نے ہمیں حیوان سے آدمی، اور بن جائیں تو آدمی سے انسان بنانے کی فکر میں مکتب بٹھایا تھا، آج پچاس برس کے سن میں بھی یاد آتے ہیں تو اللہ جانتا ہے یہ تالو پٹ کھوپڑی، یہ ٹھنڈا لوٹی پیٹھ، یہ کفگیر سی ہتیلیاں معاذاللہ معاذاللہ لرزنے لگتی ہیں، ہڈی ہڈی الامان پکارتی ہے، ہنسی کی بات نہیں مکتب کی گزران کا اندازہ کچھ وہی کرسکتا ہے جس نے دودھ کے دانت گرنے سے عقل داڑھ نکلنے تک مہینے کے چار جمعے، اور سال میں عید بقرعید کے دو دن چھوڑکر، کچھ اوپر ایک صدی کے بچے کھچے میاں جی کے آگے، ٹاٹ کے پھٹے فرش پر، دوزانو بیٹھکر قمچیوں کے سائے میں گزاری ہو، ورمنہ سے اف نہ کی ہو، ورنہ خطا معاف، جس کے پیر نہیں بوائی، وہ کیا جانے پیر پرائی۔

آپ جانتے ہیں کہ مکتب کی پہلی سیڑھی بسم اللہ ہوتی ہے اور حیثیت کے مطابق امیر غریب سبھی یہ مبارک تقریب کرتے ہیں، اور پرانے چلن پر چلے تو خدارات سے پہلے ہیں، بلاوا جاتا ہے، شام ہوتے ہی ٹولی بھر بھر کے برادری کی بیویاں اترنے لگتی ہیں، ڈومنیوں کو کھچڑی جاتی ہے، کڑھائی چڑھتی ہے، اور ڈھولک کی غٹرغوں، غٹرغوں، میں رات بھر گلگلے تلے جاتے ہیں، اور یہ رت جگا مناکر تاروں کی چھاؤں اور جوگنک کی روشنی میں اللہ میاں کا رحم اور گلگلوں کے طباق، محلے کی مسجد بھجوائے جاتے ہیں، جہاں طاق بھرنے کے بعد یہ زنانی رسم ختم ہوجاتی ہے، پھر دوپہر ڈھلے تک مہمانوں کے کھانے دلانے سے نچنت ہو، بچے کو نہلا دھلاکے نوشہ بناتے ہیں، اور اللہ دے تو باجے گاجے سے گھوڑے پہ بٹھلاکے مسجد کے سلام کو بھجواتے ہیں، عصر کے قریب مہمانوں کے جھرمٹ میں گھر کا کوئی بزرگ بچے کی زبان سے بسم اللہ کہلوا دیتا ہے اور مبارک سلامت ہوکر لوگ آئے گئے ہوجاتے ہیں۔

یہی معمولات کم وبیش ہمارے ہاں بھی برتے گئے، اور دولہا بننے کی خوشی میں ہم ایسے اترائے کہ گندم کی طرح پھولے ہوئے جھم جھم کے کپڑوں اور چنبیلی کی بدھیوں میں مچل مچل کے جو سوئے تو ساری رات یہی خواب دیکھتے رہے کہ موتی چور کے لڈوؤں سے کھیل رہے ہیں، چار برس چار مہینے چار دن کی کھوپڑی کے وہم میں بھی یہ تعبیر نہ گزری کہ صبح کو باسی ہوکر جب بیدار ہونگے تو میاں جی کے مکتب اور قاعدہ بغدادی کی بھول بھلیوں میں پھنسنا ہوگا۔

گٹ پٹ کے یہ اسکول جو آج کل ٹکے دھڑی کے بھاؤ سے گلی گلی ملتے ہیں، ان دنوں تولے ماشے کے حساب سے بکتے تھے، عام رواج یہ تھا کہ کھاتی پیتی سرکاروں میں جہاں رتھ، بہلی، گھوڑے، ہاتی ــــ یا ٹیم ٹمام کے اور لوازمے ہوتے ہیں، وہاں گھر کے بچوں کی تعلیم تربیت کے لئے ایک میاں جی کا اسم بھی ضرور ہوتا، جو برکت کے پانچ روپے تنخواہ، اور عیدی جمعراتی کی بالائی پر ٹکے ہوتے الف بے سے لے کر پنج رقعہ، مینا بازار تک گھٹوانے میں مشاق ہوتے، ریز کرتے بچے مکتب کے پنجرے میں بند کئے جاتے، اور زیادہ مدت نہ گزرتی کہ خاصے ہزار داستاں کی طرح چہکتے ہوئے برآمد ہوتے۔

ایسا ہی ایک مکتب تھا جس میں بسم اللہ ہوتے ہی رونے دھونے اور خوب خوب فیل مچانے کے باوجود ہمیں بٹھا ہی دیا گیا، میاں جی نے بڑی آؤبھگت کی، چمکارا، ناکند بچھیرے کی طرح پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیرا، اور مٹھائی اور کھلونوں کے داؤں پر رکھ کے قاعدے کا پہلا صفحہ چت کیا، اور میاں، بھیا ہی کہتے کہتے "الف بے جیم" کے جنجال میں الجھا دیا، پیار کے بھرے پر پہلے دن کا سبق ازبر ہوگیا، چھٹی بھی جلد مل گئی۔

اسی چہ غم میں "عین غین" تک پہونچنے پائے تھے کہ جمعرات آئی اور سندیسا لائی کہ آموختہ سنانا ہوگا، جل تو جلال تو، آئی بلا کا خوف کہیے، یا آنے والے جمعے کی خوشی کہ اتنے دن کا کھایا پیا ہضم، معدہ خالی، یعنی ہفتے بھر کی محنت اکارت، اول سے آخر تک پوری تقطیع ندارد، مطلع صاف، آگے عین غین پیچھے عین غین۔ ناگہاں بڑے میاں کی تاربندھے دانت نکلے، نچلا ہونٹ دبا، بھویں سکڑیں، آنکھیں چمکیں، سیدھے ہات سے کان کی لو پکڑی، الٹے سے ایک دو انگشتا چٹکٹ جو رسید فرماتے ہیں تو کلے پہ بیٹھا چٹ سے! مگا آنسو بھری آنکھوں سے جھل مل جھلمل کرتا دکھائی دیا کہ تاڑ کے جھاڑ برابر "الف" کھڑا ہے، اس کے سائے میں سیدھی سیدھی اور یہ موٹی "ب" پڑی ہے۔ اور "جیم" کے پیٹ میں نقطے کی جگہ ہم خود دبکے بیٹھے ہیں۔

بہرحال کھونٹی اٹھتے ہی چکارا بولا، بھولا ہوا آموختہ فرفر چلنے لگا

وہ بھی قرأت سے صحیح صحیح مخرجوں کے ساتھ، چٹکی کی گرفت بھی ڈھیلی پڑگئی۔ اور کلّے پر جولال للّٰہ "الف دو زبر اَن" بن گئے تھے، وہ بھی موٹے موٹے آنسوؤں نے دھو دیے اور ہلکا سا یہ اطمینان محسوس ہوا کہ پٹے تو بلا سے، کان میں منت کا جو وُر پڑا تھا اُس نے میاں جی صاحب کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا زنبور بھی تھوڑی دیر کے لئے ضرور موتھرا کر دیا ہوگا۔ طے کر لیا تھا کہ چھٹی ملتے ہی میاں جی کے خلاف گھر کی کچہری میں استغاثہ دائر کریں گے۔ اور ایک چھوڑ دو دو جرموں کے ارتکاب پر سزا برطرفی تو ضرور ہی تجویز کرائیں گے، مگر قسمت جس پر ازل سے مکتب کندہ تھا کھوٹی تھی۔ کراہ کراہ کے، سسک سسک کے دقوعے کا ثبوت، کان کی لَو، کلّے کا درد، ایک سے ایک بڑھ کر دیا، مگر امی جان اور ابا جان کے متفقہ اجلاس سے فیصلہ ہمارے خلاف ہی صادر ہوا، گوشمالی اور چپکٹ بحال رہے۔ ابا جان تو خیر ان میانجی کے پرانے شاگرد، اور شاید اب تک ہم سے زیادہ بڑے حضرت سے جھکتے تھے، مگر یہ نانی اماں؟ اِن سے بڑی امیدیں تھیں، وہ بھی صرف "ہچ! برا ہوا میرے لال!" کہہ کر ٹال گئیں۔ بڑا فہیمن نے بے شک میاں جی کو بُدر بُدر کوسا، اور امرتی کا ایک ٹکڑا دے کر شکایت مضمحل کر دی، اس طرح ہماری مسل داخل دفتر ہو گئی۔

مکتب کی گزران میں یہ بڑا وصف ہے کہ پڑھائی کا کوئی نصاب مقرر نہیں ہوتا، نہ مُردوں کی چھ ماہی برسی کی طرح ششماہی، سالانہ امتحان کی پخ، کتاب ختم ہوئی، پانچ پیسے کے بتاشے آئے، مصنف رحمتہ اللہ علیہ کی روح پر فتوح کو پنج آیت کا ثواب بخشا گیا، اور نئی کتاب شروع۔ یافتاح رب یسر ولاتعسر۔ بتاشوں کا حساب یہ کہ بٹے آدھے میاں جی کے، باقی آدھے میں سے پاؤ خلیفہ کا حق، بچا چورا چارا، وہ سارے مکتب پر تقسیم۔ ہاں جائزہ تھا کہ کتاب موٹی تگڑی ہو، تو فاتحہ بھی سات پیسے حد ڈھائی آنے تک، اور بتاشوں کی جگہ جلیبیاں ــــ حاضری کے باب میں بھی مکتب کی روایت مخصوص تھی، یعنی بستہ دبائے، تختی لٹکائے آ گئے تو خیر یت، اور جو کہیں رستے میں ہوا بیر، جامن، امرود کا درخت اور شروع کر دی بقول شخصے "کلوخ اندازی" اور ہو گئی دیر، پھر کیا تھا، چھوٹے چار مسٹنڈے، اور ع:

پا بدستے دگرے دست بدست دگرے

لائے بھگوڑے کو ٹنگی کر کے!

ان ہی حالات و واقعات کو جھیلتے جھالتے تھوڑے ہی دن میں مکتب کی ہوا ہمارے اندر خوب سرایت کر گئی، اور قاعدے کے بعد "آنا پانا جانا" دل دے سن لے" والی کتاب ختم کر کے اُردو کی چوتھی پڑھتے، اور بڑی "سے" تک تختی لکھنے لگے تھے کہ کریا گلے پڑی، اور خلیفہ جی کی کمان میں بیس تک پہاڑے، اور پونے، سوئیے، ڈھئے بھی رٹنا قرار پائے ـــ!

مکتب میں خلیفہ کا وہی رتبہ ہوتا ہے جو اسکول میں کلاس مانیٹر کا فرق اتنا ہے کہ مانیٹر اپنا ہم سبق، اور جزوی جزوی اختیارات کا حامل ہوتا ہے، برخلاف اس کے خلیفہ مکتب کا سینئر شاگرد، چغلی کھانے میں طاق، مار کھلانے میں چاق، اور میانجی کا پروڈکٹیٹر ہوتا ہے، تیل کے لڈو یہ پھسلا لے، باجرے کی ٹکیاں آدھوں آدھ یہ بٹوا لے، مگر دقت پڑے پر جس کا کھائے، اُسی کو لے بیو نت بٹو لئے، خلیفہ کی خطرناک پوزیشن کا اس سے اندازہ کیجئے کہ مکتب کے میخزین کے لئے آلاتِ زد و کوب کی فراہمی اسی کے ذمہ ہوتی ہے، چھٹی کے دن باغ یا جنگل سے یا محلے کی ٹال سے چن چن کے لانا، اور میانجی کی بھینٹ چڑھانا۔ چنانچہ بڑے حضرت کے داؤں قمچیوں کی پوری پلٹن ہمیشہ فالن رہتی، قصور کی اہمیت کے لحاظ سے ان کا استعمال بھی الگ الگ تھا، شاید ہات میں دیدے جڑے تھے کہ بن دیکھے موزوں چھڑی ہی پر پڑتا، مثلاً "چمو" وہ پتلی پاتی چھڑی تھی جو صرف ہتیلی اور انگلیوں کے لئے مخصوص تھی، اور اس وقت بکار آمد ہوتی، جب تختی کی مشق کا "الف" نوکیں چھوڑ کر تین نقطے سے کم زیادہ ہو، یا "بے" کی کشش ۷، ۹ یا ۱۱ نقطے سے گھٹ بڑھ جائے، یا جیم کا دائرہ آفتابی یا بیضاوی ہونے کی بجائے لٹک کر شہد کا چھتا ہو جائے، نہیں تو، کسی کے چٹکی لی ہو، گدگدایا ہو، قلم توڑا ہو، یا دوات پھوڑی ہو، اسکی ضربیں تابڑ توڑ ہوتیں، اور ہتیلی کی چکنی سطح پر اس طرح پڑتیں جیسے تلشے پر چوب!

شفتالو کی وہ بلغمی مزاج چھڑی جو ہفتے میں ایک آدھ دفعہ ہی برتنے میں آتی، دھنّو تھی، یہ حملے سے پہلے میاں جی صاحب کے سر پہ گردش کرتی، اور فضا جب اس کے سناٹے سے بولنے لگتی، تب شکرے کی طرح کڑے تول کر شکار یا شاگرد کی پیٹھ پر گرتی، اور اپنی آمد کی یادگار ایک نیل بدھی چھوڑ کر اٹھ جاتی، اور ایسے دو ہی چار جھپٹوں میں پیٹھ پر ادودا گلہریا بن جاتا، جھوٹ بولنے، فحش بکنے، آموختہ بھولنے، یا حاجت کے بہانے مکتب سے ندارد ہونے کی پاداش میں دھنو کی مقدار خوراک ہات دو ہات ہی ہوتی، مگر یہی دھنو اس وقت بے پناہ ہو کر برستی، جب یہ نفس نفیس یا گوئندوں کے ذریعے بڑے میاں کو کسی موزوں طبع شاگرد کے بچکانہ افکار کا پتہ چلتا، جن کے

موضوع خود بدولت ہی ہوتے، جیسے "تختی پہ تختی، میانجی کی آئی کم بختی" یا "کریما بہ بخشائے بھونے چنے، کڑھائی میں ڈالے تو خوب ہی بنے، جو لڑکوں نے مانگے تو دو دو بٹے، میانجی نے مانگے تو ڈنڈے پڑے"۔

ایک چیچک رو، خمدار لکڑی اور تھی جو شاید کسی سابق خلیفہ نے پہاڑی علاقے سے لاکر نذر کی تھی، اس کی ہر ضرب میں چونکہ ضرر شدید پوشیدہ تھا، جس کا نتیجہ یقیناً کوتوالی اور کھُلا ہوا جیل، اس لئے کم نکلتی، اس خاصیت کو بہ مصلحت راز میں رکھا جاتا، اور مکتب اتنا ہی جانتا کہ خدانخواستہ "کبڑی" کا اٹھنا اور صور کا پھکنا ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ البتہ مولا بخش نام، ذات کے آبنوسی، قد کے لانبے تھکے بیل کی طرح تھان ہی پر بندھے رہتے، معتبر روایت ہے کہ میاں جی کی جوانی اور اِن بزرگوار کی عمر لگ بھگ تھی، اب یہ اتنے جہاندیدہ ہو چکے تھے کہ کسی بڈھے کرنیل کی طرح زبانی ڈرانے دھمکانے اور جوانی کے کارنامے سنانے بھر کے رہ گئے تھے۔

مکتب میں ڈسپلن قائم رکھنے کا یہ ضابطہ بالواسطہ تھا، اس کے سوا "سلف پنشمنٹ" یا خود بخود سزا کے دو طریقے اور بھی رائج تھے، یعنی "اُٹھا بیٹھی" اور "مرغا بننا"۔ اٹھا بیٹھی اگر اکہری ہوتی تو ذرا نرم سی چیز تھی۔ "دُہری" البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی، خصوصاً اس وقت کہ دوگانہ کی ایک فرد لمبی پوئی کی ہو، اور دوسری چھوٹی راس کی۔ "مرغا بننا" زیادہ تر اُن کُند ذہن بدشوقوں کے لئے تجویز ہوتا جو سب کچھ کرتے مگر سبق ہی نہ یاد کرتے، ان مُرغوں کی سیر اس وقت زیادہ پُر لطف ہوتی، جب حُسن اتفاق سے ایک چھوڑ لی کئی بنائے جاتے۔ اپنے مزے سے ٹانگوں میں سے ہات نکالے، کان پکڑے، پیٹھ اچکائے، سر جھکائے ایک قطار میں اکڑوں بیٹھے جھول رہے ہیں، گردن پر ٹھیکری رکھی ہے، ہلے اور گری، گری اور ہوئے ضابطے باہر، اور بڑھی سزا کی میعاد، یہاں تک کہ منہ لال چقندر ہو گیا۔ دل کا بخار آنسو بن کر کچھ آنکھ سے کچھ ناک سے ٹپکنے لگا، توبہ تلا ہوتی، تب جا کر آئندہ کے وعدے وعید پر بخشے گئے۔

اکتا گئے ہو گے؟ مکتب کی گزران کا یہ ایک شوشہ ہے، ابھی خوشنویسی، نقاشی، بیت بازی، صنم آمد، وغیرہ کے دلچسپ مشغلے، میاں جی کی طرز تعلیم، اور اپنے ہم مکتبوں سے روشناس کرانا باقی ہے، جی لہرایا، اور کسی کی پسند آیا، تو پھر کسی ملاقات میں، ورنہ آگے آیت والسلام۔

"آوارہ"

برات

مصروفِ گشت ہے کسی زردار کی برات
ڈوبی ہوئی ہے شام کے جلووں میں کائنات
باراتیوں کا سیل ہے یوں رہ گذار میں
جیسے چلت حساب دلِ سود خوار میں
نوشہ کے ہیں مکٹ پہ وہ موتی جڑے ہوئے
دکان دار دیکھ رہے ہیں کھڑے ہوئے
بازار میں چھتوں پہ تماشائی دور تک
یوں محوِ دید ہیں کہ جھپکتی نہیں پلک
باجوں پہ ہے اترتی ہوئی دھوپ جلوہ گر
پرچھائیاں سی کانپ رہی ہیں اِدھر اُدھر
نغمے گھلے ہوئے ہیں نشیلی ہواؤں میں
تانوں کے جال پھیل رہے ہیں فضاؤں میں
یہ زر کا کھیل دھوم دھڑکے کا کاروبار
نظروں میں ناچتے ہیں ستارے سے باربار
دُلہن کی پالکی ہے زری پوش و زرنگار
محنت سے ہیں عرق میں نہائے ہوئے کہار
اے ہمنشیں ہٹا کے ذرا سطح سے نظر
اِس منظرِ جمیل کی تہ پر بھی غور کر
رسم و رواج ڈھونگ رچاتے ہیں کس طرح
فطرت کے اقتضا کو چھپاتے ہیں کس طرح
شب خون رُونما ہے لباسِ بہار میں
محشر نہ کیوں بپا ہو دلِ داغدار میں
کانٹوں کے دوش پر ہے گلِ جانفزا کا رتھ
ظلمت کے بیل کھینچ رہے ہیں ضیا کا رتھ
کیسا حقیقتوں پہ ستم ڈھا رہے ہیں لوگ
دوشیزگی کی لاش لئے جا رہے ہیں لوگ

احسان دانش

آؤ کھوج لگائیں

کشور:۔ (اپنی بیوی سے، بڑے سنجیدہ لہجہ میں) آؤ کھوج لگائیں۔

لاجونتی:۔ کھوج لگاؤ گے ـــ تم کھوج لگاؤ گے ـــ تم جیسے لال بجھکڑوں کی بابت ہی تو وہ کہاوت مشہور ہے۔

کشور:۔ کون سی کہاوت؟

لاجونتی:۔ وہ جو ہاتھی کے پاؤں کا نشان دیکھکر ایک لال بجھکڑ نے کہا تھا۔ چکی کا پڑ باندھکر کوئی ہرنا ناچا ہوئے گا۔

کشور:۔ لاجونتی تمہیں شرم نہیں آتی میرا مذاق اڑاتے۔ اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ میرا اتنا نقصان ہو گیا ہے۔

لاجونتی:۔ آپ کا نقصان کیا ہوا ہے۔ وہ تو میرے ہی گھر میں ہونجا پھرا ہے۔ میرا ہی سب کچھ غارت ہوا ہے۔ آپ کا کیا گیا ہے۔ ایک فاؤنٹین پن اور وہ موا سگرٹ کیس۔

کشور:۔ لو بھئی تم نے یہ نیا شوشہ چھوڑ دیا ـــ تمہاری نظر میں تو میرے سگرٹ کیس اور پن کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ گویا بخشیش کے تھے۔ میرا سگرٹ کیس اصلی چاندی کا تھا۔ جنگ سے پہلے اس کی قیمت بیس روپے تھی۔ آجکل تو کم از کم تیس روپے کی ہوگی اور وہ پن کوئی ایسا ویسا تھوڑی تھا ـــ ساڑھے سترہ روپے میں خریدا تھا۔

لاجونتی:۔ بس تمہیں تو اپنی ہی چیزوں کی فکر ہے چاہے دوسرے کا سارا گھر بار لٹ جائے۔

کشور:۔ تمہارا گھر بار کیا میرا گھر بار نہیں؟

لاجونتی:۔ مجھے اس وقت نہ ستاؤ منے کے پتا ـــ مجھے اس وقت نہ ستاؤ ـــ میں اس وقت بھری بیٹھی ہوں ـــ (آہ بھر کر) پرماتما کرے نہ رہے اس دنیا کے تختے پر جس نے مجھ غریب پر اتنا ظلم کیا۔ کڑکتی بجلی گرے ـــ پرماتما کرے کسی موٹر کے نیچے آجائے ـــ کوڑھی ہو کے مرے ـــ!

کشور:۔ لو تم نے تو رونا شروع کر دیا ـــ نہ رو لاجونتی، نہ رو۔ تم روتی ہو تو میرا بھی جی بیٹھنے لگتا ہے۔ لو بس اب چپ ہو جاؤ۔ ایسے صدمے آدمی کے لئے کوئی نئے نہیں ہیں۔ سچ پوچھو تو ہمیں اب اس کی بابت غور ہی نہیں کرنا چاہیئے اور صبر شکر کر کے خاموش ہو جانا چاہیئے۔

لاجونتی:۔ خاموش ہو جانا چاہیئے۔ کیوں۔ کوئی ہم پر ستم ڈھائے اور ہم اُف بھی نہ کریں۔ دن دہاڑے ہمیں لوٹ لیا جائے اور ہم اسکی شکایت نہ کریں۔ کیوں۔ تو پھر بتاؤ جی ہلکا کیسے ہو۔

کشور:۔ جی ہلکا یوں ہو سکتا ہے کہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کریں۔ ہنسی مذاق میں اس دکھ کو اڑا دیں۔ لاجونتی۔ تم خود سمجھدار ہو۔ آخر کب تک ہم یوں آہیں بھرتے رہیں گے۔

لاجونتی:۔ سب کچھ سمجھتی ہوں مگر کیا کروں۔ نگوڑے اس دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ چاہتی ہوں دھیان ادھر سے ہٹ کر کسی دوسری طرف لگ جائے مگر بیٹھے بیٹھے کلائی پر نظر پڑتی ہے تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے ـــ ٹوٹ جاتی۔ اس کا ایک ایک پرزہ میری آنکھوں کے سامنے کوئی علیحدہ کر دیتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ معلوم نہیں کس کے پاس ہے کس کے پاس نہیں ہے۔ اپنے پاس رکھی ہے یا بیچ باچ دی ہے۔

کشور:۔ تم اب اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں اچھی گھڑی لادونگا۔ سونے کی۔ جو رات کو بھی وقت بتائے۔ لو اب ہٹاؤ اِس قصے کو۔ آؤ کوئی اور بات کریں۔

لاجونتی:۔ لیکن چوری کس صفائی سے کی گئی ہے۔ مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے ـــ میری نیند کو اس روز کیا ہو گیا۔ آپ کی تو خیر بہت بھاری نیند ہے کہ پاس ڈھول پیٹے جائیں اور آپ کو خبر نہ ہو پر مجھے کیا ہو گیا تھا۔ چور آیا، گھڑیاں، پیالے، سگرٹ کیس، قلم ـــ اور کیا ـــ؟

کشور:۔ اب چھوڑ بھی دو نا اِس داستان کو۔

لاجونتی:۔ ہاں۔ چور بڑے مزے سے آیا۔ گھڑیاں، پیالے، سگریٹ کیس، قلم اور آپکے اُسترے کے نئے بلیڈ لیکر چمپت ہوا اور ہم دونوں آرام سے سوتے رہے۔ اگر وہ میز کرسیاں بھی اٹھا کر لے جاتا تو ہمیں خبر نہ ہوتی۔

کشور:۔ ذرا آہٹ بھی تو نہیں ہوئی۔ لیکن چھوڑو۔ میں کہتا ہوں اگر ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تو میں فوراً جاگ پڑتا۔ لیکن اب ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا۔ ہاں تم یہ بتاؤ میرا ٹپ اوور کب تیار ہوگا۔ اون تو میں نے ایسی اتنی بڑھیا لا کر دی ہے تمہیں، بس اب ایسا بُن اوور بنے کہ طبیعت خوش ہو جائے ـــ نرائن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز)

نرائن :۔ نرائن کی آنکھیں تو اس وقت کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں جب اُس نے یہ سنا تھا کہ تمہارے گھر پرسوں رات چور آیا اور گھڑیاں، قلم دوات اور نہ معلوم کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے گیا۔ نمسکار بھابی جان — مجھے ابھی ابھی گھر سے معلوم ہوا کہ آپ کی چوری ہو گئی ہے — ہاں بھئی کشور یہ تو بتاؤ آخر ہوا کیا۔ میں نے سنا ہے تم مزے سے سوتے رہے اور چور اپنا کام کر گیا — کیا یہ سچ ہے؟

کشور :۔ جو کچھ بھی اب کہا جائے سچ ہے۔

نرائن :۔ یہ بھی کوئی جواب ہے۔ مجھے سارا واقعہ سناؤ۔ چور کب آیا، کب گیا کون کون سی چیزیں اُٹھا کر لے گیا۔ کس راستے سے اندر داخل ہوا۔ جب وہ آیا اس وقت تم سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ تمہیں کس پر شک ہے۔ نوکر سے پوچھ گچھ کی۔ تمہارے ہمسائے کیا کہتے ہیں۔ پولس میں رپٹ لکھوائی اگر لکھوائی تو اس کا کیا حشر ہوا۔ یہ سب باتیں مجھے بتاؤ۔ آخر چوری ہوئی ہے۔

کشور :۔ میں اسکے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

نرائن :۔ بھئی واہ۔ تو یہ چوری کیسے پکڑی جائے گی۔ مجھے بتاؤ کہاں کہاں سے چیزیں اُٹھائی گئی ہیں۔ میز پر پاؤں اور انگلیوں کے نشان ملے۔ کیا فرش پر پاؤں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر کھڑکی کے راستے چور اندر آیا ہے تو جنگلے پر ضرور نشانات ہوں گے — اور ہاں میں نے سنا ہے کہ وہ تمہارے استرے کے نئے بلیڈ بھی لیتا گیا۔ اس کے متعلق تم نے غور کیا۔ بلیڈ کس چھاپ کے تھے — اور گھڑیوں میں کیا کوک بھری ہوئی تھی۔

کشور :۔ کوک شام کو بھری تھی یا رات کو۔ قلم میں روشنائی نیلی تھی یا سبز۔ بلیڈ پر جو کاغذ چڑھا ہوتا ہے کس رنگ کا تھا۔ اب جانے دو نانشرلک ہومز بننے کی کوشش نہ کرو۔ جیسے بلیڈوں کا چھاپ معلوم کر کے آپ چوری کا کھوج لگالیں گے۔

نرائن :۔ اور یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے سے تم ضرور چوری کا پتہ لگالو گے — نہ بتاؤ۔ میری بلا سے۔ آج کل میں کوئی اور چور آئے گا اور گھر میں جھاڑو پھیر کر چلا جائے گا پھر بھی کچھ نہ کرنا۔ تمہیں میری قسم ہے کھوج لگانے کی ذرا کوشش نہ کرنا۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے ہمدردی کے طور پر تم سے یہ باتیں کیں۔ اب کچھ تم سے پوچھوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔

کشور :۔ تم ناحق بگڑتے ہو، بات دراصل یہ ہے کہ میں اس چوری کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا ؎ ۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت ؏

لاجونتی :۔ یعنی کوئی ہمیں اُٹھا کر نہیں لے گیا۔ سو آپ جب یونہی گھوڑے بیچ کر سویا کریں گے تو ایک روز یہ بھی ہو جائے گا۔ نرائن صاحب ذرا ان کی نیند ملاحظہ ہو کہ چور کمرے میں داخل ہوا۔ میزوں کی سب درازوں کی تلاشی اُس نے لی — اور تو اور اس تپائی پر سے اُس نے گھڑی اُٹھائی جو اِن کے سر کے ساتھ جُڑی رہتی ہے لیکن انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ بھئی کیا نیند پائی ہے۔

کشور :۔ مجھے کوسے چلی جاتی ہو۔ تپائی کی طرف تو تم ہی سوتی ہو۔ تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا تھا۔

لاجونتی :۔ کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ میری چارپائی تو دوسرے کمرے میں ہے۔

کشور :۔ (گھبرا کر) ارے ہاں۔ تمہاری چارپائی تو دوسرے کمرے میں ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا — میں یہ کہہ رہا تھا کہ تپائی جو میرے سر کے ساتھ جُڑی رہتی ہے کیوں نہ ہلی۔ تمہارا کیا خیال ہے نرائن۔ مجھے تو یہ چور بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔

نرائن :۔ تم میاں بیوی سے تو معمولی سے معمولی چور بھی ہوشیار ہوگا — ہاں تو آپ دونوں ایک پلنگ پر سو رہے تھے کہ —

لاجونتی :۔ نرائن صاحب۔

نرائن :۔ جی۔

لاجونتی :۔ میں بھول گئی کہ میں کیا کہنے والی تھی — ہاں نرائن صاحب یہ چور چوری کیوں کرتے ہیں؟

نرائن :۔ (ہنستا ہے) چور چوری کیوں کرتے ہیں (ہنسنا بند کر کے) بھئی نہیں، بات معقول ہے۔ چور چوری کیوں کرتے ہیں سوچنا چاہیئے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ چور کس لئے چوری کرتے ہیں۔

کشور :۔ اسلئے چوری کرتے ہیں کہ میاں بیوی میں لڑائی ہو۔

لاجونتی :۔ بس آپ کو تو ہر وقت لڑائی جھگڑے ہی کی سوجھتی ہے۔

نرائن :۔ چھوڑئیے اس قصے کو — ہاں بھئی کشور تم یہ بتاؤ کہ چور زیادہ تر مرد ہوتے ہیں یا عورتیں۔

لاجونتی :۔ عورت بچاری کیا چوری کرے گی۔ ہزار میں ایک ہوگی۔ مگر چور تو ہوتے ہی مرد ہیں۔ نتو چوٹا نامی گرامی لکھنؤ کا چور گذرا ہے جو چھت پر جست لگا کر چھپکلی سا چمٹ جاتا تھا۔

کشور :۔ کنتی خانہ بدوشوں کی سردار عورت پنجاب میں ایسی گزری ہے جس نے چوروں کے بھی کان کاٹے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکوؤں کو دریا لے جا کر پیاسا لاتی تھی۔

لاجونتی :۔ میرے گلے کا لاکٹ تمہارے اس رامو نے ہی چرایا تھا۔

کشور:۔ اور میرا ٹائم پیس تمہاری وہ درگاہی میانی میں چھپا کر بھاگ رہی تھی۔

نرائن:۔ تو ثابت ہوا کہ مرد اور عورتیں دونوں چور ہوتے ہیں۔

کشور:۔ ثابت کچھ نہیں ہوا۔۔۔ اب ہمارا تماشہ دیکھنے کی کوشش نہ کرو۔ لاجونتی اب بند کرو اس گفتگو کو۔۔۔ بتاؤ وقت کیا ہوا ہے۔ مجھے باہر جانا ہے۔

لاجونتی:۔ وقت۔۔۔ لیکن گھڑی کہاں ہے۔ (آہ بھر کر) پرماتما کرے وہ کلائی ہی ٹوٹ جائے جس پر میری گھڑی باندھی جائے۔ موئے نے بیچ بھی دی ہوگی اونے پونے داموں میں۔ پرماتما کرے کیڑے چلیں اس کے جسم میں۔۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دے۔

(دروازے پر دستک)

کشور:۔ کون ہے؟

(دروازے پر دستک)

کشور:۔ (کرسی پر سے اُٹھنے کی آواز)۔ اس وقت کون آیا ہے۔ کون ہے۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

کشور:۔ فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے۔

ملاقاتی:۔ آپ سے۔

کشور:۔ آپ کا اسم گرامی۔

ملاقاتی:۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ جو گفتگو ابھی ابھی آپ لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں آپ کا ممنون ہونگا۔

کشور:۔ اندر تشریف لے آئیے۔ (دو تین سکنڈ کے لئے خاموشی۔ پھر کرسیوں کی آواز)۔۔۔ بیٹھیے۔۔۔ ہاں۔ یہ میری وائف ہے اور یہ میرے دوست مسٹر نرائن۔

ملاقاتی:۔ نمسکار۔۔۔ میں آپ دونوں کو جانتا ہوں۔

کشور:۔ کیا کہا آپ نے۔

نرائن:۔ مجھے۔۔۔ مجھے آپ کیسے جانتے ہیں؟

ملاقاتی:۔ میں زیادہ دیر تک آپ لوگوں کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں آپ سب کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کے تو میں کئی افسانے پڑھ چکا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں صرف آپ ہی ہندوستان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ کیونکہ آپ کے تخیل میں ندرت ہے۔ آپ ترقی پسند ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمارے ادب نے ابھی تک افسانے پیدا ہی نہیں کیا مگر آپ نے۔۔۔

نرائن:۔ قدر افزائی کا شکریہ۔۔۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ہندوستانی ادب میں افسانہ ناپید ہے۔ جو لکھنے والے ہیں۔۔۔

کشور:۔ مگر ابھی تک ہم سب اندھیرے میں ہیں۔

ملاقاتی:۔ معاف کیجئے گا میں اور نرائن صاحب افسانے کی رَو میں بہہ گئے۔ ہاں تو نرائن صاحب آپ سے ہندوستان کے افسانوی ادب پر پھر کبھی باتیں ہونگی۔ مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیئے تھا۔ خاکسار وہ چور ہے جس نے یہاں کی چیزیں چُرائی ہیں۔

لاجونتی:۔ (چونک کر) چور۔۔۔!

کشور:۔ کیا کہا آپ نے۔

نرائن:۔ آپ چور ہیں؟۔۔۔ اور میرے افسانے۔۔۔

ملاقاتی:۔ میں آپ کے افسانوں کے متعلق پھر بات کرونگا۔ جی ہاں خاکسار وہی چور ہے جو پرسوں رات یہاں حاضر ہوا تھا۔

لاجونتی:۔ میری گھڑی۔ (ایکا ایکی چونک کر۔ چیخ کے ساتھ۔)

ملاقاتی:۔ جی ہاں یہ آپ ہی کی گھڑی ہے جو میں نے اپنی کلائی پر باندھ رکھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ ٹھیک وقت دے گی مگر اب معلوم ہوا کہ یہ پندرہ منٹ تیز چلتی ہے۔

لاجونتی:۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔

ملاقاتی:۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کے انتخاب کو اچھا نہیں سمجھتا۔ آپ کا ذوق یقیناً بہت اچھا ہے۔ آپ کے سنگار کی دوسری چیزیں اس کی گواہ ہیں۔ مگر آپ نے مجھے گالیاں دیکر احترام کے اس جذبے کو ضعیف کر دیا ہے جو کہ میرے دل میں آپ کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ گہری نیند سونے والی خاتونوں اور آرٹسٹک انتخاب رکھنے والی عورتوں کا رتبہ میری نگاہوں میں ہمیشہ بلند رہا ہے۔۔۔ لیکن آج جب میں نے آپ کی زبان سے اپنے متعلق غیر مناسب الفاظ سُنے تو یقین مانیئے مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ جیسی بلند سیرت خاتون نے میری تذلیل کی۔

نرائن:۔ تذلیل۔

کشور:۔ چور کی تذلیل۔۔۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ملاقاتی:۔ یہی کہ میری بیحد تذلیل ہوئی ہے۔ اس گھر میں جس کی ہر ایک شئے میں بڑی آسانی سے اُٹھا کرلے جا سکتا تھا آپ سب نے مل کر میرے وقار پر حملہ کیا ہے۔ میرے تعزز کی مٹی پلید کی ہے۔ میری غیر موجودگی میں آپ نے میرے پیشے کو بُرا بھلا کہا ہے۔ ایک شریف آدمی کی اس سے

بڑھکر اور کیا ہتک ہو سکتی ہے۔

کشور:۔ وقار۔

لاجونتی:۔ تعزز۔

کشور:۔ شریف آدمی۔

نرائن:۔ سگرٹ شوق فرمائیے۔

(دیا سلائی جلانے کی آواز)

ملاقاتی:۔ شکریہ۔ (سگرٹ سلگاتا ہے) میں یہاں صرف اپنی پوزیشن صاف کرنے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ قانون کی نظر میں ہم لوگ سوسائٹی کے دشمن ہیں لیکن اگر اس دشمن پر تہمتوں کے انبار لگا دئے جائیں اور اُسے ذلیل و رسوا کیا جائے تو بتائیے اس کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی۔ ہمیں ایک عام پیشہ ور کی حیثیت سے کیوں نہیں دیکھا جاتا۔ میں اس سوال کے منطقی اور معاشرتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا پیشہ اس شئے لطیف کے بالکل قریب ہے جسے ہم آرٹ کہتے ہیں۔ ہمارے پیشے میں وہ تمام عنصر موجود ہیں جو آرٹ کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً فراخ ہمتی، امنگ، خیال آرائی، تخلیق تحریک، روحانی فیضان اور ایجاد کا مادہ۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ چور بننے کے لئے فطری صلاحیت کا ہونا اشد ضروری ہے تو شاید آپ میرا مذاق اُڑانا شروع کر دیں مگر یہ حقیقت ہے۔ بعض لوگ قدرتی طور پر غیر معمولی حافظے کے مالک، حاضر دماغ اور تیز نگاہ ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں بلا کی پھرتی ہوتی ہے۔ اُن کی قوت لامسہ بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ لوگ اگر آپ یقین فرمائیں صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ شاندار قسم کے جیب کتروں کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے بڑی چابکدستی، حرکت کے زبردست تیقن، مشاہدے اور توجہ کی انتہائی شدت اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح شاعر پیدا ہوتا ہے اسی طرح چور پیدا ہوتا ہے۔ اور اصلی چور کو آپ کسی حیلے سے بھی لالچ دے کر اُسے اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے۔ اچھی ملازمت کی پیشکش، قیمتی سے قیمتی تحفے حتیٰ کہ عورت کی محبت بھی اُسے ورغلا نہیں سکتی اس لئے کہ اس کے پیشے میں خطرے کی مستقل خوبصورتی، کھٹکے کی مسرت افزا گہرائی۔ دل دہلنے کا لُطف اور نبضِ حیات کی تیز دھڑکن ہے۔ ان سب کے اُوپر ایک کیف ــــ ایک ــــ ایک وجد ــــ ایک ناقابل بیان ترنگ ہے۔

کشور:۔ (ہنستا ہے) خوب ہنستا ہے) بھئی لُطف آگیا ــــ ان سب کے اُوپر ایک کیف۔ ایک وجد، ایک ناقابل بیان ترنگ ہے ــــ اور اُسکو اُوپر میرے معزز ملاقاتی کا سر ــــ (ہنستا ہے)

ملاقاتی:۔ نرائن صاحب۔ آپ اپنے دوست سے کہیں کہ وہ زیادہ نہ ہنسیں۔ ہنسی وہ ہے جو خود بخود آئے۔ زبردستی ہنسنا صحت بخش نہیں ہوتا۔

نرائن:۔ اسے ادب آداب سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ جو کچھ کہہ رہے تھے اُسے جاری رکھئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

ملاقاتی:۔ میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ آپ لوگ قانونوں۔ قسم قسم کے تالوں، بندوقوں، تلواروں، پولس کے سپاہیوں اور ٹیلیفونوں سے مسلح ہیں۔ لیکن ہمارے پاس صرف پھرتی، ہوشیاری اور بیباکی ہے جس کے ذریعے سے ہم آپ کا مقابلہ کرتے ہیں ــــ اور ہاں کیا آپکو معلوم ہے کہ ہمارے دیہاتوں میں صاحب ذکاوت لوگ جو کہ آرٹسٹک طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اکثر گائے چور بن جاتے ہیں یا گھوڑے چُرانا شروع کر دیتے ہیں۔

کشور:۔ کیوں۔

ملاقاتی:۔ اس کے سوا وہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ یہ زندگی اُونچی فضاؤں میں پرواز کرنے والی روحوں کے لئے بہت کم حقیقت۔ تنگ اور نہایت درجہ خشک اور بے کیف ہے۔

لاجونتی:۔ وہ ذہانت اور ذکاوت کس کام آئیگی جو بُری جگہ استعمال ہو۔

ملاقاتی:۔ خاتون محترم۔ ذہانت اور ذکاوت اگر مسجد مندر سے الگ ہٹ جائے تو بھی اُس کی خوبصورتی میں فرق نہیں آتا۔ ترقی ایک قانون ہے اور چوری بھی مخلوق ہوتی ہے ــــ یہ لیجئے اپنی گھڑی ــــ اس گھڑی کا اسٹریپ میں نے بدل دیا ہے۔ چونکہ پہلا بہت ہی ان آرٹسٹک تھا۔ میں ان لوگوں کی گھڑیاں اپنے پاس نہیں رکھا کرتا جو مجھے گالیاں دیں اور میرے پیشے کو بالکل غلط رنگ میں دیکھیں ــــ اچھا اب میں اجازت چاہتا ہوں۔

نرائن:۔ سگرٹ شوق فرمائیے۔

ملاقاتی:۔ شکریہ ــــ یہ آپ کا سگرٹ کیس بہت اچھا ہے۔

(سگرٹ سلگانے کی آواز)

نرائن:۔ میں ایک بات آپ سے پوچھ سکتا ہوں؟

ملاقاتی:۔ بڑے شوق سے۔

نرائن:۔ آپ کشور کے بلیڈ کیوں چُرا کر لے گئے تھے؟

ملاقاتی:۔ (ہنستا ہے)۔ بلیڈ ــــ قصہ یہ ہے کہ جس روز میں یہاں آیا اُسی روز میں نے نئے قسم کے بلیڈوں سے ڈاڑھی مونڈی تھی۔ بلیڈ

داہیات بلیڈ ہیں۔ گھاس کھودنے والا اوزار ان سے بہتر ہوگا۔ سنگھار میز پر جب میں نے اُن کو دیکھا تو اُٹھا کر جیب میں رکھ لئے۔ تاکہ صبح اُٹھکر جب یہ ڈاڑھی مونڈنے لگیں تو آپریشن سے محفوظ رہیں۔ میز کی داہنی دراز جوکہ مقفل تھی، میں نے کھولی تھی، مگر اس میں ان کے پرائیویٹ خط تھے۔ ایک خط میں نے پڑھا تھا۔ داؔغ ان کو بہت پسند ہے۔ جگہ جگہ آپ نے اُس کے شعر ٹھونسے تھے۔ یہ خط آپ نے پوسٹ نہ کیا ہو تو ایک شعر دُرست کر لیجئے۔ آپ نے لکھا ہے:۔

میری فریاد دوسرا نہ سُنے
بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے

یہ غلط ہے۔ آپ نے امیرؔ اور داؔغ دونوں کے شعروں کو خلط ملط کر دیا۔ امیرؔ کا شعر یوں ہے:۔

میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو
بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے

اور داؔغ فرماتے ہیں:۔

میری فریاد دوسرا نہ سُنے
تم سُنواؤ بُتو خدا نہ سُنے

امیرؔ کے مضمون میں اتنی ترقی پیدا کرنا داؔغ ہی کا حصّہ ہے ——
اچھا اب میں رُخصت چاہتا ہوں۔ نرائن صاحب میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلّف ارشاد فرما دیجئے گا —— اور ہاں کشور صاحب آپ کی دوسری چیزیں اس پارسل میں موجود ہیں۔ آداب عرض۔

(تھوڑی دیر خاموشی پھر دروازہ بند کرنیکی آواز)

لاجونتی:۔ آپ نے یہ خط کس کو لکھا ہے۔
کشور:۔ نرائن —— پکڑو جانے نہ پائے۔
نرائن:۔ کون؟
کشور:۔ یہی چور اور کون —— وہ کس آرام سے آیا اور چلا بھی گیا۔ تم نے اُسے پکڑا ابھی نہیں —— چلو —— چلو اُسے پکڑ کر پولس کے حوالے کر دیں —!
لاجونتی:۔ آپ میری بات کا جواب دیجئے۔ یہ آجکل شعروں بھرے خط کسے لکھے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی نئی بلا پالی ہے۔
کشور:۔ کون سے خط —— چلو نرائن —— چلو۔ ابھی وہ سیڑھیوں ہی پر ہوگا۔
لاجونتی:۔ بات نہ ٹالئے —— مجھے اس بات کا جواب دیجئے کہ آجکل خط کس کو لکھے جا رہے ہیں۔ رات گیارہ بجے تک آپ اپنے کمرے میں کیا کرتے رہے تھے؟۔
کشور:۔ جھک مار رہا تھا۔ ادھر چور ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور اس نے اپنی تفتیش شروع کر دی ہے۔ چلو نرائن۔
نرائن:۔ اماں چھوڑو۔ آدمی دل کا اچھا ہے۔ جانے دو۔
لاجونتی:۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟
کشور:۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔
لاجونتی:۔ میز کی دراز میں کس کے خط ہیں۔ اور وہ شعروں والا خط آپ نے کس کو لکھا ہے۔
کشور:۔ کون سے خط۔ کیسے شعر۔ وہ تمہیں بنا گیا ہے۔ یہ لو چابی اور جا کے دیکھ لو۔ اُس نے یہ شوشہ ہی اس لئے چھوڑا تھا کہ ہم لوگ اس بک بک میں پڑ جائیں اور وہ آرام سے چلا جائے۔ اور تم ہوا اوّل درجے کے چغد۔ اُس نے تمہارے افسانوں کی تعریف کر دی اور چلو تم خوش ہو گئے۔ اب اتنی دیر کے بعد اُسے کس طرح پکڑا جا سکتا ہے۔ پنجرے میں آکر کس صفائی سے باہر نکل گیا۔
نرائن:۔ چلو اب چھوڑو اس قصّے کو —— لو سگرٹ پیو —— ارے۔ میرا سگرٹ کیس کدھر گیا —— میرا سگرٹ کیس —— میرا سونے کا سگرٹ کیس ——!
کشور:۔ (ہنستا ہے)۔ اُس نے اس کی تعریف جو کی تھی۔ (ہنستا ہے) پریشان کیوں ہوتے ہو، وہ تو تمہارے افسانوں کا مدّاح ہے۔ تمہیں ہندوستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہے —— ارے —— کدھر چلے ——؟
نرائن:۔ مذاق نہ کرو کشور۔ میرا سگرٹ کیس بہت قیمتی تھا —— میں دیکھتا ہوں، شاید وہ بازار میں مل جائے۔

(کشور ہنستا ہے۔)

سعادت حسن منٹو

جہنم
دس طبقوں کی دہشتناک سیر۔
گناہگاروں کی لرزہ خیز سزائیں
نارِ جہنم میں موت کی لپٹی ہوئی تمثیل! دانتے کی آتش بیانی اور مولانا عنایت اللہ کی معنیٰ آفرینی عجیب و غریب چیز ہے۔ قیمت ۱۲ آنے محصولڈاک مع رجسٹری ۴
ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی؛

ہونے والی بھکارن سے

یہ تری حیراں نگاہی یہ تری مایوس چال
کر نہ دیں نظمِ جہاں کو یہ ادائیں پائمال
دم بخود ہے کس لئے تیرا جمالِ بے مثال
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

مُفلسی نے قہر برسایا ہے تیری جان پر
اب سرِ بازار پھیلاتی ہے کیوں دستِ سوال
لیکن اب تک آسکا دھبّہ نہ تیری آن پر
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

جانتا ہوں تیرے سینے پر ہے فاقوں کی خراش
ایک جیتی جاگتی عفّت ہے تیرا بال بال
ہو نہ جائے آئنہ لیکن حیا کا پاش پاش
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

اطلس و کمخواب کی لذّت سے تو بیگانہ ہے
کیوں تجھے رہتا ہے اپنی کمتری کا احتمال
تیرا احساسِ خودی اک گوہرِ یک دانہ ہے
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

میرے زخمی ہونٹ، اُلجھے بال، سوکھے ہات دیکھ
بھیک کی جانب نہیں جاتا مگر میرا خیال
آئنے میں میری صورت کے مرے حالات دیکھ
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

پیپڑیاں ہونٹوں پہ اور زلفوں پہ تیری گرد ہے
عزم بھر کر دل میں یہ گرتی ہوئی حالت سنبھال
دُھندلی دُھندلی تیری آنکھیں رنگ تیرا زرد ہے
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

رات کافی ڈھل گئی ہے سارا عالم سو گیا
کیوں اچانک جم گئی دل پر ترے گردِ ملال
اے صبوحی دم بخود کیوں ہے؟ تجھے کیا ہو گیا؟
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

کیا تجھے یہ خوف ہے اب بھوکوں مر جائیگی تو
دل میں اپنے ایسے بے بنیاد خطروں کو نہ پال
پیٹ بھرنے کیلئے کچھ بھی نہیں پائے گی تو
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

تیری خاطر بیٹھ پر پتھر اُٹھا سکتا ہوں میں
جھڑیوں کے گو مرے رُخ پر بچھے جاتے ہیں جال
گولیاں تیرے لئے سینے پہ کھا سکتا ہوں میں
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

جھڑکیاں سرمایہ داروں کی سہے گا میرا دل
تھک کے سستا نا مرا راہوں پہ ہے یکسر محال
حشر تک ہوگی نہ لیکن میری قوت مضمحل
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

کھا چکی ہے گو بہت دھوکے مری رُوحِ شباب
وہ لئے پھرتے ہیں طیارے وطن کی تو نہال
سُن رہا ہوں دیر سے لیکن نویدِ انقلاب
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

قہر بن کر دہر کی وسعت پہ چھا جائیں گے یہ
دفعتاً سوئے ہوئے شیروں کو آئے گا جلال
مفلسی کے دیو کے جبڑے چبا جائیں گے یہ
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

میری شہزادی! تری محزوں نگاہوں کی قسم
کر نہ دے میرے ارادوں کو تری حالت نڈھال
بھوک کی شدت سے یہ تیری کراہوں کی قسم
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

یہ کنول کے پھول سے ہاتھوں پہ مٹی کی تہیں
یہ ترا میلا انگرکھا، یہ تری بوسیدہ شال
ہائے کب تک ضبط سے میری اُمیدیں کام لیں
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

سر پھرا کوئی تجھے جھنجلا کے ٹھکرا دے اگر
بھیک مانگے گا تری خاطر ندیمِ خوش خیال
آنچ آ جائے گی تیرے حُسن میرے عشق پر
ہائے تُو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

احمد ندیم قاسمی

سازِ آزادی

فلک کے نیلگوں شیشے کی نیلی جھلملاہٹ میں
فلک سیر ابر کے ٹکڑوں کے شور اندوز جھرمٹ میں

اُڑی جاتی ہے اک زہرہ جبیں قوسِ قزح بنکر
شرابِ ارغواں کا ایک رنگیں سا قدح بن کر

رواں ہیں نغمے اس کے نرم اور گلرنگ ہونٹوں پر
وہ نغمے دوڑتی ہی جس سے سُرخی اُسکے گالوں پر

نگاہوں میں غلامی کے نشیمن کی تباہی ہے
تجلّی ریز چہرے پر وقارِ کج کلاہی ہے

شباب اس کا نشاطِ جاوداں کی ایک دعوت ہے
محبّت کا سکوں ہے اور نویدِ صبحِ راحت ہے

سُنہرے گیسوؤں کے جال کی زرتار زنجیریں
زبردستوں کی گردن کیلئے ہیں تیز شمشیریں

یہ اُس کے نرم و نازک پاؤں ہیں ننھے کبوتر سے
غلامی ہو رہی ہے ریزہ ریزہ جن کی ٹھوکر سے

نوا پیرا ہے دستِ مرمریں میں سازِ آزادی
وہ جس سے پھوٹتا ہے چشمۂ آوازِ آزادی

غلامی کی اجل ہے ساز کے ہر تار سے پیدا
ہے گلبانگِ مسرّت تار کی جھنکار سے پیدا

جہاں یہ ساز نازک اُنگلیوں سے چھیڑ دیتی ہے
وہیں اک نوجوانی کی فضا انگڑائی لیتی ہے

وہاں گمراہیاں رہگیر کی قائد نہیں ہوتیں
زبان و دست پر پابندیاں عائد نہیں ہوتیں

وہاں نازک رگِ احساس کو کچلا نہیں جاتا
وہاں انسان کو زنجیر سے جکڑا نہیں جاتا

وہاں مجبوریاں، معذوریاں ڈھونڈے نہیں ملتیں
فریب و مکر کی غم کوشیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں

وہاں خواہش دبائی جا نہیں سکتی تشدّد سے
وہاں پڑتا نہیں ہے واسطہ دل کو تردّد سے

وہاں ذوقِ طرب کی داد دے سکتا ہے ہر کوئی
فضا میں سانس آزادی سے لے سکتا ہے ہر کوئی

وہاں رہتے ہیں سب آپس میں مل جل کر محبت سے
وہاں دیکھا نہیں جاتا کسی کو چشمِ نفرت سے

وہاں لب پر جہاں گیری کے رنگیں قصّے ہوتے ہیں
حکومت میں وہاں سب کے مساوی حصّے ہوتے ہیں

سیاست کا وہاں کچھ اور ہی مفہوم ہوتا ہے
وہاں پر بربریت کا نشاں معدوم ہوتا ہے

برسنے کو ہیں پھر خاکِ وطن پر دل نشیں نغمے
غزلخواں سازِ آزادی کے کوثر آفریں نغمے

مخمور جالندھری

دِلّی کی بیگمات

سُبحان اللہ! کیا مزے کی بات ہے کہ مردوں سے فرمائش ہوتی ہے کہ وہ بیگماتی زبان میں لکھیں، تقریر کریں اور مرد دیئے اپنے چاروں طرف بیویوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہڑ دنگیاں شہدے کے لٹھ ہوگئیں۔ وضع دیکھو تو وہ آدھ مردی، لباس دیکھو تو وہ مردانہ۔ کسی کو تحریر تقریر کا شوق ہوا تو جانے مردوا باتیں کر رہا ہے، خیر ہزاروں برس سے مرد ہی عورت کے اُستاد ہیں۔ داؤں پیچ سکھا کر خوب چت ہوتے ہیں۔ میں بھولا بھی چلوان بیویوں کو اُن کی بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دوں۔ میں نے اٹھارویں صدی کی بیگمیں دیکھی ہیں۔ اور اکثر بڑھیائیں ایسی دیکھیں جو محمد شاہی عہد دیکھنے والیوں کو دیکھ چکی تھیں۔ اس لئے میری تقریر شاہ عالمی زمانے سے شروع ہوگی۔ میرے چھٹپنے میں جو صورتیں دلی والوں کو پسند تھیں اور جو اُن کا مذاقِ حُسن تھا وہ یہ تھا کہ گورا سبزہ رنگ ہو۔ گورا رنگ موتی کی آب کا پسند کیا جاتا تھا۔ فرنگی لون سفید نہ سمجھا جاتا اور نہ اس کو گورا کہا جاتا۔ بھورا یا لال کہلاتا۔ اور اس رنگ کے مالک لال دیو یا لال بونیا کہلاتے۔ بال سیاہ اور گھندار پسند کئے جاتے۔ بھویں پتلی اور کھنچی ہوئی جُٹی ہوئیں تو کیا کہنا۔ قد مدرا، ڈیل گدرا مائل بلاغری۔ پیشانی محرابدار یا بنی ہوئی۔ ناک پتلی۔ نتھنے تنگ اور نازک۔ دہن پستہ۔ ہونٹ پتلے اور بستہ۔ بتیسی چھوٹی اور چمکدار۔ شانے گول۔ کمر پتلی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ پتلی پتلی اُنگلیاں لمبوتری۔ پوریں قدرے لمبی اور ناخن آبدار، اگر بن مہندی کے ہوں تو گلابی۔ اور گوشت انگشت کے برابر، نہ نکلے ہوئے نہ ہٹے ہوئے۔ یہ شاہ عالمی آئینِ حُسن تھا جو شہر آبادی میں اکبر شاہ بہادر شاہ تک رہا اور شہر بربادی میں صورتوں کے دلدادہ دلی والے اسی معیار پر کستے اور پرکھتے رہے۔ یہی مذاقِ حُسن اُنیسویں صدی کے آخر تک رہا۔

دلی میں بیگموں کے تین بڑے طبقے تھے۔ اوّل شہزادیاں، ان میں دو درجے تھے۔ ایک بادشاہِ وقت کی بیگمات اور بیٹیاں بھتیجیاں، دوسرے سلاطین زادیاں۔ کہ جن کے اسلاف صاحبِ تخت و تاج رہے تھے۔ یہ بادشاہ کے بھائی بندھی کہلاتے تھے۔ ان میں دو درجے تھے۔ ایک تو وہ جن کا سلسلہ حضرت عالمگیر رح تک جا پہونچتا اور یہ نو محلے میں رہتے ان کی بیگمات نو محلے والیاں کہلاتیں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت بابر بادشاہ تک پہنچتا ہوتا وہ بڑی بُنیاد والے کہلاتے اور اُنکی بیگمات بڑی بُنیاد والیاں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت تیمور صاحبقراں سے جا ملتا وہ چھوٹی بُنیاد والے کہلاتے، اور اُن کی بیگمات چھوٹی بُنیاد والیاں۔ ان میں اتا خیل بھی شریک تھے۔ دوسرا طبقہ نواب زادیوں کا تھا۔ ان میں دو درجے تھے۔ ایک تو وہ جو پوتروں کی امیرزادیاں تھیں۔ وہ اپنے کو شہزادیوں سے کم نہ سمجھتیں۔ اور دوسرے وہ جن کے مرد ولایت سے آتے یہاں خدمات بجالاتے۔ بادشاہ تک رسائی ہوتی۔ مناصب پاتے۔ جنگ و ولائی ملکی کے خطابات سے سرفراز ہوتے۔ یہ دولتئے کہلاتے اور تین چار پشت تک حسد اور رشک کی نظروں سے قدیم امیروں میں دیکھے جاتے۔ تیسرا طبقہ شریفوں کا تھا۔ ان میں خوش باش جن کے پاس گاؤں، باغ، مکان، دُکانیں ہوتیں اور اُس کی آمدنی سے بسر کرتے۔ دوسرے نوکر پیشہ کہ یہ شاہی نوکریاں کرتے لیکن خطاب، جاگیر اور منصب سے محروم رہتے۔ تیسرے مولوی چوتھے حکیم۔ شریفوں میں ان چاروں ذیلی طبقوں کی بیویاں بیگمیں کہلاتیں۔ اِسی طبقہ میں ایک ذیلی طبقہ تھا۔ جو پیروں کا طبقہ کہلاتا۔ شاہانِ مغلیہ میں اکبر بادشاہ سے پیری مُریدی کی بُنیاد پڑی اور اکثر مقربِ بارگاہ۔ ارادت مند، عقیدت کیش اور مُرید خاص کہلاتے اور یہ رنگ آخر بہادر شاہ بادشاہِ غازی تک رہا۔ جو مُرید کرتے۔ اور عمل بخشتے اور اسم بتاتے۔ یہ بادشاہ کسی صاحبِ دل کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ اس کی توجہ لیتے اور کسبِ باطن کرتے۔ رعیت کے عقیدے میں ظل اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہی وہ صاحبِ تصرف سمجھے جاتے اور لوگ اُن کو صاحبِ کشف و کرامات سمجھتے۔ اور اُن کی روحانی قوت اور خرق عادات کے قائل تھے۔ یہ بادشاہ ایسے خوش عقیدہ تھے کہ اکثر نے اپنی بیٹیاں اُن پیروں کو یا اُن کی اولادوں کو دیں جن کے وہ معتقد ہوتے۔ اس لئے اکثر دلی میں پیروں کے گھرانے ایسے تھے جنکا ننھیالی رشتہ شاہی خاندان سے تھا۔ اور دلی والے انیسوی صدی تک بہت پیر پرست رہے۔ اور ان پیروں کا بہت اثر آبادی پر تھا اور ان کی بادشاہ کے بعد عزت کی جاتی بلکہ ایسے زمانے گزرے ہیں جبکہ بعض کو تو بادشاہوں پر بھی فوقیت دی جاتی۔ اور بادشاہ ان کے حلقوں میں حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتے۔ اور اُن کے وجود کو اپنی

اور اپنی سلطنت کے بقا کا موجب جانتے۔ ان پیروں کے ہاں کی مستورات بھی بیگموں میں شمار ہوتیں۔

پردہ شاہی خاندان میں کم تھا۔ کیونکہ رعایا اولاد سمجھی جاتی اور اولاد سے پردہ کہاں۔ امیروں اور شریفوں میں پردہ سخت تھا اور عورتیں گھروں میں رہتیں۔ برسات اور گرمی میں جن کے باغ ہوتے وہ پردے کا انتظام کرا کے دنوں اور مہینوں ان باغوں میں جا کر رہتیں۔ امریوں میں جھولے پڑتے، کڑھائیاں چڑھتیں۔ جھرنوں، مدرسوں، مقبروں اور جنگلوں میں سیر کو جاتیں۔ فالیز پر شام کو جاتیں پردے کا انتظام ہو جاتا۔ اور خربوزے تربوز کھائے جاتے۔ ریتی پر ڈیرے خیمے لگ جاتے۔ بجرے نواڑوں ناووں میں بیٹھتیں۔ مچھلی کا شکار ہوتا۔ اور وہیں تل کر کھاتیں۔ زندگی کی ساری دلچسپیاں گھروں میں موجود رہتیں۔ اور آئے دن خوشی کی ایسی تقریبیں نکلتی رہتیں کہ جس کے بہانے سو پچاس بیویاں بلالی جاتیں اور کھانا، گانا، ہنسنا بولنا ہو جاتا۔ کچھ نہ ہوا بہار میں جلاب لے لئے۔ منضجیں پی جا رہی ہیں۔ رنگ اور خون کی صفائی کے لئے ماء الجبن (مال جوبن) سلنے جا رہے ہیں۔ گلابی محل کی دیواروں پر گلابی رنگ ہوا۔ فرش گلابی ہوا۔ پردے گلابی چھٹے۔ جھاڑ کنول، دیوار گیریاں، ہانڈیاں، مردنگ سب گلابی۔ ماماؤں، اصیلوں، لونڈیوں، باندیوں نے گلابی جوڑے پھڑکائے۔ ملنے جلنے والیاں کنٹھے، رنگ کے قرابے، پانوں کے بیڑے۔ بن سو پیاری (سپیاری) دھنیا، الائچیاں بھجوا رہی ہیں۔ گنگا جمنی الائچیاں ہیں۔ چکنی سپیاری پر چاندی سونے کے ورق چڑھے ہیں۔ باجرے کے دانے برابر گول گول چھالیا کتری ہے۔ اور اس پر سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ الائچی کے دانوں پر بھی سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ پستے بادام کھوپرے کی پھول پتیاں کاٹ کر زعفران، شہاب میں رنگ کر، پھول گل بنا کر گلدستے بنا گلدانوں میں سجا کشتیاں آراستہ کر بھجوائی ہیں۔ سواریوں پہ سواریاں اتر رہی ہیں۔ ڈومنیوں کا ناچ گانا ہو رہا ہے۔ نقلیں ہو رہی ہیں۔ خوب چہل پہل اور آہا ہو ہو ہے۔ کوئی بات رنج کی جلابن بیگم کے کانوں میں نہیں پڑنے پاتی کہ کہیں جلاب بگڑ جائیں اور خون چکر کھا جائے رنگ جل کے چٹے اور چھائیاں نہ پڑ جائیں گھروں میں بیگمیں اپنا کام کرنا عیب نہ سمجھتیں اور جب کام سے فارغ ہوتیں بنا سنورا کرتیں۔ صبح پو پھٹے اٹھنا، ضروریات اور نماز سے فارغ ہوئیں۔ اور حمام کی سوجھی۔ ہر حویلی میں حمام کا ہونا ضروری تھا۔ محلسراؤں میں سنگ مرمر کے پانچ پانچ درجے کے حمام ہوتے جن میں فرش، اجارہ، حوض، ستون اور محرابیں سنگ مرمر کی ہوتیں۔ چھتیں لداؤ کے گنبد کی ہوتیں جس کے بیچوں بیچ روشندان ہوتا۔ اور اس میں روشنی آنے کے لئے چھوٹے چھوٹے مربع شیشے لگے ہوتے، کھڑکیاں ہوتیں جن میں چونے کی زہ بنا کر شیشے بٹھاتے تاکہ حمام خوب روشن رہیں۔ حمام گرم اور سرد دونوں ہوتے۔ ایک درجہ جامہ کن کہلاتا۔ جہاں کپڑے اتارے جاتے۔ اور ایک درجہ معتدل ہوتا۔ جس میں گرم حمام کے بعد آ بیٹھتیں۔ ساتھ مامائیں، مغلانیاں، لونڈیاں باندیاں رہتیں۔ اکثر اپنا کام یہیں کرتیں۔ کوئی سیتی پروتی۔ کوئی مہندی لگاتی۔ لگنیوں میں مہندی گندھی رکھی ہے۔ مہندی میں رنگ آنے کے لئے کتھا اور چڑیا کی بیٹ ملاتے۔ اور اگر سیاہی مائل سرخ رنگ پسند ہے تو اس میں ذرا سا نیلا تھوتھا ملا دیتیں۔ دلہنوں کے حمامی مہندی لگائی جاتی کوئی چھلا چور مہندی لگاتی۔ کوئی ہتھیلیوں پر مچھلیاں بناتی۔ کوئی چاند، کوئی سورج، کوئی ٹکیا بناتی۔ بعض قندتی مہندی لگاتیں۔ کوئی جالی کی مہندی لگاتی۔ مہندی لگانے کے بعد ارنڈ کے پتے ہاتھوں میں لپیٹ کر حنا بند جو سرخ قند یا سرخ خلتے کے ہوتے اور جن میں سبز مغزی لگی اور گوٹا ٹکا ہوتا، باندھ دئے جاتے۔ پاؤں میں بھی مہندی ہاتھوں ہی کی وضع کی لگائی جاتی۔ اکثر رات کو لگا کر سوتیں اور صبح حنا بند کھول، ارنڈ کے پتے الگ کر، مہندی چھڑا چنبیلی کا تیل مل تھوڑی دیر میں ہاتھ پاؤں دھو لیتیں اور مہندی ایسی رچتی جیسے سرخ سرخ باقرخانیاں یا بیر بہٹیاں۔ ناشتہ بھی یہیں کر لیا جاتا۔ پانچ چھ گھنٹے حماموں میں گزرتے۔ جب دن گرم ہو جاتا تو ان حماموں میں سے نکلا جاتا۔ حمامی عورتیں نہلاتی دھلاتی اور مشت مال کرتیں۔ ان حماموں میں اگر کی بتیاں خوشبو کے لئے روشن کی جاتیں اور کوڑ یا لوبان کی دھونی دی جاتی۔ گرمیوں میں سرد حماموں میں نہاتیں۔ گھر کی نہروں اور حوضوں میں تیرتیں۔ چھینٹے کھیلتیں۔ گھنٹوں پھواروں کے نیچے بیٹھی رہتیں۔ گرمی کی چاندنی راتوں میں کھانے سے پہلے نہایا جاتا۔ ان نہانوں میں نری عورتیں ہوتیں۔ مرد کے نام چوہے کا بچہ نہ ہوتا۔ جو پانی سے ڈرتی اسکو زبردستی گھسیٹ کر پانی میں ڈالتیں۔ اور ڈوبنے نہ دیتیں۔ اس کی کفن پھاڑ چیخیں اور دوسریوں کی ہنسیاں ان قہقہہ دیوار کی محلسراؤں میں ایک اودھم مچا دیتیں۔ سر، آنولوں، بیری کے پتوں اور ارڑد کی دال سے دھویا جاتا، تاکہ بال ہمیشہ کالے رہیں اور بڑھیں۔ نرم ہوں اور ان میں حلقے پیدا ہوں۔ جاڑوں میں جلد کو نرم رکھنے کے لئے فتنہ ملتے اور پھٹے ہوئے حصوں پر موم روغن لگایا جاتا۔ جلد کا روکھا پن عیب میں داخل تھا۔ چکنے چپڑے چہرے پسند کئے جاتے۔ اس لئے

باہر والیاں چہروں پر ہلکا ہلکا تیل مل لیا کرتیں۔

سیر تفریح نہ ہوتی۔ بیگمیں رات دن حویلیوں میں رہتیں۔ اِس چار دیواری کی دُنیا میں اُن کے لئے تمام دلچسپی کے اسباب جمع رہتے۔ صبح کی نماز وظیفے کے بعد پیش خدمت نے فوراً زیر انداز مسند کے سامنے لا بچھایا۔ زیر انداز کھاروے، بانات اور مخمل کے ہوتے اور عام طور پر عنّابی رنگ کے ہوتے۔ سادے اور حاشیہ دار۔ حاشیہ بالکڑی کا یک کا ہوتا۔ یا کلابتونی یا کارچوبی ہوتا۔ آفتابچین نے سلیچی، استادہ اور مقابہ والی نے مقابہ سامنے رکھا۔ جھک کر مُجرا عرض کیا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔ مقابے میں بیسن دانی۔ کھلی دانی۔ منجن کی ڈبیہ۔ جیبی۔ پیلو کی مسواک۔ صندل کی ٹکیاں اور بٹنے کی ڈبیا ہوتی۔ آفتابچنیں، آفتابے ٹھنڈے گرم پانی کے لئے کھڑی ہیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش زانوؤں پر ڈال دیا۔ زانو پوش بانات، اطلس، مخمل اور گلبدن کے ہوتے۔ روپاک سے چہرہ پوچھا، دستمال سے ہاتھ، پاپاک سے پاؤں پوچھے اور یہ سامان بڑھا دیا گیا۔ سنگار دان سامنے آیا۔ سنگار دان میں آئینہ، گیسو دانی۔ شانہ پیچ میں کنگھی۔ حنابند۔ ایک چھوٹی سی تلدانی میں سُوئی تاگا۔ اور مباف جن کے کناروں پر دھنک کی بنی کلبیاں اور کرن یا تھل کے پھول ٹکے رہتے۔ سُرمہ دانی۔ سلائی۔ کجلوٹی۔ تیل گیری۔ تیل کی کپی۔ تیل کی کٹوری۔ مسّی کی ڈبیہ۔ افشاں کی ڈبیہ۔ قینچی۔ ایک ڈبیہ میں کاشکاری (کاشغری) سفیدے کی پوٹلی بندھی رکھتی۔ ایک ڈبیا سچّی سیپ کے سفوف کی۔ ایک کٹوری میں شہاب۔ ایک ڈبیہ میں کارچوبی نزلے بند۔ ایک ڈبیا میں کاشانی مخمل کے خال۔ ایک کٹوری میں گوندکا پانی۔ لکھوتی میں لاکھا۔ ایک گنگاجمنی نلکی میں سُرمے، کاجل، شہاب، مسّی، زعفران لگانے کی سلائیاں۔ ایک سلائی ذرا موٹی سی بھی ہوتی۔ جس پر لٹیں لپیٹ کر بال گھونگر والے بنائے جاتے۔ مشاطہ نے عمر اقبال اور سہاگ کی دُعائیں دیں۔ ست پوتی، کوکھ اچھوتی۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ کوکھ مانگ بھری رہے۔ اللہ اللہ کرکے اَب بناؤ شروع ہوا۔

مشاطہ نے پہلے صندل کا چھاپہ گلے اور مانگ پر ہلکا سا دیا۔ پیچھے گُھٹنوں پر بیٹھ کر بیگم صاحب کے تیل گیری بیٹھ پہ ڈال کپّی میں کو تیل کی کٹوری میں۔ سے تیل نکال بالوں میں تیل لگایا۔ شانہ پیچ سے کنگھی نکالی موٹے دندانوں۔ سے بال سُلجھائے۔ باریک دندانوں سے سونتے۔ مانگ نکالی۔ چاند نبریوں کا یا محمد شاہی پٹیوں کا سر گوندھا۔ کنواری لڑکیوں کے عیب کے سر گوندھے جاتے تاکہ مانگ پھٹ کر چوڑی نہ ہو جائے اور کوڑے کے مباف ڈالے جاتے کہ بالوں کی نوکیں پھٹیں۔

نہیں محفوظ رہیں اور بال بڑھیں۔ بچاری لڑکیاں بیچ میں یاد آ گئیں۔ ہاں بیگم صاحب کا بناؤ سنیئے۔ کھجوری چوٹی گوندھ، مباف دانی میں سے جوڑے کے رنگ پر کھلنے والے رنگ کا مباف نکال۔ ڈالا، مانگ بھری' اَفشاں چُنی۔ بیگم صاحب نے سیپ کے سفوف کی پوٹلی سے مُنہ پر سفوف مَل کر باریک مَلمل سے برابر کیا۔ پھر روئی سے شہاب لے کر رُخساروں پر غازہ لگایا۔ پپوٹوں پر اور حدقۂ چشم پر ہلکا ہلکا افیم زعفران اور سوت کا لیپ کرکے آنکھوں میں حلقے بنائے۔ دُنبالے دار سُرمہ لگایا۔ شہاب سے دو خط دُنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اُوپر نیچے کھینچے کہ آنکھ مچھلی بن گئی۔ کاجل سے بھویں بنائیں کن پٹیوں پر گوند لگا جڑاؤ یا کارچوبی نزلے بند چپکائے۔ بانچھ پر بالائی لب سے ہٹا ہوا مُگلی تل لگایا۔ کتھا چونا ملا لاکھا بنایا اور سلائی سے ہونٹوں پر باریک خط لاکھے کا کھینچا۔ اس پر مسّی کی تحریر سلائی سے دی۔ جامدار خانے والی نے جوڑوں کے دست بقچے حاضر کئے۔ موسم اور رُت کے اعتبار سے کھلتا ہوا رنگ پسند کیا۔ پیش خدمتوں نے اوٹ کھڑی کی۔ پوشاک بدلی۔ مشاطہ نے مدد دی۔ مشاطہ کا کام مغلانیاں ہی میرے زمانے میں کرنے لگی تھیں۔ چاندی کی ہشت پہل انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی اور اُس پر لٹوں کو لپیٹ، حلقے بنا چھوڑ دئے۔ زلفیں بنائیں۔ کالا دانہ اُتار آگ میں ڈالا کہ دیکھنے والیوں کی نظر نہ لگے۔ اور بناؤ میں کھنڈت نہ ہو۔ چٹ چٹ سر سے پیر تک کی بلائیں لے خدمت کی سرفرازی کا آداب بجا لا، اُلٹے قدموں دعائیں دیتی رخصت ہوئی۔ اب جواہر خانے والیوں نے زیور کے خوانچے اور کشتیاں پیش کیں۔ سگھڑ گھڑیوں کے گھڑے اور جڑتر جڑیوں کے جڑے نگینے جن پر ہوشیار میناگروں نے باغ و بہار۔ ہزار رنگلے اور گل اندر گل کے مینے کئے اور کندن گروں نے کندن کئے۔ یا سادہ کاروں نے متناسب کوٹھیاں بنا اور حساب سے باٹنی ڈال، زیبہ بٹھا، آواز دار زیور بنائے۔ اور رنگ ایسی خوبصورتی سے برابر بٹھاتے کہ ایک ڈال جوہر ہونے کا دھوکا ہوا۔ جڑائی میں وہ صفائی کہ جینی غلتہ پھیر دو تو کیا مجال جو ذرا ریشم سے اُلجھ جائے۔ زیبہ ایسی کہ کندن گردن کے کُندن کو پرے بٹھائے۔ جس رنگ کا جوڑا پہنا ہے تو زیور اسی رنگ کا پہنا جاتا۔ اگر لباس دو رنگ کا ہے تو زیور کے نگینے بھی دو رنگ کے ہوتے۔ میں نے اپنے بچپنے میں شہر آبادی کے زمانے کا ایک جوڑا دیکھا، یہ ریشمی تھا اور بارہ مختلف چہچہاتے رنگوں کی اُنگل اُنگل چوڑی پٹڑیاں پڑی تھیں، اور ہر پٹڑی میں چھوٹی چھوٹی بُوٹیاں تھیں۔ نہ پوشی کا ریشم بہت تیز

روٹی کا روٹی اور نرم۔ اور محرم کرتی کا ریشم باریک بافت کا نرم، معلوم نہیں
کس شہر کا تھا۔ چادرا رامپور کا بنا ہوا کھیس تھا۔ بےحد نرم اور دبیز۔ اسکے
ساتھ کے تمام زیور میں بارہ بارہ رنگ کے مختلف نگ جڑے تھے۔ جو
جوڑے کے رنگ سے ملتے تھے۔ اور اُسی کے ساتھ کی ایک شال تھی
جامہ وار کی۔ جس کی میں نے کٹوا کر شیروانی سلوائی۔ نگوں کے رنگوں میں
بھی موسم کا خیال کیا جاتا۔ مختلف خاندانوں میں مختلف جواہر بھاگوان
اور منحوس سمجھے جاتے۔ سعد اور نحس کا بڑا وہم کیا جاتا۔ بعض نگ بعض
کو سازگار ہوتے اور دوسروں کو ناساز۔ نیلم منحوس سمجھا جاتا۔ لہٰذا
بعض کو سازگار اور بعض کو ناساز ہوتا۔ نیا نگ پہلے سوتے وقت تکیے
کے نیچے رکھکر سوتے اور دوچار دن تک اُس کے اثرات کا خیال رکھتے
اور ان دنوں میں جو کچھ ہوتی ہوتی وہ نگ کے اثر سے تعبیر کی جاتی۔
اور اہلِ خاندان اور متوسلین کو اس کے سعد و نحس خواص کا عقیدہ
ہو جاتا۔ عقیق میں جگری بھاگوان سمجھا جاتا۔ ہیرے سے دھڑکن دور ہوتی
شودر ورن یعنی کالا ہیرا منحوس سمجھا جاتا فیروزہ اگر موافق ہے تو دافع بلیات سمجھا
جاتا۔ زمرد سے سانپ اندھے ہوتے۔ دل قوی ہوتا اور دافع نظر بد سمجھا جاتا۔
یاقوت سے جرأت بڑھتی۔ لال سے لالن کی قوت گویائی بڑھتی اور مدعیوں
کی زبان لال ہوتی۔ موتی سے دل کی گرمی دور ہوتی اور کالا موتی پیامِ
مرگ سمجھا جاتا۔ پکھراج بسنت رُت میں پہنا جاتا۔ یاقوت جاڑے میں موتی
گرمی میں اور زمرد برسات میں۔ ہیرے کا کوئی موسم نہ تھا۔ برہما برن ہیرا
بے عیب سفید ہوتا۔ اور بےحد پسند کیا جاتا۔ چھتری برن ہیرا نیلگوں آبی
زیادہ پسند نہ کیا جاتا۔ بیش برن ہیرا زردی لئے ہوتا اور یرقان کی بیماری
پیدا کرتا اور نحل پر وال تھا۔ ہیرے کی ترصیع چاندی میں اور بجلیاں یا
چھپکے کے بالے بہت پسند کئے جاتے۔ چندن ہانس اور گل جیب بھی اکثر
چاندی کے گھاٹ کے ہوتے اور یہ چاندی میں جڑے ہیرے کے زیور
چاندنی راتوں یا جشن مہتابی میں پہنے جاتے۔ عوام میں یہ سفید سونے
کے زیور سمجھے جاتے۔ سبز سونا بہت نادر سمجھا جاتا اور اس کے لچھے ترنج
ملکہ زمانی کے ہاتھ میں رہتے۔ یہ سُنتے ہیں دیکھے نہیں۔ البتہ کتابوں میں
لوحیں اور جدولیں سبز سونے کی دیکھیں۔ قدیم پشواز اور سیدھے "ٹننگ"
پاجامے کا رواج کم ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں ایک نئی قسم کا
پاجامہ ایجاد ہوا جو قفنی دار کہلاتا تھا۔ پائنچے میں اوپر کندے ہوتے اور
گھٹنے سے نیچے کندے کی نوک سے ایک ایک کلی کی نوک ملا کر پائنچہ
سی لیا جاتا۔ جو کولھے سے گھٹنے تک تو پھنسا رہتا اور گھٹنے کے نیچے
سے ٹخنوں تک بتدریج ڈھیلا ہو جاتا۔ جو ریوں پر پیچا چڑھا ہوتا یا معزی
لگی رہتی۔ اکثر سنجاف بھی لگاتیں۔ یہ پیجامہ پہن کر بیگمیں پاموز مرغیاں یا
کبوتریاں معلوم ہوتیں۔ اندر محرم، محرم کے اُوپر پشواز۔ سر پر تین گز کا
روپٹہ۔ اُنیسویں صدی سے کچھ پہلے پہلے پشواز بالکل چھُٹ گئی۔ اور وہ
صرف نیلنوں اور گھوسنوں میں رہ گئی۔ البتہ باہر والی دُلہنوں کو چوتھی
کے جوڑے میں پشواز چڑھتی اور وہ باہر والوں میں تلک کہلاتی۔ شہر میں
پشواز کی جگہ اڈّھی کی کرتی نے لے لی۔ جو باریک بیٹ، روڈ جالی اور لاہی
یا کسی اور باریک کپڑے کی سلی ہوتی۔ جس کپڑے کی کرتی ہوتی اُسی کپڑے
کی محرم ہوتی۔ اڈّھی کی کُرتی پیچھے گُدّی کے نیچے سے پانچ اُنگل چوڑی بنتی
ہوئی پسلیوں سے لپٹی ہوئی نیفے سے دو اُنگل اُوپر تک رہتی اور سامنے
کوڑی سے ناف تک آتی۔ اور پنڈے پر چُسپ رہتی۔ دو بند کھووں پر سے
ہوتے سامنے کی پاکھیوں میں سلے ہوتے اور سامنے کی دونوں پاکھیوں
میں سیدھے ہاتھ کی طرف لو تام اور بائیں ہاتھ کی طرف کاج ہوتے۔ جو
پہن کر لگا لیتے جاتے۔ محرم، کنٹھی پٹھے کی ہوتی جس کی وجہ سے دگدگی
کے نیچے تک کا حصّہ کھلا رہتا۔ چڑیا میں دونوں طرف چار چار ٹکیوں
کی کٹوریاں جو مونڈھوں سے سامنے کی طرف کھُلی ہوتیں، اور پیچھے مونڈھوں
میں پچھوے جڑے ہوتے۔ ملکٹ کی دو بکٹیاں چڑیا سے جڑی ہوتیں اور دو
بکٹیاں اگاڑیوں سے سلی ہوتیں۔ اور یہ اگاڑیاں بغلوں سے مونڈھوں
اور پچھووں سے ملی ہوتیں۔ سی دی جاتیں۔ پچھووں میں اُوپر نیچے
بیچ کلیوں میں دو دو بند ٹکے ہوتے جو پیٹھ پر کس کر باندھ لئے جاتے
اور پُشت پر اُن کی بندش سے ایک لوزات سی بن جاتی۔ مونڈھوں میں
چُست آستینیں لگی ہوتیں جو کبھی کلائی تک آتیں اور کبھی آدھے بازووں
تک رہتیں۔ محرم اور کرتی بالکل اُوپر کے جسم کے حصّے کی ساخت کی
ہوتیں اور جسم سے چپکی رہتیں۔ روپٹے، محرم، کُرتی اور پاجاموں کی سلائی
پر بڑی بڑی ہنرمند مُغلانیاں دیدہ ریزی کر کے وہ وہ نئے نئے کام ڈھنگ
بیک، گوکھرو۔ مقیشی گوکھرو۔ کلابتوں، سلمے، ستارے بکھوئیے۔ گجائی۔
کٹوریوں، حباب۔ کرن۔ تھل۔ ٹھپے۔ بانکڑی۔ چمپا۔ ننھی جان اور ریشم
کے کرتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے اور ان ٹکنوں ہی کی وجہ سے
ان ٹکنوں کے کام کی بدولت ہزار بیگمیں کسی ایک محفل میں ہیں تو ان کا
لباس الگ الگ معلوم ہوں گے اور ایک کا دوسری سے نہ ملیگا۔
حالانکہ وہی چار پارچے۔ روپٹہ، محرم، کرتی اور پاجامہ ہوتے، لیکن
کیا مجال کہ ایک بیگم کی وضع کسی دوسری سے تول جاتے۔ البس نئے
مغلانیاں سیتے وقت بڑی احتیاط کرتیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی بیگم
صاحب سے پہلے یہ ٹکن عام ہو جاتے۔ جاڑوں میں جھیل جھیلی بیگمیں تو

باریک حباب سے رد پٹے اوڑھتیں۔ لیکن شال۔ دوشالے۔ کھیس چادرے، دولائیاں اور چھینٹ کی لادہ بیّ۔ پوسیری روئی کی رضائیاں اوڑھی جاتیں۔ صدریاں۔ کمریاں اور نیمہ آستین بھی پہنی جاتیں۔ انگر کھے یا چکنیں پہننا شہد یانی وضع سمجھی جاتی۔ لیکن اکثر بانکیاں پہنتیں۔ دولائیاں رضائیاں چادرنے پاجامے غفت کپڑوں کے ہوتے۔ روپٹے، پشوازیں، محرم کرتیاں باریک کپڑوں کی ہوتیں۔ کبھی کبھی رنگین میان تہ دیکر دولائیوں اور رضائیوں میں باریک ابرے لگاتے۔ پاجامے کمخواب، مشجر، زربفت، نیم زری۔ پوتھ۔ دریائی لسٹر۔ کنادیز۔ اطلس۔ غلتہ۔ چوڑ بیا۔ زادھا نگر، بانک کٹار۔ مشروع، گلبدن۔ مخمل۔ نین سکھ۔ تن سکھ۔ کمرک، گورنٹ پرمٹا۔ ساٹن۔ سائن کلاٹ۔ مشہدی۔ ریشمی سوسی، اٹیلین۔ نرما۔ الیچہ (الاچہ) خاصہ۔ چھینٹ۔ قلم کاری۔ مومی چھینٹ۔ سمٹی۔ گمٹی۔ چھال ٹین، باتات۔ کشمیرا۔ موٹرا۔ دھوپ چھاؤں۔ پھلالین۔ ان میں کمپنی بہادر کی بدولت کمرک۔ گورنٹ آئے اور انگریزی حکومت میں پرمٹا، ساٹن، ساٹن کلاٹ، اٹیلین، لٹھا، نرما، پھلالین، آئے۔ بیگمیں ان میں سے بعض کپڑے اپنی باندیوں کے لئے خریدتیں۔ باریک کپڑے ململ، تن زیب، آب رواں، ہوائو دریا، حسینی گھاس، لاہی، محمودی، تارترنگا، جھونا، چوتاری، سربصاف، گنگا جل، اساوری، پنجتولیہ، پھوار، رین بسی، لپشتولیہ۔ سیلہ۔ بنارسی۔ جامدانی۔ ڈھاکہ پاٹن، گلشن، ڈورجالی، بابرلیٹ۔ کتان۔ رنل، چکن، رینگ، کریب، جامدانی ٹانڈے اور سیکاکول کی۔ ململ چندیری اور ڈھاکے کی پسند کی جاتی۔

قلعے میں جوڑے ایک رنگ کے ہوتے، اور دو رنگ کم پہنے جاتے۔ روپٹہ، محرم کرتی ایک ہی رنگ کے ہوتے اور تہ پوشی دوسرے رنگ کی۔ کبھی تین رنگ کے جوڑے ہوتے۔ روپٹے کا الگ رنگ، محرم کرتی ایک رنگ کی۔ تہ پوشی اور رنگ کی۔ لیکن تین رنگ کے جوڑے پہننا بہت مشکل تھا۔ اس میں بہت سلیقہ اور خوش مذاقی درکار تھی۔ تین رنگ اس طرح ملائے جاتیں کہ وہ آنکھوں کو بھائیں۔ مثلاً اودی تہ پوشی، سبز محرم کرتی اور نارنجی روپٹہ ہوتا۔ اگر ان تین رنگوں میں سے ایک رنگ نکال کر کوئی اور رنگ شامل کرلیا جاتا تو اُس پر پھبتیاں ہوتیں۔ تین ترنگا دیوالی کا ہیجڑا۔ ترنگی بلی یا دیوالی کی کلھیا۔ یہی حال دو رنگوں کا تھا کہ اُن کا ملانا بھی سہل نہ تھا۔ کاسنی اور شربتی۔ فیروزی اور بادامی۔ انگوری اور پیازی۔ کافوری اور سوتی، شنگرفی اور پستئی۔ تربوزیا اور کاہی۔ شفقی اور طاؤسی۔ سردئی اور زنگاری۔ گلناری اور سبز۔ بسنتی اور آسمانی۔ زعفرانی اور بیجنی۔ ماشی اور جوزی۔ دھانی اور فالسائی۔ آتشی اور زبرجدی۔ ارغوانی اور زمردی۔ سُرخ اور سبز۔ لیکن اس پر کبھی کبھی مرچوں کے کھیت اور کچے پکے بیروں کی پھبتی ہو جاتی۔ البتہ نیلا اور سُرخ ملا کر کوئی نہ پہنتا۔ اگر کوئی باہر والی پہنے دکھائی دیتی تو کلیجی پھیپھڑے کی پھبتی کسی جاتی۔ زرد اور سیاہ کا بھی میل نہ ملاتے۔ کیونکہ کڑھی پہ کوئیلا کون سُنتا۔ عباسی۔ ناسپاتی۔ اگرئی۔ صندلی۔ ملاگیری۔ شتری۔ کشمشی۔ دودھیا کاسنی۔ چنپئی۔ سیپی۔ کوکناری۔ سُرمئی۔ توتیائی۔ گندکی۔ کپاسی۔ سُنہری۔ روپہلی۔ جوگیا۔ کشنیزی۔ مٹیالا۔ سیندوری۔ گیروا۔ خاکستری۔ بھورا۔ لاکھی۔ تیلیا۔ لاجوردی۔ کرنجوی۔ گڑملی۔ شہابی۔ گیندئی۔ نافرمانی۔ نیلوفری۔ کستوری۔ گلابی۔ مسئی۔ زہریا۔ آبی۔ سفید موتیائی۔ غرض کہاں تک رنگوں کے نام لوں۔ رنگوں کی ایک دُنیا تھی۔ پھر ان میں ہلکے گہرے۔ شوخ، چہچہاتے۔ سُن۔ سوتے۔ مدھم۔ رنگوں نے مل کر وہ رنگ برنگی پیدا کر دی تھی کہ رہے نام رنگیلی کا۔ صوفی اور شاعروں کی دُنیا دو رنگی تھی اور بیگموں کی دُنیا لکھ رنگی۔ لیکن اب تو بے رنگی کا دَور دورہ ہے اس کا کوئی کیا کرے۔

تلفی دار پجاموں کے بعد فرشی تہ پوشیوں کا رواج ہوا۔ جن میں بیس بیس کلیاں ہوتیں۔ یہ کلیاں پائیچوں میں چور کلی کے بعد ایک دوسرے میں سی دی جاتیں۔ جن کی نوکیں اوپر چور کلی کے پاس رہتیں اور سر نیچے کی طرف۔ اس طرح دونوں پائینچے نیچے کی طرف بہت چوڑے ہو جاتے اور کولھوں پر سمٹے رہتے۔ ان پائینچوں کو پیچھے چھوڑ دیا جاتا تو تو پڑے ہوئے بڑے بھلے معلوم ہوتے جیسے مور کی دُم۔ ان پائینچوں پر پانچ پانچ منزل کی اور سات سات منزل کی گوٹیں چڑھائی جاتیں لیکن یہ گوٹیں سات انگل سے بڑھنے نہ پاتیں۔ کیونکہ دلی میں ایک بالشت سے زیادہ گوٹ گنوارو سمجھی جاتی اور گوٹوں کے چوڑے اور پتلے ہونے سے بیگمات میں تمیز ہو جاتی کہ کس طبقے کی ہیں۔ پانچ انگل سے کم گوٹ ہندنیوں کی سمجھی جاتی اور بالشتی گوٹ ثقہ اور وضعدار۔ تہ پوشیوں کے پائینچوں کو پیچھے چار چار چھوکریاں سنبھالتی ہوئی چلتیں۔ ان فرشی تہ پوشیوں کا اب تک رواج ہے۔ اور کم سے کم چوتھی کے جوڑے میں روپٹہ تین گز کا۔ محرم۔ اڈی کی کرتی اور ڈھیلے پائینچوں کے پاجامے اب تک دئے جاتے ہیں۔ اور شادی کی سمدھنیں اسی وضع کا لباس پہن کر بیاہنے چڑھتی ہیں۔ تہ پوشی کا پہننا کمال تھا اور پائینچوں کا سنبھالنا اور نیفے میں اُڑسنا یا کلائی پر ڈال یا پیچھے چھوڑ کر چلنا وہ ادا ہے دکھاتا ہے کہ اُس کو تلوار باندھنے والے ہندوستان کے مردوں سے پوچھئے۔ نیفے لال قند۔ کالے پرمٹے اور کالی یا لال گورنٹ کے نیفے

جاتے۔ جوانیں اور سہاگنیں لال قند کے نیفے لگاتیں اور بیگماتی لغت میں
لال نیفہ یا لال نیفے والی سے مراد عورت ہوتی اور کہتیں "اے اِس موئے
زرغل مردوئے کو صورت کا کیا شعور نفاقتے کو لال نیفہ چاہیئے"

شہر بربادی میں روپٹہ، محرم کرتی اور تنگ (موری کے) پاجامے
بھی پہنے جانے لگے تھے۔ یہ تنگ پاجامے سیدھے اور چُست ہوتے، اُوپر
پائینچوں میں کُندے لگائے جاتے اور چورکلی سے دونوں پائینچے جوڑ دیئے
جاتے اور موریاں یا تو ٹُرھیا دی جاتی یا پتلی مغزی لگاتے۔ اور اُس
ٹرھیا ذن یا مغزی سے اُوپر بانکڑی یا بیک ٹانکی جاتی۔ نیفے کے مُنہ تک
نیچے چورکلی کی نوک رہتی اور عام طور پر چورکلی کی لمبان سوا بالشت رہتی
جو ٹخنے کے بعد ایک بالشت کی رہ جاتی۔ موریاں گاؤدم ہوتیں اور پنڈلیوں
پر پھنسی رہتیں۔ اور اکثر بیگمیں موریاں کھول کر پہنتیں اور پہننے کے
بعد اُن کو اُلٹ کر سی لیتیں تاکہ پنڈلیوں پر ایسی پیوست ہو جائیں کہ چٹکی
لی جائے تو گوشت نہ آئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں آڑے پاجاموں
کا رواج ہوا۔ جو یا تو تھیلے کی تراش کے ہوتے یا سموسے کی تراش کے۔
یہ قدرے گھٹنوں سے اُوپر کولھوں تک ذرا ڈھیلے رہتے اور پنڈلیوں
پر خوب چُست۔ ٹخنوں پر تھوڑی سی چوڑیاں رہتیں۔ ان پر گھٹنوں سے
نیچے کُرتے پہنے جاتے۔ اور گریبان کاج پٹی کے ہوتے اور رنگلے ناخونی۔
گلے، گریبان، مونڈھوں، آستینوں اور گھیر میں کٹاؤ کا کام کرکے اُن پر
ستارے کی ٹکری دیتے۔ جو مہین کرتوں میں سے پٹبیجنوں کی طرح جھم جھم
کرتے۔ کُرتوں کے نیچے محرم رہتی۔ اور اُس میں بھی کٹاؤ کا کام ہوتا اور نین سکھ
کی پھول پتیاں کاٹ کر اور اُس پر ستارے جما کر باریک کپڑوں کے نیچے
تیپچی کرکے ٹانک دیتے۔ کُرتے اور روپٹے ایک ہی قسم کے باریک کپڑے
کے ہوتے اور رنگ بھی ایک ہی ہوتا۔ قلعے میں کُرتے کا نام نہ لیتے، اور
منحوس سمجھتے۔ اس کے لئے تھنکارے کا کنایہ تھا۔ اگر مُنہ سے کُرتے کا
لفظ نکل جاتا تو تھو تھو کر دیتے۔ کیونکہ کُرتا رنڈ سالے میں دیا جاتا۔ لیکن
شہر بربادی میں انیسویں صدی کے آخر سے شہر میں کُرتوں کا رواج عام
ہو گیا۔ سُہاگنیں اور رانڈیں سب ہی پہننے لگیں۔

کہتے ہیں آڑے پاجامے پنجاب سے آئے۔ پہلے پہلے دلّی کی
پنجابی تاجروں کی عورتوں نے یہ وضع اختیار کی۔ اس کے بعد کوٹھے
والیوں نے پھر نوجوان نواب زادیوں نے۔ اور لوگوں نے خوب
خوب نام دھرے۔ لیکن پھر یہ وضع عام ہو گئی۔ صرف بڑی بوڑھیاں یا
حکمنیاں سیدھے پاجامے اور اُونچے کُرتے پہنتی رہیں۔ اکثر گھرانوں میں
گرمیوں میں بیگمیں نین سُکھ کے غرارے دار پاجامے پہنتیں جن کا پائینچہ
عرض کا ایک ہوتا ہے اور اُس کی موریوں پر چکن کی کنگوریدار بیل یا چین
کا ہوتا۔ لیکن یہ وضع اچھی نہ سمجھی جاتی۔ کیونکہ مرد غرارے دار پاجامے
جن کو تُمّان (تنبان) کہتے تھے، پہنتے۔ مولویوں کے گھرانے کی بیویاں
سیدھے پاجامے جو چُست نہ ہوتے پہنتیں اور جہاں وہابیت کا اثر ہو گیا
تھا وہ شرعی پیجامے پہنتیں جن کی موریاں ذرا ڈھیلی رہتیں اور پنڈلیوں
پر اس قدر ڈھیلے ہوتے کہ جسم کی ساخت نظر نہ آئے۔ اُن کے کُرتے
اور روپٹے ذراغف کپڑے کے ہوتے تاکہ جسم ذرا سا بھی اُن میں سے
نہ جھلکے۔

بیسویں صدی میں تین کلی کے پاجاموں کا رواج ہوا۔ مدرسوں
میں پڑھنے والی لڑکیوں نے اس کو زیادہ پسند کیا۔ جس کی وضع ایسی
ہوتی جیسے انگریزنوں کے دو سایوں کو جوڑ دیا گیا ہو۔ اُس پر اُٹھنگے
کُرتے پہنتے اور تین گز کے روپٹے اوڑھے جاتے۔ بمبئی کی زبیدہ خاتون
دلّی میں حکیم اجمل خاں سے علاج کرانے آئیں اور دلّی کی بیگمات سے
ملیں تو اکثر دلّی والیوں نے اُن کی وضع انوکھی سمجھ کر اس کو اختیار
کر لیا۔ تراہے کے مفتی والوں میں کی بعض لڑکیاں بمبئی والوں میں
بیاہی گئیں اُنہوں نے بمبئی کے بوروں کی وضع اختیار کی اور ان کی
ریس اکثر نے دلّی میں کی۔ سہنگے بھی پہنے جاتے مگر بہت کم۔ یہ لہنگے
کی طرح ہوتے۔ ایک ہی پائینچہ ہوتا اور اس میں پانچ پانچ کلیاں پیچھے
کی طرف ڈالی جاتیں۔ کلیوں کی نوکیں اُوپر رہتیں اور سرے نیچے۔ سہنگے
میں چونکہ دونوں ٹانگیں ایک ہی پائینچے میں رہتیں اس لئے اندر گھٹنے
پہنے جاتے۔ اس پر کُرتا ذرا اُٹھنگا گھٹنوں سے ایک بالشت اُونچا رہتا
یا محرم کُرتی کے ساتھ پہنتے اور اُس کے ساتھ دوپٹہ گاتی مار کر اوڑھا
جاتا۔ ساڑیاں دلّی میں ہمیشہ حقیر سمجھی گئیں۔ کیونکہ یا تو گھسیاریاں پہنتی
تھیں یا ناٹے کی نٹنیاں۔ کبھی کبھی پورب سے جو مونڈھے والیاں
آتیں تو وہ گرمیوں میں باریک ساڑھیاں باندھتیں۔ ہندنیاں لہنگے
پہنا کرتیں۔ ساڑی وہ بھی نہ باندھتیں۔ زیور اناپ شناپ لادنا عیب
تھا۔ زیور کا پہننا آسان نہ تھا اور گہنوں کا سلیقے سے پہننا بڑی تعریف
کی بات سمجھا جاتا۔ سر کے زیور پھول تھے۔ سیس پھول۔ چاند۔ سُورج۔
مانگ، تعویذ، سیس جال اور جڑاؤ چوٹی تھے۔ ماتھے کے زیور جھومر۔
چھپکے، ٹیکہ، سیس پٹی، ڈامنی، مرزا بے پروا تھے۔ کنپٹیوں کے زیور۔
نزلے بند۔ نظر بند۔ اور سر اسریاں تھیں۔ کان اُوپر کے چار چھیدے
جاتے اور نیچے کے تین یا چار چھیدے جاتے۔ اس لئے ہر کان میں سات
یا آٹھ چھید ہوتے۔ کن بندھے، دھار باندھ کر چھیدا کرتے اور کن بندھائی

کی تقریب میں کھوپرا مصری تقسیم ہوتی۔ گانا ہوتا۔ بیویاں بلائی جاتیں اور کھانا کھلایا جاتا۔ اُوپر کے چار چھیدوں میں پتے بالیاں پہنی جاتیں جو طرح طرح کی ہوتیں۔ جڑاؤ، سادی، مولسری کے پھول کی۔ موتی چور کی ہوتیں۔ نیچے لو کے چھید میں چھلنیاں۔ جھمکے، کرن پھول۔ لڑے۔ چھڑے۔ چاند چودانیاں۔ مگر چودانیاں۔ مچھلیاں، بالے۔ بالے جھلے۔ للکن۔ جھمکے کے بالے۔ بُندے۔ آویزے۔ انٹیاں۔ مُرکیاں۔ مور بھنور، جھمکے مگر۔ دُرنجی لولک۔ کرن پھول۔ کنٹھلے۔ کان اور ردائج پہنے جاتے۔ نیچے لو کے چھید میں۔ لمبے زیور عام طور پر پہنے جاتے۔ جیسے جھلنیاں۔ لڑے۔ چھڑے۔ جھمکے کے بالے۔ یا چاند چودانیاں وغیرہ۔ اس سے اُوپر کے سُوراخ میں پھولوں بھری بالیاں پہنی جاتیں۔ بچ کنے باہر والیاں چھداتیں۔ اور اس میں خوشہ یا بالی پہنتیں۔ ناک کے سیدھے نتھنے میں ایک سُوراخ کیا جاتا۔ ناک کے زیور کیل اور نتھ تھے۔ پھلی، لونگ، مورنی، توتا، بیسر، بلاق باہر والیوں کے زیور تھے۔ بلاق شہر میں اور قلعہ میں منت کے لئے کبھی کبھی چھیدا جاتا۔ اور جن کو بلاق پہناتے اُن کے نام مرزا بلاقی اور بُلاقی بیگم رکھے جاتے۔ لیکن مور، توتا اور بیسر ہندوانی گہنے سمجھے جاتے جو گنواریاں اور باہر والیاں پہنتیں۔ گلے میں اُوپر گلوبند یا ٹیپ پہنی جاتی۔ اس کے نیچے چگنی اور چمپا کلی، جوے کی یا بادامی ہوتی۔

اکبر بادشاہ کے زمانے میں کان کا ایک زیور پتوں سے ملتا چمپا کلی بھی تھا۔ ہنسلی باہر والیوں کا زیور تھا۔ یا میرانجی میں بچوں کے گلے میں منت کی ہنسلیاں پہنائی جاتیں۔ مالا۔ موہن مالا۔ دُگدگی۔ ڈھولنا۔ تعویذ۔ ہار۔ چندن ہار۔ چندن ہانس۔ کنٹھی ست لڑا۔ گجرے کا توڑا۔ چھلّے۔ توڑے۔ پنچ لڑا۔ دُولڑا۔ بدھی۔ ادھی۔ ادھی بدی۔ طوق، کیری، عطردان، زنجیر، ہیکل، حمائل۔ گلے کے زیور تھے۔ بازوبند۔ نورتن۔ جوشن۔ بجھ بند۔ گل چیپ۔ تعویذ۔ بل۔ بل ڈنڈ۔ اکے۔ سہ نگے۔ نونگے۔ تعویذ بازو کے زیور تھے۔ کڑے طرح طرح کے ہوتے۔ شیر دہاں۔ مگر دہاں۔ توتے کے سر کے۔ مور کے سر کے، مینڈھے کے سر کے۔ ہوتے اور سب کے آگے پہنے جاتے۔ کڑے پیچھے پہننا گنوارپن اور باہر والا پن سمجھا جاتا۔ اور اکثر کہاریاں پہنا کرتیں — چوڑیاں، جہانگیریاں، جوئی۔ سمرن۔ دست بند۔ تعویذ۔ لچھے۔ پری چھم۔ چھن۔ چوہے دنتیاں۔ کنگن۔ کوکر دنتیاں۔ تیتر پنکھیاں۔ گجرے۔ پہنچیاں، چوڑا۔ بنگڑیاں پچھلیاں۔ کلائی کے زیور تھے۔ چھن۔ پری چھم۔ بنگڑیاں باہر والیاں پہنتیں۔ پچھلیاں جو سب زیور کے پیچھے پہنی جاتیں اُن کا رواج کم تھا۔ اُنگلیوں میں انگوٹھی، چھلّے اور پوریں پہنی جاتیں۔ انگوٹھے میں آرسی ہوتی۔ ہتھ پھول انگلیوں اور پہنچے میں پہن کر پشت دست پر رہتا۔ کمر میں کمربند ہوتا جس کو ازاربند کے دونوں سروں میں پرو دیا جاتا۔ تاگڑی۔ کمرپیٹی۔ زنجیر۔ چھدر کھٹ کا۔ کٹ میکھلا، ہندنیاں پہنتیں۔ خلخال۔ جھانجن۔ چوڑیاں۔ بل۔ کڑے۔ رم جھول۔ پازیب۔ بانک۔ پایل توڑے۔ گھنگرو۔ لنگر۔ پینجنیاں پاؤں میں پہنے جاتے۔ لنگر اور پینجنیاں باہر والیوں کے زیور تھے۔ اور گنوارو سمجھے جاتے۔ پاؤں کی اُنگلیوں میں چٹکی چھلّے پہنے جاتے۔ بچھوے۔ انوٹ۔ انوٹ بچھوے۔ باہر والیاں پہنتیں۔ پگ پھول کا رواج بہت کم تھا۔ زیوروں کے نام بہت ہیں۔ اگر اُنکی ساخت اور وضع قطع بیان کی جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب ہو جائے۔

بیگموں میں لکھنا، پڑھنا۔ خوشنویسی۔ سینا پرونا۔ کاڑھنا۔ کھانا پکانا۔ ہنروں میں داخل تھے۔ قلعہ میں اِن ہنروں کے علاوہ گانا۔ ناچنا، اور ساز بجانا بھی کمال میں داخل تھے۔ لیکن شہر والیوں میں ناچنے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ البتہ ڈھول بجانے اور گانے میں مضائقہ نہ تھا۔ قلعہ میں شادی کرتے وقت جب لڑکی کے جہاں اور کمالوں کی کھوج کی جاتی وہاں دریافت کرتے کہ ناچ میں توڑا کیسے لیتی ہے۔ نشانہ لگانا۔ تلوار چلانا۔ تیرنا۔ درختوں پر چڑھنا۔ گھوڑے کی سواری۔ بڑے گھرانوں کی بیگمیں جانتی تھیں۔ اور شہزادیوں کو چوگان کا بھی شوق تھا۔ چوگان میں صرف عورتیں ہی شریک ہوتیں۔ اور قلعہ کے نیچے بیلے میں چوگان کا میدان تھا۔

کھانا دن میں چار دفعہ کھایا جاتا۔ صبح نو بجے تک ناشتہ۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا۔ تیسرے پہر چار پانچ بجے ناشتہ اور رات کو دس گیارہ بجے کھانا۔ سارے دن خشک و تر میوہ، ترکاریاں یعنی مقامی میوے مٹھائیاں حلوے اور طرح طرح کے چٹخے مٹھے سارے دن کھائے جاتے۔ اور کہا جاتا ہے کہ جبڑا چلے ستر بلا ٹلے۔ صبح میٹھے والی آئی گرما گرم حلوا پوری۔ پھڑ پھڑاتی کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ مٹھڑیاں۔ خستہ کچوریاں۔ جلیبیاں۔ تلاقند۔ گلاب جامنیں مال پوے۔ رس گلے، موہن بھوگ، لائی۔ پھر ملائی والی آئی صاف ستھری جگمگاتی تھالی میں یہ دل دار روئی کی روٹ ملائی جمی ہے۔ دُھلے دُھلائے ہرے ہرے پتوں کے دونے بنے ہیں۔ سیر آدھ سیر ملائی تول دی۔ دوپہر ہوئی برف والی آئی۔ کھیرے کی برف۔ خربوزے کی برف، رنگترے کی برف۔ شربت کی برف۔ انگور کی برف۔ آم کی برف۔ فالسے کی برف۔ بادام کی برف۔ پستے کی برف۔ کھرچن کی برف۔ ملائی کی برف

ربڑی کی برف۔ لسی کی برف کے سوندھے سوندھے مٹی کے آبخورے جمے ہیں۔ یا جست کی قلفیاں ہیں۔ ہنڈا لے بیٹھ گئی۔ قلفیاں اور آبخورے کھول کھول کھلانے شروع کئے۔ یہ گئی، کا چھن آئی۔ رُت کی ساری ترکاریاں ہیں۔ فصل کے میوے ہیں۔ لئے اور کھائے۔ پھر دہی بڑے والی آئی۔ جل جیرے سونٹھ کا پانی۔ بتاشے۔ بوندیاں۔ بڑے۔ سونٹھ کے چھوارے۔ پھلکیاں۔ پتے۔ سموسے۔ منگوچھیاں۔ لونگ چڑے۔ قلمی بڑے۔ دال سیو۔ پپڑیاں۔ سیویاں۔ تلے ہوئے کابلی چنے آئی دے گئی۔ کہ اتنے میں کچالو والی آئی۔ امرود کے کچالو۔ آلو کے کچالو۔ پنڈالو کے کچالو۔ کچالو کے کچالو۔ کھیرے کے کچالو۔ کیلے کے کچالو۔ اُبلی مٹر کے کچالو۔ انناس کے کچالو۔ آم کے کچالو۔ پھوٹ کے کچالو۔ لوکاٹ کے کچالو۔ سنگاڑے کے کچالو۔ آڑو کے کچالو۔ ککڑی کے کچالو۔ جس ترکاری کی رُت ہوئی اُس کے کچالو بنائے۔ بارہ مصالحہ ڈالے۔ دکالی مرچ۔ لال مرچ۔ تستا مرچ۔ سانبھر نمک۔ لاہوری نمک۔ منہاری نمک۔ کالا نمک۔ سفید زیرہ۔ کالا زیرا۔) اور کھلائے۔ سی سی کر رہی ہیں۔ چٹوری زبان رُکتی نہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ کان سے رطوبت ٹپکے پڑ رہی ہے۔ آلو چھولے والی آئی۔ آلو چھولے طرح طرح کی گھنگنیاں دے گئی۔ حلوائین آئی۔ پستے کی لوز۔ بادام کی لوز۔ کھوپرے کی لوز۔ فالسے کی لوز، زعفرانی لوز، برفیاں۔ دال موٹ۔ دال بی جی۔ نکتیاں۔ دربہشت۔ امرتیاں۔ انگور دانے۔ موتی چور کے لڈو۔ بیسن کے لڈو۔ مونگ کے لڈو۔ میوے کا قلاقند۔ اندرسے۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں۔ کھجلے۔ جو موسم کی مٹھائی [illegible] دے گئی۔ کوابن آئی، [illegible] کے کواب، مچھلی کے کواب، گولی کے کواب۔ کلیجی کے کواب۔ بھیجے کے کواب۔ چڑیا کے کواب پسندے کے کواب، مولی کے کواب، گولر کے کباب، خوب چٹنی مصالحہ ڈال دے گئی۔ گھر میں بیٹھے ہمہ نعمت چلی آتی ہے۔ مالن پھول کنٹھے گجرے دے گئی، اپنا انعام لے گئی۔ منہاری طرح طرح کی چوڑیاں لائی پہنائیں اور اپنا نیگ لیا۔ دعائیں دیتی رُخصت ہوئی۔ عطر والی طرح طرح کے عطر۔ مسّی۔ کاجل۔ سرمہ۔ اگر۔ لوبان۔ صندل۔ خوشبو۔ چھیل چھبیلا۔ ناگر موتھا۔ بال چھڑ۔ کپور کچری۔ خوشبودار تیل۔ خوشبودار کھلیاں دے گئی۔ اپنی تقدیر کا انعام لے گئی۔ پکّے رنگ کے کپڑے جن میں کتھ اور نیل کا میل ہوتا رنگریزنیں رنگنے لے جاتیں۔ اجلی کے گھر کپڑے دھلنے جاتے۔ بیویوں کے کپڑے میل خورے کو دینے بے شرمی سمجھی جاتی، بلکہ شہر آبادی میں رومالیاں کھولکر رکھ لی جاتیں۔ کندے اور پائینچے الگ کرکے کھیپ میں دئے جاتے۔ چھوٹے کپڑے گھر ہی میں چھوچھوئیں دھو لیتیں۔ استری کا رواج نہ تھا۔ کلف کندی کی جاتی۔ کپڑے والی۔ گوٹے والی۔ بساطن۔ غرض کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ دُنیا کی ہر شے موجود ہو جاتی اور گھر میں مینا بازار لگ جاتا۔ سودے سُلف خرید و فروخت سے فرصت ہوئی تو گھر گھر پھرنے والیوں نے سارے شہر کی خبریں سُنا دیں۔ گھر گھر کا حال بتا دیا۔ بھلا اب اخبار کے پیچھے کون دیدے پھوڑے۔ اُن سے فرصت ہوئی رات کو کھانے کے بعد قصہ خواں عورتیں قصہ پڑھ رہی ہیں۔ داستان گو عورتیں داستان سنا رہی ہیں۔ کوئی پہیلیاں بجھوا رہی ہے، کوئی کہ مکرنی۔ ان مل۔ ڈھکوسلا سُنا رہی ہے۔ یہ نہ سہی ڈھولکی بجنے لگی۔ اور لگی چھوکریاں گانے ناچنے۔ تھک کر سو رہے۔ پھر صبح ہوتی اور وہی زندگی۔

بیویاں گلہریاں پالتیں۔ کبوتر پالتیں۔ لال۔ مینا۔ طوطے۔ پالے جاتے۔ بلّیاں بندر پالے جاتے۔ اور اکثر بیویاں اپنے شوق کے ناموں سے مشہور ہو جاتیں۔ جیسے بندر والی بیگم صاحب۔ گھر کے چمنوں میں جو درخت ہوتے اُس سے بھی مشہور ہو جاتیں۔ جیسے بیری والی بیگم صاحب۔ کھجور والی بیگم صاحب۔ املی والی بیگم صاحب نواب بھولا بیگم۔ کھٹولے پر بیٹھی رہتی تھیں اس لئے کھٹولے والی بیگم صاحب کہلاتی تھیں۔ نواب ولیداد خاں رئیس مالاگڑھ کی بیگم کی آنکھیں شہر بربادی کے ہنگامے میں جاتی رہی تھیں۔ اس کے بعد سے وہ اندھی بیوی کہلاتی تھیں۔

لو وقت تو ہوا ہو گیا۔ اللہ سب کی زندگیوں کی خیر رکھے اور لڑائی کا مُنہ جلدی کالا ہو جو دلوں کو چین اور اطمینان نصیب ہو۔ پھر آپ میری باتیں سُنیں۔ اللہ بیلی۔ اللہ نگہبان۔

(نظامِ ادب) **آغا حیدر حسن دھلوی**

نجم السحر

پانچہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراجِ کمال پر تھی تو رب عمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سنہرے محلوں میں آنکھیں کھولیں، پروان چڑھی جوان ہوئی اور پھر اسکی داستانِ عشق شروع ہوئی جو حد درجہ المناک ہے۔ ساحرہ آتشی کا جادو، ثوران کے مظالم، کیفر کی پُراسرار ہستی، اشمعون نجومی کی سحر آفرینی، غرض اُس زمانے کے تمدن معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا۔ اسکے دورانِ مطالعہ میں آپکو معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش قلم آپ حال کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ضخامت ۴۱۰ صفحات۔ قیمت عہ
ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو، دہلی

ردِ عمل

انگلستان میں چھ سال کے قیام نے حسین کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جب وہ یورپ کی آزادانہ زندگی سے اپنے آبائی دیہاتی ماحول کی بندشوں اور بے سبب رکاوٹوں کا مقابلہ کرتا تھا تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی یورپ میں گُذار دے۔

"اُف ہم ہندوستانی مرد عورتوں کے ساتھ کس قدر نامنصفانہ سلوک کرنے کے عادی ہو گئے ہیں" وہ اکثر سوچتا۔ "ہم نے خود ذہنی نشوونما اور ترقی کے سارے دروازے اُن پر بند کر رکھے ہیں لیکن سمجھتے اور کہتے یہ ہیں کہ عورتیں جسمانی اور دماغی طور پر ہم سے اس درجہ پست ہیں کہ ہم اُن سے مساویانہ برتاؤ کر ہی نہیں سکتے۔" انگلستان کی عورتوں کا کلچر، اُن کی تعلیم، اُن کی طرز زندگی سے وہ اس درجہ متاثر ہو گیا تھا کہ وہ اُنہیں نسائیت کا اعلیٰ ترین اور قابل رشک نمونہ سمجھنے لگا تھا۔ ابتدا میں کھانے کی میز پر جب وہ اپنی لینڈ لیڈی کی لڑکیوں کو سائنس، فلسفہ، بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کرتے سنتا تو اس کے کان میں اپنی ماں اور بہنوں کی گھریلو باتیں، ماماؤں کے قصے قضیئے، ہمسایوں کے خانگی معاملات کے تذکرے گونجنے لگتے اور اُس وقت اُسے آپ ہی آپ اپنے اُوپر شرم سی آنے لگتی۔ اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ اُن لڑکیوں کی عام معلومات کا ذخیرہ اُس کے اپنے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ وہ برابر سے یہ سمجھتا آیا تھا کہ مرد عورت سے صرف جہالت تنگ نظری پست خیالی اخذ کر سکتا ہے لیکن انگلستان میں وہ حیرت کے ساتھ محسوس کرتا تھا کہ عورتوں کی روزمرہ ملاقاتوں اور گفتگو سے خود اُس کی واقفیت اور علم میں روز روز اضافہ ہو رہا تھا۔ "عورت بھی مرد کی افزونیٔ علم و دانش کا ذریعہ بن سکتی ہے!" اُسے یہ مشاہدہ شروع میں عجیب سا معلوم ہوا تھا۔

یورپ کی زندگی نے حسین کو اس کا کامل یقین دلا دیا تھا کہ عورت مرد سے مساویانہ حقوق طلب کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ "کوئی وجہ نہیں کہ مرد اپنے مقابلہ کی ایک ہستی کو اس طرح پامال کرتا رہے۔ عورتوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں اس حد تک آزادی ملنی چاہیئے جتنی مرد کو حاصل ہے۔ انہیں اپنی زندگی کی باگ ڈور آپ سنبھالنے دینا چاہیئے۔ وہ اپنے اچھے بُرے کی آپ تمیز کر سکتی ہیں۔ مرد کو کیا حق ہے کہ انکے افعال و کردار پر اپنے فیصلے منضبط کرتا رہے؟"

حسین نے اکثر ارادہ کیا کہ وہ اپنی دوستوں میں سے کسی ایک کو اپنی شریکِ زندگی بنالے۔ لیکن وہ برابر اس ارادے کی تکمیل کو ملتوی کرتا رہا۔ "اس میں جلدی کیا ہے۔ ہندوستان واپس جاتے وقت دیکھا جائے گا" یہانتک کہ ہندوستان کی واپسی کا وقت آگیا اور حسین اپنی ایک عزیز ترین دوست سے شادی کا وعدہ لیکر سینہ میں داغ مفارقت چھپائے انگلستان سے روانہ ہو گیا۔ ہندوستان پہونچکر حسین ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا اور شادی ملازمت کے حصول پر ملتوی رکھی گئی۔ عرصے تک بیکار کوششیں کرنے کے بعد حسین کو کلکتہ میں ایک بنک کی منیجری مل گئی۔ تنخواہ اتنی نہ تھی کہ حسین ایک یورپین بیوی کے اخراجات کی کفالت کر سکتا۔ پھر ایک عرصے کی مسلسل علیحدگی کے بعد "چہ از دیدہ دور از دل دور" کے مصداق محبت کی آگ بھی کچھ مدھم سی پڑ گئی۔ خلاصہ یہ کہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ اور حسین کو اپنی نظرِ انتخاب ہندوستانی لڑکیوں کی طرف پھیرنی پڑی۔ لیکن اس کا معیار کافی بلند تھا۔ "لڑکی نہایت تعلیم یافتہ ذہین اور روشن خیال ہو۔ اعلیٰ سوسائٹی میں ملنے جُلنے کے قابل" کوئی ہندوستانی لڑکی اس کی نظر میں جچتی نہ تھی۔

حسین نے مس خالدہ بی۔ اے۔ سے شادی کر لی۔ شادی دفعتاً نہیں ہوئی۔ پہلے ملاقاتیں ہوئیں، پھر دوستی پیدا ہوئی اور آخر میں شادی۔ حسین جیسی بیوی چاہتا تھا اُسے مل گئی۔ خالدہ خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ، روشن خیال اور ساتھ ہی فنون لطیفہ کی ماہر۔ سوسائٹی کی اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں اُس کی آؤ بھگت ہوتی تھی اس کی بدولت حسین کے تعلقات کلکتہ کے اُن گھرانوں سے پیدا ہو گئے جہاں شادی سے قبل وہ کسی کی سفارشی چٹھی لیکر بھی مشکل سے پہونچ سکتا تھا۔

"کیوں آج بنرجی کے یہاں پارٹی میں نہ جاؤ گی؟ ۹ بجے ہیں۔ پانچ بجے کا وقت ہے نا۔ تم نے تو اب تک کپڑے تک نہیں بدلے ہیں۔"

"نہیں میں تو آج نہ جاسکونگی۔"

"کیوں؟" حسین نے تعجب سے سوال کیا۔

"جانتے ہو۔ دسمبر میں آل انڈیا آرٹ اگزیبیشن ہونے والی ہے۔ میں نے ابتک اپنی تصویر کا موضوع تک نہیں سونچا ہے۔ تمہیں یاد ہے، جمالی میری پچھلی تصویر کی کس قدر تعریف کر رہا تھا۔ جمالی خود آرٹسٹ بھی ہے اور آرٹ کا نقاد بھی۔" خالدہ کے چہرے پر اس کیفیت کی جھلک نمایاں تھی۔ جب ہم کسی ممتاز شخصیت سے متاثر ہو کر محظوظ ہوتے ہیں۔ حسین نے اسے محسوس کیا اور اس کا چہرہ بے رونق ہوگیا۔ "آج ۵ بجے وہ آئے گا۔ مجھے اُسے لانے کیلئے اسٹیشن جانا ضروری ہے۔ میری طرف سے بنرجی سے معافی مانگ لینا۔"

"لیکن کیا ضرور کہ تم خود لانے جاؤ۔ شوفر کو......"

"نہیں جمالی بڑا ذکی الحس ہے۔ آرٹسٹ فطرتاً ذرا نازک مزاج بھی ہوتا ہے۔ گرچہ میں اس سے مستثنےٰ ہوں۔" خالدہ نے حسین کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے اپنا رخسار اُس کے ہونٹ کے قریب کر دیا۔ حسین نے خالدہ کا بوسہ لے لیا۔ لیکن بالکل اضطراری طور پر بے کیفی کے ساتھ۔ حسین کو خود اس کا احساس بھی ہوا۔

"اچھا۔ تو کیوں نہ جمالی کو تم ساتھ لیتی آجاؤ۔ کچھ دیر ہی ہو جائیگی تو کیا؟"

"جمالی یونہی بے بلائے وہاں پہونچ جائیگا؟ وہ تم سے زیادہ شریف اور باعزت ہے۔" خالدہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو تم نہیں آؤ گی؟" حسین نے شکست خوردہ آواز میں پوچھا۔

"کیسے آسکتی ہوں؟"

"اچھا تو پھر تم کار اسٹیشن لے جاؤ گی؟ میں ٹیکسی منگوا لیتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

ٹیکسی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ حسین کے دماغ میں بے ربط خیالات کا سلسلہ بن رہا تھا۔ "خالدہ کی جمالی سے دوستی مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر ہے۔ دونوں آرٹسٹ ہیں۔ آرٹ آخر ہے کیا؟ اور پھر کلاسیکل آرٹ۔ مجھے تو ایک بے معنی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ رفائل، جبرئیل، مانی آخران کی مقبولیت کا کچھ باعث بھی تو ہوگا؟ مگر کیا۔ مختلف اوقات میں انسانی دماغ میں اثر پذیر ہونے کی مختلف صلاحیتیں نمو رہتی ہیں۔ بعض وقت ہمیں ساری چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کسی کو موقع سے اُن کی تصویریں بھلی معلوم ہوگئی ہونگی۔ دو چار کے نزدیک اُس نے تعریفیں کر دیں۔ زیادہ تر انسان دوسروں کے فیصلہ پر اچھو بُرے کی تمیز کرنے کے عادی ہیں۔ اِن تعریفوں کے زیر اثر انہیں بھی یہ تصویریں اچھی معلوم ہونی ہونگی۔ پروپیگنڈا ہوگیا۔ رفائل اور مانی پیدا ہوگئے۔ بعد کی نسلیں ان کی روایتی تعریفوں سے متاثر ہو کر اُن پر نظریں ڈالتی رہیں۔ انہیں بھی یہ اچھی ہی معلوم ہوتیں۔ محسوسات کا معاملہ ہے۔ فلسفہ یا ریاضی کا مسئلہ نہیں کہ اُن کی صحت و غیر صحت ثبوت یا دلائل کے ذریعے پرکھی جاسکتی۔ آرٹ وارٹ صرف ڈھکوسلا ہے۔ فرائڈ بھی تو یہی کہتا ہے۔ انسان کی فطرت ادنےٰ اس کی آئیڈیل (مثالی) شخصیت کو دھوکہ دیکر آرٹ کے بھیس میں اپنی تسکین کرتی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کمزور شخصیتیں آرٹ کی مداح ہوسکتی ہیں۔ جنہیں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی قوت نہیں۔ میں ان شخصیتوں میں نہیں! حقیقت کا مقابلہ اس کے اصلی رنگ میں کرنا چاہیئے۔ میں اگر اپنے نفسانی محرکات سے مغلوب ہو جاتا ہوں تو کامل اعتراف کے ساتھ۔ لیکن یہ احمق آرٹسٹ خود کو اور اپنے ساتھ ایک عالم کو مبتلائے فریب کر کے انہیں ترغیبات کے شکار ہوتے ہیں۔ شاید خالدہ کو آرٹ سے روشناس جمالی ہی نے......" موٹر بنرجی کے دروازے پر رُکی اور حسین کوٹھی میں داخل ہوگیا۔

کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی کے بیشتر افراد پارٹی میں موجود تھے۔ حسین ان سبھوں سے پوری طرح روشناس ہو چکا تھا۔ ان میں سے ہر شخص حسین سے خالدہ کے نہ آنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ حسین کو ان کے سوالات سے تکلیف ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا یا اس لئے کہ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ یا اس لئے کہ خالدہ کا اُس کے ساتھ نہ ہونا خود اُسے بھی شاق گذر رہا تھا۔

"آپ تنہا کیوں ہیں؟ مسز حسین کو کہاں چھوڑا؟ آئیں گی نا؟" بنرجی نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

حسین نے محسوس کیا کہ بنرجی کو اس کے آنے کی کوئی خوشی نہ تھی، اُسے صرف خالدہ کے نہ آنے کا افسوس ہو رہا تھا۔ حسین کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ پارٹی میں حسین کا مطلق جی نہ لگا اور وہ بنرجی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے پارٹی ختم ہونے سے قبل واپس ہوگیا۔

خالدہ جمالی کو لیکر آچکی تھی۔

"تم آگئے۔ بہت جلد فرصت ہوگئی۔ جمالی اس کمرے میں ہے۔ تم کھانا تو نہ کھاؤ گے؟ میں ابھی آئی۔" خالدہ نے یہ ساری باتیں ایک ساتھ کہہ ڈالیں اور حسین کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ حسین کو اس کا یہ انداز غیر سنجیدہ معلوم ہوا۔ وہ جمالی کے کمرے میں پہونچا۔

جمالی کپڑے اُتار کر قدِ آدم آئینے کے سامنے بال دُرست کر رہا تھا۔ کمرہ میں قدم رکھتے ہی حسین کو جمالی کا عکس نظر آیا۔ دُبلا پتلا جسم، ضرورت سے زیادہ لمبی ناک پتلی پتلی خمدار اُنگلیاں گھونگریالے بالوں کے پیچ وخم میں اُلجھی ہوئیں۔

"ایسے عورت ہونا چاہیئے تھا" حسین کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا۔

جمالی نے حسین کے قدموں کی آہٹ پاکر مڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

"ہلو مسٹر حسین۔ پارٹی سے اس قدر جلد فرصت ہوگئی؟" حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے جمالی چاہتا ہو کہ وہ پارٹی سے دیر سے واپس آتا۔

"ہاں میں قبل ہی چلا آیا"

"میں بھی ان پارٹیوں سے زیادہ تر جلد ہی بھاگ جایا کرتا ہوں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح مختلف خیال اور مختلف مذاق کے لوگ اگر ایک جگہ اکٹھا ہو گئے تو اس میں تفریح کون سی ہوئی۔ آپ جانتے ہیں مجھے آرٹ سے دلچسپی ہے۔ اگر ایک عامیانہ اور غیر لطیف مذاق کا انسان میرے برابر پارٹی میں بیٹھ جائے اور مجھ سے چھیڑ چھیڑ کر میونسپلٹی اور کونسل کے انتخابات پر گفتگو کرنے لگے تو آپ ہی بتایئے اس سے سنگین سزا میرے لئے اور کونسی تجویز کی جاسکتی ہے"

حسین نے ایسا محسوس کیا کہ جمالی کا روئے سخن اسی کی طرف تھا۔

"شاید آپ میرے اس خیال سے متفق ہونگے کہ ہمارا سماجی دماغ اب تک اس درجہ دقیانوس اور پست ہے کہ ہمارے بیشتر افعال بے معنی اور مہمل ہونے کے باوجود اپنے اندر ہمارے لئے جاذبیت رکھتے ہیں۔ صاحب میں تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے وہ افراد جنہیں اپنی ترقی اور اپنے کلچر پر ناز ہے اسی حد تک روایتی رسوم وقیود کے پابند ہیں جس قدر ایک سیدھا سادا دیہاتی کاشتکار۔ یقین مانیئے مجھے تو کوئی آدمی ملنے کے قابل نظر نہیں آتا۔ شاید آپکو بھی اس کی واقفیت ہوگی کہ سوسائٹی میں میں سوشل نہ ہونے کی بنا پر کافی بدنام ہوں"

"دُرست ہے" حسین نے غیر ارادی طور پر کہا۔ اُسے جمالی کے کیریکٹر میں ایک غالب عنصر نظر آرہا تھا "یہ شخص بڑا مغرور ہے"

"اچھا مسٹر جمالی آپ آرام سے کپڑے وغیرہ اُتار کر ٹھیک ہو جایئے۔ پھر ملاقات رہیگی"

تھوڑی دیر بعد جمالی، حسین اور خالدہ کھانے کے کمرے میں پہونچے۔ حسین نے جمالی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اُسکی بغل میں دوسری کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ خالدہ میز کی دوسری طرف بیٹھی۔ گرچہ آدابِ نشست کے اعتبار سے اُسے جمالی کے بغل میں بیٹھنا چاہیئے تھا۔ اُسے خود اِن باتوں کی چنداں پروا نہ تھی لیکن حسین ان کا سخت پابند تھا۔ اُسے حسین کی اس فروگذاشت پر کچھ اچنبھا سا ہوا۔

"آرٹ اکزبیشن کے لئے آپ اپنی تصویر مکمل کر چکے ہونگے، مسٹر جمالی؟" حسین نے پوچھا۔

"میں نے ایک تصویر تو ان دنوں بنائی ہے لیکن اکزبیشن کے لئے نہیں۔ سچ پوچھیئے تو میں آرٹ کی نمائش کا قائل نہیں۔ صنعت وحرفت کی نمائش میری سمجھ میں آسکتی ہے۔ تجارتی دُنیا میں اشتہار کی ضرورت پیشہ ربائی ہے اور صنعت وحرفت کے اشتہار اور اُن کے فروغ کا نمائش سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن آرٹ کی نمائش کے معنی کیا ہوتے؟ آرٹ کا مقصد صنعت وحرفت کے مقاصد سے بالکل جُداگانہ ہے۔ صنعت وحرفت کی غرض وغایت مُلک کی معاشی واقتصادی حالت کی سدھار ہے۔ برخلاف اس کے آرٹ کسی خارجی ضرورت کی فراہمی نہیں کرتا۔ آرٹ کا صحیح نصب العین آرٹ فور آرٹ سیک (آرٹ آرٹ کیلئے) ہے۔ میں تو آرٹ کو ذریعہ شہرت تک سمجھنا آرٹ کے لئے ناروا سمجھتا ہوں۔ چہ جائیکہ آرٹ کو صنعت وحرفت کی صف میں لاکر اُسے بھی کسب معاش کا ذریعہ بنایا جائے۔ صنعت وحرفت کا تعلق خالص ہماری مادّی اور خارجی ضروریات سے ہے۔ آرٹ کا لگاؤ ہماری وجدانی اور تجلّیاتی تسکین سے۔ آرٹ کی تخلیق اور صنعتی ایجاد کا بُنیادی فرق ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صنعت کے ذریعے ہم فطرت کے مادّی خزانوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ فطرت تنہا ہماری بڑھتی ہوئی عملی ضرورتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ مادّے کی فطرتی ترتیب میں اُلٹ پھیر پیدا کر کے اُسے فکرِ انسانی کے وضع کردہ سانچوں میں ڈھالنا ہی صنعت کا کمال ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے لئے نئے نئے ایجادات پیش کرنا سائنس کا مقصدِ عالی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ سائنس کی بلندی وپستی کی جانچ اس کے عملی نتائج کی روشنی میں ہوسکتی ہے۔ برخلاف اس کے آرٹ کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنی کارخانوں کو معطل کر کے اپنی صنعتی صلاحیتوں سے دست بردار ہوجائیں اور پھر وجدانی شعاعوں کی باریک کرنوں سے اُس نقاب کو اُدھیڑ پھینکیں جو فطرت کے چہرے پر ذہن نے کمال احتیاط کے ساتھ بن رکھی ہے۔ آرٹسٹ فطرت میں جذب ہو کر فطرت کا نبض داخلہ

مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا آرٹ اسی مشاہدہ کی نامکمل ترجمانی ہے۔ میرا خیال ہے مسٹر حسین دُنیا تیزی سے پستی کی طرف جا رہی ہے۔ انسانی دماغ کا فطری تنوّع جس کے ذریعے وہ زندگی کے مختلف پہلو پر جداگانہ نگاہ ڈال سکتا تھا رفتہ رفتہ اپنا اثر کھوتا جا رہا ہے ہم ہر چیز کو ڈیا کریٹک اصول پر رکھنے لگے ہیں۔ آرٹ کی جانچ پرتال کے لئے بھی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جن کے فیصلوں کا انحصار مجالس قانون ساز کی طرح کثرت آرا پر ہوتا ہے۔ لیکن آپ تصوّر کیجئے آرٹ کو جمہوریت کے پابند کرنا کیسی ناش غلطی ہے۔ سوشلزم مجھے بھی اچھی لگتی ہے لیکن اس نوع کی نہیں جس میں انسان کی انفرادی صلاحیتوں کا فرق نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ عوام اور خواص کا فرق مادّی ضرورتوں اور خارجی آرام و آسائش کے اعتبار سے مٹایا جا سکتا ہو۔ لیکن فطری اور خصوصاً جمالیاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے عوام اور خواص کا فرق قطعاً غائب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہی فرق زندگی کے ارتقائی منازل کا آئینہ ہے۔ اس کو مٹانے کی کوشش زندگی کی ارتقا کا منکر ہونا ہے۔ زندگی اپنا ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ چند خصوصی صلاحیتوں کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے تخلیقی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے زندگی ایک لمحے کو اپنی فنکاری پر ناز کرتی ہوئی ٹھٹک جاتی ہے۔ لیکن بہت جلد ہی یہ صلاحیتیں عام ہو کر پیرایہ بن جاتی ہیں۔ زندگی دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ ارتقا اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اور شاید ہوتا رہے گا۔ کوئی اسے کس طرح روک سکتا ہے؟ سوشلزم اور بالشوزم کا سیلاب تو خود زندگی کے فطری تلاطم کا ایک وقتی اور عارضی مظہر ہے۔ اس کی رَو اگر زندگی کے دھارے کے خلاف جا رہی ہے تو بہت جلد فنا ہو جائے گی۔ دریا کی سطح کا تموّج کبھی دریا کے بہاؤ کا راستہ نہیں مقرر کر سکتا۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں مارکس اور لینن کی سوشلزم موجودہ سیاسی ہیجان میں کس طرح اپنے اصولی راستہ سے بھٹکتی چلی جا رہی ہے۔"

"اُف۔ تم لگے فلسفہ بکنے۔ شاید آپ کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ آپ نے اس وقت ایک خاص لمبی تقریر فرما دی۔ جمالی تم نے کبھی خموش رہ کر بھی کھانا کھایا ہے؟" خالدہ نے اُکتا کر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے جمالی کیلئے کئی خاص چیزیں پکوائی تھیں جنہیں جمالی گفتگو کی رَو میں قطعاً بے توجہی کے ساتھ کھا رہا تھا۔

"معاف کرنا خالدہ میں بھول گیا تھا۔ تمہیں میری گفتگو پسند نہ آئی ہوگی۔ تم تو ہر سال نمائش میں تصویر بھیجا کرتی ہو" خالدہ کھسیانی سی ہو گئی "یہ میرے ذاتی خیالات تھے ممکن ہے تمہیں ان سے موافقت نہ ہو۔ ٹھیک ہے۔ تم عورت ہو۔ عورت کی فطرت میں نمائش ضروری ہے۔ کیا عجب ہے فطرت نے اپنے جمالی پہلو کے نمود کی غرض سے عورت کی تخلیق کی ہو۔ اور عورت کی شخصیت کا راز فطرت کے اسی ارادے کی تکمیل ہو۔ پھر تو عورت اور نمائش لازم و ملزوم ہیں۔ اگر میری گفتگو تمہیں پسند نہ آئی ہو، تو میں خوشی سے واپس لے سکتا ہوں" جمالی نے ملتجیانہ نگاہ سے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جمالی تم باوجود فلسفی ہونے کے نرے احمق ہو" خالدہ نے ہنس کر جواب دیا۔

"ہاں۔ احمق اور فلسفی تو ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں" حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

"حسین کو اس طرح نہ کہنا چاہئے تھا" خالدہ نے محسوس کیا۔

کھانا ختم ہوا اور جمالی شب بخیر کہکر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

حسین اور خالدہ سونے کے کمرے میں آئے۔

"تمہیں جمالی کو اس طرح احمق نہ کہنا چاہئے تھا"

"لیکن میں نے تو تمہارے بعد کہا"

"مجھ سے تو اس کے دیرینہ تعلق ہے۔ تم سے وہ اتنا بے تکلف نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے اُسے بُرا لگا ہو"

"اُسے بُرا لگا ہو یا نہیں لیکن تمہیں ضرور بُرا لگ رہا ہے" حسین نے ترشروئی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میرے دوست کی توہین میری اپنی توہین ہے۔" خالدہ نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"ہوا کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جمالی کی شخصیت پر کیوں اس قدر فدا ہو۔ مجھے تو وہ ایک نہایت مغرور انسان معلوم ہوتا ہے۔ حد درجہ خودبین اور خودپسند۔ ساری بکواس کی غرض اس کی اپنی خودستائی تھی۔ سمجھتا ہے کہ اس جیسا روشن دماغ اور بلند نظر کوئی دوسرا انسان نہیں ــــ"

"حسین! میں جمالی کی شان میں یہ توہین آمیز جملے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اُس کی شخصیت کی عزّت کرتی ہوں" خالدہ چادر میں مُنہ ڈھانک کر لیٹ گئی۔

"دوسرے دن صبح حسین حسب معمول دفتر کے کام میں مصروف ہو گیا اور ۱۱ بجے چلا گیا۔ اس کی طبیعت کام میں نہ لگی اور وہ سویرے ہی دفتر سے واپس چلا آیا۔ خالدہ اور جمالی باہر گئے ہوئے تھے۔ حسین آرام کرسی پر دراز ہو گیا اور خیالات کے سمندر میں بہنے لگا۔ خالدہ کی جمالی سے

دوستی کب سے ہے؟ خالدہ کے تعلقات خود اس کے ساتھ نہایت ناگوار معلوم ہوتے۔ اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ پھر خالدہ اس قدر برافروختہ کیوں ہوگئی؟ خالدہ، جمالی کو چاہتی تو نہیں؟" اس خیال سے اس کے دماغ میں ایک ناخوشگوار دھندلکا چھا گیا۔ "نہیں دونوں کی دوستی ہے مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر۔ لیکن مذاق کی ہم آہنگی اتنا گہرا تعلق پیدا نہیں کر سکتی؟ خالدہ جمالی کی شخصیت کا احترام کرتی ہے۔ لیکن اتنا زیادہ کہ جمالی کے خلاف ایک بات سُن نہیں سکتی؟ کیا واقعی خالدہ جمالی کی شخصیت کی صرف عزت کرتی ہے؟" اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے اس سوال کا جواب اُسے اثبات میں مل جاتا۔

خالدہ اور جمالی کمرے میں داخل ہوئے۔ خالدہ حسین کو اس وقت بہت زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اور جمالی حسین کی نگاہ میں پس منظر کا کام کر رہا تھا۔ خالدہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ حسین کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ اس نے اُسے کبھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ حسین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"ہم لوگ کل ایک ہفتہ کے لئے دارجلنگ جا رہے ہیں۔ اکزبیشن کے اب کم ہی دن رہ گئے ہیں۔ یہاں تو ایک منٹ چین سے بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر ایک ہفتہ کے لئے بھی یہاں کی ہنگامہ آرائیوں سے دُور نہ ہو جاؤں گی تو پھر اس دفعہ اکزبیشن میں میری تصویر نہ جا سکیگی۔ گرچہ مسٹر جمالی اُسے ایک حماقت سمجھتے ہیں۔ کیوں صاحب ـــ؟" خالدہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

حسین کو وہ اس وقت بہت زیادہ حسین معلوم ہوئی۔ شاید وہ کبھی اتنی حسین نظر نہ آئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جمالی اس وقت اس جگہ نہ ہوتا۔

"کل جاؤ گی؟" حسین نے کچھ دیر خموشی کے بعد یکبارگی سوال کیا۔ جیسے وہ دفعتاً چونکا دیا گیا ہو۔

"ہاں کل ہی تو"

"کس وقت؟"

"صبح سویرے یہاں سے روانہ ہونگی"

"کیا جانے کا فیصلہ قطعاً کر چکی ہو؟"

"کیا کروں بغیر جاتے بنے گا نہیں"

"اچھی بات ہے" حسین نے جملہ کافی دیر میں ادا کیا جیسے کوئی اس سے زبردستی بلوا رہا ہو۔

"تم دفتر سے ابھی آئے؟"

"ہاں!" حسین نے جواب کے اختصار کو راست گوئی پر ترجیح دی۔ شاید اس لئے کہ وہ اس وقت اس سے زیادہ کچھ بول نہ سکتا تھا۔

خالدہ اور جمالی دارجلنگ چلے گئے۔ خالدہ کے جانے کے بعد حسین طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اُسے رات بھر نیند نہ آتی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے پراگندہ خیالات مجتمع رہتے۔ وہ کبھی فیصلہ کرتا کہ تار بھیجکر خالدہ کو واپس بلا لے لیکن اُسے خود اپنا یہ فیصلہ حماقت آمیز معلوم ہوتا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی مرض میں مبتلا ہو رہا ہو۔ اُس کی بھوک مردہ ہوگئی تھی، وہ اپنے قلب کی رفتار میں اضمحلال محسوس کرنے لگا تھا۔ اپنی اس کیفیت کا کوئی سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

خالدہ کی روانگی کے چوتھے دن اُس نے یکبارگی فیصلہ کیا کہ وہ اسے تار بھیجکر بلا لے گا۔ اُسے اپنے فیصلہ پر بھروسہ نہ رہا تھا اسلئے اس نے فوراً اس پر عمل کر ڈالا۔ تار چلا گیا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ خالدہ کے سامنے کونسا عذر پیش کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ اُس نے اپنے دماغ کو جذبے کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ "خالدہ کو مدناپور بھیجدونگا۔ کلکتہ سے دُور، یہاں کی مسموم اور گناہ پرور فضاؤں سے دُور، دیہات کی سادہ اور معصوم آب و ہوا میں۔ اُسے کچھ دن وہیں رہنا چاہئے"۔ مگر کیوں۔ اس نے اپنے دماغ سے کبھی یہ سوال نہ کیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اُسے کوئی جواب نہ مل سکتا تھا۔

خالدہ دوسرے دن دارجلنگ سے واپس آگئی۔ سہمی ہوئی، طرح طرح کے توہمات سے۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نظر حسین پر ڈالی۔ حسین کا چہرہ اُسے بے رونق معلوم ہوا۔ انتشار آگیں۔ اس نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت۔ تم نے تار میں سبب نہ لکھا۔ میں راستے بھر طرح طرح کے خیالات سے الجھتی رہی۔ خدا کا شکر ہے تمہیں بخیر پا رہی ہوں۔ جلد کہو کیا بات ہے"

"کل ہمیں ایک خاص ضرورت سے مدناپور چلنا ہے۔ اسی لئے تمہیں بلانا پڑا"

"آخر کونسی ضرورت ہے" خالدہ نے بے رُخی سے سوال کیا۔

"میں تمہیں بعد میں بتاؤنگا"

"لیکن میں تو ابھی جاننا چاہتی ہوں۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تمہیں مجھے مدناپور جانے کا

سبب بتانا ہی ہوگا۔"

"نہیں میں ابھی نہیں بتاؤ نگا۔"

"تمہیں بتانا ہوگا۔" خالدہ کا چہرہ غصّہ سے گلابی ہوگیا۔

"میں نہیں بتا سکتا۔" حسین نے بے اثری سے کہا۔

"تو پھر میں بھی مدنا پور نہیں جاسکتی۔" خالدہ نے مُنہ پھیرتے ہوتے کہا۔

"تمہیں جانا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں تم کس طرح نہیں جاتیں۔ تم میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتیں۔ میں نے تمہیں سرچڑھا رکھا ہے، تم عورتیں کبھی اس برتاؤ کی مستحق نہیں۔ تمہاری قوم کبھی اس قابل نہیں کہ اُسکے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ میں تمہاری خودسری اب ایک منٹ کو برداشت نہیں کرسکتا۔" حسین غصّہ سے تھرّا رہا تھا۔

خالدہ نے اُسے کبھی اس طرح غصّہ ہوتے نہ دیکھا تھا اور وہ بھی اپنے اُوپر۔ اس کے حواس مختل ہو گئے۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اُس کی حلق میں پھنس گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ زار و قطار۔ حسین کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن حسین، خالدہ کو مدنا پور لے گیا اور اُسے وہیں چھوڑ کر کلکتہ واپس چلا آیا۔

حسین کا آبائی گھرانہ نہایت قدامت پرست، رسم و رواج کا پابند اور موجودہ تہذیب و تمدّن سے ناآشنا تھا۔ اُس کی ماں ایک پُرانے خیال کی عورت تھی جو مکان کی چہار دیواری کے اندر بند رکھا جانا اپنا فطری حق سمجھتی ہے اور جس کے نزدیک گھر سے باہر قدم نکالنا جلا وطن کر دئے جانے کے برابر ہے۔ جو گھر سے باہر نکلنے والی عورتوں سے پردہ کرنا اتنا ہی ضروری سمجھتی ہے جتنا کسی غیر مرد سے۔ حسین کی آزادانہ روش اُس کی ماں کو مطلق پسند نہ تھی اور حسین کی خالدہ سے شادی اُس پر نہایت شاق گزری تھی۔ ایسے ماحول میں خالدہ کس طرح زندگی گذار سکتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دماغی صلاحیتیں رفتہ رفتہ معطّل ہو کر مفقود ہو جانے والی تھیں۔ اُس نے حسین کو اپنے کلکتہ آنے کے متعلق متواتر خطوط لکھے لیکن حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حسین کی اس خاموشی کا راز کیا تھا حسین نے اُسے مدنا پور کیوں بھیجدیا۔ حسین اپنے گھر کی فضا سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ وہ اس فضا میں رہنا ایک منٹ کے لئے بھی پسند نہ کرتی تھی۔ حسین خود بھی تو اپنے والدین کی قدامت پسندی اُنکی دقیانوسی روش کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ پھر اُس میں دفعتاً ایسا انقلاب کیوں پیدا ہوگیا؟ اُسے حسین پر غصہ آنے لگا جس نے رفتہ رفتہ نفرت کی صورت اختیار کرلی۔ حسین اُسے ایک مکّار، فریبی، خودغرض انسان معلوم ہونے لگا جس کی موجودہ تہذیب و تمدّن پر فریفتگی ایک کھوکھلی نقّالی تھی۔ اُسے اب تک حسین کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی رہی تھی۔ وہ اُسے ابتک ایک روشن خیال، صحیح معنی میں ترقی یافتہ اور سمجھدار انسان سمجھتی رہی تھی لیکن اب اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا۔ وہ اس حالت میں اپنی زندگی کا باقی ماندہ حصہ حسین کے ساتھ کس طرح گذار سکتی ہے؛ لیکن خالدہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ حسین سے کس طرح علیحدہ ہوجائے اُس کا دماغ کچھ روز تک ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ ذہنی کشاکش کے برداشت کی قوّت اس میں باقی نہ رہی اور اُس نے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق فیصلہ کرلیا۔" وہ مدنا پور سے کہیں بہت دُور چلی جائے گی۔"

رات کے بارہ بجے وہ بستر سے اُٹھی۔ اُس نے حسین کے نام خط لکھا اور پو پھٹنے سے قبل دبے پاؤں مکان سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دی اسٹیشن پہونچکر لیٹر بکس میں اُس نے خط ڈالا اور جو پہلی گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی اُسے کلکتہ اور حسین سے دُور لے گئی۔

حسین دفتر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اُسے خالدہ کا خط ملا۔ خط مختصر تھا۔

"میں تمہاری غایت مشکور ہوں کہ تم نے مجھے ایک گہری غلط فہمی سے نجات دلادی۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے جو دن گذرے میں نے اُنہیں حروف غلط کی طرح مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ گویا میری زندگی کا گذشتہ ایک سال مجھے واپس مل گیا ہو اور مجھے پھر اُسے اپنے طور پر گذارنے کا حق حاصل ہو۔ اس سودے کے لئے میں صرف ایک ہی قیمت ادا کرسکتی تھی، یعنی یہ کہ ہمیشہ کیلئے کلکتہ اور وہاں کے تعلّقات سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ میرا یہ فیصلہ صرف میرے ہی نجات کا سامان بہم نہیں پہونچائیگا، مجھے یقین ہے کہ یہ تمہیں بھی مطمئن کر دیگا۔"

خط پڑھکر حسین دفعتاً کرسی پر گر گیا۔ اُس کے دماغ میں متضاد خیالات تیزی کیساتھ اُبھرنے لگے۔ "خالدہ چلی گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ اپنے جمالی کے پاس گئی ہوگی۔ ذلیل کمینہ انسان! وہ اُسے خاک میں ملا کر چھوڑیگا۔ ٹھیک ہے۔ خالدہ کو اپنے کرتوت کی سزا ملنی چاہیئے۔" اسکے چہرے پر وحشیانہ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ "لیکن خود اُسے بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔" اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "خالدہ اُسے رسوائی اور ذلّت کا شکار بنا کر چلی گئی۔ وہ کسی کو کس طرح مُنہ دکھا سکے گا؟ نہیں وہ کمال احتیاط سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش

کریگا۔ اُس سے فوراً گھر ایک تار روانہ کر دیا: "خالدہ یہاں آگئی ہے آپ لوگ مطمئن رہیں"۔

خالدہ جب سے کلکتہ سے گئی تھی کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں اس کی کمی کافی محسوس کی جا رہی تھی۔ ہر ملاقاتی حسین سے اس کے متعلق سوال کرتا۔ حسین نے لوگوں کے استفسار کے ڈر سے دفتر کے سوا دوسری جگہ آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ خالدہ کے بھاگ جانے کے بعد اسکے لئے دفتر جانا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا کہ خالدہ کے غائب ہونے کی خبر دوسروں کو مل نہ چکی ہو۔ کہیں کوئی راستہ میں اس سے اس کی بابت سوال نہ کر دے۔ اُسکے کمرے میں کسی کے آنیکی آہٹ سنائی دیتی تو اسکا دل دھڑکنے لگتا۔ شاید آنے والا اس سے خالدہ کے بھاگنے کا سبب پوچھنے آ رہا ہے۔ اس نے دفتر سے طویل رخصت لیلی اور مدنا پور چلا گیا۔ گھر والوں پر وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ خالدہ کلکتہ میں ہے۔

حسین کی رخصت ختم ہونے کو آئی لیکن اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی قوت اُس کو کلکتہ جانے سے روک رہی ہے۔ جیسے کلکتہ جانا اسے کسی ایسی آفت میں گرفتار کر دیگا جس سے چھٹکارا محال ہو۔ وہ کب تک کلکتہ والوں سے خالدہ کے بھاگنے کا راز چھپائے رکھنے میں کامیاب رہ سکتا ہے۔ آخر یہ راز ظاہر ہو کر ہی رہیگا۔ اور وحشی شعلوں کی طرح سارے کلکتہ میں پھیل جائیگا۔ وہ اپنے آپکو ان شعلوں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔ انکے مقابلے کی قوت اُسے اپنے اندر محسوس نہ ہوتی تھی۔ اُس نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔

حسین اب ایک کٹر ملا کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ غریب کا ایک گوشہ نشین مقلد بن گیا ہے۔ اُسکے دن کا بیشتر حصہ مسجد کے اندر درود وظائف میں صرف ہوتا ہے۔ مسجد میں صبح و شام جھاڑو دینا اُسکی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا ہے۔ اپنے دماغ کے ہیجان سے اس نے مذہب کی خود فراموشی میں پناہ حاصل کی۔ اُسے کہیں اور سکون مل بھی نہ سکتا تھا۔

محمد محسن

تم

آنکھوں میں اشکِ غم جو مرے پا رہے ہو تم
اللہ جانتا ہے کہ یاد آ رہے ہو تم

کہنے بھی دو سکوں سے مجھے داستانِ غم
یہ کیا کہ بات بات پہ شرما رہے ہو تم

شاید سکون ہی نہیں دل کے نصیب میں
نظروں سے دور رہ کے بھی تڑپا رہے ہو تم

ہاں ہاں وفا کرو گے یہ مجھکو یقین ہے
بیکار میرے سر کی قسم کھا رہے ہو تم

تم سے نہ نبھ سکے گا یہ پیمانِ عاشقی
پھر بات درمیاں میں وہی لا رہے ہو تم

تم مجھ کو دیکھ دیکھ کے ہنستے ہو کس لئے
جو آگ بجھ چکی ہے وہ بھڑکا رہے ہو تم

یہ دل وہ ہے کہ جس پہ تصدق ہی کائنات
اللہ ایسی چیز کو ٹھکرا رہے ہو تم

یا خود ہی بڑھ گئی ہے یہ تابانیِ جہاں
یا گوشۂ نقاب کو سرکا رہے ہو تم

حیرت میں کیوں ہو تم مرے سجدوں کو دیکھکر
مجھکو تو ہاں کچھ اور نظر آ رہے ہو تم

سمجھوں نہ سمجھوں اس سے تو کوئی غرض نہیں
پر یہ سمجھ رہا ہوں کہ سمجھا رہے ہو تم

دیر و حرم کی حد تو کبھی کی گذر چکی
بہزاد اب کدھر کو بہے جا رہے ہو تم

بہزاد لکھنوی

ہیرودیاس :- فرانسیسی مفکر اعظم فلابیر کا نایاب کارنامہ۔ سلومی کا رقص موت کا ناچ تھا۔ یوحنا پیغمبر سے اُسے دیوانہ وار عشق تھا۔ جب وہ اسے زندہ حاصل نہ کر سکی تو اُس نے اپنے ناچ کے انعام میں پیغمبر کا سر مانگا۔ اس مُردہ کے خون آلود لبوں کو اُس نے پاگلوں کی طرح چوما اور خود بھی دیکھنے والوں کے غیظ و غضب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ حسن و موت کی عجیب و غریب کہانی بقیمت صرف ۱۲ر
ملنے کا پتہ :- ساقی بکڈپو۔ دہلی

صبح چمن

وہ جاڑے کی رت اور صبحِ چمن — روپہلی فضائیں، سنہری کرن
وہ کہرے کی چادر بہت ہی مہین — دھندلکا، مگر انتہا کا حسیں
اُجالے میں کہرا نکھرتا ہوا — سحر کا تبسم بکھرتا ہوا
اندھیرا چھٹا، دھوپ چڑھنے لگی — حرارت بتدریج بڑھنے لگی
ہوا ڈالیوں سے جو ٹکرا گئی — کلی کے لبوں پر ہنسی آ گئی
اُبھرنے لگے پھول کے خط و خال — نکھرنے لگا گلستاں کا جمال
چٹک کر جو غنچوں نے آواز دی — گلوں کی مہک نے بھی انگڑائی لی
ہوائیں چلیں گیت گاتی ہوئیں — بہکتی ہوئیں، لڑکھڑاتی ہوئیں
لچکتی ہوئیں ڈالیوں کے تلے — جھلکتی ہوئی اوس کی سر دمے
وہ سبزے کی بدمست انگڑائیاں — مچلتی ہوئیں سبز پر چھائیاں
ہواؤں میں اُڑتی ہوئیں تتلیاں — پلک مارتے میں یہاں سے وہاں
پرندوں کے نغمے، وہ بھونروں کے گیت — تخیل کی ہر گام پر ہار، جیت
کہیں بلبلوں کے ترانوں کا رنگ — کہیں فاختاؤں کے نغموں کی چنگ
روپہلی، روپہلی چنبیلی کے پھول — محبت کے جس طرح سادہ اُصول
گلوں کے کٹورے چھلکتے ہوئے — گہرہائے شبنم ڈھلکتے ہوئے
گلستاں کی زینت مہکتے گلاب — کہ جیسے عروسِ نوی کا شباب
دمکتے کنول، مسکراتے کنول — ہر اک پھول، اک مطلعِ برمحل
درختوں کے پتّے ہیں یا مورچھل — ہر اک شاخ حافظ کی رنگیں غزل
لہکتی ہوئی عشق پیچاں کی بیل — کہ جنگل میں جیسے ہرن کی کلیل
وہ جنّت جو آدم سے کھوئی گئی — یہاں ہر کلی میں سموئی گئی
گلستاں نہیں، مرکزِ رنگ و بو — مقابل ہیں رنگینیاں، چار سو
نظر پھول کو چوم کر رہ گئی — فضائے چمن پھول کر رہ گئی

ماہر القادری

ہم کیوں غصہ کرتے ہیں

• انسانی جذبات میں، تماشائیوں کے نقطۂ نظر سے، غصہ سب سے پُرلطف جذبہ ہے۔ آیئے ہم لوگ غصہ پر ایک ایسے زاویہ سے روشنی ڈالیں جس میں غصہ اس خطرناک شکل میں ظاہر نہ ہو جس میں عموماً یہ ظاہر ہوتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسانی جسم کا ہر حصہ حرکت اضطراری کا مرکز بنجاتا ہے۔ دل دھڑک کر دورانِ خون کو تیز کر دیتا ہے۔ اس لئے جسم کے وہ حصے جو عموماً حالت سکون میں اپنے اندر خون کی تھوڑی سی مقدار رکھتے ہیں، زیادتی خون کی وجہ سے سُرخ ہو جاتے ہیں مثلاً چہرہ، آنکھیں وغیرہ۔ چہرہ تمتما اُٹھتا ہے، چہرے کے گوشت اور پوست طرح طرح سے پھیلنے اور سُکڑنے لگتے ہیں، آنکھوں میں سُرخ ڈورے ابھر آتے ہیں، پتلیاں پھیلنے اور سکڑنے لگتی ہیں، ہونٹ تن کر باریک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں یا پھر غصہ اگر گالیوں اور سخت کلامیوں کیساتھ آرہاہے تو ہونٹ سُکڑ کر مسوڑے کی جڑوں سے جا لگتے ہیں اور پوری بتّیسی باہر نکل آتی ہے۔ تھوک کے باریک قطرے ہر زوردار فقرے کے ساتھ اُڑ اُڑ کر باہر آنے لگتے ہیں اور اگر غصہ کچھ دیر تک تھم گیا تو تھوک خشک ہو کر لیسدار ہو جاتا ہے، زبان سُوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہے اور بات کرتے وقت چٹ پٹ، چٹ پٹ کی آواز نکلنے لگتی ہے۔ گردن کی رگیں پھول کر اُبھر جاتی ہیں اور چہرہ ایک ہیبب سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے جسکو دیکھکر بیساختہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

چہرے کی تبدیلی کے بعد ہاتھوں کا نمبر آتا ہے۔ ہاتھ اُٹھتے ہیں اور گرتے ہیں، گرتے ہیں اور اُٹھتے ہیں، کبھی مٹھی بندھ جاتی ہے اور کبھی کھُل جاتی ہے۔ کبھی انگشتِ شہادت دیگر انگلیوں سے بغاوت کر کے تن تنہا کھڑی ہو جاتی ہے اور مغضوب کی آنکھوں اور چہرے کے آگے پہونچ کر ناچنے اور تھرکنے لگتی ہے۔ کبھی پانچوں انگلیاں پانچ سپاہیوں کی طرح مل کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور غریب مخالف کے گال سے کچھ الگ رہ کر سے طمانچہ کی دھمکی دیتی ہیں۔ ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اُٹھکر گویا خدا کو انصاف کیلئے بلاتے ہیں اور کبھی زمین کی طرف جھک کر مخالف کو قبر، دفن وغیرہ کی یاد دلاتے ہیں۔ سانس زور زور سے آنے لگتے ہیں، دل کی رفتار بھاگتے ہوئے گھوڑے کی چال سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے تمام گوشت پوست سکڑ جاتے ہیں، آنتیں بل کھانے لگتی ہیں، صفرا کی تھیلی سکڑ جاتی ہے اور صفرا کافی مقدار میں معدہ میں چلا آتا ہے جو اکثر غصہ کرنے والے کی متلی کا سبب بن جاتا ہے۔ جلد کے مسامات بند ہو جاتے ہیں جس سے پسینہ کی آمد و رفت میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ اور تمام اعصاب کثرت اشتعال کی وجہ سے حد درجہ ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ شدید غصہ کی حالت میں یہ ذکاوت غائب ہو جاتی ہے اور دماغ و اعصاب غبی ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مطلق باقی نہیں رہتی۔ ضرب شدید بھی ہلکی پھلکی خراش معلوم ہونے لگتی ہے۔ جسم کے اندر جتنے غدود ہیں اس میں بعض اپنا فعل بالکل بند کر دیتے ہیں اور بعض معمول سے زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔ پاؤں کی قوت میں توازن قائم نہیں رہتا۔ شدید غصہ کی حالت میں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ سکون اضطرار سے بدل جاتا ہے اور رہ رہ کر پاؤں اس چیز کی طرف اُٹھنے لگتے ہیں جس پر غصہ آتا ہے۔ کبھی پاؤں وزنی موگدر کی طرح دھم دھم کرتے ہوئے زمین پر پٹکے جاتے ہیں۔ اس دھماکے سے آس پاس کی فضا میں، جو طرح طرح کی آواز سے معمور ہو چکی ہوتی ہے، ایک خاص قسم کا مہیب تلاطم پیدا ہو جاتا ہے جس سے غصّہ کئے جانے والی ہستی پر رُعب چھا جاتا ہے۔ الغرض غصّہ خیز بیولوجیکل نقطۂ خیال سے ایک دلچسپ معمّہ ہے جس پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ انسانی جذبات میں، بھوک اور خواہشِ جنسی کے بعد اس کا نمبر آتا ہے جس میں انسان موجودہ تہذیب، تمدّن، علم و عقل کے باریک نقاب کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور پھر ایک بار اپنے آباؤ اجداد کے اس دَور کی جھلک دکھا دیتا ہے جب وہ جانور تھے گوشت خوار قسم کے، جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے، دن رات لڑتے اور جھگڑتے تھے، کبھی اپنے دُشمن کو کاٹ کھاتے تھے اور کبھی اپنے زبردست دُشمن سے بچنے کیلئے چیختے چلاتے ہوئے، اپنی دُم کو اٹھائے ہوئے پہاڑوں میں قلا بازیاں کھاتے پھرتے تھے۔

اب آیئے اس غصّہ پر ایک دوسرے زاویہ سے روشنی ڈالیں غصّہ کیوں آتا ہے، کس لئے آتا ہے اور کیونکر جاتا ہے۔ انسانی فطرت خود غرض اور اندھی واقع ہوتی ہے۔ اگر کوئی شے اسکے مزاج کے خلاف ہو جائے تو اُسے ناگوار گذرتا ہے اور یہ جھنجلا کر اپنی صدائے

احتجاج غصّہ کی صورت میں پیش کرتی ہے مثلاً ایک بچّہ صابن کے جھاگ کو پینے کے پانی میں ملانا چاہتا ہے۔ اگر اس سے صابن چھین کر پانی کے مٹکے کو ڈھکنا دیجیے تو وہ جھنجلا کر غصّہ کرے گا اور اگر اس کا یہ غصّہ صابن اور مٹکے کو واپس نہ لا سکا تو وہ رونے لگے گا جو اظہار ہے غصّہ، نفرت، ضد اور رعب ڈالنے کا۔ اسی طرح ایک عورت آئینہ کے سامنے بیٹھکر گھنٹوں اپنی صورت دیکھتی ہے، کبھی آنکھیں نیم باز کرتی ہے، کبھی مسکراتی ہے، کبھی اپنے دانتوں کو طرح طرح سے نکالکر دیکھتی ہے، کبھی بالوں کے پیچ وخم کو چھیڑتی ہے اور پھر پیار سے اُنکو اپنی جگہ پر تھپک دیتی ہے، کبھی کھڑی ہو کر سیدھی طرح اپنے تمام جسم کو آئینے میں دیکھتی ہے، کبھی آنچل کو سینے پر کھینچکر اپنے جسم کو ترچھی ہو کر دیکھتی ہے۔ اگر عین اسی سنگار یا دیکھ بھال کے وقت آپ نے دبے پاؤں آکر کہدیا "اجی بہت ہوا۔ ذرا خوبصورت ہوتیں تو اور نہ جانے کیا کرتیں!" تو بس سمجھ لیجیے کہ آپ کے اِس معصوم سے جملہ پر اُس کو غصّہ آجائیگا اور شدید قسم کا۔ اس پر بھی وہی تشنّجی کیفیت کا دَورہ پڑجائے گا جس کا ذکر آگے ہو چکا ہے۔ عورت چونکہ اہمسا کی قائل ہے اس لئے وہ بھوک ہڑتال کر دیگی، خاموش ہو کر گفتگو بند کر دے گی اور اگر ان باتوں کے باوجود غصّہ زائل نہ ہوگا تو بال پریشان کر کے روئیگی، ماتم کریگی، شور مچائیگی اور اس طرح غصّہ کرنے کا یہ مقصد کہ غصّہ کئے جانے والے پُر رعب ڈالا جائے، پورا ہو جائے گا۔

اب ایک نوجوان مرد کو لیجیے، کڑے خاں پٹھان کو، بھلا ان کا کیا کہنا، یہ تو غصّہ کرنے کو پیدا کئے گئے ہیں، بات بات پر غصّہ، منٹ منٹ پر غصّہ، قدم قدم پر غصّہ۔ کسی کو اپنی شامت لانی ہو تو ان کے صافہ کے رنگ کو بُرا کہہ دے، یا اُنکی مونچھوں کے بل کو ٹیڑھا بتا دے، یا اُن کی مرزا پوری لاٹھی کی تعریف نہ کرے، یا اُنکی ہاں میں ہاں نہ ملائے۔ یہ حضرت اکڑ کر آگے بڑھیں گے، جسم پر، چہرے پر، الغرض اپنے جسم کے ہر حصّہ پر وہی تشنّجی کیفیت طاری کر لیں گے جس کا بیان آگے ہو چکا ہے اور غریب شامت زدہ کو وہ دھول لگائینگے کہ وہ چاروں شانے چِت جا پڑیگا۔ اگر اس طرف بھی کوئی فولاد خاں ہوئے تو بس سمجھ لیجیے کہ لُطف آگیا۔ گالیوں کا آغاز "ابے چل، دُور رہو، بڑا آیا، وہ دونگا، کیا دکھتا ہے ابے او اُلّو!" وغیرہ جیسے بے معنی الفاظ سے ہوگا۔ کچھ دیر تک دور دُور سے پھبتی، گالی، سخت کلامی سے اظہار غصّہ و نفرت کیا جائیگا۔ لیکن اس وقت خیریت سے اگر دو مضبوط اور مسٹنڈے قسم کے صلح پیشہ حضرات آ دھمکے تو خیر، بیچ میں پڑ کر دونوں کو کھینچتے ہوئے دُور لے جائیں گے اور الگ کر دینگے گرچہ اس کھینچا تانی کے دوران میں بھی گالیوں کا وظیفہ بدستور جاری رہیگا جو کچھ دیر بعد خود بخود آہستہ آہستہ بند ہو جائیگا۔ اگر بدقسمتی سے صلح کرانے والے حضرات نہ ہوئے اور ہوئے بھی تو کمزور اور بُزدل قسم کے تو پھر نہ پوچھیے کہ غصّہ کی ایکٹنگ حرف بحرف پوری ہو کر رہیگی۔ پاؤں زور زور سے زمین پر پٹکے جائینگے، ہاتھ مختلف و انواع اقسام کے حرکات میموئی کرنے لگیں گے، چہرہ مہیب اور خوفناک ہو کر بچّوں کے خوف اور عورتوں کے اختلاجِ قلب کا باعث بن جائے گا، فریقین کا درمیانی فاصلہ کم ہو کر غائب ہو جائیگا۔ گالی گفتار، دھول دھپا، دھینگا مشتی، اُٹھا پٹخ، مار پیٹ، لٹھم لٹھا، خون خرابا وغیرہ قسم کی حرکات ہونے لگیں گی جن کو بیان کرنے کے لئے لغت میں یہ مرکبات وضع کئے گئے ہیں۔ اس قسم کا غصّہ خون کے بہنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا ہے یا پھر پولیس کی لال پگڑی سے۔

جوانوں کے بعد بڈھوں کا نمبر آتا ہے گرچہ غصّہ کی فہرست میں ان کو سب سے اوّل جگہ دینا چاہیئے تھی۔ ساٹھ سال کے بعد زندہ رہنا اگر گناہ نہیں تو کم از کم جُرم ضرور ہے۔ اس عمر کے بعد تمام قویٰ مضمحل ہو کر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں مگر غصّہ کرنے کی صلاحیت جوان تر ہو جاتی ہے۔ بڑے میاں ظاہرہ دیکھنے میں سفید ریش و بروت سے ڈھکے ہوئے روئی کے گالے نظر آتے ہیں مگر ذرا ان کو چھو کر دیکھیے تو کرختگی میں سنگِ خارا اور فولاد سے کم نہیں۔ آپ نے ایک کہی نہیں کہ دس سُن لی۔ آپ نے کہا "دادا میاں، آج کیا کھائیے گا؟" دادا میاں گویا اسی انتظار میں ساون بھادوں کے بادل کی طرح بھرے بیٹھے تھے، گرج کر برس پڑے "چل دُور رہو مردود، تیرا اور کوئی دادا ہوگا حرامخور، نالائق، مسخرا وغیرہ" الغرض بڑے میاں نے ایک معقول سوال کے جواب میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو اس سوال سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں جو زیر بحث تھا۔ بڈھے غصّہ کرتے ہیں اور بات بات پر، غصّہ کرتے وقت اُن پر بھی وہی تشنّجی دورہ پڑ جاتا ہے مگر چونکہ اُن کے اعضاء کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں اس لئے بیک وقت اتنے شدید جذبات کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اُن کے سارے جسم میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ سر میں رعشہ ہونے لگتا ہے اور لاٹھی جو اُٹھکر غصّہ کئے جانے والے پر پڑنا چاہتی ہے تھرتھرا کر غلط نشانہ پر لگتی ہے۔ اپنی اس غلط اندازی پر بڑے میاں بجائے اسکے کہ پشیمان ہو کر خاموش بیٹھ جائیں اور برہم ہو جاتے ہیں اور

لگاتار سانپ کے بدلے لکیر پیٹنے لگتے ہیں۔ یہ سماں ایک فلسفی کی نگاہ میں خواہ کچھ بھی بے ثباتیِ حیات کا نقشہ کھینچتا ہو مگر کمسن دماغوں میں تو یہ ہمیشہ تالیاں بجا بجا کر اور فرش ہو ہو کر ہنسنے کا باعث بنتا رہا ہے۔ بڑھاپے میں غصہ کا آنا اکثر دماغ میں شریان کے پھٹ جانے کا باعث ہوتا ہے جس کے بعد فالج اور موت کے مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں مگر اس حکیمانہ نصیحت کو کون بڑے میاں بغیر غصہ کئے ہوئے مانیں گے ؟۔

غصہ پیشہ کے اعتبار سے بھی کم یا زیادہ مقدار میں آتا ہے مثلاً بنئے کو غصہ نہیں آتا یا اگر آتا ہے تو بہت مدھم قسم کا۔ وہ بدستور نظریں نیچی کئے ہوئے سامان تولتا جائے گا مگر اس کے لب کو غور سے دیکھئے تو وہ ہلتے ہوئے پائے جائیں گے۔ یہ لبوں کا ہلنا بنئے کے غصہ کا تمام و کمال مظاہرہ ہے جو وہ بطور صدائے احتجاج آپ کے کہے ہوئے کم نرخ پر بلند نہیں پست کرتا ہے۔ یا پھر ملا مسجد نشیں کا مسلسل اور چھچھورے قسم کا غصہ جو محلہ والوں کی ہر کفایت شعاری پر ابھرا آتا ہے اور معصوم بچوں پر جو مکتب آتے ہیں اُن پر اترتا ہے۔ یہ مولوی غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے اور معصوم بچوں کے حرف حرف پر غلطیاں نکالتا ہے اور بات بات پر پیٹتا ہے۔ یہ اپنے معصوم شکار کو جتنا مارتا ہے، اُس پر جتنا ظلم کرتا ہے اتنا ہی اسکے غصہ کی آگ بھڑکتی جاتی ہے حتیٰ کہ لڑکا بیہوش ہو کر دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاتا ہے یا مکتب سے اُٹھکر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر مرتے دم تک کبھی لَوٹ کر نہیں آتا۔

لیڈروں کو غصہ موقع موقع سے آتا ہے۔ لیڈر جب دیکھتا ہے کہ اب غصہ کرنے سے اُس کے سامعین بھی غصہ کریں گے تو وہ فوراً اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ غم و غصہ کی اعلیٰ درجے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔ مخلوق جو جلسوں میں عقل گھر چھوڑ کر جاتی ہے، لیڈر کے غصے کو دیکھکر آگ بگولا ہو جاتی ہے اور انقلاب انقلاب کے نعرے لگاتی ہوئی مشین گنوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیڈر ایک محفوظ مقام سے اپنے غصے کے جراثیم کے پھیلتے ہوئے مُہلک اثرات کو دیکھتا ہے اور قتل و غارتگری کے لمحوں کے بعد میدان میں آتا ہے، زخمیوں کو دادِ شجاعت دیتا ہے اور مُردوں پر فاتحہ پڑھتا ہے: پھر فریقِ ثانی سے گفتگو مصالحت کر کے کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ لیتا۔

• غصہ پیغمبروں کو بھی آتا ہے۔ ان کا غصہ کسی عالمگیر تباہی یا سیلاب یا وبا کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ان کے غصہ میں رحم کی بھی آمیزش ہوتی ہے یعنی یہ ایک سانس میں غصہ کرنے والوں کو گمراہی سے ڈراتے ہیں تو دوسرے سانس میں اپنے کئے پر پچھتاتے ہیں۔ اکثر پیغمبر ایسے ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے غصہ کا ہر لفظ صحیح ہوتا تو آج یہ دُنیا اجرامِ فلکی سے خارج ہوتی یا پھر اس پر آباد ہونے والے گنہگار انسان کے بدلے پردار فرشتے ہوتے۔

پاگلوں کا غصہ ایک اچانک اور بالکل غیر ارادی فعل ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کب غصہ آئے گا اور کس بات پر آئے گا اور آکر کونسی صورت اختیار کرے گا۔ چیخنا، چلانا، بھاگنا، دھمکیاں دینا، کپڑے پھاڑنا وغیرہ تو عین پاگل کی شان ہے۔ یہ چیزیں اگر نہ ہوں تو انسان پاگل کیوں کہلائے مگر ان باتوں کے ساتھ اگر کہیں غصہ آگیا تو پھر اُس کی خیریت نہیں جس کی وجہ سے غصہ آگیا ہو۔ پاگل زنجیر توڑ کر، دیوار پھاندکر، آگ اور پانی سے گذر کر اپنے خیالی نقصان کا بدلہ لیتا ہے اور بُری طرح جسکو دیکھکر انسانی دل ہل جاتے ہیں اور تہذیب دامن میں مُنہ چُھپا کر رونے لگتی ہے۔

غصہ کرنے والوں کی ایک قسم اور ہے، جن کا غصہ سوسائٹی یا اَوروں کے لئے مخدوش نہیں ہوتا۔ آپ نے سُنا ہوگا "قہرِ درویش برجانِ درویش"۔ اس قسم میں نمبر ایک پر حضرت درویش آئے۔ ان کے بعد عاشق کی باری آتی ہے۔ یہ حضرت بھی غصہ اپنی جان پر کرتے ہیں، خود اپنا خونِ دل پیتے ہیں اور لختِ جگر کھاتے ہیں۔ عاشق کے بعد قیدی یا کمزور غلام آتے ہیں جن کے لئے کوئی راہِ فرار نہیں۔ اس قسم کے غصہ کرنے والوں میں مہاتما بھی آتے ہیں جو غصہ اس لئے نہیں کرتے کہ ندامت کون اُٹھائے یا مفت کی مار کون کھائے۔

قصہ مختصر غصہ ایک شدید قسم کا وقتی جنون ہے۔ اس جذبہ کے تحت میں انسان انسان نہیں رہتا۔ اس سے ہر وہ حرکت سرزد ہو جاتی ہے جس پر بعد میں پشیمانی ہوتی ہے اور مارے ندامت کے رونے کو جی چاہتا ہے۔ ہر غصہ کرنے والے سے میری اتنی سی درخواست ہے کہ وہ غصہ تنہائی میں کرے یا غصہ کی حالت میں اپنی صورت آئینہ میں دیکھ لے مجھے یقین ہے وہ اپنی صورت دیکھکر شرما جائیگا یا نہیں تو کم از کم ہنس ضرور دیگا۔

(ڈاکٹر) محمد نصیر الدین۔

گناہگار

آنو ایک لاری ڈرائیور تھا۔ مگر پیٹ بھرنے کا یہ ذریعہ اختیار کرنے سے پہلے اُس نے زندگی کے کئی پہلو دیکھ رکھے تھے۔ درحقیقت وہ جمنا داس سیٹھ کے سائیس کا بیٹا تھا اور اُسی سیٹھ کے اصطبل کے پہلو کے کمرے میں اُس کی پیدائش ہوئی تھی۔ مگر جب اُس کی عمر صرف پانچ برس کی تھی اُسکے ماں باپ کا سایہ اُس کے سر پر سے اُٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں پلیگ کا شکار ہوگئے تھے اور اپنے اکلوتے بیٹے کو سیٹھ جمنا داس کے متعدد نوکروں کے سُپرد کر گئے تھے۔ پانچ برس کی عُمر سے لیکر بارہ برس تک آنو سیٹھ صاحب کے گھر میں رہا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ انہی ایام میں اسکو سیٹھ صاحب کے نوکروں کے دھول دھپے اور گالی گلوج بھی سہنے پڑے۔ آخر بارہ برس کی عمر میں ایک دن وہ چُپ چاپ سیٹھ صاحب کے مکان اور اُن کے نوکروں کو خیرباد کہہ کر نکل پڑا اور بارہ برس سے بائیس برس کی عمر تک اُس نے ہزاروں پاپڑ بیلے۔ نان بائیوں کی دُکان پر برتن مانجھے۔ تیس تا چالیس روپے کے گریڈ کے بابوؤں کے گھر کا انتظام سنبھالا۔ مزدوری کی۔ سنیماؤں میں جھاڑو دی۔ غرضکہ ایک بے چپو کی کشتی کی طرح جو متلاطم سمندر میں کسی منزل کا رُخ کئے بغیر موجوں کے تھپیڑوں سے ڈول رہی ہو آنو بھی دُنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو رہا تھا۔ مگر زندگی کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے جب اُس نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تو وہ ایک شرابی بن چُکا تھا۔ جُوئے کا اس کو چسکا لگ چکا تھا۔ مختصراً وہ ہر ایک بُری عادت کا شکار تھا۔ ایک کمپنی کی لاری چلانے کے عوض میں پچیس روپے ماہانہ وصول کر لیتا تھا۔ اور ایک گندے سے بازار کے کونے کی کوٹھری (جسکو اُس نے تین روپے ماہانہ کرایہ پر لے رکھا تھا) میں رات کو شراب پی کر آتا اور پڑ رہتا۔

دھنو ایک نہایت معمولی کاشتکار تھا۔ پچاس برس کی عُمر میں بھی اُسے بڑی جانفشانی سے محنت کرنی پڑتی تھی کیونکہ اپنے کثیرالتعداد کُنبے کو پالنے کا ذریعہ صرف محنت تھا۔ بدقسمتی سے اُس کے پہلے چھ بچوں میں سے ایک بھی اولادِ نرینہ نہ ہوئی تھی بلکہ سب لڑکیاں تھیں۔ باقیماندہ چار بچے مرد تھے مگر ابھی اس قابل نہ ہوئے تھے کہ اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹا سکتے۔ بطرف دیگر لڑکیاں جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی کی شادی اُس نے گاؤں کے ایک کسان سے کر دی تھی مگر اُسکی دوسری لڑکی چمپا بھی اب ساڑھے چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ اس لئے دھنو اور اُسکی بیوی دونوں پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اُس کی شادی بھی ہو جائے تو اس طرح ایک تو گھر سے ایک عدد کھانے والا کم ہو جائے اور دوسرے جوان کنواری لڑکی کا گھر میں رکھنے کا خدشہ بھی مِٹ جائے۔

قسمت ایک شام آنو کو چند سواریاں لیکر اُسی گاؤں کی طرف لے گئی جہاں دھنو رہتا تھا۔ وہاں اُس کی لاری بگڑ گئی اور ہزار کوشش کرنے پر بھی نہ ٹھیک ہو سکی۔ مجبورًا وہ رات اُسے وہیں کاٹنی پڑی۔ اُسی شام کو اتفاقاً چمپا اُس کے نظر پڑی۔ اُس کی اُٹھتی جوانی اور دیہاتی حُسن دیکھکر وہ بھوچکا سا رہ گیا۔ اُس کے دل میں ایک زبردست خواہش اُٹھی کہ کسی طرح چمپا کو اپنے بس میں کرے۔ مگر چمپا کوئی فاحشہ عورت تو تھی نہیں جس کو وہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ ادا کرکے اپنی نفسانی خواہشات کی آگ بُجھا لیتا۔ چمپا کا حسب نسب دریافت کرکے وہ دھنو کے پاس پہونچا اور چمپا سے شادی کرنے کی درخواست نہایت میٹھے لفظوں میں پیش کر دی۔ دھنو کو ایسی درخواست سے تعجب ضرور ہوا مگر معمولی سا دریافت کرنے کے بعد اور حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُس نے یہی سوچا کہ آنو اور چمپا کا جوڑ خوب رہیگا۔

چنانچہ آنو کی لاری بگڑنے کے ایک ہفتہ بعد ایک سہانی شام کو آنو چمپا کو بیاہ کر اپنے ساتھ لاری میں بٹھائے گھر لے جا رہا تھا۔ بھولی بھالی چمپا کے دل میں نامعلوم مستقبل کے ڈر کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کی پریاں ناچ رہی تھیں۔ شہروں کے پکے گھر، صحن کے نل، بارونق بازار، مٹھائی اور کپڑوں کی دُکانیں، سینما، پھولوں سے بھرے باغ۔ وہ بچاری اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ اُس کو ایک شہری شوہر نصیب ہوا۔ وہ اپنے کپڑوں میں پھولے نہ سماتی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کنوؤں سے پانی لانا، گوبر سے گھر کو لیپنا، تیل کے چراغ جلانا۔ برسات میں ٹپکتی چھت کی مرمت کرنا اُس کی زندگی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ وہ موٹر میں اُڑی جا رہی تھی اور اپنے شوہر کے موٹر چلانے کے کمال سے مرعوب ہو رہی تھی۔ نئی زندگی کے خوشگوار خواب دیکھنے کے لئے اُس کا

معصوم دل ناچ رہا تھا۔ مگر جب آلو اُس کو اپنی کوٹھری میں لے گیا تو اُسکی غلاظت اور بے ترتیبی دیکھ کر اُس کے دل پر پہلی چوٹ لگی اور سہاگ کی رات کے آنے سے پہلے اُس نے آلو کی گندی بالٹی لیکر بازار کے نل سے پانی بھرا اور پھر جھاڑو لیکر کمرے کو جھاڑا اور دھویا اور پھر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ رہی۔ شہروں کے پکے گھر، صحن کے نل، بارونق بازار۔ مٹھائی اور کپڑوں کی دکانیں، سنیما اور پھولوں سے بھرے باغ اُس کے دماغ سے اوجھل ہو چکے تھے۔ نئی زندگی سے لڑنے کیلئے وہ تیار بیٹھی تھی بلکہ اپنے شوہر کے کمرے کو جھاڑ جھٹک کر اُس جدوجہد میں پہلا وار بھی کر چکی تھی۔

آلو اگرچہ اوباش اور شرابی تھا لیکن ابھی بائیس سال کا جوان تھا اور اس لئے اُس کی آوارہ زندگی اُس کی مردمی میں کچھ کمی نہ پیدا کرسکی تھی۔ اُس نے اس آسانی سے بچے پیدا کروانے شروع کردئے جیسے پرانے زمانے کی عورتیں دو گھڑے پانی کے اٹھا کر کنوئیں سے لے آتی تھیں۔ چنانچہ شادی ہونے کے تین سال کے اندر اندر چمپا تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

آلو نے شادی کے بعد اپنا رویہ بالکل تبدیل نہیں کیا بلکہ وہی شادی سے پہلے کی عادتیں جاری رکھیں۔ مثلاً وہ ہر رات گھر آنے سے پہلے خوب شراب پیتا اور جب گھر پہونچتا تو ہمیشہ مدہوش ہوتا اور اس طرح وہ عقل و ہوش کھو دینے کے بعد چمپا کے شکایت کرنے پر اُسکو گالیاں سناتا اور بچوں کے رونے پر اُن کو مارتا اور اکثر اُن کو بچانے کی خاطر چمپا بیچ میں پڑ کر آلو کے ہاتھوں پٹا کرتی۔ مگر آلو کو اپنی بیوی اور بچوں پر ذرا ترس نہ آتا۔ اُس کے لئے چمپا محض اس لئے تھی کہ اس کو روٹی پکا کر کھلاتی اور رات کو جب شراب کی گرمی سے اُس کا خون کھولتا تو اس کی نفسانی خواہشات کو فرو کرتی۔ اور اس حرکت سے جو بچے پیدا ہوتے اُن کی پرورش کا ذمہ دار وہ نہ تھا۔ درحقیقت شراب کے نشہ نے اُسکو اس معاملہ پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ دی تھی۔

بدقسمت چمپا نے پہلے سال تو آلو کو سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر جب اس کو معلوم ہوگیا کہ اُس کے شوہر پر چکنے گھڑے کی طرح کچھ اثر نہ ہوسکا تو اُس نے خود محنت مزدوری کرنی شروع کی اور اس طرح بمشکل اپنے دو بچوں کا گزارا چلاتی رہی۔ شادی ہونے کے بعد اُس نے ایک بھی نیا کپڑا نہ سلوایا تھا۔ وہی شادی میں ملی ہوئی ساڑھی اور چولیوں کو دھو دھو کر اور سی سی کر وہ اپنا تن ڈھانکتی۔ شہری زندگی اور شوہر کی موجودگی کے سُکھ اب اُسے سپنوں میں بھی نظر نہ آتے تھے۔

اُس کی ازدواجی زندگی کا تیسرا سال تھا۔ حال ہی میں تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا۔ شہر کے ایک محلے میں ایک مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ یہ بچاری اپنے دو بچوں کو اُٹھائے اور تیسرے کو ساتھ لیکر روزانہ وہاں جاتی اور صبح سے شام تک اینٹیں ڈھویا کرتی۔ واپسی پر اپنے بازار کے گوالے مدھو سے بچوں کے لئے دودھ خریدتی ہوئی گھر واپس آجاتی۔ شوہر کے لئے کھانا تیار کرتی اور تکان سے چور ہو کر ایک کونے میں بیہوش پڑ جاتی۔

چمپا کی قسمت میں سُکھ نام کو نہ لکھا تھا۔ جب تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا، خوراک کی کمی اور محنت و مشقت کی زیادتی کی وجہ سے اُس کا دودھ سوکھ گیا تھا۔ اس لئے اپنے دو چھوٹے بچوں کے لئے وہ کام پر جاتے وقت کچھ دودھ ایک بوتل میں ڈال کر ساتھ لے جاتی اور وہاں اُن کے رونے پر جب اُن کو دودھ پلانے لگتی تو مکان بنانے والے راج مزدور اس پر پھبتیاں اُڑاتے۔ ٹھیکہ دار اس کو سُستی سے کام کرنے پر فحش گالیاں دیتا۔ یہ بچاری سب کی باتیں خاموشی سے سُنتی اور شام کو جب تین آنے گرہ میں باندھ کر گھر کی طرف واپس لوٹتی تو اپنی زندگی پر غور کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکل سکتے۔

کمائے ہوئے تین آنوں سے وہ گھر کا خرچ نہ چلا سکتی تھی۔ بچوں کے لئے دودھ کی ضرورت تھی، اپنے اور شوہر کے لئے آٹا اور دال خریدنا ضروری تھا۔ ایک شام جب وہ مدھو گوالے سے دودھ لے رہی تھی تو مدھو نے للچائی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھکر کہا۔ "چمپا تمہیں شوہر کچھ نہیں دیتا۔ مجھے تعجب ہے کہ تم گزارا کس طرح کرتی ہو؟"

چمپا نے جواب دیا۔ "میری تقدیر ہی بُری ہے۔"

مدھو نے پھر کہا۔ "چمپا تم جوان اور خوبصورت ہو۔ تمہارا شوہر تمہاری پرواہ نہیں کرتا۔ تمہارے بچوں کی پرواہ نہیں کرتا، پھر تم کیوں اُسکی پرواہ کرتی ہو؟"

چمپا کا جواب تھا۔ "وہ میرا شوہر ہے۔"

مدھو نے جوش میں آکر کہا۔ "تو پھر تمہاری اور تمہارے بچوں کی پرورش کیوں نہیں کرتا؟ تم خواہ مخواہ تکلیف اُٹھا رہی ہو۔ میں تمہیں روز دودھ مفت دیدیا کرونگا اگر تم گھر جاتے وقت ....."

پیشتر اسکے کہ مدھو اپنی بات پوری کرتا چمپا اپنا دودھ اُٹھا بچوں کو ساتھ لئے وہاں سے نکل گئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ گھر جاکر خوب مدروئی۔ آخر جب دل ہلکا ہوا تو بچوں کو دودھ پلایا مگر وہ تین بچوں کیلئے کافی نہ تھا۔ بچاری نے کسی طرح لوریاں سُنا سُنا کر اُن کو بھوکے پیٹ

سُلا دیا۔ اُس رات جب آنو حسبِ معمول شراب کے نشے میں چُور ہو کر گھر آیا تو اُس سے روتے ہوئے بچوں کی حالت اُس کو سُنائی۔ اُس نے چمپا کو اُلٹا دھمکایا، گالیاں سُنائیں اور جب بھوکے بچے باپ کے شور سے جاگ اُٹھے اور رونا شروع کیا تو اُس نے اُن پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ بدبخت چمپا نے بچوں کو بچانے کیلئے پھر شوہر کی مار کھائی اور آخر جب خاوند سو گیا تو وہ بھی روتے روتے کسی وقت نیند کی آغوش میں پڑ گئی۔

دوسرے دن جب وہ کام پر گئی تو سارا دن بھوکے بچوں کے بلکنے کی آواز اُسے ستاتی رہی۔ شام کے وقت جب مدھو گوالے کے پاس دودھ لینے گئی تو اُس نے پھر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنی تجویز پیش کی۔ چمپا پھر اُس کی بات پر دھیان دئے بغیر دودھ لیکر نکل آئی۔ رات کو پھر بچوں نے بھوک کی وجہ سے چلّانا شروع کیا۔ شرابی شوہر آنو نے پھر اُن کو پیٹنے کی کوشش کی۔ چمپا نے اُن کو مار سے بچانے کی خاطر پھر آنو سے مار کھائی۔

آخر ایک شام جبکہ امیر لوگ ٹینس کھیل کر برِج کھیل رہے تھے اور آنو اپنا دن کا کام ختم کر کے شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا تو چمپا دھنو کے گھر کے اندر کی کوٹھری میں ایک بے بستر کی چارپائی پر لیٹی آنکھیں بند کئے اپنے بلکتے بچوں کا تصوّر جمائے دودھ حاصل کرنے کے لئے اپنی حرمت و آبرو بیچ رہی تھی . . . .

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ وہ ہر شام کام سے لوٹتے وقت مدھو کے پاس جاتی۔ مدھو قیمت وصول کر کے اُس کو اتنا دودھ دیدیتا جو اُس کے بچوں کی پرورش کے لئے کافی ہوتا۔ اِسی قسم کی ایک شام تھی۔ چمپا مدھو کے گھر سے بچوں کو اُٹھائے گھر جا رہی تھی۔ بازار کے قصائی نے اپنے سامنے کے میوہ فروش سے کہا "یہی ہے چمپا، آنو کی بیوی اور مدھو کی آشنا" میوہ فروش نے جو دُکان کی چھت سے لٹکتے ہوئے کیلوں کے گچھے کو ٹھیک کر رہا تھا، مسکراتے ہوئے جواب دیا "آج کل کی عورت ہی۔ بڑی گناہ گار ہے"

چمپا کے کانوں میں "بڑی گناہگار ہے" کے لفظ گرم سیسے کی طرح پڑے۔ جلدی جلدی بیجان ٹانگوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے وہ گھر پہونچی اور بچوں کو دودھ گرم کر کے پلایا اور سُلا دیا۔ رات کو آنو شراب سے بدمست آیا اور قے کرتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیہوش ہو کر پڑ گیا۔

چمپا کے کانوں میں میوہ فروش کے وہی الفاظ گونج رہے تھے۔ "بڑی گناہگار ہے" ایک بچے کو سینے سے چمٹائے وہ سوچنے لگی کہ . . .
"کون گناہگار ہے؟"

بھارت چند کھنہ

کوئلے کی کان کے باہر

کولوں کی کثیف فضا میں کب ہے لطف ساماں میرے لئے
فطرت کا پجاری ہوں فرحتؔ ہی محفلِ امکاں میرے لئے
یہ گوشۂ عزلت کنجِ خنک، یہ سرد ہوا، خاموش فضا
مخمور صبا، مدہوش گھٹا، ہے محفلِ رنداں میرے لئے
کیوں چھوڑ نہیں دیتے وہ مجھے، تسکینِ قلبِ پریشاں کو
کیوں درپئے استبداد ہیں خود، اربابِ گلستاں میرے لئے
اک منظرِ فطرت کافی ہے، شاعر کے سکونِ خاطر کو
کیوں دوست بہ اصرارِ پیہم، ہیں حمتِ خنداں میرے لئے
بہنے میں پہاڑی چشموں کے، پُرکیف و مسلسل نغمے ہیں
یہ سلکِ صوت و موسیقی، ہی لطف کا ساماں میرے لئے
اِن ننھی ننھی بوندوں میں، ان گھرتی کھلتی گھٹاؤں میں
ہی یاس و اُمید کا محشر سا، مستور و نمایاں میرے لئے
اس دُور و کشادہ جنگل میں آباد ہی یہ چھوٹی سی جگہ
پُرکیف مناظر چاروں طرف، ہیں بزمِ سلیماں میرے لئے
ہر گُل ہی نمونہ چھوٹا سا، قدرت کی بڑی صناعی کا
ہر ٹہنی کی نازک سی لچک، ہی رشکِ گلستاں میرے لئے
ہر شاخ لچک کر جھکتی ہی، جھکنے میں نسیم اٹھلاتی ہے
ہر ایک گلِ صحرائی ہے، خود یوسفِ کنعاں میرے لئے
ہر غنچۂ نورس، ایک سبو، ہر ٹہنی اک مے خانہ ہے
ہر جنبشِ موجِ ہوا مینا ہی، اک شورشِ رنداں میرے لئے
فرحتؔ یہ فضائیں وادی کی مخمور بھی ہیں، مدہوش بھی ہیں
بے سود ہے دعوتِ جام و سبو، اے محفلِ رنداں میرے لئے

فرحتؔ کانپوری

برج اور میری مایوسی

ساڑھے چار کا وقت ہے۔ ننے ننے ٹینس کے شوقین کلب کی
یاری میں مصروف ہیں۔ ادھر خانساماں پر خفگی ہو رہی ہے کہ چاء تیار
ہیں ہوتی اُدھر اُن حضرت پر جن کو قانون میرا شوہر اور میں صاحب
ہتی ہوں، غصہ آرہا ہے کہ تیار ہوتے نصف گھنٹہ ہو گیا مگر انکی واپسی
ا پتہ نہیں۔ کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے کام زیادہ ہو گا، کبھی یہ
، شاید موٹر کا ٹائر پھٹ گیا ہو۔ اسی سوچ میں ایک ایک منٹ گھنٹوں
ی طرح گزرتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں جیسے گزرتی ہیں اُس سے ہر ایک
اقف ہے۔ خدا خدا کر کے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ چلو جان میں
ان آئی کہ کم از کم ایک سٹ ٹینس کا تو مل جائیگا۔ صاحب بہادر آتے
ی کبھی تو خوش مزاج اور کبھی ایسے کہ اگر ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو ناک
ی اُڑا دیں۔ اکثر جب تشریف لاتے ہیں تو مجھ سے خطاب کرنے سے
پہلے رنکیں (جو ہم دونوں کا اکلوتا کتے کا پلا ہے) سے پندرہ منٹ
ھیلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اِدھر میں ریکٹ ہاتھ میں لئے وقت
زرتے دیکھکر غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوں اور ڈرائنگ روم
یں فرضی ٹینس کھیلنا شروع کر دیتی ہوں جس سے کمرے کی سجاوٹ
کے لئے رکھی ہوئی چند چیزوں کی اصلی حالت بگڑ جاتی ہے۔ آخر کیا کروں
جھے ٹینس کی بیماری ہے، اور اس بیماری کے علاج کے لئے صاحب
ی مدد کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ رنکیں کی طرح موٹر بھی گھر میں ایک
ہے اور کلب ہمارے گھر سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ بعض اوقات
وچتی ہوں کہ گھر سے پیدل چلدوں مگر پھر یہ خیال آتا ہے کہ اگر کسی
رح پانچ میل کی مسافت طے بھی کر لوں گی تو ٹینس کھیلنے سے پہلے
ہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ اسی کا نام مجبوری ہے۔ غرضکہ کتے کا دل
ہلانے کے بعد صاحب بہادر نہاتے ہیں اور کپڑے وغیرہ پہن کر شربت
لسی یا دونوں کے ایک دو گلاس حلق سے نیچے اتارتے ہیں۔ اور
ب آخر کار وہ کلب جانے اور مجھے ساتھ لے جانے کیلئے تیار ہو جاتے
یں تو وقت ہمیشہ ساڑھے چھ کا ہوتا ہے۔ بھلا آپ ہی خیال فرمائیے
میرے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔

خیر کچھ اُمید لئے ہوئے کہ شاید تھوڑا بہت کھیلنے کو مل جائیگا
ٹر میں دھڑکتے ہوئے دل سے بیٹھ جاتی ہوں۔ کلب پہونچکر وہی ہمیشہ
والا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یعنی بہت سی ٹینس کی بیمار بیویاں اور شوہر
(جو ہمیشہ مجھ سے پہلے پہونچ جاتے ہیں) مینڈکوں کی طرح کھیلنے کا انتظار
اور خوشی میں ٹرّا رہے ہوتے ہیں، کیونکہ میں ابھی اس کھیل میں اناڑی
کی حیثیت رکھتی ہوں اس لئے دیر سے پہونچنے پر رہا سہا کھیلنے کا موقع
بھی نہیں رہتا۔ اچھے کھیلنے والے مجھ سے کھیلنے سے آنکھ چراتے ہیں۔
یوں تو اخلاقاً یہ کہا جاتا ہے کہ "میڈم آپ کھیلئے۔ اگر یونہی بیٹھی رہیں گی
تو کھیلنا کبھی نہیں آسکیگا۔" مگر میں اُن کے دل کا حال جانتی ہوں ورانکا
کھیل خراب نہیں کرتی۔ بس شکریہ کہکر اوروں کو کھیلتے دیکھا کرتی ہوں۔
صاحب ٹینس کے شوقین نہیں۔ ہوں بھی کس طرح جب وہ صبح اٹھکر
ہر روز مگدروں اور سپرنگ سے اتنی ورزش کر لیتے ہیں کہ باقی ساڑھے
تیئیس گھنٹے آرام کا متلاشی رہنا پڑتا ہے۔

اندھیرا ہوتے ہی "چھوکرا برج کی میز جماؤ" کی صدا بلند ہوتی ہے
اور ساتھ ہی دوست احباب اصرار کرتے ہیں کہ "آؤ بھئی برج کھیلیں"
صاحب کی مُراد بر آتی ہے۔ مگر چونکہ میں ساتھ رہتی ہوں اسلئے براہِ راست
کھیلنا شروع نہیں کرتے بلکہ دوستوں سے آنکھوں آنکھوں میں مدد کی
درخواست کرتے ہیں۔ وہ اِن کو مجبور کرتے ہیں۔ یہ میری طرف دیکھتے
ہیں۔ اِن کے دوست مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ "میڈم براہِ خُدا
ان کو اجازت دے دیجئے"۔ میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی! اپنی
عزّت قائم رکھنے کے لئے کہہ دیتی ہوں کہ "ضرور کھیلئے"۔ اگر یہ نہ کہوں
تو بھی وہ برج کھیل کر رہیں گے، اسی لئے تو کلب جاتے ہیں۔ صاحب
یہ کہکر کہ "اچھا ایک بازی کھیل ہی لیتا ہوں"۔ کرسی کھینچکر بیٹھ جاتے
ہیں۔ کلب کی سب عورتیں ایک ایک کر کے چلی جاتی ہیں۔ صرف
برج کے مریض رہ جاتے ہیں۔ کھیل شروع ہوتا ہے اور سوائے
"ون نو ٹرمپ: ٹو سپیڈز: فائیو ڈائمنڈز ــ ڈبل: ری ڈبل" کے
کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ ہر ایک ہاتھ ختم ہونے کے بعد گلے اور
نکتہ چینی شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ کھلاڑی بحث کرتے کرتے
کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک طوفانِ بدتمیزی مچ جاتا ہے
معلوم ہوتا ہے کہ اب لڑے۔ آخر دوسرا ہاتھ بانٹا جاتا ہے۔ کوئی بزرگ
کہتا ہے کہ "گزری ہوئی باتوں کی یاد مت کرو آئندہ سے غلطی نہ کرو"۔

اس پر ابھرے ہوئے جوش فرو ہوجاتے ہیں، کسے ہوئے مُکّے ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔ پتّے اُٹھا کر دوسرا ہاتھ شروع ہوتا ہے جس کے بعد پھر وہی باتوں کی جنگ شروع ہوتی ہے اور کچھ دیر جاری رہ کر پھر کھیل شروع ہوجاتا ہے۔

ایک "ربر" ختم ہوتا ہے۔ دوسرا شروع ہوتا ہے۔ پھر تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور اسی طرح سات، آٹھ، نو اور دس بج جاتے ہیں۔ اس دوران میں جو میری حالت ہوتی ہے اُسے صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اگر غلطی سے کبھی صاحب سے پوچھ بیٹھوں "گھر کب چلو گے؟ بھوک لگ رہی ہے" تو جواب ملتا ہے "ہاں چار ہارٹس بنانے ہیں۔ بڑا دلچسپ ہاتھ بٹا ہے۔ دیکھو کس طرح بناتا ہوں"۔

یہ بے تکی سُن کر مجھے ہنسی آجاتی ہے اور رونا بھی کہ صاحب کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا۔ دیوانے ہوگئے ہیں جو میری سیدھی سادی بات نہیں سمجھ سکتے۔

آخر ساڑھے دس بجے جب برج کا دَور ختم ہوتا ہے تو میری بھوک ٹینس کھیلنے کی اُمید کی طرح مرچکی ہوتی ہے۔ سب لوگ کرسیوں پر سے اُٹھتے ہیں۔ ایک صاحب حساب کرتے ہیں۔ صاحب بھی اُٹھتے ہیں حساب کرنے والے صاحب اُن کو بتاتے ہیں کہ وہ صرف پونے چار روپے ہارے ہیں۔ صاحب میرے بیگ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر بہت ہی محبت سے کہتے ہیں "معاف کیجئے دیر ہوگئی، آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی"... پھر گلا صاف کر کے کہتے ہیں:۔

"آج قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ خواہ مخواہ تین روپے بارہ آنے ہار گیا۔ نہ ہی کھیلتا تو اچھا تھا۔ ہاں آپ کے پاس ریزگاری ہوگی۔ عنایت فرمائیے تاکہ برج کا قرضہ چکا دوں۔ پھر جب جیتوں گا تو لوٹا دوں گا"۔

مجھے ہاری ہوئی رقم دینی ہی پڑتی ہے۔ مگر یہ اُمید کہ صاحب جیت کر واپس کر دیں گے کبھی پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارے صاحب، ہارنے کے ماہر ہیں۔ جب سے اُن کو برج کھیلنے کا چسکہ لگا ہے میں نے ایک بھی ساڑھی نہیں خریدی۔ خریدوں بھی کیسے جو تنخواہ آتی ہے اس میں سے کچھ مکان کے کرائے اور کچھ گھر چلانے کے کام آتی ہے۔ باقی جو بچتا ہے وہ رکّیں کے لئے۔ پتّے اور لبکٹ خریدنے اور پانچ روپے روز برج کی ہار کا حساب چُکانے میں صرف ہوجاتا ہے۔

جب گھر پہونچتے ہیں تو کپڑے بدلتے ہوئے صاحب کہتے ہیں "دیکھا کبھی دوست واحباب کو بھی خوش کرنا پڑتا ہے... یہ برج کا کھیل بھی عجب ہے۔ ایک وقت اگر بیٹھ جاؤ تو اُٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی مگر باوجود اس کے آپ کی تکلیف کا خیال کر کے اُٹھنے ہی والا تھا مگر چونکہ ہار رہا تھا اس لئے جیتنے کی اُمید میں اتنی دیر بیٹھا رہا... آج پتے بالکل نہیں آتے اور میرا پاٹنر بھی عجب چغد تھا۔ کمبخت ہمیشہ ہارا کرتا ہے۔ پھر بھی نہ کھیلنا ترک کرتا ہے نہ کھیلنے میں کسی قسم کی ترقی کرتا ہے... وغیرہ وغیرہ"۔ اِن سب باتوں کا جواب میرے پاس سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا۔

کھانا زہرمار کر کے ہم اپنے اپنے پلنگ پر پڑجاتے ہیں۔ صاحب تو لیٹتے ہی سوجاتے ہیں اور مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مجھے اپنا ٹینس کا ریکیٹ یاد آتا ہے جس کو میں نے کس شوق سے خریدا تھا۔ اس کی تانت کا وارنش بھی ابھی تک نہیں اترسکا۔ کاش ہمارا گھر کلب کے پاس ہوتا.....

"سکس کلبز۔ آپنے ڈبل کیا تو میں نے ری ڈبل کیا۔ جیت لی بازی.... مار لیا میدان۔ چار سو اسّی نیچے۔ پانچ سو اوپر سات سو ربر کے.... اکیس پوئنٹس کا ربر ہے۔ کیوں پاٹنر کیسا ری ڈبل کیا......"

صاحب بڑبڑا رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نیند میں برج کھیل رہے ہیں۔ جو اصل زندگی میں نہیں جیت سکتے تو خواب میں اپنی آرزو پوری کر رہے ہیں۔ یہ کانٹرک برج یعنی معاہدے کی برج کے مریض کا حال ہے۔ کاش کہ اُن کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ نکاح کر کے جو معاہدہ اُنہوں نے کیا ہے اُسکے فرائض کیا ہیں!

بیگم وہاب الدین احمد

سلامبو۔ فلابیر کا شہ پارہ قرطاجنہ کی حسین ترین دوشیزہ سلامبو نے وحشیوں کے دیوہیکل سردار ماتو کو اپنے حُسن کے دام میں گرفتار کیا اور اپنے ملک کو بچانے کے لئے اپنی زندگی برباد کرلی۔ بھوکے وحشی اپنے مُردے تک کھا گئے۔ تاریخ و رومان کا حسین مرقع۔ جس میں کئی ہزار سال پہلے کی تہذیب پیش کی گئی ہے۔ قیمت تین روپے۔

انطونی اور کلا بطرہ شیکسپیر کا دوسرا کارنامہ۔ کلا بطرہ کے سانس میں زہر اور آغوش میں موت تھی۔ شہرۂ آفاق ڈرامہ۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو، دہلی۔

تحلیلِ نفسی

تعارف ۔ گزشتہ دو قسطوں میں عام فہم نظریہ، تاریخی ارتقا، پس منظر، اور جملہ مروجہ دبستانوں پر بالتفصیل بحث ہو چکی ہے۔ اب انفرادی مسئلہ جات پر روشنی ڈالنا درپیش ہے، اس ضمن میں مندرجہ ذیل موضوع منتہائے نظر ٹھہرتے ہیں:۔
جنسی مسئلہ جات، خواب، مذاق و مزاح، قلم اور زبان کی لغزشیں اور دو نفسیاتی حالتیں جنہیں حکما ___ احساس سفلی و علوی ___ Superiority and Inferiority Complex کا نام دیتے ہیں ___
پیش نظر قسط میں قلم و زبان کی لغزشوں اور آئے دن کی دیگر غلطیوں پر بحث تمحیص کی گئی ہے۔___

بے خودی بے سبب نہیں غالب   کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اس مقالے میں ہم ٹھوس منطقی بحث اور خشک تاریخی چھان بین سے حتی الوسع کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنا قدم تحقیق و تفتیش کے تجرباتی میدان میں رکھیں گے۔ آج کے ان دلچسپ تجربات و مشاہدات کیلئے ایک ایسی غیر اہم چیز چنی جائے گی جس سے ہر خاص و عام واقف ہو، جسے نفسی بیماریوں سے کوئی خاص تعلق نہیں اور جس میں سوسائٹی کا ہر فرد و بشر مبتلا ہے۔ ہماری مراد ان لغزشوں سے ہے جو تمام اشخاص سے سرزد ہوتی ہیں۔ یعنی ایک تو زبان کی فرد گزاشتیں، قلم کی لغزشیں، غلط پڑھنا، غلط سننا، (خیال رہے کہ یہ فرد گزاشتیں اور لغزشیں کسی عضوی خامی یا بیماری کا اثر نہ ہوں) ___ دوسری قسم کی غلطیاں عارضی نسیان کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً کسی واقف شخص کا نام اس طرح بھول جانا کہ وہی نام زبان پر پھرے لیکن یاد نہ آئے؛ ان فرد گذاشتوں کی تیسری قسم کسی چیز کو کہیں رکھکر بھول جانا ہے۔ ان متعین اقسام کے علاوہ ان لغزشوں کے کئی اور نمونے بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مخصوص وقت کے لئے کسی بات کو سچ مان لینا حالانکہ اس سے پہلے یعنی عہد ماضی میں اسی امر کا غلط ہونا معلوم تھا۔ اور اس کے بعد یعنی عہد مستقبل میں اس بات کو جھوٹ سمجھا جائے۔ خیال رہے کہ اس قسم کی غلطیاں عارضی ہوتی ہیں، ان سب لغزشوں کو ایک ہی سلسلہ میں پرونے کے لئے اور ان کا اندرونی تطابق نمایاں کرنے کے لئے اس قسم کی تمام غلطیوں کو جرمن زبان میں ایسے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے جن کا آغاز لفظ (Ver) سے ہو۔ انگریزی میں اس مطلب کے لئے (Slips) کا استعمال روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ ترکیب ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ آپ اسے اُردو زبان کی تنگ دامانی کا کرشمہ کہہ لیں کہ اس زبان میں اس قسم کی غلطیوں کے لئے ایسے مترادف اور متوازی الفاظ جن میں کسی قسم کی تجنیس کا پہلو نکلے سرے سے پیدا ہی نہیں ___ بہرحال آج ہم انہی لغزشوں کی چھان بین کے لئے تحلیل نفسی کا حربہ بروئے کار لائیں گے ___

باقاعدہ مطالعہ و مشاہدہ شروع کرنے سے پہلے آپ یہ کہیں گے کہ آخر ان معمولی فروگذاشتوں کی اتنی اہمیت ہی کہاں ہے کہ دُنیا، روح، نفس اور دماغ کے دیگر اہم ترین مسائل پر وقت صرف کرنے کی بجائے ہم اپنے قیمتی لمحات یہ دریافت کرنے میں گزار دیں کہ فلاں مقرر نے اپنی تقریر میں فلاں لفظ غلط کیوں استعمال کیا یا فلاں شخص اپنی کنجیاں کہیں رکھکر کیوں بھول گیا؟ اگر تحلیل نفسی کو بیشتر وقت ان فروعی اور غیر اہم امور پر ہی صرف کرنا ہے تو ایسے فن کو ہمارا دُور سے سلام ہے۔ فرائڈ اس اعتراض کے جواب میں رقمطراز ہے:۔" یہ سچ ہے کہ تحلیل نفسی کبھی غیر اہم اُمور سے کنارہ کشی نہ کر سکی۔ بلکہ حقیقت تو یوں ہے کہ تحلیل نفسی کی امتحانی نلیوں میں عموماً وہ اجزا تحلیل کئے جاتے ہیں جو مادی دُنیا کے دیگر علوم و فنون کے دارالتجارب میں غیر اہم اور معمولی قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اہم اشیا عام نہیں ہو سکتیں؟ مثال کے طور پر آپ اس امر کو لیں کہ نوجوان عاشق کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا سنگدل محبوب اب مہربانی پر آمادہ ہو چلا ہے؟ کیا محبوب کوئی تحریری اقرار نامہ بحق عاشق محفوظ کروا دیتا ہے۔ یا لطف و کرم کے جوش میں ازخود اپنی باہیں عاشق کے گلے میں ڈال دیتا ہے؟ کیا عشاق پر محبوب کی آمادگی تلطف ظاہر کرنے کے لئے ایک پراں نظر، ایک گہرا سانس، یا ایک غمزہ غماز ہی کافی نہیں زیادہ نہیں؟ دیگر مثال کے لئے تب لیجئے آپ کو ایک ایسا جاسوس سمجھ لیں جو کسی روپوش قاتل کے سراغ میں سرگردانی ہو۔ کیا آپ یہ اُمید رکھیں گے کہ قاتل جاتے وقت اپنا فوٹو بمع ایڈریس آپ کی یادداشت کیلئے مقام قتل پر چھوڑ جائیگا؟ اور کیا آپ صرف چند

غیر اہم نشانیوں سے قاتل کا کھوج نکالنے کی سعی نہ فرمائیں گے؟۔

اہمیت اور عمومیت کی اس بحث کے بعد ایک نیا روڑا تحلیل نفسی کی راہ میں اٹکتا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی بعض لوگ کہیں گے کہ کیا تحلیل نفسی کے اصول سے علیحدہ رہ کر ان فروگزاشتوں کی تشریح نہیں ہو سکتی؟۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ یہ غلطیاں ہلکی عضوی خامی کا نتیجہ ہوں یا اُن کی تہ میں خفیف دماغی بیماریاں پنہاں ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک عام آدمی میں زبان و قلم کی لغزشیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب یا تو وہ بہت تھکا ہوا ہو یا بیمار ہو یا جذباتی جوش میں ہو۔ یا اس کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو رہی ہو۔ یہ تو عام آدمی بھی جانتے ہیں کہ درد سر یا جسمانی تھکاوٹ کی حالت میں عارضی نسیان کا عرضہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض ممالک میں معروف اشخاص کے نام بھول جانا درد سر میں مبتلا ہونے کی پہلی نشانی سمجھا جاتا ہے؛ جذباتی جوش میں آکر الفاظ کا ٹھیک ادا نہ ہو سکنا بھی ایک مشہور بات ہے۔ ایشیائی حکما و شعرا نے جذباتی جوش کے بہت نئے نئے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ اور اس ضمن میں عاشق کی طرف سے حیرت، حسرت، وحشت اور محبوب کی طرف سے حیا و شرم، انفعال و اجتناب کے نقشے کھینچے ہیں[1]۔ انحراف توجہ کے سبب لغزشیں کھانے کی صدہا مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے مشہور مزاح نگار کی بابت مشہور ہے، کہ ایک دن آپ شام کو دفتر سے ذرا دیر میں گھر واپس آئے۔ اور خاموش اوپر کی منزل پر پہونچے۔ وہاں ایک کمرے میں آپ نے اپنی چھتری کو ایک لحاف میں لپیٹ کر بڑے آرام سے چارپائی پر لٹا دیا۔ اور آپ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کسی سوچ میں کھڑے ہو گئے۔ وہ تو بھلا ہوا ایک دوست کا کہ اُن کی تلاش میں اُوپر آ پہونچا ورنہ وہ حضرت تو شاید تمام رات وہیں کھڑے کھڑے گزار دیتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ اپنی نئی تصنیف کا ڈھانچہ اور پلاٹ سوچ رہے تھے۔

اِن جملہ مثالوں سے بادی النظر میں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لغزشوں کی چھان بین تحلیل نفسی کی کسی خاص توجیہ کی محتاج نہیں۔ لیکن کیا یہ لازم نہیں ٹھہرتا کہ تحلیل نفسی کے دامن کو چھوڑ دینے سے پہلے ہم ایک نظرِ تعمق ان مذکورہ بالا دلائل اور اسباب پر دوڑائیں؟ —— سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ جن اُمور کو قلم و زبان کی لغزشوں کا سبب قرار دیا جاتا ہے وہ تمام کے تمام ایک دوسرے کے ہم جنس نظر نہیں آتے۔ پہلی قسم خفیف عضوی بیماریوں اور دورانِ خون کے جملہ نقائص کی ہے۔ اِن لغزشوں کی عضویاتی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے۔ دوسری قسم میں جوش، ہیجان، تھکاوٹ اور فقدانِ توجہ شامل ہیں۔ یہ اسباب پہلی قسم سے مختلف ہیں۔ انہیں ہم "عضویاتی نفسی" (Psycho-Physiological ——) اسباب کا نام دے سکتے ہیں۔ اور ان پر آسانی سے ایک توجیہ تراشی جا سکتی ہے۔ یعنی اوّل تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اِن جملہ لغزشوں کا بنیادی سبب توجہ کی کمی ہے اور بعد میں یہ ثابت کر دکھایا جا سکتا ہے کہ تھکاوٹ، ہیجان وغیرہ کی حالت میں توجہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ دورانِ خون کے نقائص اور دیگر عضوی خامیوں سے بھی توجہ میں تغیر و تبدّل واقع ہو جاتا ہے اور اِن وجوہات کی بنا پر پیشِ نظر فعل نادرست طور پر سرانجام پاتا ہے۔ یعنی لغزشوں کی تہ میں ہمیشہ فقدانِ توجہ کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ خواہ یہ نفسی اُمور سے پیدا ہو یا عضویاتی اسباب سے پھوٹ نکلے —— یہاں تک تو راستہ بالکل صاف ہے۔ لیکن اِس توجیہہ کی روشنی میں مشاہداتی اُمور پر روشنی ڈالنا اس توجیہہ کے لئے ازحد مُضر ثابت ہوتا ہے۔ ہمیں پہلی ہی نظر میں پتہ ملتا ہے کہ نہ تو اس توجیہہ کے سہارے جملہ مشاہدات کی تشریح ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس توجیہہ سے جملہ لغزشیں منطقی طور پر اخذ کی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت ہے کہ بسا اوقات یہ لغزشیں ایسے افراد سے سرزد ہوتی ہیں جو نہ تو تھکے ہوتے ہیں اور نہ کسی جوش و جذبہ کے ماتحت ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں[2]۔ اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ زیادہ تر حالات میں توجہ کی کمی یا زیادتی پیشِ نظر فعل پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے۔ اور بعض اُمور بغیر کسی خاص توجہ کے سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً دفتر جاتے وقت آپ ہمیشہ ٹھیک راستہ اختیار کریں گے۔ اور بغیر کسی خاص توجہ کے سیدھے دفتر پہونچ جائیں گے۔ دیگر مثال کے لئے آپ کسی باکمال ٹائپ کرنے والے کی حرکات مُلاحظہ فرمائیں۔ اور خود دیکھ لیں کہ وہ کس قدر عدم توجہی سے اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ بہت کم اغلاط کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ بعض اُمور ایسے بھی ہیں جو صرف اسی حالت میں ٹھیک

---

[1] چند نمونہ جات مُلاحظہ ہوں:۔ جوش میں کہتا تھا کچھ مُنہ سے نکل جاتا تھا کچھ ۔ کیا مجھے خفت ہوئی ہے نامہ بر کے سامنے

کہتے ہیں تجھکو ہوش نہیں اضطراب میں ۔ سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں (مومن)

شرم سے نام تک نہیں لیتے ۔ اب ہمارا خطاب ہے "کوئی" (داغ)

[2] یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ ان لغزشوں کا سبب یہ کہدیں کہ وہ ایسی لغزشوں کے ہنگام غیر شعوری طور پر جوش یا تھکاوٹ میں مبتلا تھے۔

طور پر سرانجام دے جاسکتے ہیں جب ہم اُن کی طرف بہت کم متوجہ ہوں۔ اور طرفہ یہ کہ جوں جوں ہم اپنی خاص توجہ ان پر مبذول کرتے جائیں گے توں توں ان میں غلطیاں بڑھتی جائیں گی۔ آپ کہیں گے کہ توجہ کی زیادتی اور کثرت کے باعث ہیجان پیدا ہو جاتا ہے لیکن شاید آپ اس کا کچھ جواب نہ دے سکیں گے کہ یہ جوش توجہ کو کم کرنے کی بجائے اور زیادہ کیوں نہیں کرتا؟ یعنی زیر مطالعہ توجیہہ کے سہارے آپ کبھی بھی نہ بتا سکیں گے کہ ایک مقرر کی زبان سے کیوں اور کس طرح دورانِ تقریر میں غلطی سے اسکے خیالات کے بالکل برعکس الفاظ نکل جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ چند دیگر اُمور بھی پیدا ہیں۔ جو اس توجیہہ کی مدد سے کسی طرح بھی سمجھے نہیں جا سکتے۔ مثلاً آپ عارضی طور پر کسی دوست کا نام بھول گئے ہیں۔ آپ اس نام کو یاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اپنی تمام تر توجہ اور دماغی قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ نام آپ کی زبان کے سِرے پر آ کر پھرتا ہے لیکن آپ اسے ادا نہیں کر سکتے۔ اور پھر اگر اس وقت کوئی اور شخص وہ نام لے لیتا ہے تو آپ سو فی صدی یقین کے ساتھ اس نام کو پہچان لیتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ بعض حالات میں جب ہم کسی غلطی کو درست کرنے لگتے ہیں تو اور کسی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جوں جوں ہم اُس کی درستی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں توں توں غلطیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ مثلاً آپ کو کسی سے ملنا ہے۔ اور آپ کو اس سے ملنا یاد نہیں رہتا۔ بار دیگر آپ تہیہ کر لیتے ہیں کہ اس دفعہ ضرور مل کر رہونگا۔ اور ایسے آپ کو اپنا عہد تو یاد رہتا ہے لیکن آپ کو مقررہ دن نہیں یاد رہتا۔ یا آپ کسی فراموش شدہ نام کو یاد کرنے کی کوشش میں ہیں اور اس کوشش میں آپ ایک دوسرا نام فراموش کر بیٹھتے ہیں حالانکہ اس دوسرے نام سے پہلا نام یاد کرنے میں کافی مدد ملتی تھی۔ یا آپ شاعر ہیں۔ آپ کو ایک مصرع سوجھتا ہے آپ اس پر دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ دماغ پر بہت زور ڈال کر مصرع تیار ہوتا ہے لیکن تب پتہ چلتا ہے، کہ پہلا مصرع ہی ذہن سے اتر گیا ہے۔ اب پہلے مصرع کی ڈھونڈی پڑتی ہے۔ اور اس دوران میں دوسرا مصرع بھی ففرو ہو جاتا ہے۔ چھاپہ خانہ کے کمپوزیٹر اس قسم کی غلطیاں عام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک اخبار میں یہ فقرہ نظر پڑا "مدعو حضرات میں مسخرہ شاہزادہ (Clown - Prince) بھی موجود تھا!" دوسرے دن پرچے میں معذرت کے ساتھ اس فقرے کی درستی اس طرح کی گئی تھی۔ "مدعو حضرات میں کوا شاہزادہ (Crow - Prince) بھی موجود تھا!" یہ سب ولی عہد شاہزادہ (Crown - Prince) کی مسخ شدہ صورتیں تھیں!۔

شاید آپ اس امر سے واقف نہ ہوں کہ آپ اثر آفرینی ___ Suggestion کے زیر اثر دیدہ و دانستہ دوسروں سے یا اپنے آپ سے زبان کی غلطیاں سرزد کرا سکتے ہیں۔ اس دلیل کو پختہ تر بنانے کیلئے صرف ایک مثال کافی ہوگی:۔

"خاتونِ آرلینز" (Maid of Orleans) کا ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ ایک نو آموز ایکٹر کا پارٹ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں جا کر باآواز بلند یہ کہدے کہ "جناب کانسٹبل صاحب اپنی تلوار (Swords) واپس بھیجتے ہیں"۔ ریہرسل کے دوران میں چیف ایکٹر از راہِ مذاق اُس سے یہ فقرہ کہلواتا رہا۔ "کامفورٹیبل[1] (___ comfortabel) اپنا گھوڑا (steed) واپس بھیجتے ہیں"۔ اگرچہ اس نئے ایکٹر کو معلوم تھا کہ یہ مذاق ہے اور اصل ڈرامہ کے وقت اس کو صحیح فقرہ بولنا چاہیئے۔ پھر بھی ڈرامہ میں اس کے مُنہ سے بیساختہ یہی مذاقیہ فقرہ نکل گیا۔

مندرجہ بالا نکات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ یہ توجیہہ کہ "غلطیاں فقدانِ توجہ کا لازمی نتیجہ ہیں" کچھ مکمل اور تسلی بخش معلوم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہ یہ توجیہہ سرے سے ہی غلط ہے عین ممکن ہے کہ اس توجیہہ میں بہت کچھ صداقت پنہاں ہو۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ اس توجیہہ میں سے کوئی ایک آدھ ایسی کڑی مفقود ہے جس کے بغیر یہ توجیہہ بیکار اور لایعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور مزید یہ کہ بہت سی غلطیاں ایک اور نظریہ کے ماتحت بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

نمونہ کے لئے پہلے زبان کی لغزشوں کا مطالعہ شروع کیا جاتا ہے۔ مگر مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ امر ذہن نشین ہو جانا چاہیئے کہ اب تک ہم اس مسئلہ پر صرف سوچ بچار کرتے رہے ہیں کہ کب اور کن حالات کے ماتحت زبان سے غلط الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی توجہ کو اس طرف مبذول نہیں کیا کہ فلاں حالات میں کیوں ایک مخصوص غلط لفظ زبان سے ادا ہو جاتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جب تک اس سوال کا تسلی بخش جواب

---

[1] جرمن کرخنداروں کی زبان میں ایک گھوڑے والی بگھی کو کہتے ہیں:۔

نہ مل جائے۔ تب تک ہم اِن غلطیوں کی ماہیّت سے بخوبی روشناس نہیں ہو سکتے۔ بلکہ تب تک یہ غلطیاں ہماری نگاہ میں ایک نفسیاتی حادثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ایک فرد ایک لفظ کے انتخاب میں غلطی کرتا ہے تو وہ غلط لفظ کے لئے ہزارہا الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ چن سکتا ہے یا اصلی لفظ کو ہزارہا طریق سے مسخ کر سکتا ہے۔ اب یہ سوچنا ہے کہ یہ مخصوص غلط لفظ کسی اندرونی طاقت کے ماتحت چُنا جاتا ہے یا یہ انتخاب محض ایک حادثہ ہے۔ جسے جذبۂ شعور اور قوتِ تعقّل و ادراک کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں۔

۱۸۹۵ء میں ایک ماہرِ عضویات اور ایک ماہر مسمریزم[۵] نے اس مسئلہ کو اسی نظریہ کے ماتحت حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے زبان کی غلطیوں کے بہت سے نمونے فراہم کئے۔ اور ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا۔ اگرچہ ان کی یہ تقسیم کچھ زیادہ بصیرت افروز نہ تھی۔ پھر بھی اس پر چند ایک موجودہ توجیہات کی بُنیادیں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔ ان حضرات کی ایک ادنیٰ مثال مُلاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں: "الفاظ کے مسخ شُدہ ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک صورت یہ بھی ہے کہ الفاظ اپنی مقررہ جگہ تبدیل کر لیں۔ مثلاً 'شریف حسین بخاری' کی بجائے 'بخار حسین شریفی'۔" اس تقسیم کے بعد ان حضرات نے جو حل پیش کیا وہ بقول فرائڈ بہت حد تک غیر مکمل ہے۔ ان ہر دو حضرات کا خیال تھا کہ "الفاظ کی آوازوں اور ارکان کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور بلند درجے کی آوازیں نچلے درجے کی آوازوں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ یا اُن پر چھا جاتی ہیں —"

صاف ظاہر ہے کہ ان کا یہ نظریہ صرف چند ایک قسم کی لغزشوں کی تشریح کے کام آ سکتا ہے۔ مثلاً وہ غلطیاں جن میں شین قاف کی تکرار بدرجہ تنافر موجود ہو۔ یا جن میں مستقبل بینی —— anticipation کا اثر نمایاں ہو۔ دیگر اقسام کی فروگزاشتیں عموماً الفاظ کے صوتیاتی اثرات کی مرہونِ منت نہیں ہوتیں۔ بلکہ زیادہ تر واقعات میں ہم صحیح لفظ کی بجائے عموماً ایک ایسا لفظ استعمال کر بیٹھتے ہیں جو حقیقی لفظ سے بہت حد تک مشابہ ہوتا ہے۔

بایں ہمہ زبان کی لغزشوں کی سب سے عام اور عیاں قسم وہ ہے جس میں ہم صحیح لفظ کے عین برخلاف لفظ کہہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی فروگزاشتیں ظاہرا طور پر مشابہت اور آوازوں کے اثرات سے غیر متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض حکما کے نزدیک متضاد الفاظ میں ایک ایسا تصوری تعلق پنہاں ہوتا ہے جو اِن الفاظ کو نفساتی طور پر ایک ہی رنگ میں سمو دیتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثالیں بکثرت پیدا ہیں۔ جس طرح متضاد الفاظ تصوری تعلق کی بنا پر غلطیوں کی وجہ بن سکتے ہیں اس طرح دیگر اقسام کے تصوری تعلق بھی اکثر اوقات ایسے ہی نتائج پیدا کر دکھاتے ہیں — اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان غلطیوں کی تہ میں آوازوں کے اثرات اور لفظوں کی مشابہت کے علاوہ لفظوں کے تصوری تعلقات بھی پوشیدہ ہیں۔ لیکن اسکے باوجود تمام تر اسباب کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

ہم ابھی تک یہ سوچ بچار کر رہے تھے کہ یہ فروگزاشتیں کن حالات کے ماتحت سرزد ہوتی ہیں اور کن اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ہم نے ابھی تک اِن غلطیوں کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ اگر ہم اِن غلطیوں پر نگاہِ غور دوڑائیں گے تو ہم جلد اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ یہ غلط الفاظ بھی بہت پُر معنی ہوتے ہیں۔ یعنی ہم باوثوق طور پر کہہ سکتے ہیں کہ غلطیاں کرنا ایک مکمل اور دماغی فطری فعل ہے۔ اور پھر مزید یہ کہ یہ فعل کسی مقصد کو لئے ہوتا ہے اور اس کے نتائج مکمل اور بامعنی ہوتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ ابھی تک تو زبان کی لغزشیں ایک قسم کی فروگزاشتیں تھیں اور اب یہ فطری فعل بنی جا رہی ہیں —؟

سنیئے — اکثر حالات میں غلطی کے معنی عیاں اور بیاں ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ ایک پارلیمنٹ کے صدر نے اپنے افتتاحیہ خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ "معزز حاضرین — میں دیکھتا ہوں کہ پارلیمنٹ کے جملہ آداب و قواعدِ جلسہ کو شروع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس لئے میں اِس اجلاس کو "برخاست" کرتا ہوں!" — بقول فرائڈ صدر کے اس غلط لفظ کے استعمال سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے دل میں اس اجلاس کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس اجلاس سے کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا۔ اس لئے وہ مناسب سمجھتا ہے کہ ایسے اجلاس پر وقت ضائع نہ کیا جائے۔

دیگر مثال:— ایک خاتون جو اپنے شوہر پر بہت رُعب رکھتی تھیں فرماتی ہیں۔ "میرے شوہر نے حکیم صاحب سے استفسار فرمایا کہ کون سی غذا اُن کے لئے بہتر ثابت ہوگی۔ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ اُن کے لئے کوئی خاص پرہیزی غذا کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر وہ چیز کھا پی سکتے ہیں جو میں" (خاتون) "اُنہیں بتاؤں!"—

---

۵ Meringer and Mayer

اب اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ نہ صرف چند ایک لغزشیں بلکہ ہماری جملہ غلطیاں اور تمام تر فروگذاشتیں اپنے دامن میں گوناگوں مقاصد و معانی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ تو پھر ہمیں باقی تمام اثرات و وجوہات سے قطع نظر کرتے ہوئے عنانِ توجہ کو یک قلم اِن معانی کی چھان بین کی طرف موڑنا پڑے گا۔ اس وقت ہمیں تمام عضویاتی اور "نفسی۔عضویاتی" وجوہات کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اور اپنی تمام تر توجہ اِن غلطیوں کے معانی و مقاصد کی طرف مبذول کرنا ہوگی۔

نامناسب نہ ہوگا اگر آپ ہمارے ہمراہ ان غلطیوں پر ایک نظر مذکورۂ بالا نیت سے دوڑانے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر ایک نگاہِ غور ڈالیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شاعر لوگ زبان کی غلطیوں یا دیگر فروگزاشتوں کے استعمال سے مضامین کو چمکاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اِن غلطیوں کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ غلطیاں ارادتاً پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ غلطیاں اتفاقاً سرزد ہوتیں تو ضرور بالضرور طبع ثانی میں صاف ہو جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر لوگ ان غلطیوں سے اپنے کرداروں کے افعال و اخلاق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ کبھی تو کسی مخصوص کردار کی بد دماغی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ کبھی کسی کردار کو تھکا ماندہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی کسی اور وجہ سے یہ حربہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو شلر (Schiller) کا لکھا ہوا "والن سٹین" (Wallenstein) (Piccolomini, Act I, Scene 5.)۔ گزشتہ سین یہ ہے کہ نوجوان پکولومینی (Piccolomini) ڈیوک والن سٹین کا طرفدار بن گیا ہے۔ اور صلح اور آشتی کی بھلائیاں بیان کر رہا ہے۔ اصل میں وہ صلح کی اِن خوبیوں سے اپنے ایک گزشتہ سفر میں متعارف ہوا ہے۔ اور اس تعارف کرانے والی ہستی کو نواب والن سٹین کی مہ پارہ دختر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نوجوان پکولومینی کے اسٹیج چھوڑنے کے بعد اسٹیج پر آکٹے ویو Octavio (پکولومینی کا والد) اور اُس کا مصاحبِ خاص گوسٹین برگ تشریف لاتے ہیں:

گوسٹین برگ:۔ "آہ! یہ کیا ہوگیا؟ دوست کیا ہم اُسے ایسے دھوکے میں مبتلا رہنے دینگے؟ کیا ہم اُسے یونہی ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے؟ کیا ہم اُس کی آنکھوں سے یہ غلطی کی پٹی دُور نہ کر سکیں گے؟ کیا ہم اس کی آنکھیں نہ کھول سکیں گے؟"

آکٹے ویو:۔ (کسی گہرے خیال سے بیدار ہوتے ہوئے) "اُس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور میں ضرورت و خواہش سے زیادہ دیکھ رہا ہوں"

گوسٹین برگ:۔ "کیا مطلب؟"

آکٹے ویو:۔ "اِس کے اِس سفر پر لعنت!"

گوسٹین برگ:۔ "لیکن یہ کیوں؟"

آکٹے ویو:۔ "بس۔ بس دوست، مجھے چلنا چاہیئے۔ اور حقیقت حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو ـــ"

گوسٹین برگ:۔ "کہاں ـــــ کہاں جاتے ہو؟"

آکٹے ویو:۔ "اس کی طرف، اس عورت کی طرف ـــ" (To her, herself ـــ)

گوسٹین برگ:۔ "کہاں ـــــ؟"

آکٹے ویو:۔ (غلطی کو درست کرتا ہوا) "اس کی طرف، نواب کی طرف، آؤ چلیں ـــ!"

آکٹے ویو کہنا چاہتا تھا کہ نواب کی طرف چلیں۔ لیکن اس کی زبان پھسلتی ہے۔ اور وہ نواب کی لڑکی کا نام لے دیتا ہے اور اس طرح یہ راز آشکار کر دیتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے متاثر ہونے کی اصل وجہ سے واقف ہے۔ دیگر مثال کے لئے آپ او، رینک (O. Rank) کی وہ مثال ملاحظہ کریں جو اُس نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامہ "تاجر وینس" (Merchant of Venice ـــ) سے ڈھونڈ نکالی ہے ـــ بہتر ہوگا کہ یہاں رینک کے ایک پیرا کا ترجمہ پیش کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں:۔

"شیکسپیر کی وہ غلطی جو تاجر وینس" کے تیسرے ایکٹ کے دوسرے سین میں سرزد ہوتی ہے، عجیب شاعرانہ احساسات بیدار کرتی ہے۔ اور شاعر کے فنی کمال کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس غلطی کی طرح جو "والن سٹین" میں سرزد ہوتی ہے، اور جس کا ذکر فرائڈ نے اپنی کتاب "روزمرہ کی نفسی امراض کا معالجہ" (Psychology of every-day Life) میں کیا ہے۔ شیکسپیر کی اس غلطی سے ظاہر ہے کہ شعرا ان غلطیوں کی ماہیت اور معانی و مقاصد سے واقف ہوتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ پڑھنے سننے والے بھی ان اُمور سے بخوبی واقف ہونگے۔

پورشیا اپنے باپ کے حکم کے بموجب اپنے شوہر کا انتخاب بذریعے قرعہ اندازی کرنے پر مجبور ہے۔ اب تک حُسن اتفاق سے تمام خواہشمند نوجوان ناکامیاب رہے ہیں۔ اب بزانیو ([illegible]) کی باری ہے۔ پورشیا اُس سے محبت کرتی ہے اور ڈرتی ہے کہ قسمت اُسے بھی قرعہ اندازی میں ناکامیاب نہ رکھے۔ وہ چاہتی ہے کہ کسی طرح اُسے وہ یہ بتادے کہ قرعہ اندازی میں ناکامیاب رہنے کے بعد بھی وہ اُسے چاہتی رہے گی۔ اور اس سے شادی کرنے پر تیار ہوگی۔ لیکن چونکہ وہ باپ کے سامنے حلف اُٹھاچکی ہے اس لئے اس کی زبان بند ہے۔ اِس اظہارِ کشمکش میں شاعر کی قابلیت جھلکتی ہے اور وہ پورشیا کے منہ سے یہ الفاظ ادا کراتا ہے۔

پورشیا:۔ "میں تمہیں بتاسکتی ہوں کہ کونسی ڈبیا میں کامیابی کا نمبر پوشیدہ ہے۔ لیکن میں ایسا نہ کرنے کی قسم کھاچکی ہوں۔ اس لئے میں کبھی ایسا نہ کروں گی ..... تمہاری نظروں نے میرے دو برابر حصے کردئے ہیں۔ ایک آدھ تو تمہارا ہے اور دوسرا آدھ "تمہارا" ——— مجھے کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ ایک آدھ میرا ہے۔ لیکن چونکہ میری ہر چیز تمہاری ہے اس لئے یہ آدھ بھی تمہارا ہے۔ اور اس طرح میں تمام کی تمام تمہاری ہوں ——"

اِن مثالوں کے بعد قلم پھر سے غلطیوں کے معانی کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہر غلطی شرمندۂ معانی ہے اصل میں یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر غلطی ایک نفسی عمل ہے جس میں نیت کی جھلک اور دیگر نفسی افعال کی ترتیب موجود ہے۔ یعنی ہم اپنی مذکورہ بالا مثالوں میں معانی کی بجائے نیت اور رغبت کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ ایک سُنہری دھوکا تو نہیں؟ کہیں یہ سب کچھ شاعرانہ اغراق کی کرشمہ سازیاں تو نہیں؟ ——

آیئے پھر سے چند مثالوں کو مشعلِ راہ بنائیں۔ صدرِ اجلاس کی افتتاحیہ تقریر میں یہ فقرہ کہ میں "اجلاس کو برخاست کرتا ہوں" اسکی نیت کی غمازی کررہا ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں یہ نیت اتنی عیاں وبیاں نہیں ہوتی پھر بھی تھوڑا سا تدبّر و تدلّل ہمیں پنہاں نیت تک لے ہی پہونچتا ہے۔ بسا اوقات غلطی ہمیں اصل معنی کے علاوہ ایک اور نیا معنی عطا کردیتی ہے۔ اور اس صورت میں فقرہ ایک قسم کا اختصاری جملہ معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا خاتون والی مثال میں خاتون کا فقرہ مندرجہ ذیل فقروں کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے۔ "میرا خاوند جو چاہے کھا سکتا ہے؟! لیکن اس کا اتنا اختیار ہی کب ہے کہ وہ کسی چیز کا انتخاب کرے۔ اس لئے میں خود ہی اس کے لئے انتخاب کروں گی —— پہلی اور دوسری مثال میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک حالت میں ایک ارادہ دوسرے ارادے پر مکمل طور پر غالب آگیا ہے۔ اور دوسری میں غلبہ ادھورا ہے۔ اور اس لئے صحیح الفاظ کے عین برعکس الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ بہرحال اِن مثالوں سے بقول فرائڈ یہ ظاہر ہے کہ یہ غلطیاں نہ تو نفسیاتی حادثات ہیں اور نہ ہی بے معنی۔ بلکہ یہ نفسیاتی فطری افعال ہیں۔ اور گوناگوں معانی کی حامل ہیں۔ اور یہ کہ یہ ارادوں کی تکرار اور اُن کے بیک وقت پیدا ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کیا یہ توجیہ زبان کی ہر قسم کی غلطیوں کی تشریح کرسکتی ہے؟ اس کا جواب فرائڈ نے یہ دیا ہے کہ آپ کو زبان کی ہر غلطی کی تہ میں یہی نکتہ پوشیدہ ملے گا۔ اگرچہ یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ اس تکرارِ ارادہ کے بغیر کوئی غلطی سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر بھی ہم باہمہ وثوق یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی زیادہ تر لغزشیں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور عین ممکن ہے کہ زبان کی تمامتر غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہوں —— دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ توجیہ زبان کی لغزشوں کے علاوہ دیگر اقسام کی غلطیوں پر بھی استعمال کی جاسکتی ہے؟ فرائڈ نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ لیکن اس جواب کی مکمل تفسیر بیان کرنے سے پہلے ایک مسئلہ قابلِ توجہ ہے۔ یعنی دورانِ خون، تھکاوٹ، ہیجان، بے توجہی۔ وغیرہ کی جانچ پڑتال۔

آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ فرائڈ کے پیرو ان چیزوں کو یک قلم رد نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ کمزوری، تھکاوٹ وغیرہ کی حالت میں اکثر زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن وہ یہ ماننے سے انکاری ہیں کہ یہ چیزیں غلطی پیدا کرنے کے ضروری اسباب میں شامل ہیں۔ فی الحقیقت اِن غلطیوں میں مبتلا ہونے کے لئے کسی خاص عضویاتی ماحول میں داخل ہونا ضروری نہیں۔ یہ غلطیاں صحیح وسالم دماغ اور جسم میں بھی رونپذیر ہوسکتی ہیں۔ پس یہ ثابت ہوا کہ جسمانی علامات محض امدادی اثرات کا رنگ رکھتی ہیں۔ یعنی یہ غلطی پیدا کرنے والے انجن کو صاف چلنے میں مدد دیتی ہیں۔ فرائڈ نے اس کی مثال اس طرح پیش کی ہے کہ فرض کریں کہ آپ اندھیری رات میں کسی غیر آباد حصۂ شہر میں گشت لگارہے ہیں۔ وہاں ایک چور آپ پر حملہ آور ہوتا ہے اور آپ سیدھے ہاتھوں اپنا بٹوا اور طلائی گھڑی اس کے سپرد کردیتے ہیں۔ اب اندھیرے کے سبب آپ اپنے چور کی شکل

نہیں دیکھی۔ اس لئے تھانہ پہنچ کر آپ اپنی ابتدائی رپورٹ اس طرح لکھواتے ہیں "تنہائی اور تاریکی نے میرا قیمتی مال چھین لیا" اس پر تھانہ انچارج کہتا ہو کہ "صاحب اس میکانیکی نقطۂ نگاہ کو چھوڑئے۔ اور یوں فرمائیے کہ تاریکی کے پردے میں اور آپ کی تنہائی سے فائدہ اٹھا کر کسی نامعلوم چور نے آپ کا مال ہتیا لیا ہو۔ اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ چور کا پتہ لگایا جائے"۔

یہ حقیقت ہے کہ فقدانِ توجہ، ہیجان، بے توجہی وغیرہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ تو صرف ہوائی گھوڑے ہیں یا بالفاظِ دیگر یہ ایک قسم کے پردے ہیں اور ہمیں ان پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنا لازم ہے کہ ہیجان، بے توجہی پیدا کیوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں الفاظ کی صوتیات کے تناسب اور حروف کی مشابہت پر غور کرنا بھی کافی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ امور غلطی کو ایک نیا رستہ بتا کر ایک لحاظ سے اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی سوچنا لازم ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک راستہ موجود ہو تو کیا آپ کو اس رستہ پر جانا ضروری ٹھہرتا ہے؟ کیا آپ کو قوتِ ارادی اور کسی جنبش دینے والی قوت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لحاظ سے آواز کے یہ تناسب اور حروف کی یہ مشابہتیں دیگر عضویاتی امور کی مثل زبان کی غلطیوں کی ممد تو ثابت ہوسکتی ہیں لیکن ان کی اصلی وجہ نہیں بن سکتیں۔ مشہور فلاسفر [illegible] کا قول ہے کہ زبان کی لغزشیں تب پیدا ہوتی ہیں جب جسمانی تھکاوٹ کے سبب قوتِ تلازم association قوتِ ارادی پر فتح حاصل کر لیتی ہو۔ اگرچہ بعض حالات میں اس کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہو۔ لیکن ہمارا مطالعہ و مشاہدہ ہمیں ہزارہا ایسے واقعات سے دوچار کراتا ہو جب زبان کی لغزشیں تلازم اور تھکاوٹ کی غیر موجودگی میں بھی سرزد ہوتی ہیں۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ہم کس طرح ان دو ارادوں کا پتہ لگا سکتے ہیں جن کی باہمی کشمکش ہمیں غلطی میں مبتلا کر دیتی ہو؟ —— یہ تو آپ مان لیں گے کہ وہ ارادہ جس کی راہ میں رکاوٹ حائل ہوتی ہے اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ خود غلطی کرنے والا فرد اس ارادے سے واقف ہوتا ہے اور ہمیں بخوبی بتا سکتا ہے کہ اس کا ارادہ کیا تھا۔ البتہ دوسرے ارادے کو متعین کرنا ذرا دشوار نظر آتا ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بعض حالات میں یہ راستے میں اٹکنے والا روڑا بہت اچھی طرح عیاں و بیاں ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو مذکورہ بالا صدرِ اجلاس والا بیان۔ لیکن بعض حالات میں یہ ارادہ اصلی ارادے کی راہ میں کچھ اس طرح حائل ہوتا ہے اور صحیح لفظ کو کچھ اس طرح مسخ کر دیا جاتا ہے کہ اس ارادے کی تلاش صیغۂ ناممکنات میں جا پڑتی نظر آتی ہے۔ پھر بھی بعض امور کی مدد سے ہم اس ارادے کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کی غلطیوں میں ہم غلطی کرنے والے کی رائے دریافت کرتے ہوئے حقیقتِ حال تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ تحلیل نفسی کا طریقہ ہے۔ اب آپ اعتراض کریں گے کہ ماہرِ نفسیات ہر حالت میں غلطی کرنے والے کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ اور ان کا یہ عام وطیرہ ہے کہ جو بات انکی توجیہ کو امداد دے اسے تو وہ لے لیتے ہیں اور جو بات انہیں ناپسند ہو وہ بلا دلیل رد کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرائڈ کمرۂ عدالت کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہاں اگر ملزم اقبالِ جرم کر لے تو عدالت اس کا بیان صحیح تسلیم کر لیتی ہے۔ اگر ملزم اقرارِ جرم سے انکاری ہو تو عدالت کبھی اس کی بات نہیں مانتی۔ کیونکہ اس طریقۂ کار کے بغیر عدل و انصاف میں قانون کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ یہ تو آپ بھی کہیں گے کہ یہ طریقۂ کار باوجود چند ایک نقائص کے کافی کارآمد ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ان غلطیوں پر تحلیل نفسی کا عمل کہاں سے آغاز ہو۔ اگر غلطی کرنے والا خود ہی امداد کرنے پر آمادہ ہو، تو پھر معاملہ ہی صاف ہے۔ اب اگر وہ اپنی غلطی کی کوئی تشریح پیش کرنے سے قاصر ہو تو کن امور پر نظر رکھنا لازم ہوگا؟ —— فرائڈ اس ضمن میں چند ایک چیزوں کا نام لیتا ہے۔ اوّل غلطی کرنے والے فعل کے مشابہ افعال کے ساتھ مقابلہ کرنا، مثلاً ایک شخص کے نام کو مسخ کر دینے کو ارادی فعل سمجھ لینا، اور پھر اس کی تحلیل اسی طرح کرنا جیسے مذاق یا تمسخر کی تحلیل کی جاتی ہے۔ دوسرا، غلطی کے نفسیاتی ماحول کا مطالعہ کرنا اور اس ضمن میں غلطی کرنے والے کے عام کردار اور اس مخصوص واقعہ کے افعال و کردار کا مطالعہ کرنا، عام طور پر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ عام اصولوں کے ماتحت غلطی کے معانی دریافت کر لیتے ہیں۔ اوّل اوّل میں یہ ایک قسم کا اندازہ ہی ہوتا ہے البتہ بعد میں نفسیاتی ماحول کا مطالعہ ہمارے نتائج کی تصدیق کر دیتا ہے۔ بعض اوقات ہمیں واقعاتِ مستقبل کا انتظار کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اکثر حالات میں یہ غلطیاں کسی آئندہ امور کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور اس حالت میں واقعاتِ مستقبل کے بعد ان کے مطالب دریافت نہیں کئے جا سکتے۔ مثال ملاحظہ ہو۔ ایک مجلس کے عام اجلاس میں ایک نوعمر رکن نے اپنی زبردست اور جوشیلی تقریر میں ارکانِ کمیٹی ([illegible]) کی بجائے غلطی سے ممبرانِ ہو کا راہیں

کمپنی" ([illegible]) کے الفاظ استعمال کئے۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس غلطی کرانے میں کوئی ایسا ارادہ یا جذبہ کارکن ہوگا جسے کسی طرح قرض دلانے سے کوئی نسبت ہوگی۔ بعد میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ مقرر صاحب مالی مشکلات میں گرفتار تھے اور قرض لینے کی فکر میں غلطاں تھے، اس لئے ان کے دل میں ضرور یہ خیال پنہاں ہوگا "مخالفت میں ذرا کمی ہی مناسب ہے۔ کیونکہ سامعین میں اکثر ایسے افراد موجود ہیں جو قرضہ دینا پسند کریں گے۔" یہ تو ہوئی زبان کی لغزش کی مثال۔ دیگر مثالوں کے لئے ہمیں دوسری قسم کی غلطیوں کی طرف راجع ہونا پڑیگا۔

بقول فرائڈ اگر کوئی آدمی کسی واقف کار کا نام بھول جائے ـــــ اور باوجود کوشش کے بھی اس کا نام یاد نہ رکھ سکے، تو آپ یقین کر لیں کہ اس کے تعلقات اس نام والے شخص سے اچھے نہیں ہیں۔ اس خیال کے ماتحت آپ مندرجہ ذیل مثال ملاحظہ کریں:۔

مسٹر الف[1] ایک خاتون پر عاشق ہوئے۔ خاتون نے اُن کی محبت کو ٹھکرا دیا اور مسٹر جیم سے شادی کر لی؛ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے مسٹر الف اور مسٹر جیم آپس میں واقف تھے۔ اور انکے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ پھر بھی اس ازدواج کے بعد مسٹر الف عموماً مسٹر جیم کا نام بھول جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ مسٹر جیم کی ناخوشگوار یاد کو فراموش کیا چاہتے ہیں۔

ایک اور مثال[2]:۔ ایک خاتون اپنی ـــــ ایک عزیز سہیلی کے متعلق ایک حکیم صاحب سے استفسار و مشورہ کے دوران میں اپنی سہیلی کا "اسمِ دوشیزگی" (Maiden Name) استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ فی الحقیقت وہ اپنی سہیلی کا "ازدواجی نام" (Married Name) ہی فراموش کر بیٹھی ہیں۔ وہ خود جانتی ہیں کہ وہ اس رشتہ کے برخلاف تھیں۔ اور اب بھی اپنی سہیلی کے شوہر سے حد درجہ متنفر ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس نفسانی حالت کا مطالعہ مکمل کر لینا چاہیئے جس حالت میں افراد سے یہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

کسی پکّے ارادے کو فراموش کرنے کی تہ میں عموماً مخالف احساسات کی زبردست روعمل پذیر ہوتی ہے اور یہ ہمارے پختہ ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچنے نہیں دیتی۔ یہ نہیں کہ صرف ماہرانِ تحلیل نفسی ہی اس مخالف احساسات کی رَو کے قائل ہوتے ہیں۔ بلکہ سماج کے جملہ افراد اِس رَو کی موجودگی کے قائل ہیں۔ اگر کوئی حاکم کسی سفارش کو بھول جائے تو سفارش کرنے والا فوراً سمجھ جائیگا کہ حاکم کی مرضی ہی نہیں ہے کہ اس کا کام کرے۔ اس وجہ سے فراموش کاری سماج کی جملہ حالتوں میں سخت نکتہ چینی کا ہدف بنائی جاتی ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ ایک میزبان اپنے مہمان کا استقبال اِن الفاظ میں کرتا ہے:۔ "اوہو! ـــ معاف کیجئے گا۔ مجھے تو یاد ہی نہ تھا کہ آج آپ کی دعوت ہے!" یا آپ اندازہ کریں کہ ایک نوجوان عاشق اپنی محبوبہ سے مقررہ موقع پر ملاقات نہ کر سکنے کی وجہ یہ پیش کرتا ہے کہ وہ مقررہ موقع بھول گیا تھا۔ کیا اُسکی محبوبہ کبھی بھی مان سکے گی کہ اس کا عاشق محض اس وجہ سے مقررہ موقع پر نہ پہونچ سکا؟ ـــ شاید آپ کو پتہ ہو کہ فوج میں "بھول جانا" کوئی بہانہ نہیں۔ اور یہ بہانہ کسی فرد کو سزا سے ہرگز ہرگز نہیں بچا سکتا، اور پھر طرّہ یہ کہ فوج کا یہ قاعدہ بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، حیرانی کی بات ہے کہ اگر تمام لوگ اس موقع پر مان لیتے ہیں کہ فلاں غلطی کے معنی ہیں تو وہ دیگر قسم کی غلطیوں کو کیوں مطالب و معانی سے بے نیاز گردانتے ہیں۔

ارادوں کو فراموش کر دینا بہت آسان اور عیاں فعل ہے اور اس پر زیادہ وقت صرف کرنا فضول ہے۔ اب ایک اس سے زیادہ گنجلک امر کی طرف عنانِ توجہ پھرائی جاتی ہے۔ یعنی چیزوں کا کہیں رکھکر بھول جانا، بادی النظر میں یہ بات مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ کہ اس غلطی کا مرتکب اس غلطی کی تہ میں کوئی مطلب چھپائے بیٹھا ہے۔ لیکن مثالیں مکمل ثبوت بہم پہونچاتی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔ مثال[3]:۔ ایک نوجوان طالبعلم اپنا ایک عزیز قلم کہیں رکھکر بھول گیا۔ چند دن ہوئے اُسے اپنے بہنوئی کا خط ملا تھا جس میں یہ فقرہ درج تھا: "نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میری نیت ہے کہ تمہاری اِن خرافات اور فروعات پر قلم اُٹھاؤں۔" ساتھ ہی یہ پتہ چلا کہ یہ قلم اسی بہنوئی کا تحفہ تھا۔ اگر ہمیں اِن دونوں واقعات کا پتہ نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی بھی غلطی کے معانی تک نہ پہونچ سکتے۔ اس قسم کی کافی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بقول فرائڈ عام آدمی ان حالات میں چیزیں عموماً کہیں رکھکر بھول جاتا ہے۔ یا عجب بے پروائی کی حالت میں ان کو گرا کر یا کسی اور طریقے سے توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں فرائڈ، مائیڈر (Maeder) برل (Brill) ارنسٹ جونز، اسٹارکی (J. Starcke) اور

---

[1] From A. A. Brill　[2] From C. G. Jung　[3] From B. Dattner

دیگر ماہرانِ نفسیات کی تصنیفات میں بکثرت موجود ہیں۔ اب ہم ان سے قطع نظر کرتے ہوئے دو اہم امور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایک تو جمع ہونی ہوئی غلطیاں ہیں اور دوسرا اپنے نتائج کی تصدیق بعد کے واقعات سے کرنا ہے۔

جمع کی ہوئی غلطیاں ایک دلچسپ مطالعہ پیش کرتی ہیں اور اگر ہمیں صرف غلطیوں میں معانی کی موجودگی ہی ثابت کرنا ہوتا تو ان سے بہتر شاید ہی کوئی اور ثبوت موجود ہو۔ کیونکہ ان کے مطالب بہت عیاں اور ظاہر ہوتے ہیں اور پھر غلطی کا اعادہ تو کبھی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ ارنسٹ جونز کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک دفعہ ایک خط لکھکر میز پر رکھا اور کافی دن گزرنے کے باوجود وہ مکتوب یونہی میز پر بلا وجہ دھرا رہا۔ آخر کار ایک دن کافی ہمت سے انہوں نے وہ خط ڈاک میں ڈال ہی دیا۔ لیکن جلد ہی انہیں وہ خط واپس مل گیا۔ کیونکہ اس پر کسی کا پتہ درج نہ تھا۔ اب کے انہوں نے پتہ لکھا اور خط کو لیکر لیٹر بکس کا قصد کیا۔ وہ خط ڈاک کے ڈبے میں ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ انہیں دھیان آیا خط پر ٹکٹ مفقود ہے۔ ایسے انہیں خط نہ لکھنے کی وجوہات سمجھ میں آگئیں۔ اور انہوں نے خط سپردِ ڈاک نہ کیا۔ ایک اور واقعہ میں کسی چیز کو غلطی سے اُٹھا لینا اور پھر کہیں رکھکر بھول جانا جمع تھا۔ ایک خاتون اپنے بہنوئی کے ساتھ اٹلی گئی۔ اُس کا بہنوئی ایک زبردست مصوّر تھا۔ اٹلی میں اس مصوّر کو ایک سنہری تمغہ پیش کیا گیا۔ لیکن اس مصوّر نے کمال بے توجہی سے وہ تمغہ ایک میز کی دراز میں رکھ چھوڑا۔ اس خاتون کو تمغے کی اس بے قدری پر بہت افسوس ہوا۔ جب وہ سفر سے واپس لوٹے، اور خاتون اپنے بہنوئی سے الوداع ہو کر اپنے گھر پہنچی، تو اُسے معلوم ہوا کہ غلطی سے وہ تمغہ اُس کے بیگ میں آگیا ہے۔ اُس نے فوراً اپنے بہنوئی کو اس غلطی کی اطلاع دی۔ اور لکھا کہ جلد ہی وہ تمغہ اُسے واپس بھیجدیگی۔ لیکن جب وہ دوسرے [illegible] واپس بھیجنے لگی، تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ تمغہ کسی جگہ رکھکر بھول گئی ہے۔ اور اب اُسے خیال آیا کہ اسکی اس عدم توجہی کی تہ میں [illegible] یہاں ہے کہ وہ تمغہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس قسم کی دیگر مثالیں پیش کرنا کافی دلچسپ امر ہوگا۔ لیکن اب ہم ایک دوسرے امر کی طرف متوجہ ہونا لازم سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ واقعات جہاں ہمارے لگائے ہوئے اندازوں کو آنیوالے واقعات سچا ثابت کر دکھاتے ہیں۔

ان واقعات کی بنیادی شرط یہ ہے کہ غلطی کرتے وقت ہم تجزیٔ نفسانی حالات سے واقف نہیں ہو سکتے اس لئے اس موقع پر ہمارا کام محض ایک اندازہ ہوتا ہے جس کو خود ہمارا دل بھی کوئی خاص وقعت نہیں بخشتا۔ لیکن بعد کے واقعات ہمارے اندازوں کی تصدیق کر دیتے ہیں۔ فرائڈ نے ایک مثال پیش کی ہے۔ "میں ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کا مہمان تھا۔ نوجوان بیوی نے مجھے اپنا ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ کہ کس طرح وہ "ماہ عسل" سے واپسی کے بعد اپنی بہن کے ہمراہ بازار گئی اور کس طرح اُس نے سڑک کے پار ایک نوجوان آدمی کو دیکھکر بے ساختہ اپنی بہن سے کہا۔ "دیکھو وہ مسٹر الف ہیں"۔ وہ بھول چکی تھی کہ یہ مسٹر الف عرصہ دو ہفتہ سے اُس کے شوہر بن چکے تھے۔ میں اس واقعہ کو سنکر کانپ اُٹھا۔ لیکن میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ کچھ مدت بعد پتہ چلا کہ اُنکی شادی سخت ناکامیاب رہی ہے۔"

دیگر مثال :- ایک مشہور جرمن کیمیادان کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کی شادی محض اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ وہ شادی کے دن گرجا جانیکی بجائے غلطی سے اپنے دار التجربہ میں جا نکلا۔۔۔۔ اور یہ تو اس کی عقلمندی کا ثبوت ہے کہ وہ اس تلخ تجربہ کے بعد شادی کرنے سے تمام عمر کے لئے فارغ رہا۔ اور مرتے دم تک ان بندھنوں سے آزاد رہا۔

اُوپر کہیں ذکر ہو چکا ہے کہ غلطیاں دو ارادوں کی باہمی کشمکش کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ارادہ دوسرے ارادے کی راہ میں حائل ہو کر افراد کو لغزشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ اب اس سدِراہ بننے والے ارادے کے متعلق دو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ سوال کہ کونسی قسم کی نیتیں اور ارادے یوں سدِراہ بنجاتے ہیں اور دوسرا یہ سوال کہ جن دو ارادوں میں باہمی نزاع پیدا ہوتا ہے ان کے مابین کس قسم کا تعلق نمودار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں زبان کی لغزشوں کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے ہم پہلے دوسرا سوال حل کرینگے۔

اکثر حالات میں حائل ہونے والا ارادہ صحیح ارادے کے ساتھ معانی کے لحاظ سے متعلق ہوتا ہے۔ ان حالات میں عموماً غلط ارادہ صحیح ارادے کی تردید ہوتا ہے۔ یا اس پر اصلاح اور ایزاد کا عمل آزماتا ہے۔ زیادہ گنجلک اور پیچیدہ واقعات میں عموماً ان دو ارادوں کے درمیان کوئی معنوی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کے معنوی تعلقات کی مثالیں ہم اُوپر عرض کر چکے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو صاحبِ صدر کی وہ مثال جس میں افتتاحیہ خطبہ کے اندر یہ خیال بھی موجود تھا۔ "میں اجلاس کو شروع کرتا ہوں۔ لیکن میں بہتر سمجھتا ہوں کہ یہ اجلاس برخاست ہی ہو"۔

From:- R. Reitler

دوسری قسم کے تعلقات (یعنی جہاں معنوی تعلقات غیر موجود ہوں) بادی النظر میں کچھ غیر فطری نظر آتے ہیں۔ اور خیال گزرتا ہے کہ معنوی تعلقات کے بغیر یہ دو ارادے اوّل تو اکٹھے کس طرح ہو جاتے ہیں؟ اور پھر حائل ہونے والا ارادہ اپنی موجودگی کا اظہار کس طرح کرتا ہے؟ مشاہداتی واقعات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لغزش واقع ہونے سے پیشتر غلطی کرنے والا فرد اپنے دماغ میں ایک خیالات کی رَو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ حائل ہونے والا ارادہ انہی خیالات میں پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ ارادہ اپنا اظہار بلا کسی روک ٹوک کے بطور تاثر مابعد" (— after effect) کے کرتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس اظہار کے وقت یہ بالکل لازم نہیں کہ اظہار پہلے ہو چکا ہو یا ابھی پردۂ خامشی میں پنہاں ہو آپ اسے ایک قسم کی گونج (— Perseveration) کہہ سکتے ہیں، اگرچہ یہ کہے ہوئے الفاظ کی صدائے بازگشت نہیں۔ واضح ہو کہ تلازم کا تعلق تو یہاں بھی دونوں ارادوں کے مابین پیدا ہوتا ہے لیکن یہ معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو ایک مصنوعی تعلق ہوتا ہے جو خیالات کی قوت کے ماتحت حقیقی معنوی تعلق کا کام دے جاتا ہے —

اب ہم بحث کے اہم ترین سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سوال جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ کونسی قسم کی نیتیں اور ارادے یوں سدِّ راہ بن جاتے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ان ارادوں کی گوناگوں اقسام پیدا ہیں۔ لیکن ہم کوشش کرینگے کہ کوئی ایسی علامت دریافت کریں جو ان سب میں یکساں موجود ہو۔ مثالوں کا مطالعہ و مشاہدہ ہمیں تمام اقسام کے تین گروپ بنا دے گا۔ پہلا گروپ اِن واقعات پر مشتمل ہے جن میں غلطی کرنے والا فرد غلطی کرنے سے پہلے حائل ہونے والے ارادے سے واقف تھا۔ اور وُہ اس کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ دوسرا گروپ اِن اقسام سے پیدا ہوتا ہے جن میں غلطی کرنے والا فرد یہ تو مانتا ہے کہ حائل ہونے والا ارادہ اسی کا ہے لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ غلطی کرتے وقت یہ ارادہ اس کے اندر متحرک تھا۔ ان حالات میں وہ ہمارے اندازہ کو صحیح تو مان لیتا ہے لیکن کچھ حیران سا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثالیں زبان کی غلطیوں کی نسبت دیگر لغزشوں میں زیادہ پیدا ہیں —— تیسرے گروپ میں غلطی کرنے والا فرد ہمارے اندازے کو سختی سے جھٹلاتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ غلطی کرتے وقت کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ ارادہ آج تک کبھی اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکا۔ ان حائل ہونے والے ارادوں کو اِن تین گروپوں میں تقسیم کرنے کے بعد آیئے اور اِن اقسام میں کوئی مشابہت ڈھونڈئے۔ پہلے دو گروپوں میں غلطی کرنے والا فرد حائل ہونے والے ارادے سے واقف ہوتا ہے۔ اور ان دو حالات میں یہ ارادہ دبایا جاتا ہے۔ تقریر کرنے والے افراد نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس خیال کو ہرگز ہرگز الفاظ کا جامہ نہ پہننے دیگا۔ اس ماحول میں اِن کی زبان لغزش کھاتی ہے۔ اور یہ ناقابلِ اظہار خیال خواہ مخواہ اُن کی مرضی کے برخلاف ان کی زبان سے کسی نہ کسی صورت میں ادا ہو جاتا ہے۔ یعنی کبھی تو اصل خیال سے مل جلکر کبھی مسخ شدہ صورت میں اور کبھی اصل خیال کو باہر نکال کر خود اس کی جگہ پر متمکن ہو جاتا ہے۔ یہ ہے زبان کی غلطیوں کی ترکیب۔ فرائڈ تیسرے گروپ کو اسی ترکیب کے سانچے میں ڈھال دکھاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان تینوں گروپوں میں فرق یہی ہے کہ اس حائل ہونے والے خیال کو کسی میں کم دبایا جاتا ہے اور کسی میں زیادہ۔ کسی میں یہ دباؤ زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور کسی میں کم، پہلے گروپ میں یہ حائل ہونے والا ارادہ موجود ہوتا ہے۔ اور تقریر سے پہلے محسوس ہو سکتا ہے اور تقریر کے بعد اِس کی تردید کی جاتی ہے، دوسرے گروپ میں یہ تردید کافی پہلے کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے یہ ارادہ تقریر سے پہلے محسوس نہیں ہوتا۔ یعنی یہ تردید اس کو احاطۂ محسوسات سے باہر نکال آتی ہے۔ تیسرے گروپ میں یہ تردید اس سے بھی پہلے کی چیز قرار پاتی ہے۔ اور یہ تردید اتنی مستحکم اور قوی ہوتی ہے کہ خود غلطی کرنے والا فرد اس کی مالکیت سے منکر ہو جاتا ہے۔ اِن تینوں گروپوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ارادے کا دبا دیا جانا کسی زبان کی غلطی کے پیدا ہونیکا بنیادی سبب ہے۔

مذکورہ بالا بحث و تمحیص سے مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے:-

اوّل یہ کہ غلطیاں مطالب و معانی سے آسودہ ہیں۔ دوم یہ کہ معانی و مطالب پہچانے جا سکتے ہیں۔ سوم یہ کہ غلطیاں دو ارادوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ چہارم یہ کہ حائل ہونے والا ارادہ صرف اس لئے غلطی کا سبب بن نکلتا ہے کہ اس کی حرکت میں کوئی روڑا اٹکایا جاتا ہے۔ یعنی پیشتر اس کے کہ وہ خود سدِّ راہ بن سکے یہ لازم ہے کہ اس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا نتائج جملہ لغزشوں کی خاطر خواہ اور تسلی بخش تشریح پیش نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جُوں جُوں ہم حل کے قریب پہونچتے جائیں گے ہم پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ تیز ہوتی جائے گی —— مثلاً ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو ارادوں کی باہمی کشمکش کیوں صلح یا کوئی اور سادہ پہلو اختیار نہیں کر لیتی)؟ یعنی یا تو صحیح ارادہ غالب ہو یا مکمل طور پر مفتوح ہو جائے۔ یہ کیا ہوا کہ اس کا کچھ حصّہ ہار گیا اور کچھ حصّہ غالب آگیا؟ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِس

نصف یا نصف جیت کے اسباب نفس انسانی میں ضرور پنہاں ہوں گے۔ لیکن ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کوئی تحقیقاتی ثبوت یا مشاہداتی دلائل پیش نہیں کر سکتے۔

ہم تمام بحث میں اپنی توجیہات زبان کی غلطیوں سے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اُن کے متعلق تو اب کچھ کہنا تحصیلِ حاصل کا مصداق ٹھہرے گا البتہ دیگر اقسام کی غلطیوں کے متعلق فردعی طور پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی لازم ہے۔ قلم کی لغزشیں زبان کی فروگزاشتوں سے اس درجہ مشابہ ہیں کہ ان میں نئے نقطۂ نظر تلاش کرنا سعیِ لاحاصل ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک بات کافی دلچسپ ثابت ہوگی یعنی یہ انکشاف کہ قلم کی ادنیٰ اونیٰ غلطیاں حروف کھاجانا۔ فقرے کے آخری الفاظ کو پہلے لکھ جانا وغیرہ وغیرہ سے غلطی کرنیوالے کی بے التفاتی اور عجلت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

غلط پڑھنا، زبان اور قلم کی لغزشوں میں پیدا ہونے والی نفسانی حالت سے کوسوں دور ہے۔ یہاں جو دو ارادے باہمی نزاع میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے ایک ارادہ کی جگہ احساسی ہیجان لے لیتا ہے۔ اور یہ ہیجان دیگر ارادوں کی نسبت کمزور ہوتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ زیرِ مطالعہ چیز انسان کی اپنی پیداوار نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر واقعات میں زیرِ مطالعہ الفاظ کی جگہ سرے سے نئے الفاظ پڑھا لئے جاتے ہیں۔ اور ان ہر دو الفاظ میں عموماً لفظی مناسبت کے سوا کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے حائل ہونے والے ارادے کی تلاش میں نکلتے وقت ہمیں زیرِ مطالعہ خیال کو بالائے طاق رکھدینا چاہئے اور تحلیل نفسی کو ان دو سوالوں سے شروع کرنا چاہئے۔ اوّل یہ کہ تلازمِ آزاد (free association) کی رُو سے غلط پڑھا ہوا لفظ کونسا خیال پیدا کرتا ہے؟ دوم یہ کہ یہ غلط پڑھنے والا واقعہ کس ماحول میں وقوع پذیر ہوا؟ چند حالات میں صرف دوسرے ہی سوال کا جواب کافی ہوتا ہے لیکن اکثر حالات میں اور خاص طور پر جب صحیح الفاظ اور غلط الفاظ میں کوئی نمایاں تعلق نظر نہیں آتا اس وقت مکمل تحلیل کرنا بہت مشکل امر نظر آتا ہے اور اس وقت ہمیں ایک ماہرِ تحلیل نفسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن خیال رہے کہ زیادہ تر حالات میں غلط پڑھنے کے کسی واقعہ کی تشریح بہت آسان امر ثابت ہوتا ہے کیونکہ غلطی کرنیکے اسباب کافی سے زیادہ عیاں و بیاں ہوتے ہیں۔

پکے ارادوں کا بھول جانا ہمیشہ ایک ہی بات ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ بات اتنی ظاہر اور نمایاں ہوتی ہے کہ ہر کس و ناکس بآسانی اس پر انگلی دھر سکتا ہے۔ یہاں حائل ہونے والی نیت ہمیشہ صحیح ارادے کی مخالف ہوتی ہے۔ یعنی ایک قسم کی نارضامندی۔ اور عموماً یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آخر اس جذبۂ نارضامندی کو چھپایا کیوں گیا تھا۔ کسی پکے ارادے پر عمل نہ کرنے کے واقعات عموماً اتنے عیاں اور بالتفصیل ہوتے ہیں کہ اُن پر تحلیل نفسی کا منتر چلانا کچھ ضروری نہیں ٹھہرتا۔ ان سب میں ایک قسم کی مخالف قوتِ ارادی عمل پذیر ہوتی ہے جسے ہر شخص بغیر کسی علم نفسیات کے جانچ سکتا ہے۔

افراد اور شہروں کے نام بھول جانا بھی ایک قسم کے مخالف ارادہ کا مرہونِ احسان ہوتا ہے۔ اور یہ ارادہ کبھی تو سیدھی سادی نفرت یا ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے اور کبھی پیچ در پیچ خیالات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایسے نام بھول جانا جن سے کوئی تکلیف دہ یاد وابستہ ہو خاص مطالعہ کے لائق ہے۔ اس سلسلہ میں کسی کا شعر ہوا ہے:-

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں ۔۔۔ اچھا کیا جو مجھکو فراموش کر دیا!

خود تکلیف دہ یادوں اور احساسات کا فراموش کر دینا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس جگہ اکثر حضرات یہ کہیں گے کہ عام مشاہداتی واقعات اور روزمرہ کے حالات اس توجیہ کے برخلاف ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ نفس انسانی تکلیف دہ یادگاروں کو فراموش کر دے یہ تکلیف دہ یادگاریں لاکھ کوششوں کے باوجود بھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اور یہ کرب انگیز احساسات بار بار اُٹھ اُٹھ کر انسان کو زیادہ تکلیف میں مبتلا رکھتے ہیں۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ یہ مشاہداتی کیفیت تو درست ہے لیکن اعتراض منطقی طور پر غلط ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نفسِ انسانی ایک قسم کا اکھاڑہ ہے جس میں ہر وقت مخالف ارادے اور جذبے مصروفِ پیکار رہتے ہیں۔ نفسِ انسانی کی بنیاد ہر قسم کے ارادوں اور ان کی ضدوں پر اُٹھائی گئی ہے۔ اور اس طرح نفسِ انسانی ایک مجموعۂ اضداد ہو گیا ہے۔ اس لئے ایک ارادے کی موجودگی کا ثبوت اُس کی ضد کے فقدان کا ثبوت نہیں بن سکتا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں ارادے پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ ہاں اس صورت میں اہم ترین سوال یہ ہوگا کہ دونوں مخالف ارادے آپس میں کیا تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا مجموعی اور انفرادی طور پر کیا اثر پیدا ہوتا ہے۔

چیزوں کا کہیں رکھکر بھول جانا اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ ایک واقعہ کے کئی معنی نکل سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک غلطی کرتے وقت بارہا مختلف

شموں کی حائل ہونے والی نیتیں موجود ہوتی ہیں۔ البتہ جو چیز سب حالات میں یکساں موجود ہے وہ کسی چیز کے گم کر دینے کی خواہش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خواہش ہر بار کسی نئے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی عموماً کوئی اپنی چیز تب کھو دیتا ہے جب وہ چیز پرانی ہو گئی ہو اور وہ غیر شعوری طور پر اسی نئی چیز سے تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ یا اُسے اب اُس چیز کی ضرورت یا پروا نہ رہی ہو۔ یا یہ چیز کسی ایسے فرد کے پاس سے اُسے پہونچی ہو جس سے اُس کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے ہوں۔ یا یہ چیز کسی ایسی حالت میں دستیاب ہوئی ہو جسے اب اس چیز کا مالک یاد نہ رکھنا چاہتا ہو۔ چیزوں کو گرا دینا، توڑنا یا اُن کو خراب کر دینا بھی یہی مطلب رکھتا ہے۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز بغیر اپنی وقعت کھوئے گم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی خود ساختہ اور خود عائد کردہ قربانی ہوتی ہے جو کسی اور مصیبت کو دور کرنے کیلئے کی جاتی ہے اور یہ مخصوص قسم کی رضاکارانہ قربانی مہذب ترین ممالک میں بھی پیدا ہے۔ اس ضمن میں چیزوں کا گم کر دینا کبھی کبھار غصہ یا خود عائد کردہ سزا کا پرتو بن نکلتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ چیزیں گم کرنے کی تہ میں ہر قسم کے ارادے پناہ گزین ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے ہماری روزمرہ کی غلطیوں کا کچا چٹھا۔ اُمید ہے کہ آپ اس بحث کے بعد آئے دن کی فروگذاشتوں کو محض ایک حادثہ سمجھکر نظر انداز نہ کر دیں گے اور آپ موقع بننے پر اپنے آپ پر ضرور سوال کریں گے کہ کیا یہ محض حادثہ ہے کہ بسا اوقات ہم اپنے آپ کو بلا حیل وحجت خطرہ میں ڈال دیتے ہیں یا اپنے آپ کو کوئی اور نقصان پہونچا بیٹھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان فروگذاشتوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی نمایاں ہو کہ بہت سے اعتراضات اور سوال بغیر جواب دینے کے چھوڑ دئے گئے ہیں اور اس طرح پڑھنے سننے والے حضرات کو اپنی تحلیل نفسی کرنے کا کھلا موقع دیا گیا ہے لیکن بوجوہ احسن اب اس قسط کو فرائڈ کے ایک فقرے پر ختم کیا جاتا ہے:۔

"جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے اگر سماج کے عام معیاری افراد غلطیوں کی ماہیت کو اس قدر سمجھتے ہیں اور بسا اوقات اسی طرح عمل کرتے ہیں جیسے وہ اُن کے مطالب و معانی سے بخوبی روشناس ہیں تو پھر کیا وجہ ہو کہ وہ ان غلطیوں کو 'حادثہ'، 'لایعنی' اور 'فضول' قرار دیتے ہیں؟ اور پھر کیا سبب ہے کہ وہ اس تشریح کو جو تحلیل نفسی کا طریقہ پیش کرتا ہے بلاوجہ راندۂ درگاہ قرار دیتے ہیں؟"

(سے باقی دماستاب باقی)

انور مختار صدیقی
بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

آرزو

آغازِ آرزو ہوا انجامِ آرزو
وہ ترکِ آرزو کی کشاکش بھی یاد ہے!

مجھ سے زیادہ ہے کوئی ناکامِ آرزو؟
دل کانپتا ہے لیتے ہوئے نامِ آرزو!

کب ہوگا دل؟ کشاکشِ اُمید و بیم سے
باقی ہیں گرچہ ہی سحر و شامِ آرزو!

دل کو قبول ترکِ غمِ آرزو نہیں
اب آرزو ہے آپ ہی انعامِ آرزو!

یہ بھی تری نگاہِ کرم کا طفیل ہے
دل اور اُٹھا سکے غم و آلامِ آرزو!!

مایوسِ آرزو ہوں مگر اس کو کیا کروں؟
دیتی ہے ہر نظر تری پیغامِ آرزو!!

توڑا ہے دم اُمید نے اب دل کی خیر ہو
آغاز ہو چکا ہے سرِ انجامِ آرزو!

اب اعتبارِ عشرتِ غم بھی ہے ناگوار
میں ہوں فریب خوردۂ ایامِ آرزو!

قیدِ اُمید و بیم سے دل کیا نجات پائے؟
ہر زخمِ دل ہے، حلقۂ سرِ دامِ آرزو!

تابش بصد سرور و مسرت قبول کر
اس عہدِ آرزو میں ہے، غم، نامِ آرزو

تابش دہلوی

علی منظور اپنے دہاتی دوست کو قصر ... دکھا رہے ہیں

یہ ہے اے دوست! نواب آسماں توقیر کا ایواں
اگر آئینہ حیرت ہو اس کا خوشنما ساماں

نہ بڑھنے پائے پھر بھی تیری چشم دل کی حیرانی
پڑھائے گی سبق عبرت کا دولت کی فراوانی

فریم اس دلربا تصویر کا دیکھا نہیں تُو نے
ابھی پرکھے نہیں اطراف کے نقش و نگیں تُو نے

سلیقہ سے ہے یوں آراستہ یہ قصرِ عالیشاں
اسے "جنت بداماں" مان لے دیکھے اگر رضواں

ہرے مخمل کا فرش اتنا بڑا ہال!! آج ہی دیکھا
زمرد جیسی پیاری شے کو پامال آج ہی دیکھا

اگر ایک ایک کرسی کم سے کم سو سو روپے کی ہے
تو ان کی واجبی قیمت ہزاروں تک پہونچتی ہے

جب اتنی کرسیوں کی قیمتیں پہونچیں ہزاروں تک
تو لاکھوں ہی روپے کا ہے یہ فرنیچر نہیں کچھ شک

کبھی صوفے خریدے جاتے ہیں ایسا تک کبھی قالیں
رقم ہوتی نہیں کس روز نذرِ خواہشِ تزئیں

جو طبعاً ہیں یہ مُسرف ہوتے ہیں کچھ انکے چرچے بھی
نقابت ان کی کرتے ہیں کئی زر دوست پرچے بھی

کمی کرتے نہیں ہرگز یہ اپنے بھی سنورنے میں
کہ حاصل ہے یدِ طُولیٰ رقم کے صرف کرنے میں

دکھاتی ہے وہی رَو ہر گھڑی "دریا دلی" انکی
نشہ میں رات کی تمیز انکو ہے نہ کچھ دن کی

مہک اُٹھے شبستاں جبکہ عید الفطر آجائے
گُلابی، صندلی، مشکی، حنائی عطر آجائے

اِسی اسراف بے جا کیلئے محفوظ دولت ہے
نہ رہنے پائے ارماں کوئی بھی، دل میں یہ حسرت ہے

یہ ساماں دیکھکر اے دوست میرے ہوش بھی گم ہیں
مگر خود کو سنبھالونگا کہ تیرا رہنما ہوں میں

اِدھر دو ہیں اُدھر دو رُوبرو ہیں چار اسٹیچو
نہ ہو اتنا ابھی اٹلی کے فن کاروں پہ حیراں تو

فرانس، انگلینڈ، یوناں، جرمنی ہر ملک کے تاجر
ہیں اِن سے مُستفید اتنے ہی جن تک کہ ہیں ماہر

مُفید ان سب کے حق میں انکے موروثی خزانے ہیں
سپئے اہلِ وطن تو دس روپے اور چند آنے ہیں

جب آ ہکیاشی سالانہ کا ہنگام آتا ہے
زباں پر ان کی ابنائے وطن کا نام آتا ہے

نظر آتی نہیں کیا ان کو مزدوروں کی بدحالی
نہ سمجھیں اب اسے نواب اپنے حق میں خوش فالی

غضب ہے ملکیوں کا حال اس درجہ زبوں دیکھیں
وطن میں خاک اُڑتی آسمان توقیر یوں دیکھیں

علی منظورؔ

نیلوفر

موسم سرما میں دوپہر کے دو بجے جبکہ درختوں کے سائے پھیلنے ہونے شروع ہوگئے تھے "سہراب لاج" پر ایک عجیب دلفریب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے باغ میں ماہ جبیں نازک اندام نیلوفر ایک ریشمی خوشنما چھتری لگائے آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ گلاب کی مانند تروتازہ چہرہ مسرت کے باعث پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنکھیں بظاہر سامنے میز پر رکھے ہوئے پھولدان پر گڑی ہوئی تھیں لیکن ... صرف .... صرف پرویز کا خیال دماغ میں تھا۔ ہوا پھولدار ٹہنیوں کو ہلا رہی تھی۔ گلاب خاردار شاخوں کے درمیان لچک لچک کر سر اٹھاتا تھا ایک ننھا سا پرندہ ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اڑتا پھر رہا تھا۔ لیکن اُسے ان میں سے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ صرف پرویز کا خیال دل میں تھا۔

یکایک اُس نے اپنی دراز ریشمیں پلکوں کو اوپر اٹھایا اور ایک عجیب انداز سے مسکرائی۔ ایک لمبی لمبی پشم والی ایرانی بلی بھاگتی ہوئی آئی اور ایک چھلانگ مار کر اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ نیلوفر پیار سے اپنی مخروطی صندلی انگلیاں اس کے سر پر پھیرنے لگی۔ پھر ایک دم اُس نے جذبات سے بے قابو ہو کر بلی کو زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور کہنے لگی: "نیلم تجھے معلوم بھی ہے کہ تیری نیلوفر آج کتنی خوش ہے؟ تو حیوان ہی سہی لیکن تو ہی میری خوشی میں شریک ہوجا، ورنہ خوشی کی شدت سے میرا سینہ پھٹ جائیگا۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ پرویز کو پاکر کیا دنیا میں کوئی لڑکی کسی اور بات کی خواہش کرسکتی ہے۔ نہیں!! نہیں!۔ میری خوشی پر دنیا بھی خوش نظر آتی ہے۔ یہ ننھا پرندہ کس قدر شوخی کر رہا ہے۔ یہ تازہ کھلے ہوئے پھول کیسے خوش نظر آتے ہیں۔ یہ سُرخ گلاب کیسا اِٹھلا اِٹھلا کر اُٹھتا ہے۔ چمن کا ذرہ ذرہ، زمین آسمان سب خوش نظر آتے ہیں۔ مجھ پر مسرتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن آہ اگر آج میری امی جان زندہ ہوتیں .... " یہ کہتے ہوئے نیلوفر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "افسوس اگر آج وہ ہوتیں تو کیسے کیسے ارمان نکالتیں۔ اُن کی اکلوتی پیاری نیلوفر کی کل شادی ہے لیکن وہ بے خبر سو رہی ہیں اور ابا جان بھی۔ دونوں نے اپنی نیلوفر کو بھلا دیا ہے۔ ہائے امی جان کی روح کل کتنی بے قرار ہوگی۔ اپنی نیلوفر کو دلہن بنا ہوا دیکھنے کے لئے وہ کتنی بے چین ہوں گی۔ اب اس دنیا میں میرا کون دیکھکر خوش ہونے والا ہے۔ صرف ایک ضعیف چچا سہراب۔

پیارے چچا جان!!! کس قدر بھولے بھالے، نیک طبیعت، میری خوشنودی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار۔ سب کچھ ماننے کو راضی.... مگر امی جان آپ اطمینان رکھئے آپ کا ہونے والا داماد پرویز انسان نہیں فرشتہ ہے، آپ کی نیلوفر کی زندگی اس کے ساتھ بہشت ہوگی۔ پرویز تعلیمیافتہ خوبصورت اور شریف ہے اور ایک بڑے امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی ہے۔ ورنہ اگر پرویز غریب ہوتا تو چچا جان مشکل سے راضی ہوتے اور شاید نہ بھی ہوتے۔ ہماری پہلی ملاقات بھی کیسی عجیب طرح ہوئی۔ صرف پندرہ ہی دن تو گزرے ہیں۔ سینما دیکھکر باہر نکلی تو موٹر ابھی نہ آئی تھی۔ میں انتظار میں پریشان کھڑی تھی کہ پرویز صاحب تشریف لائے۔ وہ الفاظ اب تک میرے کان میں گونجتے ہیں "محترمہ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اپنی کار میں آپ کو دولت خانہ تک پہنچادوں" میں نے تکلفاً کہا "نہیں رہنے دیجئے آپ کو ناحق تکلیف ہوگی۔" کہنے لگے "نہیں زحمت کی کیا بات ہے میں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا" یہ تھی ہماری ملاقات جس نے زندگی ہی پلٹ دی۔ دوسرے دن میں نے اُن کو چائے کے واسطے مدعو کیا اور بس.... تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم دونوں کو معلوم ہونے لگا کہ زندگی ایک دوسرے کے بغیر بے معنی اور ناممکن ہے.... اور.... اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہیں۔

چچا جان تو پہلی ہی ملاقات میں پرویز کے گرویدہ ہوگئے۔ اور کون ہے جو پرویز کو پسند نہ کرسکے۔ چچا جان کو اس سے بہتر کون لڑکا فرزندی کے لئے مل سکتا تھا۔ فوراً پرویز کے خاندان کے متعلق تفتیش شروع کردی اور جب پرویز نے میرا ہاتھ چچا جان سے طلب کیا انہوں نے فوراً منظور کرلیا۔ یہ سب کچھ کتنی جلدی ہوگیا۔ پندرہ ہی دن میں۔ کل میری شادی ہوجائے گی۔ پرویز میرا پرویز، ہمیشہ کے لئے میرا ہوجائے گا۔ نوکر چاکر شادی کی تیاری میں کیسے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ گھر کو کیسا سجا کر دلہن سا بنا دیا ہے۔ پیارے چچا جان آج کل مجھ پر کس قدر مہربان ہیں۔ بار بار مجھے پیار کرتے ہیں۔ بات بات پر اُنکی آواز بھرا جاتی ہے۔ کیونکہ میں اُن سے جدا ہوجاؤں گی۔ کل کا دن بھی کیسا پُر لطف ہوگا۔"

نیلوفر یہ باتیں کر رہی تھی کہ پیروں کی چاپ نے اُسے چونکا دیا۔

آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ایک نہایت ہی حسین لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں قیامت کی چمک تھی۔ لیکن اُن آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ شعلے جو چاہتے تھے کہ نیلوفر کو ایک لمحہ میں پھونک کر راکھ کر دیں۔ خوبصورت چہرہ فرطِ غصّہ سے تمتما رہا تھا وہ نیلوفر کو گھور رہی تھی۔ نیلوفر اس کی نظریں دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن پھر فوراً ہی مسکراتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اور ایک کرسی کو آگے کر کے بولی "آداب عرض بہن، آئیے تشریف رکھیے۔ مجھے آپ کو دیکھ کر بہت ہی مسرت ہوئی۔ کیا آپ یہیں کہیں قریب رہتی ہیں؟"

نووارد لڑکی نے بے رخائی سے منہ موڑ لیا اور بغیر جواب دئے کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر ایک غمگین انداز سے سر کو اپنے کندھے پر ڈال دیا۔ نیلوفر اُس کی یہ حالت دیکھ کر پھر بولی "بہن کیا آپ کی کچھ طبیعت ناساز ہے؟"

نووارد لڑکی نے درشتی سے جواب دیا "تمہارا نام نیلوفر ہے نا؟ ہاں میں بیمار ہوں... میرا جسم بیمار نہیں بلکہ میری روح بیمار ہے.... اُف خدا.... او خدا.. تم نیلوفر! ہاں۔ تم مکار ہو۔ غاصب ہو... تم نے مجھے لوٹ لیا، مجھے تباہ کر دیا برباد کر دیا... تم لوٹنے والی ہو، تم تہذیب یافتہ بنی پھرتی ہو لیکن دوسروں کے مال پر ڈاکہ ڈالتی ہو اور پھر خوش ہوتی ہو، خدا کے غضب سے نہیں ڈرتیں۔"

نیلوفر۔ بہن آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں میں نے تو آج آپ کو پہلی دفعہ دیکھا ہے میں آپ کو کس طرح کوئی نقصان پہونچا سکتی ہوں جبکہ آپ کا نام تک میں نہیں جانتی۔

نووارد لڑکی۔ میرا نام بھی جانتیں.... ہاں.... میرا نام شیریں ہے۔ میرا سب کچھ تباہ کر کے، میرا سب کچھ لیکر مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کیسے نقصان پہونچا سکتی ہوں۔ پرویز، آہ جان سے عزیز پرویز۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔ تم نے اُسے پھانس لیا، اپنے پھندے میں۔ نہ صرف مجھ سے چھین لیا بلکہ مجھ سے اُس کو بیزار بھی کر دیا اب وہ مجھے اپنی صورت تک دکھانے کا روادار نہیں رہا۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت۔ اُسکے ساتھ مر سکتی ہوں لیکن اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

نیلوفر۔ محترم بہن، ممکن ہے جو آپ کہہ رہی ہیں سچ ہو لیکن میں اسے مطلق یقین نہیں کر سکتی۔ کیونکہ پرویز مجھ سے قسم کھا کر کہہ چکے ہیں کہ اُنہوں نے آج تک کسی لڑکی سے سوائے میرے محبت نہیں کی۔ کیونکہ اُن کی ہر بات پر یقین کرنا میرا ایمان ہے اس لئے میں آپ کی ہر بات کو صرف پرویز پر سفید جھوٹ اور بہتان سے زیادہ نہیں سمجھتی۔

شیریں۔ ہاں تم اس کو جھوٹ سمجھتی ہو۔ کیوں نہیں۔ کل تو تمہاری اس سے شادی ہونے والی ہے۔ اس خیال سے دل تو خوش کر لو لیکن کان کھول کر سن لو کہ پرویز میرا رشتہ دار ہے۔ ہم دونوں کی بچپن سے منگنی ہوئی ہے اور جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی لیکن صرف پندرہ دن سے آہ میری زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا تم نے کھیل بگاڑ دیا۔ اس کو اُلّو بنا لیا۔ پرویز تو سیدھا سادا ہے بھولا بھالا وہ ان فریب کی باتوں میں پھنس گیا۔ اگر تم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتیں تو خیر صبر بھی تھا لیکن تمہاری صورت نہیں بلکہ یہ تمہاری جادو بھری باتیں ہیں جنہوں نے اُسے پاگل بنا دیا ہے۔ لیکن تم کبھی خوش نہ رہ سکو گی وہ درحقیقت مجھ سے محبت کرتا ہے مگر تم نے میرے پریم مندر کو اُجاڑ دیا ہے۔

نیلوفر (تلخی سے) پیاری بہن مجھے آپ کی ناکامی پر بہت افسوس ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ آپ کی اتنے برسوں کی سچی محبت اس قدر جلدی بدل جائے۔ جس سے ظاہر ہے کہ آپ کی محبت سچی نہ تھی۔ اور آپ کی پریم مندر کی دیواریں اس قدر کمزور تھیں کہ ہوا کے ایک ہی جھونکے سے گر گئیں لیکن آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، خدا آپ کے حسن کو برقرار رکھے پرویز سے بھی بہتر قدر داں مل سکتے ہیں۔

شیریں۔ (سختی سے) بس خاموش ظالم لڑکی! تم میرا مذاق اڑاتی ہو۔ میرا سب کچھ لوٹ کر تباہ و برباد کر دو۔ لیکن مت خوش ہو۔ تم بھی ایک دن اسی طرح تباہ ہو گی۔ میرے انتقام کی آگ تم دونوں کو جلا دے گی، پھونک دے گی۔ تم کبھی چین سے نہ رہو گی۔ للہ پرویز کو مجھے واپس دیدو، مجھے دوزخ میں نہ دھکیلو۔

نیلوفر۔ (بے رخائی سے) آپ لے لیجئے اگر لے سکیں۔

شیریں۔ میں کیسے لے سکتی ہوں تم چھوڑ دو بھی۔

نیلوفر۔ میں نے کیا اُنہیں باندھ رکھا ہے؟ آپ کہتی ہیں کہ وہ آپ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ اور.........

وہ بات بھی ختم نہ کرنے پائی تھی کہ پرویز آ جاتا ہے۔ پرویز کو دیکھ کر شیریں کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے اور پرویز شیریں کی طرف دیکھ کر ایک دم پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ یہاں کس لئے آئی۔ نیلوفر فوراً پرویز کی طرف دوڑتی ہے، اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے "پرویز... میرے پرویز، یہ لڑکی کہتی ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ اب سے نہیں کئی سال سے، اور صرف پندرہ دن سے تم بدل گئے ہو" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ پھر کہتی ہے "پرویز قسم کھا کر کہدو کہ تم اس لڑکی کو نہیں جانتے نہ اس سے

محبت کرتے ہو پرویز!!! تمہارے اس جواب پر میری زندگی منحصر ہے۔"

پرویز:۔ نیلوفر... نیلوفر۔ میری رُوح اتنی سی بات پر رو رو کر اپنی پیاری آنکھیں خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ جُھوٹ ہے بالکل جُھوٹ۔ (پھر سختی سے شیریں سے کہتا ہے) شیریں تم یہاں کیوں آئیں؟ کس نے بُلایا؟"

شیریں:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اتنی سختی سے کیوں بولتے ہو پرویز مجھے کسی نے نہیں بُلایا مجھے تمہاری محبت یہاں کھینچ لائی۔ کیا تمہارے سب وعدوں اور چار سال کی محبت کے بعد بھی مجھے تم سے کچھ سوال کرنے کا حق نہیں؟"

پرویز:۔ میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی نہ کوئی وعدہ کیا۔ تم جُھوٹ بولتی ہو اور محض نیلوفر کو ستانے آئی ہو۔ نیلوفر، یہ لڑکی میری رشتہ دار ہے صرف اس وجہ سے میں لیے جانتا ہوں۔ میں اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتا۔

شیریں:۔ پرویز، پرویز! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

پرویز:۔ (غضبناک ہو کر) اگر سچی محبت کرتی ہو تو خاموش رہو محبت کی خاطر کچھ قربانی کرو اور محبوب کی رضا پر راضی رہو اور اب یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔"

شیریں:۔ تم مجھے نکال کیوں رہے ہو۔ یہ تمہارا مکان تو نہیں ہے۔

پرویز:۔ کمینی یہاں سے فوراً دُور ہو جا!"

نیلوفر، پرویز کو غصہ میں دیکھکر کانپ جاتی ہے۔

شیریں:۔ (رو رو کر کہتی ہے) آہ اتنے وعدوں کے بعد ایسا سخت دھوکا۔ خدایا کیا خبر تھی کہ قسمت میں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔"

پرویز:۔ بس بس یہ مکاری ختم کر!"

شیریں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے تک لے جاتا ہے۔ نیلوفر روکنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔

پرویز:۔ بس جاؤ فوراً نکل جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

شیریں خاموشی سے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔ نیلوفر بالکل ساکت اپنی جگہ پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا میرے لئے بھی یہی دن کھڑا ہے کہ پرویز نے آکر چونکا دیا۔

پرویز:۔ نیلوفر خاموش کیوں ہوں؟ بیٹھو اب تو بلا ٹل گئی۔"

نیلوفر کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے "دیکھو تو پیاری نیلوفر میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔"

جیب میں سے ایک ننھی سی ڈبیا نکال کر کھولتا ہے۔ ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی جگمگانے لگتی ہے۔ انگوٹھی کو نکال کر چُومتا ہے پھر نیلوفر کی انگلی میں پہنا دیتا ہے۔ نیلوفر بولنا چاہتی ہے لیکن شکریہ کی جگہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

پرویز:۔ ہائیں تم رو کیوں رہی ہو؟۔

نیلوفر:۔ پرویز قسم کھا کر بتاؤ کہ تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے۔

پرویز:۔ میری نیلوفر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس لڑکی سے محبت نہیں کرتا۔ کیا تم مجھ پر شبہ بھی کر سکتی ہو۔ بیشک یہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن میں اس کا جواب نہ دے سکا نہ کبھی دے سکتا ہوں، اسی لئے یہ انتقام لینے آئی تھی۔ ہماری شادی میں رخنہ ڈالنے۔"

نیلوفر:۔ اچھا انتقام لینے آئی تھی یہ بات ہے... ہاں پرویز اب میرا اطمینان ہو گیا۔ (ہارن کی آواز آتی ہے) اہا چچا جان آگئے۔ (پھر مسکرا کر پرویز سے) لیکن پرویز میرا خیال ہے تم اس وقت چلے جاؤ۔ کیونکہ چچا جان ہم دونوں کو اس طرح بیٹھا دیکھکر دل میں کیا کہیں گے۔"

پرویز:۔ ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں نیلوفر۔ کل کا دن بھی کس قدر مبارک ہوگا پھر تم کو کبھی شبہ کرنے کا موقع نہ ملے گا نیلوفر، اب تو خوش ہو جاؤ۔

نیلوفر:۔ ہاں ہاں میں خوش ہوں پیارے پرویز، میں تم پر پورا بھروسہ کرتی ہوں، اچھا خدا حافظ۔ چچا جان آگئے۔

پرویز چلا جاتا ہے۔ نیلوفر سیٹھ سہراب جی کے پاس دوڑی دوڑی آکر کہتی ہے "چچا جان آج تو آپ بہت جلد واپس آگئے۔"

سہراب جی:۔ "ہاں بیٹا اب مجھے واپس جانا ہے رات کے نو بجے واپس آؤنگا۔ چلو چلکر چاء پی لیں۔ اور دیکھو نیلوفر میں تمہارے لئے بہت سی چیزیں لایا ہوں۔ سب موٹر میں رکھی ہیں۔ پرویز نے بھی تمہارے واسطے ایک ساڑھی بھیجی ہے۔ چاء پی کر دیکھنا۔"

چاء پی کر سہراب جی تو پھر چلے جاتے ہیں نیلوفر خوشی خوشی جا کر ساڑھیاں اور کپڑے موٹر میں سے لاتی ہے۔ سب کو اپنے کمرے میں رکھ دیتی ہے۔ "اہا کتنی پیاری چیزیں۔ کیسے قیمتی کپڑے اور اوہو یہ زرتار ساڑھی، کل پہننے کے لئے پرویز کی طرف سے... کتنی خوبصورت ہے" اُوپر اُٹھاتی ہے۔ ایک پرچہ گرتا ہے۔ "اپنی نیلوفر کو پرویز کی طرف سے" پرچے کو اُٹھا کر پڑھتی ہے اور محبت سے بے قابو ہو کر چُوم لیتی ہے۔ پھر کہتی ہے "پرویز اس قدر فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا میں کل اِس ساڑھی کو پہنوں گی۔ کتنی نفیس اور قیمتی ہے۔"

ایک دم دروازہ کھُلتا ہے اور نوکر ایک خط دیتا ہے اور ایک چھوٹا سا پیکٹ دیتا ہے کہ حضور یہ ایک آدمی دے گیا ہے۔ کہ شیریں بیگم نے بھیجے ہیں۔ کچھ پریشان سی ہو کر نیلوفر خط لے لیتی ہے اور کھولکر پڑھتی ہے۔

پیاری بہن نیلوفر!

آپ کو جس وقت یہ خط ملے گا اُس وقت میری رُوح اِس

ناکارہ جسم کو چھوڑ چکی ہوگی۔ جو کچھ ہوا خیر میری قسمت میں یہی لکھا تھا میں نے
سچی محبت کی اس کا خوب پھل ملا جس پر جان فدا کی اسی نے مجھے
ٹھکرا دیا۔ پامال کر دیا۔ رخ بدل دیا۔ پیاری بہن! مجھے افسوس ہے
کہ میں نے آپ کو بے جا باتیں کہیں۔ مگر بہن برائے کرم مجھے معاف
کر دینا کیونکہ محبت نے میری آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ
پرویز کی طرف شبہ کرنے ہی کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن جب حقیقت
نے پردہ اُٹھا دیا تب اصلیت معلوم ہوئی۔ خدا کے لئے بہن مجھے
معاف کر دینا۔ میری حالت رحم کے قابل ہے۔ آہ میرا سب کچھ
لُٹ گیا، تباہ و برباد ہوگیا۔ میری امیدوں کا خون ہوگیا میری
آرزوئیں پامال ہوگئیں، میری حسرتیں مٹ گئیں۔ میری خوشیاں
فنا ہوگئیں۔ اب اس دُنیا میں رہنے سے کیا فائدہ۔ زندگی پرویز
کے بغیر بیکار ہے بالکل بے معنی۔ مجھے اس پر کچھ حق حاصل نہیں
بے شک آپ حق دار ہیں کیونکہ آپ دونوں ایک دوسرے
کو چاہتے ہیں۔ خدا آپ کی شادی مبارک کرے اور آپ ہمیشہ
خوش رہیں۔ آخر میں یہ آپ سے پھر کہتی ہوں کہ جو کچھ میں نے
کہا تھا بالکل سچ ہے۔ پرویز مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اب سے
تین مہینے پہلے وہ سیر کے واسطے کشمیر گئے تھے وہاں سے انہوں
نے مجھے یہ چھ خط بھیجے تھے۔ آپ محبت کا اندازہ انہیں خطوں
سے خوب لگا لیں گی۔ دل تو نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو یہ خط
دکھاؤں لیکن اس خوف سے کہ آپ تمام عمر جھوٹا خیال نہ کرتی
رہیں، یہ بھیجتی ہوں۔ خدا کرے پرویز آپ کے ساتھ وفادار
رہیں۔ اچھا اب خدا حافظ، موت میرا انتظار کر رہی ہے۔
خدا آپ پر خوشیوں کی بارش کرے۔ حرماں نصیب

شیریں"

خط نیلوفر کے کپکپاتے ہاتھوں سے گر پڑتا ہے وہ پیکٹ کھولکر
ایک خط نکالتی ہے لکھائی دیکھتے ہی پورا یقین ہوجاتا ہے کہ پرویز کا ہے
فوراً تاریخ دیکھتی ہے۔ تین مہینے پہلے کی تاریخ پڑی ہوتی ہے۔ ایک ایک
کر کے سب خط پڑھ لیتی ہے۔

"آہ، یہ خط، ایک ایک لفظ محبت سے بھرا ہوا ہے۔ شیریں سچ
کہتی تھی۔ اُف پرویز یہ تم نے کیا کیا۔ کتنا بڑا دھوکا۔ کتنا سفید جھوٹ،
اس کے ساتھ قسمیں کہ میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی، اور پھر اس
لڑکی کو جو بیت وہ دن پہلے محبوبہ رہ چکی ہو اس طرح دھکے دیکر نکالنا۔
ہائے پرویز تم انسانیت کے پردے میں حیوان نکلے۔ لعنت دغا باز۔ تم
قاتل ہو۔ تم نے شیریں کی جان لی۔ آہ کیا خبر تم میری بھی جان اسی طرح لو
لیکن میں اس سے پہلے ہی اپنی جان دے دونگی میں ہی شیریں کی موت کا
سبب بنی۔ اس کی موت کے بعد مجھے زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ ہائے
پرویز، میرے پرویز۔ تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم نے مجھے جنت دکھا کر چھین لی
کتنا سخت دھوکا ہوا۔ پرویز میں تم کو دیوتا سمجھتی تھی۔ میں نے تمہاری پوجا
کی۔ ان پندرہ دنوں میں ہر سانس تمہارا ہی نام پکارتی تھی۔ افسوس تم
دروغگو ہو، بزدل ہو، کمینے ہو، سچ بولنے سے ڈرتے ہو۔ تم نے ایک کمزور
عورت کو اپنی محبت میں پھنسا کر پھر اُسے ذلیل کیا۔ اور پھر ایک دوسری
کمزور عورت کو فریب دے رہے ہو لیکن میں فریب میں نہ آؤں گی میں اس کے
پہلے اپنی جان دیدوں گی۔ میں اپنی زندگی ایسے شخص سے وابستہ نہیں
کر سکتی۔ لیکن آہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں اب بھی اُس سے
محبت کرتی ہوں۔ آہ پرویز میں اب بھی تمہاری محبت میں کھنچی جا رہی
ہوں۔ دل سے مجبور ہوں۔ مگر تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ افسوس
تم نے بڑا سخت دھوکا دیا"

یہ کہتے کہتے نیلوفر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ پھر
ایکدم کھڑی ہوجاتی ہے۔ ایرانی بلی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ نیلوفر
دوڑ کر اسے گود میں اٹھا لیتی ہے اور کہتی ہے "میری نیلم سنتی ہو پرویز
نے مجھے دھوکا دیدیا۔ اب سب کچھ لُٹ گیا تباہ ہوگیا۔ دل چاہتا ہے
اپنے آپ کو بھی تباہ کر ڈالوں۔ ان کپڑوں کو۔۔ ہاں ان قیمتی کپڑوں کو
جلا دوں پھونک ڈالوں۔ اُف، یہ کیا ہوگیا۔ اے زمین پھٹ جا، تاکہ میں
تجھ میں سما جاؤں۔ اے برق تو ہی گر پڑ اور پھونک ڈال مجھے، اس گھر کو،
ہر چیز کو۔ ہاں ہاں میں آگ لگا دوں گی اس کمرے کو سب کچھ جل جائیگا
یہ کپڑے، پردے، یہ قالین، سب فرنیچر، کرسیاں، گدے۔ چچا جان
گھر سے باہر ہیں نو بجے واپس ہونگے۔ اس وقت چھ بجے ہیں۔ نوکر سب
دور ہیں۔ آگ کا اس وقت باہر پتہ چلے گا جب قابو سے باہر ہو جائیگی۔
سنتی ہے نیلم، تیری نیلوفر اسی کمرے میں خاک ہو کر رہ جائے گی۔ تیرا دل
چاہے تو تو بھی رہ جا۔ مگر تو کیوں اپنی جان دے" یہ کہہ کر بلی کو کمرے سے
باہر چھوڑ دیتی ہے۔ پھر کمرے کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ قالین فرش
پر سے اٹھا کر کھڑکی میں رکھ کر کہتی ہے "کھڑکی میں رکھنے سے یہ جلدی
آگ پکڑ لے گا۔ پردہ جلتے ہی یہ بھی جلنے لگے گا" کرسیاں بھی کھڑکی کے
قریب رکھتی ہے پھر خود ایک کرسی پر بیٹھ کر سسکیوں کے عالم میں رونا شروع
کر دیتی ہے "آہ میں کیا کروں۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔"

شام کے چھ بجے ہیں۔ شیریں بھی اپنے کمرے میں بیقرار ہے۔ اضطراب نے اس کی صورت ہی بدل دی ہے۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سُرخ ہیں۔ چہرہ حد سے زیادہ غمگین ہے۔ اپنے آپ سے کہتی ہے "آہ سب کچھ لٹ گیا۔ رونے کو کچھ باقی نہیں۔ میری قسمت میں محرومی ہی لکھی تھی۔ لیکن او خدا ان سب مایوسیوں کے باوجود جان دینی کس قدر مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ایک خط پرویز کو بھی لکھنا چاہیئے۔ پیارے پرویز کو آخری خط۔ آخری سلام۔ ہائے اس ظالم پرویز نے مجھے تباہ کر دیا" کرسی پر بیٹھ کر جلدی جلدی خط لکھ کر نوکر کو دیتی ہے کہ پرویز کو دے آئے۔ پھر کہتی ہے، "نیلوفر کو بھی اب میرا خط پہونچ گیا ہوگا۔ شاید وہ خوش ہوگی کہ اس کی خوشیوں کی راہ سے کانٹا نکل گیا۔ مگر مجھے کیا۔ موت مجھے پکار رہی ہے۔ آہ باہر کس قدر سردی ہے۔ کیسا بھیانک منظر ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے" اوڑھنے کے لئے شال اٹھاتی ہے۔ پھر ایک دم چھوڑ کر کہتی ہے "میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ اس جان کو تو برباد کرنے جارہی ہوں مگر آسائش کا خیال اب بھی دل میں ہے۔ اس وقت سردی سے بچ گئی تو کیا دو منٹ بعد جب کنوئیں کے سرد پانی میں میری لاش پڑی ہوگی تب کیا ہوگا" اس خیال سے اس کو پھریری آگئی "ہائے میری امی میرے ابا جان جب اپنی شیریں کی لاش دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔ کن کن ارمانوں سے پرورش کیا۔ یہ انجام دیکھ کر ان کا دل پھٹ جائے گا۔ میں تو اس وقت ہونگی نہیں۔ خدا ہی ان کو صبر دیگا"

یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ ہمت کر کے سب کی نظروں سے بچتی ہوئی کنوئیں پر پہونچ جاتی ہے۔ کنوئیں پر کھڑے ہو کر اندر دیکھتی ہے اور کہتی ہے "اف کس قدر تاریک، کتنا بھیانک، گویا موت منہ کھولے ہوئے ہے۔ اف خدا میری ہمت پست ہوئی جاتی ہے۔ پرویز میرے پیارے پرویز میں اس دنیا سے جارہی ہوں تم خوش ہوجاؤ۔ آہ کس قدر سردی ہے۔ میں کیسے اس سرد یخ پانی میں کود جاؤں مگر وقت گزر رہا ہے۔ مجھے جلدی کرنی چاہیئے۔ اچھا لے دنیا والو خدا حافظ۔ زندگی اسی کا نام ہے" اپنے گھر کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالتی ہے "لے میرے عزیزو خدا حافظ۔ پرویز خدا حافظ۔ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہارے نام پر جان دے رہی ہوں" یہ کہتے ہوئے شیریں پانی میں کود جاتی ہے۔ پانی میں ایک دھماکا ہوتا ہے اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

شام کے چھ بجے کا وقت۔ پرویز ڈریسنگ روم میں نیلوفر کے گھر جانے کے لئے لباس پہنے تیار آئینے کے سامنے کھڑا ہے۔ نوکر داخل ہوتا ہے اور شیریں کا خط دے کر چلا جاتا ہے۔ پرویز خط کھول کر پڑھتا ہے:-

"پیارے پرویز!

جس وقت آپ کو یہ خط ملے گا اُس وقت میری لاش کنوئیں کے سرد پانی میں تیر رہی ہوگی۔ میں اس لئے جان نہیں دے رہی کہ آپ نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ وہ تو میری قسمت تھی۔ بلکہ میں اس لئے جان دے رہی ہوں کہ جس سے میری زندگی وابستہ تھی جب اُسی نے مجھے چھوڑ دیا تو زندہ رہنے ہی سے کیا فائدہ۔ کاش میرے موت کی خبر آپ کے دل کو خوش کر سکے۔ خدا کرے آپ نیلوفر کے ساتھ ہمیشہ خوش رہیں۔ خدا اپنی رحمتوں کی بارش آپ پر کرے۔ وقت کم ہے اس لئے خط ختم کرتی ہوں۔ میرا آخری سلام قبول کیجئے۔ جو کچھ میں نے کیا اُس کو خدا کے لئے معاف کردیں۔ میں اب بھی آپ سے محبت کرتی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک کرتی رہوں گی بلکہ مرنے کے بعد بھی میری رُوح آپ کے لئے تڑپتی رہے گی۔ اچھا خدا حافظ۔ ہاں جو خط آپ نے مجھے کشمیر سے بھیجے تھے وہ میں نے نیلوفر کو بھیج دئے۔ کیونکہ مجھے اُن کے رکھنے کا اب کوئی حق نہیں۔

ہمیشہ آپ کی

شیریں"

خط پڑھ کر پرویز بدحواس سا ہوجاتا ہے "آہ پیاری شیریں یہ تم نے کیا کیا؟ تم تو بہت تیز نکلیں۔ خدایا میں قاتل ہوں، مجھے معاف کردے۔ آہ میں نے ہی شیریں کی جان لی۔ اُف میں کیا کروں۔ آخر تم نے جان کیوں دی مجھ دھوکے باز کی خاطر۔ او میرے خدا مجھے معاف کردے۔ اب میں نیلوفر کے پاس جا کر یہ رُوح فرسا خبر سناؤں گا کہ پیاری شیریں نے اپنی زندگی ہم پر سے قربان کردی"

فوراً کمرے سے باہر نکل جاتا ہے اور "سہراب لاج" کا رُخ کرتا ہے۔ وہاں پہونچ کر دیکھتا ہے کہ قیامت کا سماں ہے۔ مکان سے آگ کے شعلے نکل نکل کر آسمان تک پہونچ رہے ہیں۔ آگ بجھانے والے انجن برابر پانی ڈال رہے ہیں۔ لیکن آگ ہے کہ اور بھی بھڑک رہی ہے۔ نوکر چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ "خدا کے لئے کوئی سیٹھ صاحب کی بھتیجی کو بچالے، وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ سیٹھ صاحب اُس کو مالا مال کردینگے" سب سُن رہے ہیں لیکن اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے ہچکچاتے ہیں۔ پرویز یہ حالت دیکھ کر مجنون سا ہوگیا۔ ابھی ایک محبوبہ شیریں کی موت کا صدمہ

دل پر تھا کہ دوسری محبوبہ نیلوفر کو موت کی گود میں پایا۔ فوراً بھاگتا ہوا آگ کے شعلوں میں گھس گیا۔ دروازے کو جھنجوڑا لیکن وہ بند تھا۔ فوراً کھڑکی پر سے کود "نیلوفر، نیلوفر" پکارتا اندر گھس گیا۔ نیلوفر دھوئیں میں گھٹی ہوئی تھی۔ پرویز نے اُس کو پکڑ کر کھینچا "پیاری نیلوفر چلو، جلدی بھاگو" لیکن نیلوفر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور کہنے لگی "پرویز تم دھوکے باز ہو، میں نے تمہارے خط پڑھ لئے۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ درحقیقت تم شیریں سے محبت کرتے تھے، اُس نے تمہاری خاطر اپنی جان دیدی۔ اب ہمیں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ میں نے تم سے محبت کی، تمہاری پوجا کی لیکن تم دغاباز ثابت ہوئے"

پرویز گھٹنوں کے بل نیلوفر کے آگے جھک جاتا ہے "میری نیلوفر مجھے معاف کردو۔ شیریں نے بھی مجھے معاف کر دیا تم بھی معاف کر دو۔ للہ مگر باہر چلو میری جان، ورنہ ہم دونوں ہی یہاں مرجائینگے"

نیلوفر:۔ "اگر میرا باہر نکلنے کا ارادہ ہوتا تو میں گھر میں آگ ہی کیوں لگاتی ——"

پرویز:۔ (حیرت سے) "تو کیا آگ تم نے لگائی؟"

نیلوفر:۔ "ہاں میں نے"

پرویز:۔ "کیوں؟"

نیلوفر:۔ "کیونکہ میں اب تم سے شادی نہیں کر سکتی تھی اور نہ انکار کر سکتی تھی۔ کیونکہ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے میں نے اپنی جان اس طریقے سے دینے کا ارادہ کر لیا۔ مگر تم آزاد ہو۔ اب بھی چلے جاؤ پرویز۔ تم اب بھی بچ سکتے ہو"

پرویز:۔ "نہیں میں نہیں جاؤں گا"

نیلوفر:۔ (خوشی سے چیخ کر) "ہائیں، کیا نہیں جاؤ گے؟"

پرویز:۔ "ہاں میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ نہیں جاؤں گا یہیں تمہارے ہی ساتھ مر دوں گا۔ میں بھی جان دے سکتا ہوں، بزدل نہیں ہوں —— نیلوفر اب تو معاف کر دو"

"میرے پرویز، میرے پرویز" کہتی ہوئی نیلوفر دوڑ کر پرویز سے لپٹ جاتی ہے اور کہتی ہے "میری جان میں سمجھتی تھی کہ میں نے تم کو کھو دیا مگر نہیں، میں نے پھر دوبارہ تم کو پا لیا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے ..." وہ بات ختم کرنے بھی نہ پائی تھی کہ مکان کی چھت اُن پر چڑ چڑ کرتی ہوئی گر پڑی اور دو محبت سے دھڑکتے ہوئے دل خاک کے اس ڈھیر کے نیچے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

اختر قریشی۔ بی۔ اے (بی ٹی)

ایک بچے کا عزم

زمانے کے حوادث سے کبھی ہم منہ نہ موڑینگے
قسم ماضی کی مستقبل کو روشن کرکے چھوڑینگے

کرینگے اک نہ اک دن چاک ہم دریا کے سینے کو
نکالیں گے بھنور سے ناخدا بنکر سفینے کو

جو ناممکن ہے دنیا میں اُسے ممکن بنائیں گے
ہمیں بڑھنے تو دو ہم بڑھکے تارے توڑ لائینگے

نہ لیگا نام ظلم و جور کا کوئی زمانے میں
ڈھلے گا عدل کا سکہ ہمارے کارخانے میں

پلٹ جائیگی قسمت دیکھ لینا فاقہ مستوں کی
جھکیں گی گردنیں مفلس کے در پر زر پرستوں کی

ہر اک چھوٹے بڑے کو دینگے ہم درسِ وفاداری
دماغوں سے نکالیں گے خیالِ مردم آزاری

بدل جائے گی دنیا جب ہمارا دور آئے گا
مسرت ساز چھیڑے گی زمانہ گیت گائے گا

محسن اعظم گڑھی

ہارمونیم کی موت کے بعد؟

ہندوستان جنت نشان کے کسی رنگین شہر کے ایک حسین بازار میں ایک بے ڈول بدقوارہ حبشی صاحب گذر رہے تھے، راستے میں دور ایک مرقع خوبصورت آئینہ الٹا پڑا تھا۔ عجوبہ چیز دیکھ کر چپکے چپکے پاس آئے اور اُٹھا کر جیسے ہی دیکھا اپنی ہولناک اور بدہیبت صورت نظر پڑی۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور اسی طرح اوندھا رکھ دیا۔ سنا ہے کہ گھر آکر ہم قوموں سے حال بیان کیا اور بعد مشورہ یہ طے پایا کہ ایک تیز تنقید آئینہ پر لکھی جائے، اور ہر زبان میں لکھی جائے۔ غالباً انگریزی میں اسکا ترجمہ ہو۔ The Beauty Mirror on... Negger's Ban & what they say about it... اور شاید مولوی شاہد صاحب یا ممتاز بی۔ اے، بی۔ ٹی، یا شاہِ مترجماں مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے اس کا ترجمہ یوں کر دیں "مرقع حسن و جمال ڈلا اوپر"۔

ہندوستان کی موسیقی بندر کا ناریل ہے۔ جس طرح ہر دیہاتی اہل زبان ہے اسی طرح ہر کس و ناکس اس کا ماہر ہے۔ کیونکہ اپنے ملک کی اور اپنی چیز ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس تاریخ سے اے۔ آئی۔ آر۔ نے نزولِ اجلال فرمایا ہے جو مٹی پلید اس غریب کی ہو رہی ہے خدا "نازی" کی بھی نہ کرے۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں تو اس فن کا نقلی جنازہ نکالا گیا تھا اور اے۔ آئی۔ آر کے دورِ حکومت میں اصلی کام شروع ہے۔

شاہد صاحب کا تبصرہ اپریل میں پڑھا تھا۔ خیال آیا کہ کچھ ہم بھی کہہ ڈالیں مگر واللہ خدا کی قدرت آجکل موسموں کا تداخل ہے۔ فاسد مادّہ بطرف خود بخود نفیخ ہو رہا ہے معلوم نہیں یہ آنکھیں کیا کچھ نہ دکھاتیں، چپکے ہو رہے۔ پرسوں کا واقعہ عجیب ہوا۔ شام کے وقت آندھی کے جھونک میں دو چار اوراق پریشان کہاں سے کس طرح اُڑ آئے۔ واللہ اعلم کسی صاحب نے پڑھکر اور مطلب کچھ نہ پاکر (Broadcasting ...) "ایں دفتر بے معنی"... آندھی کے سپرد کر دئے ہوں۔ بچوں نے دوڑ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُنکے مطلب کی سب سے پہلی چیز "تصویریں" اور تصویروں میں بھی وہ مایہ ناز تصویر "Give them a chance" دیکھی جانے لگی۔ ایک صاحبزادی نے ہولناک "اوئی" کے ساتھ کہا "توبہ کیسی بری صورت کے بچے ہیں"۔ دوسری اُن سے ذرا سنجیدہ اور [illegible] تھی، فرمایا کہ "بیوقوف ہو بچے تو خاصی پیاری پیاری صورت کے ہیں۔ تصویر اتارنے والوں کو کہو کہ صورتیں بگاڑ کر اتاری ہے"۔

ہم نے یہ مصرع موزوں کیا ہے ع۔

ایک وہ ہیں کہ دیا انکی بھی صورت کو بگاڑ

خدا نہ کرے کہ تداخل کا فاسد مادّہ کسی کے جسم میں رہ جائے اور خدا نہ کرے کہ وہ اخلاق و کردار کو یوں بگاڑ دے جس طرح بچوں کی صورتیں بگڑ گئیں۔ تصویر سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہارمونیم کی کریہہ آوازی سے بچوں کے منہ پھٹ گئے۔ انصاف تو جب تھا جب اے۔ آئی۔ آر کے ڈائرکٹر صاحب بہادر اپنے کسی مایہ ناز پروفیسر موسیقی جو طنبورے پر گاتے ہوں ان کی بھی دو چار درجے، دھرپت اور خیال گاتے وقت کی شائع فرماتے۔ تاکہ ناظرین کرام جس طرح ہارمونیم کی کراہت کا معصوم بچوں پر اثر دیکھتے اسی طرح طنبورے کے حسن کا اثر ایک خرانٹ گوئیے پر بھی ظاہر ہو جاتا۔ چونکہ حقیقت کا انکشاف نہ اُن کے بس کی بات تھی اور نہ مقصود تھا اسلئے مجبور تھے۔ اُن کو غالباً یہ راز معلوم نہیں کہ خرانٹ گوّیا عام اس سے کہ وہ کریہہ الصوت ساز پر گاتا ہو، خواہ حسین الصوت ساز پر اس کی صفت یہ ہے کہ الفاظ کو غیر مفہوم اور صورت کو مفہوم بنا ڈالے۔ یعنی ہندوستان کا اصلی، ٹکسالی اے۔ آئی۔ آر کا گوّیا وہ ہے جس کو بزبانِ شعر یوں کہا جانے ع۔

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ڈائرکٹر صاحب کا یہ فلسفہ کہ کریہہ الصوت ساز کے ساتھ گانے سے صورت بھی کریہہ ہو جاتی ہے یقیناً عقل سلیم سے اتنا ہی دور ہے جتنے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے "بندر" سے دور ہیں۔ اور یقیناً یہ فلسفہ ہنستے ہنستے رو دینے کے لائق ہے۔ ان اوراقِ پریشاں کو دیکھکر دوسری بات جس سے طبیعت گونہ محظوظ ہوئی وہ اس کی زبان ہے۔ رسالہ کا اسم گرامی اور اُس کی زبان۔ گویا ہندوستانی سامعین سے خطاب کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب نے انگریزی زبان منتخب

فرمائی۔ اگر یہ رسالہ انگریزوں کے لئے ہے تو انڈین کا لفظ اس کے لئے ایسا ہی غیر موزوں ہے جیسے ہندوستانی ڈائرکٹر کے لئے "ہیٹ" (Hat) یعنی اس بیٹوی چہرے پر اور ہیٹ کی زیبائش۔ مٹی کی صراحی پر بلور کا پیمانہ۔ کاش ڈائرکٹر صاحب فنِ تسمیہ کے اس حمق پر غور فرماتے۔

نفسِ مضمون سے بحث کرنے سے قبل صرف مندرجہ بالا دو نکات فیصلہ کر لینے والوں کے لئے کافی ہیں۔ اور ڈائرکٹر صاحب یا ایڈیٹر صاحب انڈین لسنر، کے اس مضمون سے ایک ثقہ پڑھنے والا اس ذہنیت کا اندازہ کر سکتا ہے جس کی ماتحت یہ زرّیں مقالہ سپرد قلم کیا گیا۔ زندگی کی کشمکش اور تنازعۃ البقا کی تگ و دو میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا اور جہاں تک روٹی کپڑے کا سوال ہے ممبرانِ اے۔ آئی۔ آر نے حق نمک ادا کیا۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہانتک نفیس خوراک، اچھی پوشاک موٹی آمدنی کا سوال ہے دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی ہولناک۔ محیر العقول۔ انسانیت سے منحرف اور اخلاقیات سے باغی حرکت آپ کر ڈالئے انشاء اللہ تعالیٰ پیسوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوگا۔ آیئے ہم آپ کو ہر دوار کے میلے، پیران کلیر کے عُرس کی سیر کرائیں۔ پہلے لیجے بازار میں چلئے جہاں دُکانیں ہیں، سودے والے چیخ چیخ کر، گا گا کر، رو رو کر آوازیں لگا رہے ہیں۔ ہر کس و ناکس ہنستا ہے ادھر سے گذرتا ہے مگر خریدتا نہیں، خریدیگا وہ جو گھر سے اس کا عزم کر کے پیسے لیکر آیا ہے۔ ہر شخص پر ان چیخوں کا نغموں کا۔ اثر نہیں۔ آیئے اب آپ کو ایسے مقام کی سیر کرائیں جہاں سڑک کے دونوں طرف انجمن فقراء الہند کے رکن اپنی کرشمہ سازیوں میں مشغول ہیں۔ کوئی صاحب اوپر کا جسم آدھا زمین میں دفن کئے پڑے ہیں۔ کوئی صاحب جلتی زمین پر لوٹ رہے ہیں۔ کسی نے سارے جسم میں چاقو گھسیڑ رکھے ہیں۔ کوئی آنکھوں میں تکلے چبھوئے بیٹھا خون میں نہا رہا ہے۔ کوئی خرافات بک رہا ہے۔ ان سب ہولناک حرکتوں میں، وہ جاذبیت ہے کہ آنے جانے والا تو بہ توبہ کر کے پھریریاں لیکر پیسہ دھیلا ڈال جاتا ہے اور اس طرح مالِ غنیمت کا انبار صبح سے شام تک ان حضرات کی جیبیں گرم کر دیتا ہے۔ ایک سوامی ویدانت کے مسئلہ پر کھڑے چیخ رہے ہیں، ایک مولوی صاحب توحید پر گرما رہے ہیں۔ کون سنتا ہے فغاں درویش، سننے والوں کا بھی مجمع نہیں ہوتا۔ عمل تو دور رہے۔ دوسری طرف ایک مداری سانپ گلے میں ڈالے ڈگڈگی بجا رہا ہے، لوگ جوق جوق جا رہے ہیں اللہ رے کشش۔ جہاں تک اس بیان سے تعلق ہے ہارمونیم کے استخراج پر یہ محیر العقول مقالہ دستِ غیب کا اثر رکھتا ہے۔ تسخیرِ قلب کا عمل ہے۔ اس کے لکھنے والوں اور اس پر عمل کرنیوالوں کیلئے اس بے روزگاری کے زمانے میں پیسوں کا گھاٹا نہیں۔

شاہد صاحب نے اس مقالہ کے متعلق اجمالی مقالہ لکھا ہے اسی قدر کافی تھا مگر اے۔ آئی۔ آر کا یہ طرزِ عمل محض اس وجہ سے کہ پبلک کا پیسہ اُن کے پلے کے نیچے کافی ذرا جیّد قسم کا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اُس کا رد بھی تواتر کے ساتھ کیا جائے اور پورے زور اور قوّت کے ساتھ کیا جائے۔

آیئے اب ذرا فنّی حیثیت سے بھی اے۔ آئی۔ آر کے اس اقدام کا تجزیہ کیا جائے۔ اور ہندوستانی موسیقی کے لئے ان حضرات نے جو عروسی لباس تیار کیا ہے اُس کے تار و پود کو بکھیرا جائے۔ اس بحث میں پہلی ضرورت تو یہ دیکھنے کی ہے کہ ہندوستانی موسیقی جو آج ہر شخص کی وردِ زبان ہے اور جس کی اصلاح و دُرستی کو چند نا اہل حضرات نے سامانِ زندگی بنایا ہے، وہ کیا چیز ہے۔ کیا اہمیت ہے کیا اصلیت ہے، کیا مروّج ہے۔ جب ان پہلوؤں پر روشنی پڑ جائے تو کچھ آگے چلا جائے اور یہ غور کرنا ہے کہ آج کل کے طرز موسیقی کی تنظیم کی تکمیل کن ہاتھوں میں ہو سکتی ہے۔

زمانہ حال کی موسیقی کے متعلق ہمارا صرف ایک اعلان چیلنج کی صورت میں ہے اور ہم آرزو مند ہیں کہ حضرات ریڈیو اسٹیشن کچھ کاوش سے اس پر سپردِ قلم فرمائیں۔ آج کل کا طرز موسیقی وہ طرز ہے جو پرانے زمانے کی گرنتھوں میں سے کسی گرنتھ کا پابند نہیں۔ ایک روایت ہے کہ موسیقی کا جنم ہندوستان میں شیام وید سے ہے۔ جہاں تک تاریخ ولادت کا تعلق ہے یہ روایت صحیح ہے مگر برائے خدا موجودہ زمانے کی سنگیت کو شیام وید کی کسوٹی پر کس کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ سرے سے شیام وید کا نظام موسیقی ہی آج تک پراچین کال پر قائم نہیں۔ زمانہ کے مذاق کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ اور جو سرگم پہلے تھی آج نہیں۔ دوسرے یہ کہ شیام وید مذہبی نقطۂ نظر سے مقدس کتاب ہے اور اس میں صرف اشلوکوں کو غنا کے ساتھ ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم کو اپنے اعلان کا مزید ثبوت دینے کے لئے قدیم سے قدیم ہندوستانی موسیقی کی تلاش کرنی ہوگی۔ اس فن پر ہزار ہا کتابیں ہونگی مگر موجودہ زمانہ میں ؎

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

زمانے کے حوادث سے بچی بچائی صرف ایک کتاب سننے میں آتی ہے جس کو "رتناکر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب

پرانی سنسکرت میں ہے اور آج ہندوستان میں کوئی "گندھرب" یا گنی ایسا نہیں ہے جو اس کو سمجھ سکتا ہو برتنا تو درکنار۔ کچھ ماہرین موسیقی کا یہ قول ہے کہ ہندوستانی موجودہ موسیقی "ہنونت مت" کی ہے اور اس کی اصل "سنگیت درپن" سے ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکو تسلیم کر لیجئے کہ یہ صحیح ہے۔ آئیے اب عملی صورت میں اس کو دیکھئے۔ ہنونت مت کے اعتبار سے ہنڈول راگ کلاسیکل میوزک کے اعتبار سے۔ رکھب اور دھیوت چھوڑ کر گانا چاہیئے۔ پروفیسر صاحبان آجکل رکھب اور پنچم چھوڑ کر گاتے ہیں اور پھر فخر کرتے ہیں کہ یہ راگ بمطابق اصل ہے۔

اور آگے چلئے۔ مالکوس راگ کو ہنونت مت نے سمپورن یعنی سات سُر کا مانا ہے ہمارے ماہرین اس کو پانچ سُر کا گاتے ہیں اور بس۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر طوالت کا خیال نہ ہوتا تو اس کلاسیکل میوزک یعنی پراچین سنگیت کی جو بندر کے ناریل کی طرح اے۔ آئی۔ آر آج نشر کر رہا ہے اچھی طرح قلعی کھول دی جاتی۔ اب تسلیم کرنا پڑیگا کہ کلاسیکل میوزک کی وہ بنیاد جو پراچین سنگیت کے مسالے سے تیار کی جاتی ہے سرے سے فرضی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی صحیح تاریخ خاندان خلجی سے شروع ہوتی ہے اور خاندان مغلیہ پر ختم۔ اس لئے جو ٹیپ ٹاپ۔ اختراع اور حرمت اس فن میں ہوئی وہ وہاں ختم ہوگئی اور ہر ایک وہ بادشاہ جو موسیقی سے ذوق رکھتا تھا بقدر ہمت ذوق اس میں رنگینیاں بھرتا گیا۔ پھر ہماری موسیقی جس کو کلاسیکل کہئے یا کسی اور موہوم نام سے موسوم کیجئے قلابازیاں کھاتے کھاتے جب ٹھہری تو مندرجہ ذیل اشکال میں رہ گئی۔

(۱) الاپ۔ (۲) دھرپد۔ (۳) ساورہ۔ (۴) خیال۔ (۵) ہولی یا ہوری۔ (۶) ٹپہ۔ (۷) ٹھمری۔ (۸) قوالی۔ (۹) غزل۔ (۱۰) ترانہ۔ (۱۱) چترنگ۔ (۱۲) سرگم۔

اللہ اللہ اس سنگیت کے بنانے والوں کی رواداری کو ہم کیا کہیں، اور موجودہ زمانے کے مٹانے والوں کی سینہ زوری کو کیا روئیں۔ انہوں نے تو اس کو اس ڈھنگ سے ڈھالا کہ خرانٹ سے خرانٹ اوجھڑ اور جبڑے کی تانیں مارنے والے بائیس بائیس انچ کی گردن والے بھی گا سکیں۔ نازک اندام، صراحی دار گردن اور سیلے بڈی کے گلے والے اور والیاں بھی گائیں۔ معصوم بچے بھی گا سکیں۔ ایک طرف اگر تان مارنے سے چھت کی مٹی گرنے لگے، گھوڑے پچھاڑی تڑانے لگیں تو دوسری طرف چلتی ہوئی ہوا اور بہتا ہوا پانی ٹھہر جائے۔ ایک طرف اگر ٹھیکرے پھوٹنے کی آواز سے کان گنگ ہو جائیں تو دوسری طرف نغمہ کی نرمی اور گداز سے دل پگھل جائے۔ یعنی موجودہ طرز موسیقی علمبردار ہے اس رواداری کا جس میں گھوڑوں کے ہنہنانے، ہاتھیوں کے چنگھاڑنے، شیروں کے دھاڑنے کی بھی گنجائش ہے، اور کوئل پپیہے کی کوک بھی۔ یاد رکھنے والی بات ہے کہ موسیقی فنونِ لطیفہ کے اس شعبہ سے تعلق رکھتی ہے جس کا رشتہ سامعہ، دل اور دماغ سے ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرنے والی بات ہے کہ ہر شخص کے عصبات سامعہ دل اور دماغ یکساں نہیں ہوتے کوئی نرم اور ملائم آواز پسند کرتا ہے۔ کسی کو توپ کی گرج بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کسی کو طنبورے کی میاؤں میاؤں اچھی معلوم ہوتی ہے اور پیرس ریڈ کے ہارمونیم کو چاہتا ہے۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ چند پیسوں کی لالچ سے اے۔ آئی۔ آر۔ کے آرٹسٹ اگر طنبورے کے ساتھ ڈھیاؤں، ڈھیاؤں اور میاؤں میاؤں فرمائیں تو اُن کی "مہیب صدا" جو اعصاب سماعت پر فالج کا اثر پیدا کرنے والی ہو نہ وہ نغمہ سامعہ نواز سمجھا جائے۔ اور ایک خوش لحن قوال سُریلے ہارمونیم کے ساتھ غالب یا جگر کی غزل گائے تو وہ نغمہ نہیں "ہنکارنا" ( ) ہے۔ ع:-

برین عقل و دانش بباید گریست

خدا بھلا کرے اس نااہلیت کا، اور لعنت ہے اس شیطان لعین پر جو کھاتے پیتے انسانوں کے دل میں وسواس پیدا کرے۔ موجودہ زمانہ کی شتر بے مہار موسیقی کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ غور کیجئے کہ ساز کیا چیز ہے اور وہ کیسا ہونا چاہیئے۔

آلاتِ موسیقی دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ جو ساز کا درجہ رکھتے ہیں دوسرے وہ جو صرف نغمہ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ساز گانے والے کی قوت بازو ہیں مددگار ہیں معاون ہیں مؤید ہیں۔ اس غریب سے جو مافوق العادت اپنے اعصاب کو ہلا ہلا کر، پھلا پھلا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر آپ کو خوش کر رہا ہے آپ اتنے رحمدل ہیں کہ وفور ذوق میں اس غریب کو آس کا بھی سہارا نہ دیں۔ موسیقی کے اناڑی منتظمو، ذرا اس نکتہ کو سمجھو کہ گانے والے کا "مخرج صوت" اندھا ہے۔ گانا دیکھ کر نہیں گایا جاتا ربط اور مشق سے گانے والا مخرج صوت پر قابو کرتا ہے پھر بھی اس کو ایک لاٹھی کی ضرورت ہے کہ وہ منزل پر آسائش سے پہونچ جائے۔ بطیٔ الفہم اس کو یوں سمجھ لیں کہ اس کو ایسے ساز کی ضرورت ہے جس کے سُر اور زر کے جگہ آہنگ ہوں جو کھلے ہوئے آنکھوں کے سامنے ہوں۔ جس میں بہ اعتبار سرگم جگہ اور استھان ہر ایک سُر اسکی نظر کے

سامنے ہوں نہ ایسے ساز کی جس کو بجانے والا ٹٹولتا رہے۔ بھئی کیا لطیف وہ سنگیت ہوگی جس میں گانے والا بھی ٹٹولے اور سازندہ بھی ٹٹولے، گویا اندھے کو اندھا منزل پر لے جا رہا ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔ اور اے۔ آئی۔ آر والے حضرات سوئے ہوئے کو سوئے ہوئے سے جگائیں گے۔

اب اگر آپ اے۔ آئی۔ آر والوں سے استفسار فرمائیں کہ حضرات گانے والا جب کسی راگ کو گاتا ہے تو حسنِ ادا کے خیال سے کن قواعد اور کن اصولات کی پابندی اپنے اوپر عائد کرتا ہے تو وہ آپ کو بالکل وہی جواب دیں گے جو ایک ملاجی "ایک اور ایک کے ہوئے" کا جواب دیں گے یعنی۔۔۔ دو روٹیاں۔ لیجئے اس مشکل کو ہم حل کریں۔ گانے والا جن اصولات کی پابندی کریگا ان کو سنگیت کی اصطلاح میں لچھن کہتے ہیں۔ اور آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ یہ لچھن صرف دفتر پارینہ کتابوں کی زینت رہ گئے ہیں اور یہ کتابیں یا تو طاق پر رکھی ہیں یا "در گور"۔ آج کل جو موسیقی خرانٹ سے خرانٹ گویا ادا کرتا ہے جو لچھن بہ اعتبار "رتناکر" رائج الوقت ہیں وہ وادی سموادی الوادی۔ اور دیووادی پر ختم ہیں۔ اگر ان لچھنوں کی تشریح کی جائے تو یہ مضمون نہ صرف طویل ہوگا بلکہ "خبط"۔ البتہ عند الضرورت اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ وادی سُر، راگ کی جان جس سے راگ زندہ ہو۔ سموادی یعنی وہ سُر جو راگ کے اعضا، صورت۔ شکل اور ڈھانچہ بنائیں۔ الوادی وہ سُر جو مابقی ہوں جن سے راگ کی سرگم کا تکملہ ہو۔ دیووادی سُر وہ جو راگ کا دشمن جس کا ترک کرنا موسیقی کی سنت اور استعمال کرنا بدعت۔ اس کے علاوہ گویّے کو آرٹسٹ بننے کے لئے دو ایک اصولات کا پابند ہونا پڑتا ہے جو گرنتھ کے دوسرے ناموں سے پکارے جاتے ہیں مگر موجودہ زمانے کے آرٹسٹ صرف "میننڈ" پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب ان گذشتہ سطور سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جو باجہ موسیقی میں ساز کا درجہ رکھتا ہو اس میں مندرجہ صفات کا ہونا لازمی ہے:

(۱) آواز کا ہم آہنگ ہو نہ چنگھاڑتا ہو نہ چلیں چلیں کرتا ہو۔

(۲) بجانے میں اتنا سہل الحصول ہو کہ تمام لچھن آنکھوں کے سامنے ہوں ٹٹولنا نہ پڑے۔

(۳) آواز کے ساتھ تمام لچھنوں کی پابندی کرتا ہو۔

(۴) سُریلا ہو کرخت نہ ہو۔

(۵) میننڈ ہو۔

اب اہلِ ذوق اس کسوٹی پر ہارمونیم کو کس کر دیکھیں گے تو اربابِ ریڈیو کی "آکاڑیت" اور ظلم کا اندازہ لگا لیں گے۔

آئیے اب ذرا ان اہل الرائے حضرات کی بیش قیمت آراء تجزیہ کیا جائے جنہوں نے ان حضرات کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ کیا اندھیر ہے کہ ایک تانگہ والا تھکے ہوئے گھوڑے کو مارے اور زبردستی چلائے تو اس کا چالان کیا جائے۔ اور یہ حضرات گویّے کو بے ساز کے چلائیں تو ان کی روٹیوں میں اضافہ ہو۔ آہ نہ ہوئی آج کانگریس برسرِ اقتدار ورنہ موسیقی کا بل رکھا ہوا ہوتا۔ لیجئے ان تمام آراء کو "کوٹ چھان" کرنے کے بعد ہارمونیم کی مخالفت میں دو گولیاں تیار ہوتی ہیں۔

(۱) اس کو نکال دو یہ بے سُرا ہے اور چیختا ہے۔

(۲) اس کو نکال دو اس نے ہماری موسیقی میں مغربیت کا رنگ بھر دیا۔

اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ آپ ہارمونیم کو بے سُرا کہتے ہیں آہ، آپ نے اس کے سائنٹفک پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اس میں بے سُرے پن کی گنجائش ہی نہیں۔ واللہ آپ نے کبھی اصلی ہارمونیم سنے ہی نہیں۔ اس کا نام اس کی خوبیوں کا شاہد ہے۔ یہ بعد میں چیختا ہے پہلے آپکے گویّے چیختے ہیں۔ یہ آپ کے گویّوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ یہ ان کو صحیح راستے پر لے جائے گا کیونکہ اس کے سُروں کے استھان کھونٹے کی طرح مستحکم ہیں۔

دوسرا الزام اس غریب پر یہ ہے کہ اس نے آپ کی موسیقی میں انگریزیت کا رنگ بھر دیا۔ اس کے جواب میں دو گز لمبی آہ کے بعد گذارش ہے کہ آپ کی موسیقی کو بگاڑا ہے فلمستان نے اور الزام ہے ہارمونیم پر۔ کاش آپ نے فلم اسٹار اور آرٹسٹوں کے گانے سنے ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کی تراکیب، آواز مدّ و جزر کس طرف بہا جا رہا ہے۔ ان صاحب الرائے حضرات میں بعض ایسی مقتدر ہستیاں ہیں جن کے متعلق اعتراض کرنا بھی سوء ادبی ہے مگر واللہ جذبہ حمایت بھی عجیب جذبہ ہے۔ ع:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کہتے جاتے ہیں کہ ہم کو موسیقی سے ذوق نہیں، واسطہ نہیں، مگر پھر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ اس لئے یہ آراء قابلِ اعتنا نہیں، کیوں کہ ان میں جو کچھ الزام ہارمونیم پر عائد کئے گئے ہیں ان کے جواز میں کوئی معقول استدلال نہیں۔ اب رہی اڈیٹر صاحب یا کنٹرولر صاحب اے۔ آئی۔ آر کی رائے، اس کا تجزیہ زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایسے مسئلہ پر ہاتھ ڈال دیا جو ان کی طاقت سے باہر ہے۔ اُن گرامی رائے کا لفظ لفظ اپنے اندر ان حضرات کی عدم واقفیت، علم موسیقی میں کم مایگی کا ایک بحرِ بیکراں رکھتا ہے۔ عبارت کی بندش سے ہم کو

زیادہ بحث نہیں کیونکہ یہ "ادب" کا مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ جس مسئلہ پر یہ مقالہ لکھا گیا ہے ضروری تھا کہ اُس پر کافی استدلال کے ساتھ بحث کر کے نقائص نکالے جاتے۔ درآں حالیکہ جو الفاظ ہارمونیم کے الزام میں استعمال کئے گئے ہیں وہ اس درجہ مفلوج اور نحیف ہیں گویا گردن توڑ بخار سے ان کو توڑ مروڑ کر رکھدیا ہے۔ پہلا الزام یہ کہ :-

(۱) ہارمونیم بذاتِ خود خراب آلہ موسیقی ہے۔ لفظ خراب اپنے اندر اظہار معنی کی وہ فرومائیگی اور وہ اپاہجگی رکھتا ہے کہ سبحان اللہ۔ گویا جناب ایک جامع لفظ کہہ ڈالنے کے بعد مزید استدلال سے اس طرح فارغ جیسے کلین شیو اپنے بالوں سے۔ اب یہ قاری کا فرض ہے کہ جس طرح اور حضرات نے آپ پر ترس کھا کر ہاں میں ہاں ملادی وہ بھی آپ کے اس لفظ "خراب" کی الوہیت پر گردن جھکائے اور سر تسلیم خم کردے۔ خراب کا لفظ جس طرح ہارمونیم کے لئے استعمال ہوا اسی طرح عقل کے لئے بھی آسکتا ہے۔ فی الجملہ تو ہم خراب سے یہ مطلب سمجھے کہ کوئی پرانا دھرانا کباڑی بازار کا ہارمونیم زیر استعمال رہا ہوگا اس نے پریشان کیا ہوگا۔ ورنہ بفضلہ تعالیٰ ابھی ہندوستان میں خالص ہندوستان کے بنے ہوئے باجے اور خاص ہندوستانی ماہرین ایسے موجود ہیں کہ اگر آپ سنیں تو خراب کا لفظ آپ کے دماغ سے نکال کر نغمے کی شراب بھر دیں۔ اگر میسر نہ ہوں تو دفتر رسالہ ساقی سے استصواب کیجئے۔

دوسرا اعتراض :- ہندوستانی موسیقی کے لئے مضرت رساں ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب بھی بشرح صدر نہ افسوس ہندوستانی موسیقی سے نااہلیت کی بنا پر یہ الفاظ آپ کی قلم سے "ریٹ" گئے۔ ہندوستانی موسیقی کے متعلق پہلے ہمارے مقالے کے حصۂ اوّلیں کو پڑھئے پھر بتایئے کہ ہندوستانی موسیقی سے آپ کیا سمجھے۔ اس کے بعد یہ فرمایئے کہ ہندوستانی موسیقی سے کون سی موسیقی مراد ہے۔ سنگیت پاریجات کی؟ رتناکر کی۔ چتر پنڈت کی یا وہ موسیقی مراد ہے جو آپ کے چند گز کی ریڈیو کی دنیا میں آپ کے چند نمک خوار آرٹسٹ ارباب ریڈیو کا اسباب زندگی فراہم کرنے کے لئے اپنے گلہائے مبارک سے نشر فرماتے ہیں؟ آپ ہندوستانی موسیقی کی تشریح میں اپنے آپ کو اس قدر فرو ماندہ پائیں گے کہ آپ اپنے انحطاط بیان میں خود جذب ہو کر رہ جائینگے۔ جناب والا جس ہندوستانی موسیقی کا آپ خواب دیکھ رہے ہیں اسکے متعلق گذارش فدوی کی یہ ہے کہ جو موسیقی آپ کے خیال میں ہندوستانی موسیقی کہلاتی ہے اور ہندوستان میں اس موسیقی کے

جتنے "سماج" اور ان سماجوں کے جتنے "فاضل" اور پنڈت اس سائنس اور آرٹ کے ہیں ان میں آپس میں اتنا اختلاف ہے کہ ہر جگہ راگ، راگنیوں کی صورتیں اور برتاوے جداگانہ ہیں۔ یہاں ہندوستان غریب کو آج تک سوراج نصیب نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر ایک سماج اور سنگھٹن میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس طرح حکومت کی جائے کوئی کہتا ہے اُس طرح۔ آپ نے یہ جرأت فرمائی کہ باوجود اس اختلاف کے سوراج حاصل کرلیا اور ریڈیو جیسی پنچایتی چیز پر حکم لگا دیا۔ پھر آپ کی ہندوستانی موسیقی میں صرف پکے گانے نہیں ہیں بلکہ لے اور بول کی چیزیں ہیں جو جہاں تک نغمہ اور صوت کا تعلق ہے ہارمونیم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور رہا ہارمونیم اُن میں۔ معلوم نہیں آپ کا علم موسیقی کتنا وسیع ہے۔ ہم آپ کی مدد کرتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے آرٹ سے آپ کا مطلب سُر کی اس باریکی سے مُراد ہے تو اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوجایئے کہ ان سُرتیوں کا وجود فرضی ہے عملی نہیں۔ ہندوستان میں آج تک کوئی ماہر نہ ایسا پیدا ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے جو صحیح معنوں میں سُرتیوں کو استعمال کرسکے۔ اس لئے جملہ ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ ہماری موجودہ موسیقی میں صرف بارہ سُر ضروری ہیں جس سے تمام راگ راگنیاں برتی جاسکتی ہیں۔ اب حسن ادا کے اعتبار سے موسیقی کی ایک صنعت باقی رہ گئی جسکو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور اس کو مینڈ کہتے ہیں۔ تار کے باجوں میں اس کو "سوت" کہتے ہیں۔ تسلیم ہے کہ یہ صنعت ہارمونیم میں نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا بجانے والا اس مشکل پر بھی عبور رکھتا ہے اور جو گویا خود بجا کر گاتا ہے وہ بہمہ وجوہ اس کو پیدا کرلیتا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ہندوستانی مایۂ ناز آلہ ہائے موسیقی پر ہارمونیم کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اگرچہ مقالہ میں استدلال مفقود ہے مگر پھر آپ کی مدد کی جاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ہندوستان میں جتنے آلہ ہائے موسیقی رائج ہیں اُن میں تفریق اس امر کی کرنا کہ کونسا آلہ گوئیے کی سنگت کرتا ہے اور "ساز" ہے اور کونسا صرف نغمہ کے لئے بجایا جاتا ہے غالباً آپ کی طاقت سے باہر ہوگا۔ اس میں ہم آپ کی پھر رہبری کرتے ہیں۔ جان لیجئے کہ پرانے زمانے کا صرف ایک واحد آلہ سارنگی ایسا ہے جس کو ساز ہونے کا شرف حاصل ہے باقی سب نغمہ کیلئے ہیں۔ آہ اور پھر آہ آپ اس کی صورت شکل اور حسن کو برقرار نہ رکھ سکے، اور مس وائلن تشریف لے آئیں۔ مگر افسوس ہے کہ آپ نے وائلن کو ٹھہر بدر نہ کیا بلکہ اس سے مرعوب ہو کر شانہ پر چڑھا لیا۔

الغرض بہت سے ایسے آلات ہیں جو آپ کے ہندوستانی مایۂ ناز آلات کا چربہ ہیں اُن پر آپ نے توجہ نہ کی۔ سارنگی کی مشکلات آپ کے ادراک سے باہر ہیں اس لئے اُن پر آپ نے غور نہیں کیا۔ سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ گانے والا خود نہیں بجا سکتا۔ اور اگر بجائے گا تو کھل کر گا نہیں سکتا۔ اس لئے سارنگی کے ساتھ موسیقی دو دل اور دو دماغ پر منقسم ہے جس کا نتیجہ معلوم۔ گانے والا گاتے گاتے ایک تان لگاتا ہے، سارنگیا اس کی سنگت دو تین ماترے بعد کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ہارمونیم اس مشکل سے بری ہے۔ گانے والا خود بجائے اور دھوم سے گائے۔ اگر پھوہڑپن سے بجائے گا۔ دھونکنی کو کھال کی طرح دھونکے گا تو خواہ مخواہ ہارمونیم غل مچانے کا پیچھے گا۔ بجانے والا اگر آواز کے مدوجزر سے واقف ہے تو اسی حساب سے بجائے گا۔ اتنی بحث کے بعد قارئین کرام نتیجہ خود نکال لیں گے، اور معلوم کر لینگے کہ ہندوستانی موسیقی غریب کو نقصان ہارمونیم سے پہونچ رہا ہے یا "نااہلیت" سے۔ "ساقی" میں بہت سے مضامین ارباب ریڈیو اسٹیشن کی نااہلیت کے متعلق سپرد قلم ہو چکے۔ جو کچھ اُن کا اثر ہوا خدا بہتر جانتا ہے۔ حقیقت ہے کہ ع:-

اے زر تو خدا نہٗ ولیکن بخدا

سائنس والوں کا مقولہ ہے کہ برقی قوت سے زیادہ بڑی کوئی قوت نہیں۔ اور تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ روپے سے زیادہ کوئی قوت نہیں۔ بہرحال جو پروپگنڈا اس قوت سے چلایا جائے اس کا اثر جا ہے اور کچھ نہ ہو مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ قوال ریڈیو اسٹیشن جاتے وقت گھر بھول جائیں گے اور وہاں رو رُلا کر اپنے پیسے سیدھے کر لیں گے۔ مگر اس پروپگنڈے کی اصلی قیمت یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر ٹیگور کی طرح ہارمونیم کو کنوئیں میں پھینک دیں۔ ہمارے خیال میں ڈائرکٹر صاحب اللہ نے روپیہ دیا ہے، زود اثر پروپگنڈا تو یوں ہوگا کہ ہارمونیم کی تجویز فرمائیں اور ہارمونیم خرید خرید کر جلاتے رہیں۔ اور اس پروپگنڈے کو اس طرح دو آتشہ کیا جا سکتا ہے کہ ہارمونیم بنانے والے کاریگروں پر بھی تدارک کا حلقہ ڈالا جائے۔ یا سب سے بہتر یہ ترکیب ہے کہ مجلس قانون ساز کے ذریعے ایک عدد "بل" پاس کرا لیا جائے۔ کچھ دنوں تک تو اس شاندار کامیابی کا اچھا اثر رہیگا۔ مگر اس کے بعد دلدادگان ریڈیو کی طرف سے ہارمونیم کے نعم البدل کا تقاضہ ہوگا اور اگر تقاضہ نے شدہ شدہ عدم تعاون کی ہولناک صورت اختیار کی تو مجبوراً ڈائرکٹر صاحب کو ہندوستانی باجے کی تلاش ہوگی۔ ایک طرف ندا ہوگا کہ ہارمونیم کو نکالا ہے تو تخریب شدہ تمام باجوں کو نکالو ورنہ سنبھالو اپنا ریڈیو۔ ایسی حالت میں سیکو فون۔ کلارنٹ وغیرہ کی ڈگڈگی ہوگی پھر وہی طبلہ سارنگی۔ مگر یارانِ طریقت نغمہ میں حلاوت اور زینت کا مطالبہ کرینگے۔ تو پھر کیا ہوگا۔ ایسی صورت میں رسالہ ساقی کا یہ مضمون عنداللہ آپ کی اعانت کریگا اور اس وقت آپ اس کا مطالعہ فرمائیے تو یہ نیک مشورہ مشعل ہدایت ہوگا۔ کہ کم خرچ اور بالانشین قسم کا ساز "پونگی" استعمال کیجئے۔ گراں آرٹسٹ کے بجائے سپیرے ملازم رکھ لیجئے کیوں؟ اس لئے کہ جب ہندوستان کا نظام چرخہ قائم کر سکتا ہے تو ریڈیو کا نظام پونگی قائم کرے گی۔ جب ہندوستان کی حکومت میں جلاہے برسراقتدار ہونگے تو ریڈیو کی حکومت میں سپیرے کیوں پیچھے رہیں...... انقلاب زندہ باد۔

مضحک دہلوی

ریزۂ مینا

نفیس مزاج پڑھنے والوں کے لئے "ریزۂ مینا" سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ "ریزۂ مینا" میں پچاس مشہور انشاپردازوں کے بے مثل افسانے شامل ہیں۔ اعلیٰ درجے کی کتابت وطباعت۔ عمدہ سفید کاغذ۔ مضبوط اور خوشنما کپڑے کی جلد سنہری ٹھپہ۔ (۲۰۰) صفحے کی یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب پہلی مرتبہ اتنی کم قیمت پر مستقل خریدارانِ ساقی کو دی جارہی ہے۔ یعنی صرف دو روپے میں۔ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ خریدار حضرات کو ساقی کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ جو حضرات خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے "ریزۂ مینا" کی قیمت تین روپے۔ علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو دہلی

پھانسی

بارھواں باب

پھانسی دی جاتی ہے۔

ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے چلے جا رہے تھے۔

ایک زمانے میں سرجے گول ون اپنے چند عزیزوں کے ساتھ اسی راستے پر ایک دیہات میں برسوں رہا تھا۔ بارہا اسی راستے سے دن کو بھی اور رات کو بھی گزرا تھا۔ اس لئے ہر مقام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا ــــ میں تو اپنے گھر جا رہا ہوں۔ شہر میں دوستوں کے ساتھ دیر ہوگئی۔ اب آخری گاڑی سے لوٹ رہا ہوں۔

اُس نے اپنی آنکھیں کھول لیں اور تاریک کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بس اب ہم وہاں پہونچے جاتے ہیں"

کسی نے جنبش نہ کی اور نہ کوئی بولا۔ صرف سگالوک نے جلدی جلدی کئی مرتبہ تھوکا۔ اور گاڑی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُس نے کئی بار دیکھا، گویا کھڑکیوں، دروازوں اور سپاہیوں کو ٹٹول رہا تھا۔

ویسلی کیشرن نے کہا۔ "بڑی سردی ہے" اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، جیسے واقعی جم گئے ہوں اور اُس کے الفاظ کی آواز بڑی عجیب سنائی دی۔

تانیا نے اُٹھکر اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈا۔

"لو یہ رومال اپنے گلے میں باندھ لو۔ بڑا گرم ہے"

سرجے نے چونک کر پوچھا۔ "گلے میں؟" مگر کسی نے اُسکے سوال کو نہیں سنا کیونکہ ہر ایک کے دل میں یہی خیال آیا تھا۔ گویا کچھ کہا ہی نہیں گیا تھا۔ گویا سب نے ایک ہی وقت میں ایک ہی بات کہی تھی۔

ورنر نے کہا۔ "ویسا کچھ خیال نہ کرو۔ گلے میں باندھ لو۔ گرم رہیگا" پھر یانسن کی طرف پلٹ کر دلجوئی سے بولا۔ "اور تمہیں دوست؟ تمہیں بھی سردی لگ رہی ہے؟"

مسیا نے کہا۔ "ورنر، شاید وہ سگرٹ پینا چاہتا ہے۔ کیوں ساتھی پینا چاہتے ہو؟ ہمارے پاس سگریٹ ہے"

"ہاں"

ورنر نے خوش ہوکر کہا۔ "سرپوژا ایک سگریٹ انہیں دیدو" لیکن سرجے خود سگریٹ نکال رہا تھا۔ سب کی نظریں ہمدردی سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ دیکھ رہی تھیں کہ انگلیاں سگریٹ کو کس طرح پکڑتی ہیں کس طرح دیا سلائی جلتی ہے اور پھر نیلا دُھواں یانسن کے مُنہ سے کس طرح نکلتا ہے۔

یانسن نے کہا۔ "شکریہ۔ سگریٹ اچھا ہے"

سرجے بولا۔ "کیسا عجیب ہے!"

"کیا ہے عجیب؟" ورنر نے پلٹ کر پوچھا۔ "کیا ہے عجیب؟"

"میرا مطلب ہے ــــ سگریٹ"

یانسن کی انگلیوں میں ایک سگریٹ تھا، ایک معمولی سگریٹ۔ اُس کے معمولی زندہ ہاتھوں میں۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور وہ تعجب سے بلکہ خوف سے سگریٹ کو دیکھ رہا تھا۔ سب نے کاغذ کی اُس نلی پر نظریں جما دیں جس کے ایک سرے سے دُھویں کا ایک نیلا فیتا سا نکل رہا تھا اور سانس کے ٹکرانے سے منتشر ہو رہا تھا۔ راکھ جمع ہوتی جا رہی تھی۔ گاڑی کی روشنی گُل ہوگئی۔

تانیا نے کہا۔ "روشنی گُل ہوگئی"

"ہاں گُل ہوگئی"

"بجھنے دو" ورنر نے کچھ بےچینی سے یانسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یانسن کا ہاتھ جس میں سگریٹ تھا، اس طرح لٹکا ہوا تھا جیسے مردہ ہو۔ سگالوک نے یکایک جلدی سے پلٹ کر ورنر کی طرف دیکھا۔ جھک کر قریب تر ہوگیا۔ روبرو ہوکر اور گھوڑے کی طرح سفید سفید دیدے گھماکر چپکے سے بولا۔ "کیوں جناب کیا خیال ہے سپاہیوں کے بارے میں؟ اگر ہم ــــ کیوں؟ کریں کوشش؟"

ورنر نے بھی چپکے سے جواب دیا۔ "نہیں ایسا نہ کرو۔ جو کڑوا پیالہ ہمارے لبوں سے لگا دیا گیا ہے اُسے ہم پی کر ختم ہی کرینگے"

"نہیں کیوں؟ لڑائی میں زیادہ لُطف آئیگا۔ وہ مجھے مارتا ہے، میں اُسے مارتا ہوں۔ اور تمہیں معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کس طرح کام تمام ہوگیا۔ اور تم گویا مرنے سے بچ گئے"

"نہیں تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے" ورنر نے اتنا کہا اور پانسن کی جانب رُخ کر لیا۔ "دوست تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے؟"

یکایک پانسن کے چہرے پر سے فراست کے جملہ آثار معدوم ہو گئے اور غمناک جھرّیاں پڑ گئیں۔ جیسے کسی نے ڈوریوں کو کھینچ کر ساری جھرّیوں کو متحرک کر دیا ہو۔ اور جیسے کوئی خواب میں بولے گھٹی ہوئی خشک آواز میں بے آنسوؤں کے رو کر بولا: "میں سگریٹ پینا نہیں چاہتا۔ اہا۔ اہا۔ اہا۔ مجھ **پھانسی کیوں دی جائے؟ اہا۔ اہا۔ اہا!"**

سب نے اس کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا۔ تانیا دھاڑیں رو رہی تھی۔ کبھی اُس کے شانوں کو تھپکتی اور کبھی اُس کے گلے ہوئے کنٹوپ کے لٹکے ہوئے پاکھے ٹھیک کرتی۔ اور کہتی "میرے پیارے، رو نہیں — بچارا بدقسمت"

مُسیا نے منہ پھیر کے دیکھا۔ سگانوک نے مُسیا کی نگاہوں کو تاڑا اور دانت چمکا کر بولا: "کیسا عجیب آدمی ہے! چار پیتا ہے اور کہتا ہے کہ سردی لگ رہی ہے" یہ کہہ کر ہنسا لیکن یکایک خود اُس کا چہرہ سیاہی مائل نیلا پڑ گیا، جیسے ڈھلا ہوا لوہا ہو اور اس کے بڑے بڑے زرد دانت چمکنے لگے۔

ایکا ایکی ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے لرزے اور اُن کی رفتار گھٹ گئی۔ پانسن اور کیشرن کے علاوہ سب کے سب کھڑے ہوئے اور پھر جلدی سے بیٹھ گئے۔

سرجے نے کہا: "لو اسٹیشن آ گیا"

سب کو ایسا معلوم ہوا کہ ڈبے میں سے ساری ہوا کھینچ لی گئی۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ دل اتنا بڑا ہو گیا کہ سینہ پھٹنے لگا۔ دل گلے میں دھڑک رہا تھا۔ اور دیوانہ وار اُچھل رہا تھا اور ڈر سے خون بھری آواز میں چیخ رہا تھا۔ آنکھیں کپکپاتے فرش پر جمی ہوئی تھیں اور کان سُن رہے تھے کہ پہیئے چلنے میں کس طرح اپنی رفتار گھٹا رہے تھے — پہیوں نے پھسل کر ایک چکر اور کاٹا اور پھر یکایک — رُک گئے۔

ریل رُک گئی تھی۔

پھر ایک خواب دکھائی دینے لگا۔ یہ خواب خوفناک نہیں تھا بلکہ عقل کو دنگ کر نے والا تھا۔ کبھی ایسا عجیب و غریب خواب پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواب دیکھنے والا خود تو ایک طرف ہٹ گیا ہے اور اس کا نبے جسم چھلاوا ادھر اُدھر پھر رہا ہے، اس طرح بول رہا ہے کہ آواز سنائی نہ دے، اس طرح چل رہا ہے کہ پاؤں کی چاپ سنائی نہ دے، کوئی بکاہٹ نہیں ہے لیکن تکلیف میں مبتلا ہے۔ گاڑی میں سے

سب کے سب اس طرح اُترے جیسے خواب میں ہوں۔ دو دو کے جوڑے بنائے اور جنگل کی تازہ بادِ بہاری میں لمبے لمبے سانس لئے۔ پانسن نے چلنے سے انکار کیا، لیکن جیسے کوئی خواب میں مزاحمت کرے، اور خاموشی سے گاڑی میں سے باہر کھینچ لیا گیا۔

اسٹیشن کی سیڑھیوں پر سے سب اُترے۔

کسی نے جیسے خوشی کے لہجے میں پوچھا: "کیا ہمیں چلنا پڑیگا؟"

کسی اور نے بھی خوشی سے جواب دیا: "اب کچھ دور نہیں ہے"

اب سب کے سب ایک شب رنگ انبوہ کی شکل میں گیلی ناہموار سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ جنگل میں سے، برف میں سے، تازی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ پاؤں پھسل رہے تھے، کبھی نرم برف میں ڈوب جاتے اور غیر ارادی طور پر ساتھی ایک دوسرے سے چمٹ جاتے۔ محافظ دستے کے سپاہی اچھوتی برف پر سڑک کے کنارے کنارے چل رہے تھے اور تیز سانس چھوڑتے ہوئے تھے۔ کسی نے غصّے کی آواز میں کہا: "انہوں نے سڑک صاف کیوں نہیں کی؟ کیا برف میں ہمارے لڑھکنے کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے؟"

کسی اور نے اقرارِ جُرم مانہ کے انداز میں جواب دیا: "صاف تو کر دی تھی حضور۔ مگر برف گر رہی ہو۔ کیا کیا جائے"

قیدیوں کو اس کا احساس ہو چلا کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن یہ احساس کامل نہیں تھا — ٹکڑے ٹکڑے اور متفرق حصوں میں۔ اب اُن کی سمجھ میں عملاً یہ بات آ گئی تھی کہ "سڑک کو برف سے صاف کرنا ناممکن ہے"

ہر چیز پھر فنا ہو گئی۔ صرف سونگھنے کی قوت باقی رہ گئی۔ برف کے پگھلنے کی اور جنگل کی ناقابلِ برداشت تازگی کی خوشبو۔ شعور غیر معمولی طور پر بیدار ہو گیا۔ جنگل، رات، سڑک اور یہ حقیقت کہ انہیں پھانسی ملنے والی ہے۔ ان کی بات چیت جو سرگوشیوں کی صورت میں ہوتی تھی اب چھوٹے چھوٹے جملوں میں نمایاں ہونے لگی۔

"اب چار بجا چاہتے ہونگے"

"ہم بہت جلدی چل پڑے"

"سورج پانچ بجے نکلتا ہے"

"بیشک۔ پانچ بجے۔ نہیں —"

ایک اندھیری چراگاہ میں سب ٹھہر گئے۔ تھوڑی دور پر، ٹنڈ منڈ درختوں کے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی لالٹینیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ یہی پھانسیاں تھیں۔

سرجے نے کہا: "میرا ایک ربڑ کا گیدھ"

ورنر نے کہا "اچھا!" گو سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ سرجے نے کیا کہا۔

"میرا ایک ربڑ کھو گیا۔ بڑی سردی ہے۔"

"وسیلی کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ وہ رہا۔"

وسیلی خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

"اور مسیا کہاں ہے؟"

"میں یہاں ہوں۔ کیا تم پوچھ رہے ہو ورنر؟"

اُنہوں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ تاکہ پھانسیاں اور اُن کی متحرک روشنیاں اپنا بھیانک پیام انہیں نہ پہونچائیں۔ بائیں جانب بے برگ و بار جنگل تنگ ہوتا چلا گیا تھا اور کوئی بڑی سی سفید چپٹی چیز پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں سے گیلی ہوا آ رہی تھی۔

سرجے نے دردناک آواز اور مُنہ سے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا "سمندر۔ سمندر ہے وہ!"

مُسیا نے مترنم آواز میں کہا "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے ــــ"

"کیا کہہ رہی ہو مُسیا؟"

"میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے۔ زندگی کے ساحل اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے!"

سرجے نے مسیا کی آواز سنی اور اُس کے الفاظ سرجے کو بہا لے گئے۔ بہت سوچ کر بولا، جیسے مسیا کی صدا نے بازگشت ہو "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے!"

ورنر نے بھی یہی الفاظ دہرائے "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے!" اور ایک دم سے متعجب اور ... دور ہو کر بولا "مُسیا تم کس قدر کم عمر ہو؟"

سگا لوک نے ایکا ایکی پھولے ہوئے سانس سے ورنر کے کان میں گرمجوشی سے کہا "جناب! جناب! وہ رہا جنگل! یا اللہ! وہ کیا ہے؟ وہ ــــ جہاں لالٹینیں دکھائی دے رہی ہیں ــــ کیا وہی ہیں پھانسیاں؟ اس کے کیا معنی؟"

ورنر نے اُس کی طرف دیکھا۔ سگا لوک موت سے پہلے کرب صعب میں مبتلا تھا۔

تانیا نے کہا "ہمیں ایک دوسرے سے مل کر خدا حافظ کہنا چاہیئے۔"

ورنر نے جواب دیا "ابھی ٹھہرو۔ ابھی حکم پڑھکر سنایا جائے گا۔ یانسن کہاں ہے؟"

یانسن برف پر گر پڑا تھا اور لوگ اُس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ ہوا میں امونیا کی بُو تھی۔

کسی نے بےچینی سے پوچھا "کیوں ڈاکٹر، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں صرف غش آ گیا ہے۔ اسکے کانوں پر برف ملو۔ ہوش آ رہا ہے۔ تم حکم پڑھکر سُناؤ۔"

سیاہ لالٹین کی روشنی کاغذ اور سفید ہاتھ پر جھکی۔ کاغذ اور ہاتھ دونوں کچھ کپکپائے اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"حضرات۔ غالبًا یہ ضروری نہیں ہے کہ حکم پڑھکر آپکو سُنایا جائے۔ آپ سب اس سے واقف ہی ہیں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟"

ورنر نے سب کی طرف سے جواب دیا "مت پڑھئے" اور لالٹین جلدی ہی بجھا دی گئی۔

سب نے پادری کی خدمات بھی ضروری نہیں سمجھیں۔ سگا لوک نے کہا "مقدس باپ، اپنی چاپلوسی کو بند کیجئے۔ آپ تو مجھے معاف کر دیں گے مگر یہ مجھے پھانسی پر لٹکا دینگے۔ جائیے ــــ جہاں سے آپ آئے ہیں!"

اور پادری کا سیاہ عکس خاموشی اور تیزی سے غائب ہو گیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ برف زیادہ سفید ہو گئی۔ لوگوں کی شکلیں زیادہ واضح ہو گئیں اور جنگل سُکڑ گیا اور زیادہ اُداس ہو گیا۔

"حضرات آپ کو دو دو کی جوڑیاں بنا کر جانا ہے۔ جسے آپ چاہیں اپنا ساتھی چُن لیں۔ لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ذرا جلدی کیجئے۔"

ورنر نے یانسن کی طرف اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے اُسے سہارا دیکر کھڑا کر رکھا تھا۔ ورنر بولا "میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ اور تم سرگوئی وسیلی کو ساتھ لیلو۔ چلو آگے بڑھو۔"

"بہت اچھا!"

تانیا نے کہا "تم اور میں ساتھ چلیں گے۔ ہے نا مُسیا؟ آؤ ہم پیار کر کے رخصت ہوں!"

جلدی سے اُنہوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ سگا لوک نے زور سے پیار کیا۔ اتنا کہ دونوں نے اسکے دانت چُبھتے محسوس کئے۔ یانسن نے نرمی سے، جیسے کوئی نیند میں ہو۔ مُنہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کچھ بھی خبر نہیں کہ کیا کر رہا ہے۔

جب سرجے اور کیدیشرن چند قدم آگے بڑھ گئے تو یکایک رُک کر اُنہوں نے اونچی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ ساتھیو!"

سب نے مل کر جواب دیا "خدا حافظ ساتھی۔"
وہ دونوں چلے گئے۔ خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے پیچھے لالٹینیں ساکت ہو گئیں۔ سب منتظر تھے کہ کوئی چیخ سُنائی دے گی یا شور مچیگا ۔۔۔ لیکن وہاں بھی اتنی ہی خاموشی تھی جتنی یہاں تھی ۔۔۔ اور زرد لالٹینیں ساکت تھیں۔
کسی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "یا میرے اللہ!" سب نے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ سگا لوک تھا جو موت کے خیال سے بیچین ہو رہا تھا۔ پھر بولا "انہیں لٹکایا جا رہا ہے۔"
سب نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سگا لوک مچل رہا تھا اور ہوا کو پکڑ رہا تھا۔
"یہ کیا بات ہے حضرات؟ کیا مجھے اکیلا جانا پڑیگا؟ ساتھ مرنے میں زیادہ لُطف آتا ہے۔ حضرات اس کے کیا معنی ہیں؟"
اُس نے ورنر کا ہاتھ پکڑا۔ پہلے انگلیاں بھینچیں اور پھر ڈھیلی پڑ گئیں۔
"پیارے آقا۔ کم از کم آپ تو میرے ساتھ چلئے۔ کیوں؟ مجھ پر یہ کرم کیجئے! انکار نہ کیجئے۔"
ورنر نے تکلیف سے جواب دیا "مَیں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا بھائی۔ میں اُسکے ساتھ جا رہا ہوں۔"
"یا میرے اللہ! تو پھر مجھے اکیلا ہی جانا پڑے گا؟ میرے اللہ! یہ کیسے ہوگا؟"
مُسیا نے آگے بڑھکر کہا "تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"
سگا لوک پیچھے ہٹ گیا اور اُس کے سفید سفید دیدے گھومنے لگے ۔۔۔
"تمہارے ساتھ!"
"ہاں"
"لو ذرا اِسے تو دیکھو! اتنی سی لڑکی! کیا تمہیں ڈر لگتا ہے؟ اگر تم ڈر رہی ہو تو مَیں اکیلا جانا پسند کرونگا۔"
"نہیں مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"
سگا لوک نے دانت پھاڑ کر کہا "ذرا اِسے تو دیکھو! لیکن کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ مَیں ایک قاتل ہوں؟ کیا تم مجھے نفرت سے نہیں دیکھتیں؟ بہتر یہ ہے کہ تم میرے ساتھ نہ چلو۔ میں تمہارے نہ جانے سے ناراض نہیں ہونگا۔"
مُسیا خاموش رہی۔ اور صبح کی مدّھم روشنی میں اُس کا چہرہ زرد اور پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ پھر یکایک وہ سگا لوک کی طرف جلدی سے بڑھی اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُس کے لبوں کو زور سے چوم لیا۔
سگا لوک نے اُس کے شانے پکڑ کر الگ کیا۔ پھر چٹخارے لے لیکر اُسکے لبوں، ناک اور آنکھوں کو پیار کیا۔
"آؤ!"
ایک سپاہی جو اُن کے قریب کھڑا تھا یکایک لڑکھڑایا اور اُسکے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اُسے اُٹھانے کے لئے وہ نہیں جُھکا بلکہ ایک لمحے تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر ایکدم سے پلٹا اور کسی اندھے آدمی کی طرح جنگل کے رُخ برف پر روانہ ہو گیا۔
ایک اور سپاہی نے خوفزدہ آواز میں چیخ کر کہا "تم کہاں جا رہے ہو؟ ٹھہرو!"
لیکن وہ گہری برف میں اُفتاں و خیزاں خاموش چلا جا رہا تھا۔ پھر کسی چیز سے اُلجھا ہو گا جو اُس کے ہاتھ اُٹھے اور وہ مُنہ کے بل گر پڑا۔ اور وہیں پڑا کا پڑا رہ گیا۔
سگا لوک نے دوسرے سپاہی سے سختی سے کہا "بندوق اُٹھا لے بے وقوف۔ ورنہ میں اُٹھا لوں گا۔ تجھے اپنے فرض کی بھی کچھ خبر نہیں۔"
ننھی لالٹینوں نے پھر ہلنا شروع کر دیا۔ اب کے ورنر اور یانسن کی باری تھی۔
سگا لوک نے اونچی آواز میں کہا "خدا حافظ جناب۔ دیکھنا ہم دوسری دُنیا میں ملیں گے۔ مجھ سے مُنہ مت پھیرنا جب مجھے دیکھو تو مجھے تھوڑا سا پانی پینے کا لا دینا ۔۔۔ وہاں بہت گرمی ہوگی۔"
"خدا حافظ!"
یانسن نے اونگھتے ہوئے کہا "میں پھانسی پانا نہیں چاہتا۔"
ورنر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور یانسن اکیلا چند قدم چلا۔ لیکن بعد میں دکھائی دیا کہ وہ ٹھہر گیا۔ اور برف میں گر پڑا۔ سپاہیوں نے جُھک کر اُسے اُٹھایا اور بغلوں میں ہاتھ دیکر لے چلے۔ وہ کسمساتا رہا۔ وہ چیخا کیوں نہیں؟ وہ شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ ایک آواز بھی رکھتا ہے۔
زرد رنگ کی لالٹینیں ساکت ہو گئیں۔
تانیا نے غمناک آواز میں کہا "اور میں مُسیا، کیا مجھے اکیلا ہی جانا ہوگا؟ ہم ہمیشہ ساتھ رہے لیکن اب ۔۔۔"
"تانیا پیاری ۔۔۔"
لیکن سگا لوک نے گرمجوشی سے اس کی طرفداری کی۔ مُسیا کا

ہاتھ پکڑ کر، گویا کوئی اُسے چھین نہ لے، جلدی جلدی تانیا سے کہنے لگا۔ "خاتون تم اکیلی جا سکتی ہو۔ تمہاری رُوح پاک ہے۔ جہاں چاہو اکیلی جاسکتی ہو۔ لیکن میں ـــ میں نہیں جاسکتا۔ قاتل! . . . . سمجھیں؟ میں اکیلا نہیں جاسکتا۔ مجھ سے پوچھا جائے گا: "ارے قاتل! تو کہاں جا رہا ہے؟" میں نے تو گھوڑے تک چُرائے ہیں۔ واللہ! لیکن اس کا ساتھ بالکل ایسا ہے ـــ بالکل ایسا ہے جیسے کسی معصوم بچّے کے ساتھ میں جاؤں۔ سمجھیں؟ سمجھیں یا نہیں؟"

"ہاں۔ جاؤ۔ آؤ، میں تمہیں ایک بار پھر پیار کرلوں مَسّیا"

سگا نوک نے کہا "پیار کرو۔ ایک دوسرے کو پیار کرو۔ یہ عورتوں ہی کا کام ہے۔ ایک دوسرے کو گرمجوشی سے خدا حافظ کہو"

مَسّیا اور سگا نوک آگے بڑھے۔ مَسّیا ہوشیاری سے چل رہی تھی۔ پاؤں کبھی کبھی برف پر رپٹتا۔ وہ عادتاً اپنا سایہ ذرا اُٹھائے چل رہی تھی۔ اور مرد اُس کا ہاتھ پکڑے قدم جما جما کر رکھتا ہوا استقامت سے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔

روشنیاں ساکت ہوگئیں۔ چاروں طرف سنّاٹا اور تنہائی تھی سپاہی خاموش تھے اور صبح کی بے رنگ مدھم روشنی میں سائے نظر آرہے تھے۔

تانیا نے یکایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہا "میں اکیلی ہوں۔ سمرنوئرا مرچکا۔ ورنر مرچکا ـــ اور وسیا بھی۔ میں تنہا ہوں۔ سپاہیو، سپاہیو! میں اکیلی ہوں۔ اکیلی ـــ"

سمندر پر سُورج طلوع ہو رہا تھا۔

لاشیں ایک بکس میں رکھدی گئیں اور اُنہیں اُٹھا کر لے چلے۔ گردنیں کھنچ کر لمبی ہوگئی تھیں۔ آنکھیں اُبل پڑی تھیں۔ نیلی، پھولی ہوئی زبانیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے نامعلوم بھیانک پھول۔ خونی کف آلود ہونٹوں میں دبے ہوئے ہیں ـــــــ مُردہ جسم اُسی راستے سے واپس لیجائے جا رہے تھے جس سے وہ زندہ آئے تھے۔ موسمِ بہار کی برف ویسی ہی ملائم اور تازہ تھی۔ بادِ بہار ویسی ہی پُر زور اور خوشبودار تھی۔ اور برف پر سرگے کا کالے ربڑ کا جوتا بھیگا ہوا اور کچلا ہوا پڑا تھا۔

طلوع ہونے والے سورج کا یوں خیر مقدم کیا گیا۔

(ختم شد)

(دا ایت ... ریو)

شاھد

آدمخور!

مُرتّبہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

کیا ۱۹۴۸ء میں بھی آدمخوری ہوتی ہے اور آدمی کو آدمی مار کر کھاجاتا ہے؟ اس سوال کا خوفناک جواب کہاں؟ کیسے؟ کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے۔ لاش کو کس شوق سے تندور میں بھونتے ہیں۔ کس طرح گوشت تقسیم کر کے کھاتے ہیں۔ کس طرح عورت اپنے پیارے بچے کو بھون کر کھاجاتی ہے اور اُس کے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عجیب وغریب اور خوفناک رسمیں اور رواج۔ کس طرح دولھا انسانی گوشت اور کلیجی کے ثابت ٹکڑے نگلتا ہے اور مُنہ سے ٹکڑا اگرا نہیں کہ خود دولھا ذبح ہوکر باراتیوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ عورتوں کو سزا دینے میں ہڈّی پسلی توڑ دیتے ہیں۔ ایک شوہر بیوی کو بطور سزا یا تفریحاً بھون کر کھاجاتا ہے۔ کس طرح انسانی شکار کیلئے آہٹ نہ ہونے والے جُوتے پہنے جاتے ہیں۔ اور کس طرح انسان کا انسان کھانے سے پہلے خُون چُوس کر پی جاتا ہے۔ والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے انگاروں پر اوندھا لٹادیتے ہیں اور جب چربی پگھل پگھل کر نکلتی ہے تو کمزور لڑکے کے بدن پر اس کی مالش کرتے ہیں اور پھر بہن کا گوشت بھائی کو کھلاتے ہیں۔

دورِ حاضرہ کے خوفناک ترین آدمخوروں کی مختصر سوانح حیات۔ اس کی خونخواری، اُس کے مظالم اور آدمخوری کی ہولناک داستان، وہ خوفناک انسان جو تین بہنوں کو کھاگیا، تین بیویوں کو کھاگیا اور لاتعداد دوست و دُشمن مار کر کھاگیا۔ آدمخوروں کی شادی غمی وغیرہ کے دلچسپ مگر لرزہ خیز حالات۔ رسمیں، رواج وغیرہ۔ پُرانی باتیں نہیں، افسانہ نہیں بلکہ آج کل کے سچّے حالات۔

قیمت ۲ علاوہ محصولڈاک۔ دبیز کاغذ، لکھائی چھپائی فوٹو بلاک کی دلچسپ آدمخور کی تصویر۔ عمدہ سرورق، مضبوط جلد۔

ملنے کا پتہ

دفتر کتابت۔ جودھپور

نقد و تبصرہ

حیاتِ سیاسی:- محمد مرزا صاحب دہلوی سیاسی کُتب کے مُصنّف کی حیثیت سے مُلک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ "اتاترک" مبصّرین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ "ایشیا کے بڑے لوگ" (چاروں حصّے) مقبولِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے "مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی" لکھی ہے، جسے اگر ایک بڑا کارنامہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ گزشتہ سو سال میں ہندوستانی مسلمانوں پر کیا کیا گزری؟ انگریزوں اور ہندوؤں نے اُن کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ یہ عبرتناک تاریخی شواہد ہیں جنہیں مصنّف نے منصف کی نظر سے دیکھا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت قدم قدم پر واضح ہوتی جاتی ہے کہ ہمسایہ قوم نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہونچایا۔ اعلانیہ بھی اور پوشیدہ بھی۔ مخالف بن کر اور موافق بنکر۔ مرزا صاحب نے اِن تمام امور کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دو مہینے پہلے تک کی پوری سیاسی معلومات، اس میں شامل ہے۔ مُلک کی کُل سیاسی جماعتوں اور اُن کی کارناموں پر مفصّل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہر مُصنّف کا ایک زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا زاویۂ نظر ایک ہمدرد اور سچے مسلمان کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان کو سیاستِ وطنی سے بخوبی واقف ہونے کے لئے "حیاتِ سیاسی" کا مُطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحے۔ مجلّد۔ مضبوط گرد پوش۔ قیمت عہ/
ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دہلی۔ "ش"

بغداد کا جوہری:- اشرف صبوحی صاحب دہلوی اُردو کے صاحبِ طرز مضمون نگار ہیں۔ ناظرین ساقی ان کے اکثر افسانے ساقی کے صفحات پر دیکھ چکے ہیں۔ اب اُن کی ایک نہایت پاکیزہ کتاب "بغداد کا جوہری" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ بغداد کے ایک لکھ پتی جوہری احمد کا قصہ ہے جو الف لیلہ کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ احمد جوہری جتنا مالدار تھا اتنا ہی حسین بھی تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ رومان کی تلاش میں اُس کی رسائی خوبصورت اُنیس جلیس تک بھی ہوئی جو بالآخر احمد کی شریکِ حیات بنی۔ اُنیس کی خوبصورتی سے زیادہ اُسکی خوب سیرتی دیکھنے کی چیز ہے۔ حسن و عشق کے نازک و لطیف معاملات قصے کے پیرائے میں اتنی عمدگی سے پیش کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا پھڑک جاتا ہے۔ بقولِ تعارف نگار "اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک لطیف و پُر معنی تمثیل ہے جس میں فلسفۂ حیات اور فلسفۂ حُسن کے بہت سے رموز و نکات پوشیدہ ہیں" داستان غایت درجہ دلچسپ ہے اور شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے جی نہیں مانتا۔ یہ قصہ انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اتنا عمدہ کہ طبعزاد پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ مضبوط جلد۔ رنگین گرد پوش۔ ضخامت ۱۷۰ صفحات۔ قیمت عہ/ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دہلی۔ "شس"

ایشیا کے بڑے لوگ

حصّہ اوّل:- (ہندوستان) اس حصّہ میں رئیس الاحرار محمد علی مرحوم، دیش بندھو سی آر داس آنجہانی، گاندھی جی اور قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کے حالاتِ زندگی۔ اور ہندوستان کی سیاست میں اِن حضرات نے جو جو تحریکیں کی ہیں اُن سب کی تفصیل۔

حصّہ دوم:- (چین و ایران) چین کے مشہور لیڈر مارشل چیانگ کائی شک اور ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی اور کارنامے اردو میں پہلی مرتبہ اس جامعیت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

حصّہ سوم (عراق و عرب) اس حصّہ میں امیر فیصل بن حسین الہاشمی، اور سلطان عبدالقدیر ابن سعود کے حالاتِ زندگی اور کارنامے پیش کئے ہیں۔

حصّہ چہارم (مصر و مراقش) مصر کے اولوالعزم قائد احمد زغلول اور ریف کے مشہور مجاہد غازی محمد بن عبدالکریم کے حالات اور کارنامے۔

ان چاروں حصّوں کے ٹائیٹل نہایت خوشنما اور کاغذ لکھائی چھپائی وغیرہ اعلیٰ درجے کی ہے۔

قیمت فی حصّہ آٹھ آنے۔ چاروں حصّوں کی قیمت دو روپے۔ چاروں حصّے یکجا، اعلیٰ درجے کی کپڑے کی جلد۔ سنہری ٹھپہ دو روپے آٹھ آنے۔ محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔

ملنے کا پتہ:- ساقی بُک ڈپو دہلی

ساقی کا شاندار
افسانہ نمبر

ساقی بابت جولائی ۴۰ء افسانہ نمبر ہوگا۔ جس کے لئے نہایت کاوش سے اعلیٰ درجے کے افسانے فراہم کئے گئے ہیں۔ افسانوں میں بےحد تنوّع ہے۔ ملک کے بہترین انشاپردازوں سے یہ افسانے لکھوائے گئے ہیں۔ ایسا نادر مجموعہ آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے شامل کئے جاچکے ہیں:۔

(۱) ایم۔ اسلم، (۲) لطیف الدین احمد، (۳) کرشن چندر، (۴) پروفیسر محمد مسلم، (۵) مرزا عظیم بیگ چغتائی، (۶) صادق الخیری (۷) قیسی رامپوری، (۸) عصمت چغتائی، (۹) شاہد لطیف، (۱۰) راجندر سنگھ بیدی، (۱۱) ممتاز مفتی، (۱۲) اپندر ناتھ اشک، (۱۳) سید رفیق حسین، (۱۴) ظفر قریشی، (۱۵) اشرف صبوحی، (۱۶) وجاہت سندیلوی، (۱۷) احمد ندیم قاسمی، (۱۸) بھارت چند کھنہ، (۱۹) ماہر القادری، (۲۰) ساون مل ترکھا، (۲۱) پروفیسر محمد محسن، (۲۲) عبدالقادر فاروقی، (۲۳) سعادت حسن منٹو، (۲۴) ایس۔ ڈبلیو۔ حیدر، (۲۵) امان اللہ، (۲۶) سراج الدین احمد، (۲۷) علّامہ مضحک دہلوی، (۲۸) عبدالجلیل، (۲۹) ریاض روفی، (۳۰) کرشن چندر سکینہ، (۳۱) کوکب شاہجہانپوری، (۳۲) سید احمد حسن اسعد گیلانی، (۳۳) سید کریم احمد،

افسانہ نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی۔ محصول ڈاک مع رجسٹری چار آنے،

مستقل خریداروں سے علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائیگی۔ اگر آپ مستقل خریدار نہیں ہیں تو اب بن جائیے تاکہ یہ نفیس تحفہ آپ مفت حاصل کرسکیں،

مہتمم ساقی"